استاذ بہی خولی

تحریک اور دعوت

مترجم

عبیدُ اللہ فہد فلاحی

ہندوستان پبلی کیشنز دہلی ۶

[illegible]

3,6,829

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ملنے کے پتے

[illegible]

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ
اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ (المزمل: ۱۹)

یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب
کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے۔

(قرآن مجید)

آغازِ کلام

حسن البنا شہیدؒ

اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ اَفْضَلِ الدَّاعِیْنَ اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ وَّالْمُجَاھِدِیْنَ فِیْہِ بِاِحْسَانٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَمَنِ اھْتَدٰی بِھَدْیِھِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ وَبَعْدُ:

میں نے اسالیب دعوت اور داعیانِ دین کی تربیت و تشکیل کے سلسلہ میں ان ہدایات بلکہ لکچرس کا مطالعہ کیا۔ مجھے اس سے غایت درجہ کا اطمینان اور مسرت نصیب ہوئی اور میں نے اس میں اخلاص و للّٰہیت اور توفیقِ خداوندی کی خوشبو محسوس کی۔ میری دُعا ہے کہ یہ کتاب خلقِ خدا کے لئے نافع ہو، اس کے کلمہ کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو اور توحید کے ماننے والوں کے دلوں کو روشن کرے۔

یہ مصنّف اور لکچرار مجاہد بھائی استاذ بہی خولی کے سلسلے میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کہ موصوف اللہ کے فضل سے صاف و شفاف ذہن رکھتے ہیں، فہم و فقہ

[illegible]

محتاج دعا

حسن البنا (رحمۃ اللہ علیہ)

اخوان المسلمین کا مرشد

مُقدّمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَمَنْ وَّالَاہُ

میرے بعض اخوانی دوستوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان سے بعض وسائل دعوت پر گفتگو کروں تاکہ اخوان کی صفوں میں شامل ہو کر وہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو "داعیوں کا دستہ" کا لقب دیا۔ میں نے سوچا کہ معذرت کر لوں کیونکہ میرے اندر وہ صلاحیت اور علم نہیں ہے جو اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے درکار ہے لیکن میں نے اپنی اس رائے پر نظر ثانی کی تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے لوگوں کے حُسنِ ظن کو برقرار رکھنا چاہیئے اور اللہ کی جو مرضی ہو گی میرے اور ان کے ذریعہ وہ خدمت انجام پائے گی چنانچہ ہم نے ایک ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔ آج جو باتیں اس کتاب کی شکل میں قارئین کے سامنے میری یا میرے اخوانی بھائیوں کی جانب سے پیش کی جا رہی ہیں، ان کی طباعت کا ارادہ دراصل انہی لوگوں نے کیا اور اپنے انفرادی مصارف سے بچا کر اس کی طباعت اور چھپائی کا انتظام کیا اور اسے ان لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جو ان لیکچرس میں موجود نہیں تھے۔

میں تمام قارئین سے سب سے پہلے یہ معذرت کرنا چاہتا ہوں کہ ان باتوں میں جو

آپ کو پسند نہ آئیں وہ اگر غلط ہوں اور لغزش اور گناہ کا موجب ہوں انہیں آپ چھپا دیں اور جو کوتاہیاں نظر آئیں ان سے صرفِ نظر کرنے کے آپ مستحق ہیں۔

یہ کوئی خطیبانہ کتاب نہیں ہے

میں ابھی سے یہ بتا دوں کہ یہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں خطابت کا خیال رکھا گیا ہو، اس کے تمام علمی قواعد کا اس نے احاطہ کیا ہو اور اس کے فنی اصولوں کی چھان بین کی ہو اور ان قواعد پر اس کی عمارت کھڑی ہوئی ہو جو علم کے متقاضی ہوں اور ان اصولوں سے ایسی چیزیں اخذ کی گئی ہوں جن کی طرف یہ فن اشارہ کرتا ہے کہ فنِ خطابت سے دلچسپی رکھنے والے اس میں اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈھ سکیں اور اپنے عقل و جذبات کو لطف اندوزی کا موقع دے سکیں، خدانخواستہ اس قسم کی کوئی بات یہاں نہیں ہے۔ بلکہ یہ چند نکات پر مشتمل ایک کتاب ہے جس میں خطابت اور اصول وعظ پر مدون کتابوں کی طرف رجوع نہیں کیا گیا ہے بلکہ کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کی روشنی میں کچھ ہدایات ہیں، کچھ خاص تجربات ہیں جو مجھے دعوت کے میدان میں حاصل ہوئے ہیں، کچھ اقتباسات ہیں جنہیں میں نے استاذ حسن البناؒ کی عبقری شخصیت سے اخذ کیا ہے ان کی رُوحانی شخصیت سے بھی اور عقلی شخصیت سے بھی۔ ان وضاحتوں کی روشنی میں میرے بھائی! اس کتاب کا مطالعہ کریں، اگر آپ اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے سینے کھول دے اور اس کتاب کی تالیف میں از اوّل تا آخر جو حسن نیت شامل رہا ہو اس کی برکت سے آپ کو بھی فائدہ پہنچے آمین!

داعی اور خطیب میں فرق

لیکن فنِ خطابت کے اصول و قواعد کا احاطہ نہ کر کے مجھے قطعی افسوس نہیں ہے بلکہ مجھے غایت درجہ انشراح اور اطمینان حاصل ہے۔ کیونکہ میں نے یہ لیکچرس خطیبوں یا فنِ خطابت کے دلدادہ طلبہ کے لئے نہیں دی ہیں بلکہ میں نے تو اپنے سامنے ان داعیانِ دین کو رکھا ہے جو اللہ کی طرف خلقِ خدا کو بلانے کی رغبت رکھتے ہیں۔

داعی اور خطیب میں بڑا فرق ہے۔ خطیب بس خطیب ہوتا ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لیکن داعی ایک فکر کا علمبردار ہوتا ہے اور اس کی طرف خطابت، تحریر، عوامی گفتگو، اپنی خاص و عام زندگی کے نفع بخش اعمال اور تمام پروپیگنڈہ وسائل کے ذریعہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ مصنّف اور مضمون نگار بھی ہوتا ہے تو خطیب بھی ہوتا ہے، عوامی گفتگوئیں بھی کرتا ہے اور کردار کا نمونہ بھی پیش کرتا ہے وہ لوگوں پر اپنے کام اور اپنی شخصیت دونوں کے ذریعہ اثر انداز ہوتا ہے وہ سوسائٹی کے فاسدانہ نظام اور طریقۂ کار کی اصلاح کرتا ہے وہ ایک سوشل ڈاکٹر ہوتا ہے دلوں کے امراض کا علاج کرتا ہے چنانچہ وہ تنقید بھی کرتا ہے اور جائزہ بھی لیتا ہے اس کی زندگی اصلاح پر قائم ہوتی ہے۔ وہ ایک اچھا ساتھی اور دوست ہوتا ہے، امیر و غریب سب کا بھائی ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے شفقت و احترام کا معاملہ کرتا ہے۔ انہی صفات کی وجہ سے ہم اس کے دل میں محبت کا دریا موجزن دیکھتے ہیں اس کی آنکھوں سے رحمت و شفقت چھلک رہی ہوتی ہے، اس کی زبان زخمی دلوں پر پھاہا رکھتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے ہاتھ کمزوروں کے لئے اُٹھتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ اور یہ داعی کے لئے بہت ضروری ہے اور ان سب کا تعلق رُوح اور دل سے ہے بلاغت و فصاحت کے کمالات سے نہیں۔ داعی اپنے دائرے میں قائد ہوتا ہے، اپنے ماحول میں سیاست داں ہوتا ہے، اپنی فکر کا لیڈر ہوتا ہے اور اس فکر کے علمبرداروں کی رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ ساری صفات تنہا خطابت کے حقوق ادا کرنے سے پیدا نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ اس کے لئے اندرونی تاثیر چاہیئے، رُوحانی کمال چاہیئے، خدا سے مضبوط تعلق ہونا چاہیئے اور تاریخ کے تجربات اور لوگوں کے حالات سے عقل کا استفادہ کرنا ضروری ہے۔

اس سے میں خطابت کی قدر و قیمت کو گھٹاتا نہیں نہ دعوت کے لئے اس کی ضرورت و اہمیت سے مجھے انکار ہے یہاں تو داعی کی صفات واضح کی گئی ہیں تاکہ ان باتوں کا مزاج اور ان کی رُوح آپ کے سامنے آجائے جو داعیانِ دین کے لئے پیش کی گئی ہیں نہ کہ مقرّروں اور خطیبوں کے لئے، جیسا کہ آنے والی فصلوں میں آپ خود دیکھیں گے۔

روحانی وادیوں کا سفر

میرے مخلص بھائیؑ! آپ کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات تر و تازہ رہنی چاہیئے کہ ان گفتگوؤں میں دعوت، داعی، خطابت اور خطیبوں کے سلسلے میں جتنی گفتگو بھی کی گئی ہے ان سب سے میری مراد اخوان المسلمون کی وہ دعوت ہے جس کے نقوش امام شہید حسنؒ البنا نے اُجاگر کئے تھے اور جن کے راستے اور اُصول آپ ہی نے طے کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو۔

حسنؒ البنا کی دعوت تک اپنی گفتگو محدود کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب سے سچی

دعوت ہے اور سب سے زیادہ راست بھی، یہ وہ دعوت حق ہے جس کی خاطر آسمان اور زمین قائم ہیں اور اس میں کائنات کے ظاہری و باطنی تمام قوانین شامل ہیں اور ہمارے اطمینان کے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ اللہ کی دعوت ہے جو سراپا حق ہے اور حق کی یہ دعوت بھی اسی کی ہے۔

اسی لئے اس رسالہ میں قارئین ایسی فصلیں بھی پڑھیں گے جو روحانی وادیوں اور نفسی پہنائیوں کا سفر طے کراتی ہیں جو ان تمام رائج باتوں سے الگ اور جُدا ہیں جو فنِ خطابت اور پروپیگنڈہ کی تمام کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایسی فصلیں بھی ملیں گی جو خطیب کی حرکت اور اس کے اشارے، اس کی آواز اور مہارت، اس کے جسم کی طبیعت اور اس کی قامت کے اوصاف پر کوئی گفتگو نہیں کرتیں، میری رائے میں یہ تمام چیزیں ایکٹروں اور ڈرامہ کے اسپیکروں کے لئے تو ضروری ہو سکتی ہیں لیکن جو لوگ داعیان دین ہیں، جو ایک اُمت برپا کرنا چاہتے ہیں یا اس کا زمین مدد کرنا چاہتے ہیں —————— یا جو ایک مملکت کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں یا اس کی تشکیل کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہونا چاہتے ہیں تو ان کے لئے اُن چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بالکل طے شدہ حقیقت ہے جس میں کسی ریب و تردد کی گنجائش نہیں ہے — اُمتیں شور و ہنگامہ اور نعرہ و غوغا کے بل پر قائم نہیں ہوتیں نہ بناوٹی اور تکلفانہ حرکات سے ان میں کوئی بیداری لائی جا سکتی ہے۔ ہم نے اس کتاب کے بعض مباحث میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہم قاری کو رُوحانی وادیوں اور نفسی آفاق کی سیر کرائیں۔ اس سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کی راہ دیکھ لے، فطرت ہر آدمی کے سینے میں بکھرے ہوئے صفحات ہیں جن میں اللہ نے بلند نصب العین سیدھا راستہ اور وہ قیمتی حقائق

ثبت کردیے ہیں جن سے انسان سر بلند ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔

مَردِ خدا مست

میرے بھائی !

آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر انسان —— خواہ کوئی بھی ہو —— عظیم صلاحیتوں کا سر چشمہ ہوتا ہے، ان قدروں اور فضیلتوں کا منبع ہوتا ہے جو زندگی کو تر و تازہ بنا دیتی اور انسانیت کی زلفوں کو سنوار دیتی ہیں اور ان نفسی سر چشموں اور اندرونی سوتوں کا منہ کھولنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ بلند و برتر اللہ کے نام سے انہیں ابھار دیا جائے اللہ وحدہٗ لاشریک کا نام ہی ان بند ربانی خزانوں کی چابی ہے اور یہ چابی اللہ تعالیٰ اس خدا پرست شخص ہی کے ہاتھ میں دیتا ہے جو خدا پرستی کی تمام صفات سے متصف ہو، اپنے نفس سے بھرپور مجاہدہ کرتا ہو، اس کی خواہشات پر قابو رکھتا ہو اور اسے آسانی سے اس طرف موڑ سکتا ہو جدھر اللہ کی مرضی ہو :

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (عنکبوت : ۶۹)

(جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے، انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے)

آپ اس آیت کی عملی تفسیر ان سر فروش مجاہدوں کی تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں جنہیں رسول اکرم ﷺ نے اپنی نگرانی اور تربیت میں تیار کیا تھا اور اللہ کی توفیق اور اس کے فضل سے ان کے اندر جاں سپاری اور سر فروشی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ انہوں

نے علاقے کے علاقے فتح کر لئے کیونکہ اس سے پہلے وہ نفس کی دُنیا کو زیر کر چکے تھے، پوری دُنیا کو حق کی روشنی سے منور کر دیا کیونکہ ان کے سینے اس کی کرنوں سے روشن تھے اور کائنات کو عدل و ایثار اور انصاف و مساوات کی نعمت سے نوازا کیونکہ ان کے دلوں کے گوشوں سے ان تعلیمات کے چشمے پھوٹ بہے تھے اور وہ اعمال صالحہ، اخلاق فاضلہ اور بلند اقدار سے مسلح تھے چنانچہ انہوں نے وہ نفسی و مادّی کارنامے انجام دیے کہ اہلِ دانش دنگ رہ گئے، بڑے بڑے سورماؤں کو اپنا قد ناپنا پڑا اور افسانوں کی دُنیا کی محیر العقول باتیں تجربہ اور مشاہدہ میں آگئیں۔ اس لئے کہ وہ ایسی ہمت اور عزم محکم کے مالک تھے جس کا آسمان کے نیچے کوئی ہمسر نہ بن سکتا تھا بلکہ رسولِ خدا کے بقول اگر ایمان ثریا پر ہوتا تو یہ مردان خدامست اسے حاصل کر کے رہتے۔

میرے بھائی! اُن شاہین صفت لوگوں سے اِن گم کردہ راہ لوگوں کی کیا نسبت ہو سکتی ہے، جو خود اپنی منزل کھو بیٹھے ہیں، جنہوں نے اپنے کو طرح طرح کے فتنوں کی لپیٹ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ یورپ وطن اور وطنیت کے نعرے لگا رہا ہے، قومیت کی راگ الاپ رہا ہے اور مختلف عناصر کی خصوصیات اُبھاری جا رہی ہیں تو انہوں نے بندروں کی طرح نقالی شروع کر دی اور طوطے کی طرح رٹا رٹایا سبق دہرانے لگے، انہوں نے سیاسی و اقتصادی اور اجتماعی اُصول بنائے اور ایسی اصطلاحات اور "تہذیب یافتہ" الفاظ استعمال کئے جنہوں نے ناجائز خواہشات اور باطل ضروریات پر پردہ ڈال دیا اور دنیوی غنائم کے حصول کے لئے پارٹیاں اور انجمنیں بنائیں اور ان سے ظلم و طغیان اور شر و فساد کے سرچشمے پھوٹ پڑے۔ آج ان کے یہاں جتنی پارٹیاں، انجمنیں، بزمیں اور اجتماعات ہوتے ہیں اور جتنی لمبی چوڑی اور خوش کن باتیں

کی جاتی ہیں وہ سب ؎

طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

کی مصداق ہیں ان کی ظاہری چمک دمک جھوٹی اور فریب کُن ہے باطن میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو فطرت سے ہم آہنگ ہو یا عقل جسے تسلیم کرتی ہو، آج یہ بے وقعت آوارہ گردی کر رہے ہیں ان کے اعمال کی کوئی قیمت ہے نہ باتوں میں کوئی وزن ہے۔

میں اخوان کی جانب داری نہیں کرتا

میں ان تحریروں سے اخوان کی صفائی پیش نہیں کرتا نہ ان کے تزکیہ کا ڈھول پیٹنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ اس سے بہت پرے ہیں کہ اپنے آپ کو تزکیہ یافتہ کہیں جبکہ وہ کتاب الٰہی کی یہ آیت بھی پڑھتے رہے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ (نساء: ۴۹)

(تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے)

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (نجم: ۳۲)

(پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے)

میں اُن کے طریقہ کار کی صفائی بھی پیش نہیں کرتا کیونکہ انہوں نے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی ہے بلکہ وہ قدیم ہے وہ ایک ایسا دستور العمل ہے جس کا تزکیہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور قیامت تک کے لئے اس کی دعوت دینے کا حکم دیا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا

وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝

(یوسف : ۱۰۸)

(تم ان سے صاف کہہ دو کہ "میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں،
میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی،
اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں)

اور اگر وہ اس دستور العمل کی دعوت دیتے ہیں تو ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ
اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ان کو اس کی توفیق دی :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ
اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ (اعراف : ۴۳)

(تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ
پا سکتے تھے، اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا)

میں ان کے قول کی صفائی بھی پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ وہی کہتے ہیں جو اس
دعوت کے مفاد میں ہو، اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کرتا ہو اور اس کی کتاب
قرآن مجید اور اس کے رسولؐ کی سنت سے ماخوذ ہو۔ اور ایسے لوگوں کی تعریف خود
اللہ نے کی ہے :

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا
وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ : ۳۳)

(اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا
اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں)

یہ تعصب نہیں ہے

یہ ہے ہمارا موقف اپنے اور دوسرے لوگوں کے سلسلے میں! ہمارا اس بات پر مضبوط و مستحکم ایمان ہے کہ ہمارے پاس جو پیغام ہے وہی حق ہے، اس کے علاوہ جو دوسرے طریقہ کار اور نظریات ہیں باطل ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہے نہ ان کا کوئی وزن ہے۔ حق کے بعد تو ضلالت اور گمراہی ہی بچتی ہے اسی لئے ہم نے اسے مہلت دے دی ہے، یہاں کم یا بیش اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے اسی لئے ہمارے خلاف اس کی دلیل نہ دیں کہ باطل بے دلیل ہوتا ہے۔ یہاں حق کی دعوت اور اس کے طریقوں پر جو تھوڑی سی گفتگو ہوئی ہے وہ ان کے مقدار کثیر سے کہیں وزنی اور بے نیاز ہے۔

یہاں گفتگو کے بیچ بیچ میں ایسے جملے آئیں گے جن سے بظاہر یہ وہم ہو سکتا ہے کہ میں اخوان کی بے جا حمایت کر رہا ہوں اور ان کے سلسلے میں تعصب سے کام لے رہا ہوں لیکن میرے بھائی! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس چیز کی میرے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے نہ کسی اخوانی کے یہاں اس کی کوئی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ لیکن نہیں، مجھے کہنے دیجئے کہ میں اخوان کے سلسلے میں متعصب ہوں لیکن اس وجہ سے کہ وہ حق کے علمبردار ہیں، اس وجہ سے نہیں کہ متعین رنگ رکھنے والی کوئی خاص ہیئت ہے۔ ہم محض ایک فکر کے علمبردار ہیں کسی ہیئت یا ڈھانچہ کے علمبردار نہیں ہیں۔ اور فکر بھی ایسی جو نہایت اہم اور وسیع ہے۔ آسمان اور زمین سے بھی زیادہ وسیع — اس لئے کہ یہ ایک روح ہے جو اللہ کے حکم سے وجود میں آئی ہے، ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس فکر کو محدود کر دیں، اس کا دائرہ تنگ کر دیں یا اسے کوئی متعین رنگ دے دیں۔ اس فکر کے مدعو انسانیت

کے تمام افراد ہیں یہی اللہ کی مشیت ہے ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے کسی متعین تعداد یا محدود ہیئت میں گھیر دیں۔ ہم ظاہری صورتوں اور تنگ میدانوں کے لئے تعصب رکھنے سے بری ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اگر یہ سمجھا جائے کہ میں متعصب ہوں تو اے میرے بھائی، اسے اسی شکل میں سمجھیں۔ یہ تعصب حقِ مُبین کے لئے ہے۔ ایسے شخص کا تعصب ہے جس کا ایمان ہے کہ وہ بہر حال حق پر ہے اور اس کا مخالف بہر صورت باطل پر ہے۔ ایسے شخص کا تعصب ہے جو آپ کو آغاز ہی میں یہ سمجھا چکا ہے کہ کسی صورت میں بھی آپ کی کوئی ایسی رائے نہیں مان سکتا جو اس دعوت کی رُوح کے خلاف ہو، چاہے آپ اس کے حق میں دلیل دیں یا نہ دیں، دلائل سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کریں یا نہ کریں، وہ کبھی تیار نہیں ہو سکتا کہ کسی ایسے معاملہ میں جس کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ موجود ہے، کسی انسان کی رائے تسلیم کرلے۔ یہ ہماری دعوت پر ہمارے ایمان و اخلاص کا تقاضا ہے جسے بعض لوگ جہالت کی وجہ سے تعصب کہتے ہیں اور ہم نے بحث و مباحثہ کے لئے اور کسی حد تک معنوی موافقت کی وجہ سے اسے تعصب کا نام دے رکھا ہے۔ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور آپ کو حق پر ثابت قدم رکھے، ہمارے دلوں کو اس سے روشن کرے اور ہمیں اپنے کارکُن فوجیوں میں شامل کرلے اِنَّہٗ قَرِیۡبٌ مُّجِیۡبٌ۔

اَلْبَهِیُّ الْخَوْلِی

پہلا باب

دعوت اور داعیانِ دین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ..

وَعَمِلَ صَالِحاً ..

وَقَالَ اِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ .

فُصِلَتْ ۳۳

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ

کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا ———

——— اور کہا کہ میں مسلمان ہوں !

(قرآن مجید)

پہلی فصل

دوراہے پر

اسلام ہی توحید کی وہ عظیم دعوت ہے جسے لے کر رسول اکرمؐ مبعوث ہوئے تاکہ انسانیت کا مکمل نظام حیات، اس کی مادی و روحانی دونوں زندگیاں ہر زمان و مکان میں اسلام کے مطابق بسر ہوں۔

یہ حقیقت بالکل واضح اور آفتاب کی طرح روشن ہے، اس میں باطل آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ عقل و بصیرت کے نزدیک بھی یہ نمایاں اور کھلی ہوئی صداقت ہے یہاں تک کہ ہماری اپنی فطری ضروریات اور واقعیت پسندی بھی اس کی محتاج ہیں جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض "مسلمانوں" کے نزدیک یہ حقیقت مبہم ہے وہ اس کو زنگ آلود افکار اور بوسیدہ قوانین کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور جو لوگ اسے قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ یہ قافلۂ انسانیت سے بچھڑا ہوا گروہ ہے جو تہذیب کے اسلوب سے ناواقف ہے اور اس کی مختلف ہیئتوں اور شکلوں کے بارے میں نرمی کا کوئی گوشہ نہیں رکھتا۔ اگر ان میں سے کسی کی رائے آپ کے بارے میں اچھی ہوگی تو وہ بھی آپ کو ایسا اسلام پسند متعصب کہے گا جس کی بے باکی اور بے خوفی نے اشیاء کی قیمت بڑھا دی ہے اور بس۔

اس حقیقت کے سلسلے میں یہ دونوں نقطۂ نظر ہیں ایک اسے قبول کرتا اور اس کا

اعتراف کرتا ہے جبکہ دوسرا نقطۂ نظر اس کی تردید کرتا ہے۔ تو ان میں سے کون سا نقطۂ نظر قبول کرنے کے لائق ہے؟

ہم ابھی اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دینا چاہتے بلکہ اس سے الگ ایک دوسری حقیقت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ یہ لوگ ہم سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں نہ ہم ان سے کم سمجھ اور دانش رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ ہم پر فوقیت پا جائیں یا ہم ان سے سبقت لے جائیں تو یہ کوئی تقدیر نہیں ہے جو ہمارے اور ان کے اندر جُدائی ڈال رہی ہے اور ہم کو اور ان کو دو کناروں پر کھڑا کر دیتی ہے۔ ہم ایک دوسری حقیقت کا اثبات چاہتے ہیں وہ یہ کہ ہم پیہم مجاہدہ اور کشمکش میں لگے ہوئے ہیں تاکہ اپنی اندرونی صلاحیتوں اور طاقتوں کو زندہ و بیدار رکھ سکیں۔ ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ ہم نے منزل مار لی ہے بلکہ ہم پیہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اپنی فطری صلاحیتوں کو مادیت کی لہروں اور اس کی ناپاک خواہشات سے بچا سکیں اور اس کے ذوق اور قوت مُدرکہ پر مہر لگا دیں لیکن یہ لوگ اس طرح کے کسی مجاہدہ یا ریاضت کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ یہ پوری طرح سے مسرور اور مگن ہیں اور تہذیب جدید کے خیر و شر، تلخ و شیریں اور فوائد و نقصانات میں غرق ہیں۔

اب آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس ابدی حقیقت اور فطری صداقت — اسلام — کو سمجھنے میں ہمارے اور ان کے درمیان اختلافات کی اصل بنیاد کیا ہے؟

اختلاف کا محور

یہی نقطہ اختلافات کا محور اور افتراق و تضاد کا مرکز ہے۔ یہ لوگ رُوحانی اضمحلال کی

حالت میں ہیں، باطل تہذیب نے ان پر حملہ کر دیا ہے، ان کی اندرونی صلاحیتوں کو مسخ کر دیا ہے انہیں دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے یا جمود و تعطل کا شکار بنا دیا ہے اور افسوس ہے کہ اس بے حس گروہ کو جتنا بھی مخاطب کریں، اسلام کی صحت اور اس کی درستگی پر انہیں مطمئن نہیں کر سکتے۔ یہ آپ کی باتیں سنیں گے لیکن کانوں سے اڑا دیں گے، آپ کی طرف بظاہر دیکھیں گے لیکن دل کہیں اور لگا ہوگا:

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ (انعام: ۲۵)

(ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے) وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آ کر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ ساری باتیں سننے کے بعد یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں)

یہاں ہمارے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ اس لئے نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کی عقلیں بالکل کوری ہیں بلکہ وہ یہ حقیقت اس لئے نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ ان کے دل، جو ایمان اور عقائد کا مرکز ہوتے ہیں، مادی مشغولیات اور دنیاوی دلچسپیوں میں کھو گئے ہیں

جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے سے عاری ہیں۔

جی ہاں، عقائد، اقدار، اصولوں، مواعظ اور آداب و قواعد کے فہم کا انحصار باطن کے ذوق، اس کی مُدرکانہ قوتوں اور اس کے حواس پر ہے۔ یہ فہم ریاضی کا کوئی فارمولہ نہیں ہے جو مشق و تمرین اور حساب کے پیمانوں سے سمجھ میں آجائے نہ طبیعی عقل کا فہم ہے جو ہمارے سامنے طبیعت کی کائنات، اس کے عناصر، اس کی طاقتوں، اس کی خاصیات اور ان سے انتفاع کی کیفیت کھول کر رکھ دیتا ہے یہاں جو فہم مطلوب ہے وہ ایک حسّی عمل ہے یا باطنی مذاق ہے اور بالغ وجدان شعور ہے جو حق کو بے انتہا محبوب رکھتا اور باطل سے بے نہایت نفرت رکھتا ہے۔

حسّی طاقت

انسان کے پاس ادراک کرنے کی دو قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں ایک طاقت حسّی ہوتی ہے جسے حواس عقل کی مدد سے فراہم کرتے ہیں اس کے ذریعہ آسمان و زمین میں ہمارے اردگرد کی محسوس کائنات کا ادراک ہوتا ہے اور اسے "حسّی طاقت" کہتے ہیں، دوسری قسم "فکر" کہلاتی ہے، جسے عقلی خاصیت انجام دیتی ہے اسی سے کائنات کی وجودِ باری تعالیٰ پر دلالت کا ادراک ہوتا ہے۔

یعنی حسّی ادراک کائنات کے مادّی پہلوؤں سے خاص ہے جبکہ فکری ادراک معنوی پہلو کو اخذ کرتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات خالق تعالیٰ کی قدرت و علم، حکمت و رحمت، کرم و محبّت اور دوسری تمام صفات پر دلالت کرتی ہے۔

۱۔ اگر انسان کی یہ دونوں مُدرکانہ قوتیں محفوظ ہوں تو محسوسات و معنویات دونوں کے

سلسلہ میں اس کا شعور اور تفقہ مکمل ہوتا ہے۔

محسوسات کا علم اپنے اندر کائنات کا مادہ اور اس کے عناصر، اس کی خصوصیات اور اس کے قوانین، انہیں اخذ کرنے کی کیفیت اور ہماری دنیا اور معاش کی تنظیم کرنے کی صلاحیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

کائنات کی وجود باری تعالیٰ پر دلالت کا مطلب یہ ہے کہ یہ پوری کائنات خدائے تعالیٰ کی عظیم صفات کی نشانی ہے۔ اگر "فکر" اس نشانی کو دیکھے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اس نے کسی رنگ، کیفیت یا جسم کو دیکھ لیا ہے بلکہ اس نے اس "معنوی چھاپ" کا مشاہدہ کیا ہے جس سے دل خدا کی عظمت اور اس کی معنویت کا احساس کرتا ہے، اس کی قدرت اور اس کے مفہوم کو اخذ کرتا ہے، اس کی رحمت، اس کا کرم، اس کی دوستی اور اس کا حسن سلوک، اس کی نیکی اور بھلائی، غرضیکہ تمام اسمائے حسنیٰ اور ان کے معانی کا ادراک کرتا ہے۔ اور پھر دل میں معنویات کا "وجود" قدم جمالیتا ہے جو قدسی صفات کی نشانیاں اور اس کے آثار ہوتے ہیں اور وجدان کی ہر وہ صفت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے مناسب ہوتی ہے، یہ پاکیزہ وجود یا یہ معنوی شاندار تعمیر ہی معرفت الٰہی کا خلاصہ ہے اور اس کو ہم ایمان اور عقیدہ کہتے ہیں جو انسانی قدروں اور اس کے اصولوں اور انسانیت کی جملہ خصوصیات کا مخزن ہوتا ہے۔ ان وجدانات کی انسانی زندگی میں بڑی غیر معمولی اہمیت ہے انہی سے انسان چیزوں کے حسن و قبح کا اندازہ لگاتا اور پھر حق سے بے انتہا محبت کرتا اور باطل سے بے نہایت نفرت کرتا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ (حجرات: ۷)

(مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لئے دل ناپسند بنادیا؟
اور کفر و فسوق اور نا فرمانی سے تم کو متنفر کر دیا)

اسی سے انسان کے اندر سے کراہت اور حسد، خود غرضی اور لالچ اور فتنہ و فساد کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، یہ حق انسان کے ارادے پر مستولی ہو جاتا ہے تو اسے بلند و برتر مقاصد کی طرف موڑ دیتا ہے، خیر اور عدل، نیکی اور بھلائی، محبت اور رحمت اور دوسری تمام صفات کے چشمے پھوٹ بہاتا ہے۔

انہی وجدانات کی وجہ سے ہم اپنے دلوں میں معرفت خداوندی کے حقائق زندہ و بیدار محسوس کرتے ہیں، وہ کبھی مردہ نہیں ہوتے نہ ان پر اضمحلال طاری ہوتا ہے اور پھر آدمی اسی معرفت کی روشنی میں اور اسی کے تقاضوں کے تحت دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ یہ ہے معنوی دلالت کا مفہوم!

پھر کیا ہوتا ہے؟ فکری وجدان اپنے تمام بلند حقائق اور وجدانات اور رُوحانی خصوصیات کے ساتھ محسوسات کی منطق پر حاوی ہو جاتا ہے اور حسّی طاقت اپنے تمام اسباب و وسائل کے ساتھ ان مقاصد اور غایات کی طرف مُڑ جاتی ہے جو اس کے سامنے معنویات کی منطق پیش کرتی ہے۔ یعنی حق اس کا مقصد اور نصب العین بن جاتا ہے اور خیر و عدل کے کام اس کا مطمح نظر بن جاتے ہیں اور یہی انسان کا خدا اور کائنات سے تعلق کا بہترین درجہ ہے اور خدا پر ایمان لانے کا تقاضا بھی یہی ہے۔

۲۔ انسان کی یہ دونوں حسّی اور فکری مُدرکانہ قوتیں محفوظ ہوں تو فبہا، ورنہ اگر صرف حسّی قوت متحرک اور سرگرم عمل رہے اور فکری ادراک کی قوت کسی بھی وجہ سے پیچھے رہ جائے یا رک جائے تو وہ معنوی حقائق کا سراغ نہ لگا سکے گی کیونکہ اس وقت انسان کے شعور

میں صرف مادی محسوسات کی منطق کی جگہ بنا سکے گی جس سے ہم اپنی معیشت کی تنظیم کر سکتے ہیں اور فکری منطق حسی ادراک سے جدا ہو جائے گی پھر تو حس کی خواہشات اور اس کی اندھی رغبتیں ہی مقصد اور غایت بن جائیں گی اور انسان اس فرمانِ الٰہی کا مصداق ہو جائے گا:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(جاثیہ : ۲۳)

(پھر کیا تم نے اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے)

اور اس وقت معنوی اقدار اور الٰہی تعلیمات کے سلسلے میں اس کا تصور اور فیصلہ کسی نامعلوم اور غیر موجود چیز کے بارے میں فیصلہ کا مصداق ہوگا۔ اور یہیں سے محسوسات کے غلام مادہ پرست انکار اور کفر کی طرف مائل ہوئے اور کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مذہب عوام کے لئے افیون ہے" اور "دین خرافات کا مجموعہ ہے"

جو لوگ ہمارے مسائل، ہماری معنوی قدروں اور الہامی تعلیمات کا انکار کرتے ہیں وہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں قابلِ اعتبار اور لائق اعتنا چیز صرف مادہ ہے جسے وہ آنکھوں سے دیکھ سکیں، ہاتھوں سے چھو سکیں اور حواس سے ان کا

ادراک کرسکیں - اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں انہیں وہ غیر موجود مانتے ہیں اور ان کو تسلیم کرنے سے اپنی عقلوں کو منزہ قرار دیتے ہیں یہ کائنات سے ان کے تعلق کی بات ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے:

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۙ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ لَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ؕ ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ ؕ (نجم: ۲۹، ۳۰)

(پس اے نبیؐ! جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دُنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو — ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے)

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یا ان جیسے دوسرے انسان آپ کی بات غور سے سُن سکتے اور آپ کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جب آپ ان کے سامنے آسمانی پیغام کی بات کریں گے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کے دلوں اور نفسی زندگیوں میں آپ کی دعوت کے لئے کوئی گنجائش ہے؟ آپ ایک وادی میں ہیں اور یہ لوگ دوسری وادی میں، اور آپ کے اور ان کے درمیان حدِ فاصل قائم ہے:

وَ اِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا ﴿ۙ﴾ وَّ جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا ؕ وَ اِذَا ذَکَرۡتَ رَبَّکَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَہٗ وَلَّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِہِمۡ نُفُوۡرًا ﴿۝﴾ (بنی اسرائیل: ۴۵، ۴۶)

(جب تم قرآن پڑھتے ہو تو تمہارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا

دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے، اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں،
اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ
موڑ لیتے ہیں)

یہ نہ سمجھئے کہ یہ لوگ قرآن نہیں سمجھتے، خوب سمجھتے ہیں لیکن اپنی حسی صلاحیت سے محسوس چیز کو سمجھنے کی طرح اسے بھی سمجھتے ہیں، رہے ان کے دل، تو ان کے اندر اس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، وہ نہ اسے قبول کرتے ہیں نہ اس کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں جب اللہ تعالیٰ دلوں کے سمجھنے کی بات کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی ہوتی ہے ان میں بہت سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو بر سر عام آپ سے کہیں گے کہ اللہ ہی اس کائنات کا خالق ہے، اس نے ہمیں زندگی مرحمت فرمائی ہے اور وہ ہماری طرف سے شکر و تعریف اور تعظیم و تقدیس کا مستحق ہے۔ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو بظاہر یہ اعتراف کریں گے کہ انسان جسم و روح کا مرکب ہے۔ ضروری ہے کہ روح کے کچھ مطالبات اور تقاضے ہوں جس طرح جسم کے کچھ مطالبات اور تقاضے ہوتے ہیں اور یہ کہ مکمل انسان وہی ہے۔ جو ان دونوں کے برابر برابر حقوق ادا کرے، کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ یہ لوگ آپ سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو پیغام اس دنیا میں عملی نفاذ کے لئے آیا ہے وہ وہی ہے جو حق ہو، اس میں تمام موجودات کے لئے قانون ہو، اور انسانیت کو گمراہیوں اور غلطیوں اور نفسانی و باطنی بدبختیوں سے بچا سکے۔

حسی منطق اور معنوی منطق

یہ لوگ اس طرح کی تمام باتیں کہہ سکتے ہیں لیکن یہ "حسی منطق" ہی سے کہیں گے،

"معنوی اور قلبی منطق" سے نہیں۔ اور پہلی منطق — طبیعی و ریاضیاتی منطق — جو کچھ بھی ہوگی اس پر جمود اور تعطل اور نفی اور سلبیت کی چھاپ ہوگی جبکہ قلبی اور معنوی منطق جو کچھ تسلیم کرے گی اسے حرکت و عمل، حرارت و شوق اور ایجابی اقدامات کے ساتھ تسلیم کرے گی۔ الہامی تعلیمات اسی آخری منطق کی ضرورت مند ہوا کرتی ہیں۔ قلبی و جذباتی "عقل و فکر" ہی نفس کی دنیا کے دروازے کھولتی ہے، اسے فطرت سے ہم آہنگ بناتی ہے اور دلوں کے اندر اس کے بیج بوتی اور اعصاب میں بیداری و عزیمت دوڑا دیتی ہے، خون میں زندگی، حرکت اور فعالیت کے جراثیم گھول دیتی ہے اور انسان کا ظاہر و باطن اسی رنگ میں ڈھل جاتا ہے پھر اس رنگ کی جھلک اس کے اعمال میں، اقوال میں، افکار و نظریات میں، نیتوں اور ارادوں میں، میلانات و جذبات میں، خواہشات اور مرغوبات میں ہر چیز میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ رنگ اس میں چھا جاتا ہے، انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اسے اپنی مشیت کا تابع بنا دیتا ہے انسان اسے اپنا تابع نہیں بنا پاتا۔ وہ اس صبغۃ اللہ سے اثر انداز ہو کر زندگی گزارتا ہے، اس کی حرمت اور احترام کے لئے حد درجہ غیرت مند اور خوددار ہو جاتا ہے، اس کے اصولوں کی سربلندی کے لئے جہاد کرتا ہے، اس کی راہ میں اپنا مال، اپنی راحت، اپنا وقت، اپنا خون اور اپنی جان سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے۔ پھر بھی وہ غایت درجہ مسرور اور شادماں رہتا ہے۔ اسی فہم کے بارے میں علمائے توحید کا کہنا ہے کہ یہ تصدیق قلبی ہے، افسوس ہے کہ عقل یہ واضح نتائج اور زبردست قوت پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ذہن اسے سمجھتا ہے یا نہیں، عقل اس کی تصدیق کرتی ہے یا نہیں، بلکہ یہ تو خالص قلب کا مسئلہ ہے جو یا تو ان تمام باتوں کو پسند کر لیتا ہے یا انکار کر دیتا ہے:

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝ (انعام : ۳۳)

(اے نبیؐ ، ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ، ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے ، لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں)

ہم پھر اس سوال کی طرف پلٹتے ہیں جسے آغازِ بحث میں ہم نے بیان کیا تھا یعنی یہ کہ ان دونوں طریقوں میں سے کس کو قبول کیا جائے اور کس کو رد کر دیا جائے ؟ میرا خیال ہے کہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حق اب بالکل واضح ہو چکا ہے اور جو لوگ ہماری دعوت کا انکار کرتے ہیں وہ اس لئے نہیں کرتے ہیں کہ یہ مبہم ہے اور اس کا مفہوم واضح نہیں ہے بلکہ ان کے اعراض کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل اسے پسند نہیں کرتے ۔ یہ وہ زبردست برائی ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے یعنی تضاد اور تناقض ۔ ایک طرف وہ کسی چیز کو پسند کرے اور دوسری طرف اس کے مطابق انقلاب اور تبدیلی لانے کے لئے جدوجہد بھی نہ کرے ۔

دوسری فصل

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عربی ادب کا مشہور واقعہ ہے کہ حُطَیئہ عربی شاعر نے زبرقان بن بدر رضی اللہ عنہ کی ہجو کی اور ان کی مذمت کرتے ہوئے یہ شعر کہا:

دَعِ الْمَکَارِمَ لَا تَرْحَلْ لِبُغْیَتِھَا

وَاقْعُدْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الطَّاعِمُ الْکَاسِی

(ارفع و اعلیٰ نصب العین کا پیچھا چھوڑ دو اس کی طلب میں سفر نہ کرو اور گھر میں بیٹھ رہو کہ تمہارے کھانے پینے کے دن ہیں)

یہ شعر سُن کر زبرقان سخت برانگیختہ ہوئے، غیض و غضب کا مجسمہ بن گئے اور امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ امیر المومنین نے اسلامی شاعر حسانؓ بن ثابت کو بلا بھیجا اور آپ سے فرمایا کہ اس شعر میں ہجو کی قدر و قیمت پر گفتگو کریں اور اس کی قدرے وضاحت فرمائیں حالانکہ امیر المومنین کلام کی باریکیوں اور اس کے حسن و قبح سے ناآشنا نہ تھے۔ شاعرِ رسالت حسانؓ بن ثابت نے اس شعر کی وضاحت کی اور فرمایا کہ معاملہ یہاں ہجو گوئی سے زیادہ خطرناک ہے اور بدترین ہجو گوئی بھی اس کلام کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ زبرقانؓ کے اوپر کیچڑ اچھالی گئی ہے اور ان کی تمام خوبیوں کا انکار کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ سُنایا کہ شاعر کو

تاریک قید خانے میں محبوس کر دیا جائے۔

قارئین کو مندرجہ بالا شعر میں باپ ماں کی گالی نظر آئے گی نہ بُرائیوں اور بدکرداریوں کا الزام نظر آئے گا اس کے باوجود حسانؓ بن ثابت نے اسے ہجو کی بدترین منزلت میں رکھا۔ حُطیئہ نے زبرقانؓ سے بس یہی تو کہا تھا کہ وہ بلند و برتر مقاصد اور عزم و ہمت کے کاموں سے باز آجائیں اور ان مکارم کے حصول کے لئے زحمت نہ اُٹھائیں جن سے لوگ مزین ہیں اس لئے کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر وہ اس دشت کی سیاحی کریں گے تو بلاوجہ زحمتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوں گے اور اپنے مزاج کے خلاف دوڑ دھوپ کی مشقت برداشت کریں گے۔ کیونکہ ان کے لئے کھانے اور کپڑے کا انتظام کر لینا کافی ہے۔ انہی دونوں چیزوں کے لئے دوڑ دھوپ کر لیں یہی بہت ہے اور ان کی ہمت بس اتنی ہی کی اجازت دیتی ہے۔ یا جدید تعبیر کے مطابق یوں کہہ لیجئے کہ: وہ اعلیٰ قدریں جن کے لئے تم جی رہے ہو اور جن کے علاوہ دوسری چیزیں تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں وہ یہ کہ کھانے اور کپڑے کی شہوت میں غرق رہو۔

اس قصے کے دو اُبھرتے ہوئے پہلو ہیں:

ایک پہلو یہ ہے کہ حُطیئہ زندگی اور اس کی حقیقت سے باخبر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی کے دو مقاصد ہوتے ہیں ایک مقصد نہایت سطحی ہوتا ہے جس کی روشنی میں پست اور گھٹیا لوگ زندگی گزارتے ہیں اور دوسرا مقصد بلند و اشرف ہوتا ہے جس کی خاطر اہلِ دانش دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ اوّل الذکر لوگ کھانے کپڑے کی لذت کو ہی اپنی سعادت سمجھتے ہیں اور آخرالذکر فضیلت اور مکارم کے توشے کے حصول کے لئے محنت کرتے ہیں اور خیر اور حق سے اپنے آپ کو بہرہ اندوز کرتے ہیں اور اسی پر عمرؓ کے دو مبارک

کی پوری زندگی قائم تھی۔

دوسرا پہلو جو اس قصہ میں نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ عوام کا احساس اور شعور دونوں مقاصد کے درمیان عظیم فرق کو بخوبی سمجھتا تھا۔ ہر شخص اس چیز کو اپنی بلندی اور علوئے ہمت کے خلاف سمجھتا تھا کہ وہ معدہ کے مطالبات اور بدن کی ضروریات ہی میں غرق ہو کر رہ جائے اور اس بات کو اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتا تھا کہ اس حیثیت سے سماج میں اسے جانا جائے۔ اسی لئے حُطیئہ نے اپنے مخاطب کی اسی دُکھتی رگ کو پکڑا اور اس پر ایسی گندگی اُچھال دی جس کے بعد صفائی اور کرامت کا تصور ہی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ حسانؓ بن ثابت کے جواب کی روشنی میں :

۱۔ دونوں مقاصد میں ایک کا حصول بہت آسان ہے اور جلد ہی مل جانے والا ہے جبکہ دوسرے کے لئے ایک لمبی مدت درکار ہے۔

۲۔ شعور میں نہایت تیز قسم کا احساس پایا جاتا ہے جو پہلے مقصد سے دور بھاگتا اور دوسرے کی طرف شوق کی لگام موڑ دیتا ہے۔

اور یہ دونوں چیزیں کسی بہترین اور بااخلاق زندگی کے دو ستون ہیں ایک تو ان دونوں مقاصد کا اعتراف اور دوسری تیز حساسیت جو پہلے کو ٹھکرا دے اور دوسرے کو گلے لگالے۔ جب تک یہ دونوں حقیقتیں صحیح سالم رہتی ہیں، انسان خیر اور عدل کے سائے میں رہتے ہیں یہ ہے صحیح فطرت اور عقل سلیم کی منطق! تو کیا آج ہماری تہذیب انہی دونوں بنیادوں پر قائم ہے؟

آپ لوگوں کی دوڑ دھوپ اور چلت پھرت کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ سارے ابناء آدم بلند مقصد کے حصول سے بے نیازی برت رہے ہیں اور رہائش و

زیبائش، کھانے کپڑے کی لذتوں اور تعیشات میں مست ہیں یہاں تک کہ جو اس دوڑ میں پیچھے ہے وہ بھی اہوا، و خواہشات کی حد تک ان سے کم نہیں ہے لیکن ان کے پیچھے خرچ کرنے کے لیے دولت نہیں ہے پھر بھی دُنیا کی زیب و زینت کی طرف اس کی نگاہیں اُٹھی رہتی ہیں اور منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے۔

آپ کے ارد گرد چھوٹے بڑے ملازمین، تاجر اور صنعت کار، ڈاکٹر اور انجینئر اور جو لوگ اپنے کو مزدور کہتے ہیں، یہ سب رہتے بستے ہوں گے، آپ ذرا اپنے دل سے پوچھئے کہ ان لوگوں کے دل کس چیز کی طرف مائل ہیں؟ اپنے کام کے دائرے میں اور اس سے باہر ان کے ضمیر کس خوبی و فضیلت کی سرگوشی کرتے ہیں؟ رات و دن کس بلند زندگی کا طریقہ انہیں بے چین رکھتا ہے، یہ کس چیز کی دعوت دیتے اور اس کے حصول کے لئے محنت صرف کرتے ہیں؟ کسی بھی چھوٹے بڑے شہر کے کسی میدان میں کھڑے ہو جائیے اور گزرنے والے ہر مرد عورت اور نوجوان لڑکے اور لڑکی کے بارے میں سوچئے اور اپنے دل سے پوچھئے: کس مقصد کے حصول میں یہ سرگرداں ہیں؟ ان کے دلوں پر اس وقت کون سی چیز سوار ہے؟ ان کے دل کس چیز کی تسبیح خوانی کر رہے ہیں؟ کس سمت میں ان کے پاؤں اُٹھ رہے ہیں؟ کیا مال، لباس، کھانا، گھٹیا افکار اور پست خواہشات کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں؟ کیا بدن کی براہ راست یا بالواسطہ ضروریات اور نفس کی ظاہری و باطنی حیوانی خواہشات کے سوا اور کچھ بھی محرکات ہیں؟

ان میں سے کوئی آپ کے پاس بیٹھے گا تو وہ اللہ کی نعمتوں کا "ذکر خیر" کرے گا اور کہے گا: مجھے دُنیا سے کیا مطلب؟ بس رہائش اچھی ہو جائے، کھانے پینے کا معیار بلند ہو جائے اور قیمتی کپڑے میسر ہو جائیں اور اللہ کے فضل سے یہ سب مجھے حاصل ہیں

مجھے اب کچھ اور کرنے دھرنے کی ضرورت کیا ہے ؟ اس دُنیا کی ناز و نعمت سے انسان کو جتنا فائدہ اُٹھانا ہو اُٹھائے اور عیش کوشی و تن آسانی کے جتنے مواقع میسر ہوں انہیں استعمال کرے، اس کے علاوہ اور اس دُنیا سے بھلا وہ کیا لے جائے گا ؟ اگر آپ اپنے اس دوست سے کہہ دیں کہ آپ کا یہ نقطۂ نظر غلط ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ زبرقان ؓ کی طرح آپ پر خفا ہو جائے گا؟ اور حاکم کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دے گا ؟ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے جبکہ اس نے اپنے سکون و راحت کا اظہار کیا ہے ؟ کیا وہ اس اقدام کے بارے میں سوچ سکتا ہے جبکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ معاشرے میں اصل معیار وہ مظاہر ہیں جو دولت و ثروت کی شکل میں موجود ہیں نہ کہ اخلاق اور فضائل، لوگوں کو جو خزانے دستیاب ہیں انہیں کے حساب سے ان کی قدر و قیمت متعین کی جا رہی ہے اور ان اچھے افعال کو کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی ہے جن کی پوری انسانیت تعریف کرتی ہے ؟

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا دوست خفا نہیں ہو گا، نہ وہ حاکم کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ اگر اسے غصہ آئے گا بھی۔ تو محض اس وجہ سے کہ آپ نے اس کے طریقۂ کار میں عیب نکالا ہے اور اس کی رائے کی مخالفت کی ہے۔ پھر وہ ایک ناصح اور فلسفی استاذ کی شکل میں آپ کے سامنے آئے گا اور آپ سے کہے گا کہ تم دُنیا کی حقیقتوں کو نہیں سمجھتے تم خواب و خیال کی دنیا میں رہتے ہو، عمل کی دُنیا سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یعنی اس کے غصہ کی بنیاد یہ ہو گی کہ تم اس کی رائے کی موافقت نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی چند روزہ دُنیا کے لئے آپ سے بگڑ جائے گا۔ اگر تمہارا یہ فلسفی استاذ ان لوگوں میں سے ہے جو ہمیشہ خوش گمانی کا شکار رہتے ہیں اور دین کے خوش کُن پہلوؤں کو ہی اختیار کرتے ہیں تو بغیر کسی علم و ہدایت کے وہ کتاب اللہ سے تاویل کرنے لگے گا اور اس طرح کی آیات

سے استدلال شروع کر دے گا کہ:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ (اعراف: ۳۲)

(اے نبیؐ، ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاکیزہ چیزیں ممنوع کر دیں؟

اور وہ اپنی تمام جہالتوں اور حماقتوں کا اور قرآن کریم کی غلط تعبیر کا مظاہرہ کرے گا۔ اور حیرت کی بات یہ ہوگی کہ جس وقت وہ طیبات سے بحث کر رہا ہوگا، اپنے دل میں ان مقاصد کے سلسلے میں ذرا بھی خلجان محسوس نہ کرے گا جن کا قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے اور جن کے حصول کے لئے جسموں کو تھکانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس فصل کی گزشتہ تحریروں سے یہ بات سامنے آئی کہ با اخلاق زندگی کے دو ستون ہیں:

۱۔ دنیاوی و اخروی مقاصد کا اعتراف۔

۲۔ شعور کی تیز حس کا پایا جانا، جو پہلے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے اور آخری کو مجد و شرف کا مقام دے۔

تو آج لوگوں کی عقلوں میں، ان کے دلوں کی زندگی میں اور ان کی زندگی کے مظاہر میں ان دونوں ستونوں کی کہاں گنجائش موجود رہ جاتی ہے؟

میں آپ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ جمہور عوام ان دونوں مقاصد کا اعتراف کرتے ہیں اور انہیں سر بسر تسلیم کرتے ہیں ـــــ اور اس سے سابقہ گفتگو کی

نفی نہیں ہوتی کیونکہ آپ کے دوست یا سابق فلسفی استاذ نے جو انکار اور مخالفت کی ہے اس کی بنیاد محض بحث و مباحثہ اور غصہ و غضب پر تھی۔ آپ نے اس کے اندر ایک عیب ڈھونڈ نکالا تھا اور اس پر اس کی بے جا حمیت حرکت میں آگئی تھی اور یہ بیماری ہر اس شخص کے ساتھ لگی رہتی ہے جس کے اندر عقائد پختہ اور مستحکم نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ شاعر کے اس شعر کے مصداق ہوتے ہیں:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

آپ لوگوں سے ان رجال عظمیٰ کی باتیں کیجیے جو اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے چاہے انہیں تنگدستی لاحق ہو۔ اور ان کے ساتھ ان کی داستانیں بیان کیجیے۔ اُن نامور سورماؤں کے قصے سُنایئے اور ان انسانوں کا ذکرِ خیر چھیڑ دیجیے جو اللہ و رسول پر ایمان لائے تھے اور انہیں اپنا حرزِ جان بنا لیا تھا۔ خدا کی محبت ان کے نزدیک ملک و وطن، مال و دولت، بال بچوں اور سیم و زر سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی چنانچہ انہوں نے اللہ کی راہ میں وطن کو چھوڑا، اس کی رضا کے لیے بال بچوں اور خاندان والوں سے جدا ہو گئے اپنی ساری دولت نچھاور کر دی کیونکہ خدا کے ہاں انہیں جو کچھ مل رہا تھا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ ایسے افراد بھی ملتے ہیں جنہوں نے اپنے گھر کی ساری پونجی اس راہ میں لٹا دی اور اپنے بچوں کے لیے ایک درہم بھی نہ چھوڑا، اور اس کے باوجود وہ سرور اور شادمان تھے، اپنے دل میں ایمان کی حلاوت محسوس کرتے تھے، پوچھنے والے

نے پوچھ لیا کہ اپنے بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو تو جواب دیا: میں ان کے پاس وہ دولت چھوڑ آیا ہوں جو سارے جہان سے زیادہ قیمتی ہے، میں نے انہیں اللہ اور اس کے رسول کے حوالہ کر دیا ہے اور وہ نیک لوگوں کی نگرانی کرتا ہے۔

ان سے اللہ کی ان فوجوں کی داستانیں بیان کیجئے جنہوں نے بااخلاق زندگی کے نقوش قائم کئے، عدل و بھائی چارہ کی مثالی سوسائٹی قائم کی اور ہر جگہ اخوت فی اللہ اور قربانی و ایثار کے بے مثال مظاہرے کر دکھائے اور باطل جہاں کہیں دکھائی دیا اس کے خلاف اعلانِ بغاوت بلند کر دیا اور وہ مساوات اور برابری قائم کی جس نے عوام کے جان و مال اور تمام حقوق کی مکمل حفاظت کی اور تقویٰ و خدا ترسی نے ان کی قدر و منزلت اس قدر بڑھائی کہ اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

ان خدائی سپاہیوں کے قصے سنایئے جنہوں نے نظریاتی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی دُنیا میں یہ سب کچھ کر دکھایا حقائق کو محسوس کا ایسا لباس پہنا دیا کہ وہ اس سرزمین پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے، زندگی کو تر و تازہ بنا دیا اور بصیرت و بصارت کی روشنی بن گئے۔

آپ ان تمام قصوں اور بڑے آدمیوں کی باتیں ان کے سامنے بیان کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کی باتیں توجہ سے سُن رہے ہیں اور اس پر خوشی اور حیرت کا اظہار بھی کر رہے ہیں اور صحابہ کرامؓ کی دل کھول کر تعریف کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے جنگ و جدل اور بحث و مباحثہ سے پرہیز کیا تو وہ دُنیا و آخرت کے دونوں مقاصد کا اعتراف کرنے لگے، دُنیا کی مذمت کرنے اور آخرت کی تکریم کرنے لگے۔

لیکن اس کے پیچھے حقیقت کیا ہے؟

کیاان کے دلوں میں بھی ان کے لئے کوئی جگہ ہے یا محض حسّی ادراک نے انہیں مستحسن سمجھا اور زبان حرکت میں آگئی اور بس .... ؟ کیا دل میں کوئی ایسی رغبت یا شوق موجود ہوتا ہے جو ان بلند و برتر نمونوں کی خوبیوں کو اپنانے کی طرف مائل ہو اور انسان کو ہر وادی میں قدم رکھنے پر مہمیز کرے اور بھوک پیاس کی تکلیف اور تکان برداشت کرنے پر تیار کرے اور دل کی ان رغبتوں کی تکمیل اور ان کی حسّی و نفسی زینت کی تحصیل کے لئے خرچ کرنے پر آمادہ کرے ؟

کیاان رغبتوں اور چاہتوں کی اس کے دل میں کوئی گنجائش ہے یا مادیت کے سیلاب تیز و تند نے دل میں پائے جانے والے فضائل کے ان محرکات اور جذبات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اپنے علاوہ دوسری چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے ؟

موہوم فضائل

میں چاہتا ہوں کہ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ان اخلاقیات اور فضائل پر بھی گفتگو کرتا چلوں جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ مغرب میں موجود ہیں جو اس مادی طوفان کا مرکز و منبع ہے ۔ چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ مغرب میں خوش اسلوبی اور عمدگی سے کام کیا جاتا ہے اور ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو نہایت احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیتے ہیں، وہاں ایثار و قربانی کے جذبات موجود ہیں اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینے والے افراد پائے جاتے ہیں، وہاں مساوات ، عدل اور آزادی کا چرچا ہے ، جرأت و شجاعت اور اقدامی صلاحیت کا وافر ذخیرہ ہے خطرات مول لینے اور مصائب

کو دعوت دینے کی ہمت ہے، جان و مال اور وقت بلکہ پوری عمر کی قربانی کی مثالیں ملتی ہیں جبکہ اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح کی اور بہت سی ذاتی اور انفرادی خوبیاں وہاں پائی جاتی ہیں تو ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس مادیت کے طوفان نے ان تمام قدروں اور خوبیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال ہر اس شخص کے لئے لائق توجہ ہے جو اس مادی طوفان پر الزام لگاتا ہے اور یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک طرف تو اس پر الزام لگائے اور دوسری طرف ان خوبیوں سے صرف نظر کرے جن کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔

لیکن میرے بھائی!

امر واقعہ یہ ہے کہ اس سرکش مادیت یا کھوٹی تہذیب کے اندر یہ صلاحیت ہرگز نہیں ہے کہ اس طرح کی اخلاقی خوبیوں اور بلند قدروں کو جنم دے سکے اس لئے کہ برائی تو برائی ہی جنم دیتی ہے اور باطل سے باطل ہی پیدا ہوتا ہے:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ (اعراف: ۵۸)

(جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا)

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾ (فتح: ۲۳)

(یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے)

توجن چیزوں کو لوگ اخلاق اور فضائل کہتے ہیں وہ بس اسی غیر ثمر دار درخت کے زہریلے پھول ہیں ایسے پھول، جن میں رنگ اور شکل وصورت کے سوا کوئی خوشبو نہیں ہوتی ان کی بو ان کا مزہ اور اس کی اثر انگیزی بڑی خراب، بدبودار اور زہریلی ہوتی ہے۔ آج آپ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک جو دیکھ رہے ہیں وہ بس اخلاق اور فضائل کی نمائش ہیں، ان کی محسوس شکلیں ہیں، رہے ان کے مقاصد اور محرکات اور مآخذ تو یہ سب باطل، غلط اور سطحی ہیں اصلی اخلاق سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ کھوٹے سکّے

نیکی اور خوبی ایک سچّائی ہے میرے بھائی! اور سچائی ہر جگہ اور ہر وقت سچائی ہی رہتی ہے، اس کے جوہر میں کمی بیشی سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر آپ کسی انسان کو دیکھیں کہ وہ کسی جگہ حق کی حمایت اور مدافعت کرتا ہے لیکن دوسری جگہ حق کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے جنگ پر آمادہ ہو جاتا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ آپ اسے اعلیٰ اقدار کا عاشق قرار دیں گے اور اس کے پہلے موقف کے بارے میں کسی شک اور تردد کا شکار نہیں ہوں گے۔ ان مغربی لوگوں کے بارے میں عام انسان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ملکوں میں آزادی کی تقدیس کرتے ہیں۔ تو آزادی ایک سچائی ہے، اگر لوگوں کے خیال کے مطابق یہ لوگ آزادی کا احترام کرتے ہیں تو اس احترام کا مظاہرہ ہر جگہ ہونا چاہیئے اپنے ملک کے اندر اور باہر بھی اس کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ پھر تو جس کمزور پر ان کی نظر پڑے اس کی مدد کرنی چاہیئے، کوئی ڈرا ہوا ہو تو اسے امان دینی چاہیئے، ذلیل اور بے یار و مددگار ہو تو اس کا تعاون کرنا چاہیئے، کوئی غلام ہو تو اس کی آزادی کی فکر کرنی چاہیئے لیکن ان

مغربی لوگوں کو آپ دیکھتے ہیں کہ ملک کے اندر تو آزادی کا بڑا احترام کرتے ہیں لیکن اپنے ملک سے باہر کمزور قوموں کو ہڑپ کر جاتے ہیں، آزادی کے دلدادہ افراد اور جماعتوں کو سزائیں دیتے ہیں، اس کے حصول کے لئے جدّوجہد کرنے والوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیتے ہیں انہیں قید و بند سے لے کر قتل اور دار و رسن کی تمام تعذیبوں اور سزاؤں سے دوچار کرتے ہیں تو یہ تو بدترین بد اخلاقی ہے اسے کسی درجہ میں بھی اخلاق کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ جو شخص فضیلت اور بلند اقدار سے محبت کرے گا وہ انہیں ہمیشہ اپنے نفس اور محسوسات کی زینت سمجھے گا۔ وہ اس پر قناعت نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے دل میں معنوی صفت کی حیثیت سے موجود رہیں بلکہ اس عالم محسوسات و واقعات میں ان کی عملی صورتیں دیکھنے کی کوشش کرے گا تو کیا عقل اسے باور کرتی ہے کہ وہ اس کی مخالفت کرے گا اس کے اعوان و انصار کے درپے ہوگا، اس کی آواز دبانے اور اس کے نقوش مٹانے کی جدّوجہد کرے گا؟

جب ہم اپنے لئے خیر کو پسند کرتے ہیں تو ہمیں جری اور بیباک ہونا چاہیئے، حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی ہمت رکھنی چاہیئے چاہے پوری دُنیا ہماری مخالفت پر تُل جائے۔ ہمارے لئے یہ کافی ہوگا کہ ہمارے عقائد حق کے ساتھ وابستہ رہیں اور حق ہمارے عقائد میں پیوست رہے، ہم اپنی نگاہوں میں بلند و برتر ہوں اور جس چیز کو ہم حق سمجھتے ہوں اسے علی الاعلان کہہ سکیں اور ہماری کرامت اور پاکیزگی کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اندھی تقلید نہ کریں نہ اپنے عقائد کے سلسلے میں مذبذب ہوں۔ رہی یہ بات کہ حق ہمارے سامنے واضح ہو جائے اور ہم اسے قبول کرنے کے لئے اپنے نفس کے اندر اس وجہ سے آمادگی نہ

محسوس کریں کہ لوگ اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتے تو نہایت گھٹیا اور سطحی بات ہے اسے وہی لوگ پسند کر سکتے ہیں جو اپنی کوئی حیثیت اور وزن نہ رکھتے ہوں۔

اس لئے ہمیں کہنا چاہیئے کہ مغرب کی یہ خوبیاں دراصل کھوٹے سکے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور ہمیں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کا اعلان کر دینا چاہیئے چاہے پوری دُنیا ان کھوٹے سکوں کو اصلی اور قیمتی سمجھتی رہے اس لئے کہ جو کان مغرب کے میٹھے نغمے سُن رہے ہیں وہ ان کی بدبختی اور ظلم و جبر کے شکار مظلوم افراد کی آہ و کراہ بھی سُنتے ہیں۔

تو کیا اس عدل اور مساوات پر گفت گو بھی کی جائے جس کا یہ لوگ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی گفت گو کے بعد اور ان کی خرابیوں اور بد اخلاقیوں کا تذکرہ ہونے کے بعد اس پر گفت گو کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاق ہی اُن کا خونیں پنجہ ہے

معلوم ہوا کہ یہ اخلاق نہیں ہیں جن کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ یہ محض چند ظاہری اور صُوری ڈھانچے ہیں جن کے بل پر ان کی اجتماعیت قائم ہے انہوں نے باہمی تعاون کے لئے انہیں تراشا ہے اور تعاون بھی کس چیز کے لئے؟ اس بات کے لئے تعاون کہ کس طرح وہ اپنی انانیت کی آگ بجھا سکیں، کیسے اپنے حواس اور اعضاء و جوارح کی تسکین کر سکیں جن کی لطف اندوزی اور شکم سیری کی کوئی حد نہیں ہے، ان کا یہ تعاون نیکی اور بھلائی کے لئے نہیں ہے بلکہ نافرمانی اور ظلم و زیادتی کے لئے ہے۔ اگر مثال کے طور پر باہمی عدل کا قانون نہ بنایا ہوتا اور وہ ایک دوسرے پر ظلم کرتے تو ان کی اجتماعیت

پارہ پارہ ہو جاتی اور ہر آدمی ان کی وہ انانیت دیکھ سکتا جس کے نتیجے میں وہ لوگوں کو ہڑپ کر رہے ہیں، پھر اس کا وبال انہیں کے سر جاتا، ان کی صفوں میں کمزوری آجاتی اور فساد و تخریب کو راہ مل جاتی۔ چنانچہ ان کے عدل کی حقیقت بس اتنی سی ہے کہ وہ ایک "خود ساختہ نظام" ہے اصل اخلاق نہیں ہے۔

مساوات، سچائی اور عدل کی دعوت دینے والے اس بات کی شدید کوشش کرتے ہیں کہ باہم گر تعاون مضبوط و مستحکم ہو اور یہ تعاون دراصل ان کے غلبہ و برتری کا وسیلہ ہے۔ یہی وہ خونیں پنجہ ہے جسے وہ اپنے شکار کے جسم میں پیوست کر دیتے ہیں تعاون کی خواہش اور کوشش حد سے تجاوز ہو چکی ہے اور ان کی انانیت کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اب انفرادی انانیت کی حدود سے نکل کر معاملہ اجتماعی انانیت کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ جو شخص اپنی جماعت، اپنی امت، اپنی قوم کے لئے اپنی کوششیں، صلاحیتیں، تائید و حمایت اور جذباتی تعلق صرف کرتا ہے وہ صرف اس لئے ایسا کرتا ہے کہ وہ جماعت اس کی ذات کے لئے کام کر رہی ہوتی ہے، جماعت یا ملک کی کوششوں کا ثمرہ اس کے حق میں آتا ہے اور اس کی ساری برکتیں اور فوائد اسی شخص کے دامن میں جا گرتے ہیں چنانچہ وہ اپنی جماعت سے محبت کر کے دراصل اپنی ذات، اپنے فوائد، اپنی عیش کوشی و تن آسانی اور لوگوں پر اپنی برتری سے محبت کر رہا ہوتا ہے اور جماعت پر اس کی ذات کی محبت چھا جاتی ہے۔ چنانچہ آج وطن و قوم کے جو نعرے بلند ہو رہے ہیں اور جان و مال کی قربانی اور خطرات و مصائب کو مول لینے کی داستانیں سنائی جا رہی ہیں وہ سب فرضی اور موہوم قدریں ہیں۔

چوروں کی جماعت

میرے بھائی!

اس وحشی پاگل کے مظاہر سے دھوکہ نہ کھائیے، اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے بجائے اُس سے پوچھئے: کس مقصد کی راہ میں یہ لوگ جان و مال کی قربانیاں دیتے ہیں؟ بلاشبہ اپنی اُمت کو خوش حال بنانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں میں چاہوں گا کہ ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور پوچھیے: کس طرح سے ان کی اُمت خوش حال ہو سکے گی جب دنیا کے کمزور اقوام اور ملک کا خیال نہیں رکھا جائے گا؟ ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ ہم طاقتور بنیں اور انہی صورتوں میں محصور ہو کر اپنی قوت پروان چڑھائیں تاکہ ان کے حقائق ہم پر واضح ہو سکیں اور ہم انہیں ان کا نام دے سکیں۔

میرے بھائی! میں آپ سے دوٹوک لفظوں میں پوچھتا ہوں کہ! کیا کسی شخص کی اس حرکت کو آپ پسند کرتے ہیں کہ وہ دوسروں پر ہلّہ بول دے اس پر ظلم کرے اور اس کی جان و مال سے اسے محروم کر دے اور اس کے آزادی و امن کے حقوق چھین لے؟ اگر آپ اس شخص کی حرکت کو پسند نہیں کرتے اور اسے تسلیم نہیں کرتے تو آپ کا دل اس وقت بھی مطمئن نہیں ہو گا جب کوئی قوم اس جرم کا ارتکاب کرے گی۔ یعنی جب چھوٹی انانیت اور محدود استکبار سے آپ نے نفرت کی تو بڑی انانیت اور لامحدود استکبار سے آپ کی نفرت بدرجۂ اتم ہوگی، مجھے اپنے رب کی قسم کھا کر بتائیے: چوروں کا ایک گروہ جو مسافروں پر حملے کرتا ہے یا غافل انسانوں پر ہلّہ بول دیتا ہے اور ان تمام لوگوں کی جان و مال اور عزّت و آبرو اس لئے لوٹ لیتا ہے تاکہ اس کے بچے اور بیویاں

خوشحالی اور بے فکری کے ساتھ زندگی گزاریں، اس گروہ میں اور اُس قوم میں کیا فرق رہ جاتا ہے جو یہی جرائم کرتی ہے اور دُنیا کی کمزور اقوام کو پیس کر رکھ دیتی ہے اور ان کی عزت و آبرو اور جان و مال سلب کر لیتی ہے؟ بس فرق جو کچھ ہے وہ وسائل و ذرائع اور اسالیب کا ہے مقصد اور غایت کا فرق ہرگز نہیں ہے۔ معاملہ اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھا ہے کہ انانیت اپنی تنگ حدود سے نکل کر وسیع حدود میں داخل ہو گئی اور پہلے جرم کا ارتکاب چند افراد کرتے تھے اور چھُپ چھپا کر کرتے تھے اب پوری مملکت وہی گھناؤنا جرم کرتی ہے اور بہ بانگ دُہل قوموں کی آزادی اور ان کی جان و مال چھین لیتی ہے اور اسے کسی ندامت یا گناہ کا احساس قطعی نہیں ہوتا۔

یہ قربانی و فداکاری، اقدام و جواں مردی، خطرات و مصائب کو عبور کرنے کی صفات — یہ سب محض نام ہیں جو اس وحشی پاگل پن کی مختلف صورتوں کے رکھ دیئے گئے ہیں اور جب کوئی فرد قومیت اور وطنیت یا صحیح ترین الفاظ میں اپنی انانیت کے نصب العین تک پہنچنے کے لئے سفر شروع کر دیتا ہے تو یہ مختلف خطابات اس کے مذموم ارادوں کو ڈھانپ دیتے ہیں۔

حقیقت کی نظر ڈالئے

ہم نہیں سمجھتے کہ آپ اس اجتماعی انانیت کی خواہش کریں گے جبکہ انفرادی انانیت کا مزہ ہم اپنے ملک میں چکھ چکے ہیں، شر پورا کا پورا شر ہوتا ہے اس میں کوئی بھلائی اور اچھائی نہیں ہوتی اور جب آپ اس معاملہ پر حقیقت کی نظر ڈالیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ تنہا ایک شخص جو گناہ کی طرف دوڑتا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی جماعت کا

فرد ہونے کے ناطے گناہ کی طرف دوڑے۔ بلکہ ایک فرد کی انانیت پوری جماعت کی انانیت کے مقابلے میں کم خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کیا اس بڑی انانیت نے اس سے زیادہ کچھ کیا ہے کہ قوموں اور گروہوں اور مملکتوں کو مسلسل مقابلے کی دوڑ میں لگا دیا ہے، ہر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہے اور ہمیشہ اس کی گھات میں رہتا ہے؟ پہلے افراد ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے لیکن آج شر بہت بڑھ چکا ہے۔ آج جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، قومیں اور مملکتیں مل کر شہروں کو اُجاڑ رہی ہیں، قلعوں پر بمباری کر رہی ہیں اور لاکھوں انسانوں کو گولہ اور بارود اور بم کے دھماکوں کا لقمہ بنا رہی ہیں۔ کیا مشرق بھی اسی انانیت کی خواہش کرتا ہے؟ کوتاہ نظر کہیں گے: ہاں، لیکن ہم کہتے ہیں: نہیں ہم مشرق و مغرب دونوں کے لئے ایک دوسری چیز کی اُمید کرتے ہیں جلد ہی اس کا ذکر آئے گا اور اسی کی طرف اخوان المسلمون دعوت دیتے ہیں اور اس کی تحصیل کے لئے جدّ و جہد کر رہے ہیں۔

جہاں سے چلے تھے ہم

ہم پیچھے کہہ چکے ہیں کہ بااخلاق زندگی کے دو ستون ہیں:

۱۔ دونوں غایتوں کا اعتراف کرنا

۲۔ شعور کی حساسیت جو دنیوی غایت کو حقیر سمجھے اور اس سے اعراض کرے اور اُخروی غایت کی تکریم کرے اور اس کی طرف عزائم کو مہمیز کرے

ہم پہلے دعویٰ کر چکے ہیں کہ اکثر لوگ اس حقیقت کو نظری طور سے تسلیم کرتے ہیں۔

پھر آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ: کیا دلوں میں اس حقیقت کے لئے کچھ گداز بھی موجود ہے؟ جس سے نیکی و شرافت اور اعلیٰ کارناموں کی طرف مائل عزائم اُبھر سکیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اور ہر قاری کے درمیان اس امر پر اتفاق ہو گا کہ دلوں کے وہ تار جو بلند مقصد کی طرف بڑھتے ہیں اور ہمتوں اور عزائم کو اس کی طرف راغب کرتے ہیں، ابھی بہت کمزور اور پھسپھسے ہیں۔ یہاں پھر آکر یہ مقصد اور غایت تنہا بے یار و مددگار رہ جاتی ہے جسے انسان صرف سلبی حیثیت سے قبول کرتا ہے اور اقدام پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس طرح انسان دونوں غایتوں کے درمیان مذبذب کھڑا رہتا ہے، اپنی مادی عقل سے تو اچھائیوں کو دیکھتا ہے لیکن دل کہیں اور اٹکا رہتا ہے تا آنکہ اللہ کوئی قطعی فیصلہ کر دیتا ہے۔

تیسری فصل

علاج

ہم نے اس باب کا عنوان قائم کیا تھا " دعوت اور داعیانِ دین " لیکن اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں اس میں دعوت یا داعیانِ دین کی خصوصیات بیان کروں گا بلکہ میرے پیش نظر دو بڑے مسائل تھے:

پہلا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم وضاحت کردیں کہ وہ بڑی بیماری جو پورے معاشرے کو بیمار بنا دیتی ہے، مادہ پرستی اور اُس کی تمام ظاہری و باطنی شکلیں ہیں خاص طور سے مادیت جب دلوں میں سرایت کرجاتی ہے اور مال و دولت اور اغراض و مفادات کی پرستش پر مجبور کردیتی ہے تو نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس بڑی بیماری پر اپنی گفتگو کو مرکوز کریں جس نے انسانیت کو ہر شعبہ میں اضطراب اور بے چینی کا وارث بنا دیا ہے، ہر دل میں بغض و عداوت کے بیج ڈال دیئے ہیں اور غیر مختتم تباہ کُن جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، اس کے باوجود لوگ اس کی خطرناکیوں کی طرف دھیان نہیں دیتے اور اگر کچھ دھیان دیتے بھی ہیں تو اس سے گلو خلاصی کی ہمت نہیں کر پاتے۔

ہر داعی — چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم — پر فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک کرلے اگر انسانیت کو نجات بخشنے اور اس کو خوش حال بنانے میں

اور اس کی جان و مال اور اولاد سے اسے بے نیاز بنا دیتی ہے ـــــ یہ ہے سچا داعی، جس کا دعوت پر ایمان اس کے فکر و نظر میں، حرکت و عمل میں اشارہ و کنایہ میں حتیٰ کہ اس علامت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو اس کے چہرے کے پانی سے ملی ہوتی ہے۔ ایسا داعی ہی عوام کے دلوں میں اپنی بات اتارتا اور ان کے جذبات و احساسات اور دھڑکنوں کو اپنے مقصد کی طرف موڑ سکتا ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ داعی کو خوفناک اور ڈراؤنا ہونا چاہیے اور بناوٹی شجاعت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ عوام کو گھٹیا مقصد کے لئے استعمال کر سکے اور ان کے جذبات کو بناوٹی انداز میں اُبھار سکے یہ تو اس شخص کا کام ہے جو ایسی چیزوں کا دعوے دار ہو جو اس کے اندر بالکل نہ پائی جاتی ہوں۔ بلکہ ہم تو اس بیداری اور ہوشیاری کی بات کر رہے ہیں جو اس کی فطرت میں رچ بس جائے۔ وہ بولے تو اس کے الفاظ اور جملوں سے دعوت کے اسرار و رموز کے پردے اُٹھیں اور عوام کو وہ باطل مقصد کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ اس حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرے جس سے عقل اور فطرت دونوں ہم آہنگ ہیں۔ جب یہ ساری چیزیں خود ساختہ افکار و نظریات ـــــ جو باطل ہیں ـــــ کے لئے ضروری ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اسلام کے لئے اس سے کہیں زیادہ ضروری ہوں گی کیونکہ یہ خالص حق کا پیغام ہے اور حق اور انسانی فطرت کے درمیان ایک رشتہ ہے اور دونوں اللہ کی رُوح میں سے ہیں۔ جب انسان کا دل اس پیغام کے حقائق کو قبول کرے گا تو اس کی فطرت ان حقائق سے اس طرح مانوس ہو گی جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے مانوس ہوتا ہے پھر تو وہ انکار کرے گی نہ تردد اور انہیں پورے یقین، معرفت اور اعتماد کے ساتھ قبول کرے گی بلکہ اس میں

وہ مخلص ہے۔ اور یہ مناسب نہیں ہے کہ داعی بغیر علم و درایت کے کسی مسئلہ کو حل کرنے میں اُلجھے۔ جن بنیادوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ کسی اور بنیاد پر کسی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش ناکام ہوگی اور اس سے کوئی کامیابی یا پیش رفت ممکن نہیں ہوگی اور اس سلسلے میں جتنی بھی دوڑ دھوپ کی جائے گی وہ مرض کو اور بڑھا دے گی اور صحتیابی مزید مؤخر ہو جائے گی اس لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو فتنہ و فساد پھوٹ پڑا ہے اسے دور کرنے کے لئے داعی کو اس بڑی بیماری پر توجہ دینی ہوگی اور کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول کی تعلیمات میں جو شفایابی اور طب کے اصول بتائے گئے ہیں ان پر حکمت و دانش کے ساتھ عمل کرنا ہوگا۔

البتہ جو شخص غیر مسلم ہے اور انسانیت کو اس مرض مزمن سے بچنے کی دعوت دے رہا ہے اسے ہم اس بات کی دعوت دیں گے کہ وہ توراۃ، انجیل اور دوسری الہامی کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ قرآن کا مطالعہ بھی کرے اور انسانیت کی بھلائی چاہنے میں اگر اس کی نیت خالص ہے تو اسے اس چیز کو اختیار کرنا چاہیئے جسے اس کی فطرت صالح اور مناسب کہے —— اور ہمیں یقین ہے کہ وہ پورے اسلام کو صالح اور مناسب پائے گا —— اور تعصب کے اوہام و خیالات کو پرے پھینک دے اس لئے کہ یہ چیز عقل اور روشن خیالی سے بعید ہے کہ انسان مریض کو گھلنے اور برباد ہونے کے لئے چھوڑ دے اور اپنے پڑوسی کی دوا محض اس بنا پر استعمال نہ کرے کہ اس کی غیرت و حمیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ دوسروں کی دوا کی اثر پذیری کا اعتراف کرے ——،

دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پوری وضاحت سے بتا دیں کہ تمام پیغامات اور

افکار و نظریات میں جان اسی وقت آتی ہے جب عملی اقدامات اور جذباتی عقل کا ان سے لگاؤ ہو۔

اور یہ بات خود ساختہ افکار و نظریات کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ بغیر جذباتی تعلق اور عملی اقدامات کے ہر نظریہ کتابوں کی جلدوں میں دفن رہتا ہے اور انسانوں کے ذہنوں میں تلچھٹ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی حرکت اور زندگی باقی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر نازی ازم کو لے لیجئے۔ یہ نظریہ ایک جامد اور پرسکون فلسفہ کی حیثیت سے کتابوں کی موٹی موٹی جلدوں میں موجود تھا اور یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم ہوتی تھی یہاں تک کہ ہٹلر کے وجدان نے اسے اخذ کیا، اس کے ذہن میں حرکت اور جوش پیدا ہوا اور پوری جرأت، قوت اور اعتماد کے ساتھ اس کا اعلان کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ پوری قوم کے دل اس نئے لیڈر کے نظریہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئے اور بتدریج اس مقصد کی طرف منتقل ہونے لگے جو وہ چاہتا تھا اور حالات اور ماحول نے سازگاری کی یہاں تک نازی ازم کا فلسفہ عقیدہ راسخ بن گیا جس کی راہ میں پوری قوم لڑنے مرنے لگی گرچہ اس میں خرافات اور گھٹیا افکار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

دو بنیادی اُصول

ہم اس سے دو بنیادی اصول اخذ کرسکتے ہیں

ایک داعی کو ہمہ وقت اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ اس کی دعوت اس کے رگ و ریشے میں دوڑ رہی ہے، اس کے ضمیر میں اس کی آگ روشن ہے، اس کے خون میں جاری وساری ہے اور اسے راحت وخوش حالی سے نکال کر حرکت وعمل کی طرف کھینچتی ہے

اسے لذت، فرحت اور سرور کا احساس ہوگا:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (مائدہ: ۸۳)

(جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں وہ بول اُٹھتے ہیں کہ "پروردگار ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے")

اس لئے کہ حق ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے اور فطرت — جس پر زنگ نہ لگ گئی ہو — جب حق کو سنتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ یہ اسی کی صدائے بازگشت ہے اور اسی چیز کی ایک شکل ہے جو اس کی گہرائیوں میں موجود ہے:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ (عنکبوت: ۴۹)

(دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں)

میرے بھائی! جب آپ یہ محسوس کریں کہ اپنے دین سے آپ کا جذباتی لگاؤ نہیں ہے، دل کی دھڑکنیں اس سے وابستہ نہیں ہیں اور اس کے لئے بے باکی و بے خوفی کا آپ مظاہرہ نہیں کر سکتے اور جب آپ محسوس کریں کہ دین سے قربت اور تعلق اس لئے ہے کہ آپ ایک شعلہ بیان خطیب بن جائیں، اپنی فصاحت و بلاغت

سے لوگوں کو مسحور کرتے پھریں تو سمجھ لیجئے کہ ان دونوں ہی صورتوں میں آپ دین کو نئے سرے سے سمجھنے کے محتاج ہیں اور اس بات کے سخت ضرورت مند ہیں کہ جذبات اور احساسات کو بھی اس سے ہم آہنگ کر دیں اور آپ کا دل بھی اس کی صداقت کی گواہی دے دے یعنی ایسا مضبوط و مستحکم ایمان آپ کے اندر پیدا ہو جائے جو آپ کے ضمیر کو ہمہ آن آپ کی دعوت سے جوڑے رکھے، سوتے، جاگتے، کھاتے پیتے ہر وقت اسی کی فکر آپ کے ذہن پر سوار ہو، گھر میں، سفر و حضر میں، نجی مجلسوں میں ہر جگہ اس کا خیال آپ کو متحرک رکھے۔ اگر آپ کسی انسان سے ملاقات کریں تو دعوت کے فائدے کے لئے ملاقات کریں، کسی سے دوستی یا دشمنی کی جو پالیسی بھی اپنائیں جو دعوت کے مفاد میں ہو، خوشی و مسرت کا اظہار کریں یا حزن و غم کا، آپ کا یہ اظہار دعوت کی خاطر ہو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی زندگی کے تمام اوقات اسی دعوت کے لئے صرف ہوں۔ یہی آپ کی زندگی کی دھڑکن اور قلب کی حرکت بن جائے، آپ کی زندگی اسی کے ارد گرد گھوم رہی ہو، لیکن اس کے برعکس صورتِ حال نہ بننے پائے کیونکہ آپ داعی ہیں مدعو نہیں اور ان دونوں گروہوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

میرے بھائی! آپ کی توجہ دعوت کے لئے اس درجہ جامع اور یکسو ہونی چاہیے اور اس کے لئے اتنا زیادہ اہتمام اور فکر رکھنی چاہیے۔ صحیح معنوں میں آپ دعوت کے ہو کر رہ جائیں اور اپنے آپ کو اس کی راہ میں فنا کر دیں، اس کے مرشد، اس کے رہنما اور اس کے انصار و اعوان سے گہرا تعلق ہو، آپ کے تعلقات جتنے زیادہ گہرے اور مستحکم ہوں گے آپ اس تلوار کی طرح تیز اور صاف ہوتے جائیں گے جسے اس کا مالک تیز کرتا ہے، اس کا زنگ دور کرتا ہے اور اسے قاطع بنا دیتا ہے جس کی کاٹ

کوئی نہیں کرسکتا۔

یہ پہلا اصول داعیانِ دین سے متعلق تھا اب دوسرا اصول کارِ دعوت سے متعلق ہوگا:

تو۔ دعوت فنی تعریف اور اصلاحی حدود سے قطع نظر کسے کہتے ہیں؟ دعوت دراصل نام ہے ایک دائرے سے نکال کر دوسرے دائرے میں داخل کردینے کا، اور یہ دعوت کی ذمہ داری ہے۔ اس میں مختصر و مفصل سارے طریقہ کار پر بحث ہوتی ہے، جس نے دعوت کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور سمجھا، وہ اپنے آپ سے اور اپنے پیغام سے ناواقف رہا۔

دعوت اور اصلاح

کچھ جماعتیں ایسی ہیں جو اصلاح کا مطلب یہ سمجھتی ہیں کہ مدارس قائم کردیئے جائیں یونیورسٹیاں کھول دی جائیں، تالاب اور نہریں کھدوادی جائیں، شفاخانے بنوادیئے جائیں، کارخانے بنائے جائیں جن سے شہریوں کی ضروریات پوری ہوسکیں اور اسی طرح کی اور دیگر چیزوں تک ان کے نزدیک اصلاح کا دائرہ محدود ہے اور اس کا وہ اپنے کلبوں، انجمنوں اور اخبارات ورسائل میں پروپیگنڈہ بھی کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں کا اصلاح سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ تو زندگی کی ضروریات ہیں جن کی تکمیل کا اجتماعی زندگی کی ضروریات کے ساتھ خیال رکھنا ہے۔ ان کا اصلاح و نجات سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

آپ کیا سمجھتے ہیں، اگر ایک بھوکا انسان پانی میں ڈوب رہا ہو، اور لوگ اسے پانی سے فوراً نکالنے کے بجائے اس کے لئے کھانا ڈھونڈھنے لگیں تاکہ اسے شکم سیر کیا

جا سکے تو لوگوں کی اس حماقت کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

یا اگر کوئی انسان بیمار ہو جائے اور اس کا مرض اس کی جان کو لاگو ہو جائے، اور کوئی انسان اس کے لئے دوا دارو اور ڈاکٹر کا نظم کرنے کے بجائے ایک استاذ بلالائے جو اسے حساب یا کسی فن کی تعلیم دینے لگے تو اس انسان کا حشر کیا ہوگا؟

یوروپ میں نہروں اور تالابوں کی کھدائی سے، مدارس اور کالجز کے قیام سے، کارخانوں اور صنعت گاہوں کی تعمیر سے اور اخبارات نکالنے اور وسائل کو آزاد کرنے کا کیا فائدہ ہوگا جب کہ یوروپ کی رُوح بیمار ہے اور دل خراب ہو چکا ہے ان چیزوں کی تعمیر و تشکیل سے اس کے علاوہ اور کیا فائدے ہوئے ہیں کہ اضطرابات میں اضافہ ہوا ہے پریشانیاں دو چند ہو گئی ہیں، اصول و اقدار بنے اور بگڑے ہیں، جنگیں ختم ہوئی ہیں، اور پھر شعلہ زن ہو گئی ہیں؟!

دعوتِ دین کے علمبردارو!

آپ اُمت ہی نہیں پوری انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔ انسانیت ایک بدبودار سڑاند اور دم گھونٹ کر مار دینے والے ماحول میں گھری ہوئی ہے آپ اسے وہاں سے نکال کر ایسے ماحول میں لے جائیں جو شیریں ہو، وسیع و کشادہ ہو اور مناسب اور خوش گوار ہو۔ مادیت کے جزیرے سے نکال کر خدا پرستی کے جزیرے میں لے جائیں، دلوں کی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے جائیں پھر اس کے بعد زندگی کی نئی ضروریات پر دھیان دیں جس کا یہ زندگی تقاضا کر رہی ہو۔

میرے مخلص بھائی!

اپنے نصب العین پر پوری طاقت صرف کر دیجیے۔ اس کے لئے تمام عزائم سمیٹ

لیجیے، اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کر لیجیے اور اپنے پیغام اور اپنی دعوت کی ضروریات پر ہمیشہ دھیان رکھیے اگر کتابوں کی طباعت و اشاعت کی ضرورت ہو تو اس کا اہتمام کیجیے، مدارس و کالجز کے کھولنے کی حاجت آئے تو انہیں بھی کھولئے اور اسے بھلی گفتگو کے خلاف نہ تصور کیجیے اس لئے کہ اب مدارس کھولنے کا مقصد آپ کا یہ ہوگا کہ آپ تعلیم کو ایک دائرے سے نکال کر دوسرے دائرے میں پہنچا دیں اور دلوں کی دنیا میں انقلاب لے آئیں۔

دعوت اور تصنیف

یہاں ایسے مصنفین اور انشاء پرداز بھی آپ کو ملیں گے جو یہ سمجھتے ہوں گے کہ اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ مقالے لکھے جائیں، اور کتابیں ترتیب دی جائیں۔ اور مغرب کے علم و سائنس، سیاست و معیشت، انتظام اور آزادی اور دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا ایک خاص اسلوب، عوام کے ذہنوں میں انڈیلا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ مضامین لکھ کر کتابیں ترتیب دے کر یا انہیں شائع کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انہوں نے رسالت کا حق ادا کر دیا ہے اور اپنے وطن کے سپوتوں کی خدمت کی ہے۔

یہ قوم، مغرب کے پاس جو سائنس و فلسفہ ہے، ادب و اخلاق ہے اور اجتماعی سیاسی ڈھانچے ہیں ان کے سلسلے میں معلومات کا ذخیرہ فراہم کر کے آپ کو متحیر کر دے گی لیکن اس کے وطن کے لئے اس کے اوپر کیا یہی ذمہ داری واجب ہوتی ہے؟ ہر گز نہیں۔

ان کا کوئی مقالہ یا کوئی کتاب پڑھیے اور آپ کو یہ احساس ہو کہ مصنف یا مقالہ نگار

آپ کو ایک وادی سے نکال کر دوسری وادی میں پہنچا رہا ہے اور آپ کے دل پر جدید روحانی دُنیاؤں کے پردے بیں اُٹھا رہا ہے اور آپ کے نفس کی رہنمائی کر رہا ہے اور آپ کو قوت وایمان کی راہ میں اس ہمہ گیر خدا پرستی کی دعوت دے رہا ہے جو آپ کے لئے ایک صالح اور سعادت مند زندگی فراہم کرتی ہے جس میں قلب بھی حق ہے اور بدن بھی، تو سمجھ لیجئے کہ وہ مصنف یا مقالہ نگار ہوش مند اور باخبر داعیٔ دین ہے۔

اور اگر اس کا مقالہ یا کتاب پڑھنے کے بعد آپ کا احساس یہ ہو کہ ایک انسان آپ کو تسلی دے رہا ہے یا اپنے قلم کی ایسی جولانی دکھا رہا ہے جسے آپ سینما یا مصوّر اخبارات میں دیکھنا پسند نہ کرتے یا وہ آپ کو اپنے وسیع مطالعہ اور بے پناہ معلومات سے متحیّر کرنا چاہتا ہے ـــــ جب آپ اس کی کتاب یا مقالہ سے یہ تاثرات لیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا یہ بیچارہ مصنف رٹا رٹایا ہوا طوطا ہے، اس لئے کہ اس کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جو بصیرت کی آنکھیں کھولے، وہ ہوشمندی اور تفقہ اس کے پاس عنقا ہے جس سے ان ضروریات کا وہ ادراک کر سکتا جن کی اصلاح و انقلاب کی راہ میں ہمیں حاجت ہے۔ اس نے سمجھا کہ مغرب کے پاس جو کچھ ہے وہی مثالی قدریں ہیں جنہیں پوری انسانیت تہذیب کا نام دیتی ہے۔ یہ نری جہالت ہے اس کا ازالہ اس سے نہیں ہو سکتا کہ قوم کی معلومات میں اضافہ کر دیا جائے یا معیشت کے نئے اسالیب اور طریقے ایجاد کر لئے جائیں کیونکہ اس سے تو خود مصنف کی اور پوری قوم کی گمراہی میں اور اضافہ ہو جائے گا!

یہ اپنے آقاؤں کی غلامی کا دم بھرتے ہیں

اگر یہ لوگ خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہوتے، اپنی شخصیت اور حیثیت کو پہچانتے اور مغرب کی تمام تعلیمات کو ناقد کی نگاہ سے دیکھتے تو ان کے اوپر حقائق ضرور کھلتے اور یہ اپنی اُمت کو خیر کثیر سے نوازتے لیکن انہوں نے ان تمام چیزوں کو اپنے کندھے سے اُتار پھینکا ہے، اپنے وجود اور اپنے ارادہ سے تہی دست ہو چکے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے آقاؤں کے سامنے باندھ کر ڈال دیا ہے وہ جو چاہتے ہیں ان سے کام لیتے ہیں اور جن خیالات و افکار کو ان کے ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں، بٹھا دیتے ہیں۔ اور یہ غلامی کی بدترین قسم ہے اس لیے کہ اس میں شخصیت پوری طرح سے فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن کا تعلیم یافتہ فرد جرمن راگ الاپتا ہے تو فرانس میں تعلیم حاصل کرنے والا فرانس کی خوبیوں کے گیت گاتا ہے اور جس نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی ہے وہ اپنا آئیڈیل انگریزوں کو ہی سمجھتا ہے اس طرح جس نے جہاں تعلیم پائی ہے وہ وہیں کی ڈفلی بجا رہا ہے یہ لوگ بدترین جہالت و ضلالت اور حماقت اور اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے کسی کا قلم یہ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ان کے یہ صاحب لوگ کمزوروں کو کیوں لوٹ رہے ہیں، ان کے وطن پر قبضہ کیوں کر لیتے ہیں اور ان کی دولت و ثروت کو کیوں ہڑپ کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ نام نہاد ادباء ان صاحب لوگوں کی نام نہاد خوبیوں اور خصوصیات کو بیان کرتے نہیں تھکتے۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ ان فرانسیسی تعلیم پائے ہوئے ادیبوں میں سے کسی نے فرانس کے اس ناپاک اقدام کی مذمت کی ہو کہ وہ کیوں ٹیونس، جزائر، مراکش، سنگال، صومالیہ وغیرہ پر حملہ کر رہا ہے اور انہیں اپنے قبضہ میں لئے

ہوئے ہے؟ یا ان علاقوں کے سلسلے میں ان کا کوئی ہمدردانہ بیان آیا ہو جہاں انسانیت
کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا جا رہا ہے جسے کوئی باضمیر اور خود دار شخص کبھی برداشت
نہیں کر سکتا۔[1] کیا ان میں سے کسی نے اپنے دل کی گہرائیوں سے کوئی نعرہ بلند کیا ہے؟
اور ان انانیت پرستوں کے اوپر اپنے غیض و غضب کی بجلیاں گرائی ہیں؟ نہیں،
کبھی نہیں، یہ لوگ ان تمام چیزوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں، انہیں تو بس اپنے آقاؤں کے
محاسن اور ان کی خوبیاں ہی نظر آتی ہیں اور ان کے ملکوں میں اباحیت اور آزادی کا جو
سیلاب امنڈ پڑا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔

میرے بھائی! میں آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ ان کے علم و
ثقافت اور فہم و شعور اور انسانیت نوازی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھیں۔ اس لئے کہ
جو شخص اپنے پیغام کو نہیں سمجھتا، وہ اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا، جو خیر و عدل کا ساتھ
نہیں دیتا، اس کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی اور جو حق کے معاملہ میں خاموشی
اختیار کرے وہ گونگا شیطان ہے۔

اس طرح کے کاتب اور مضمون نگار جو آپ کو ایک دائرے سے نکال کر دوسرے
دائرے میں داخل نہیں کرتے بلکہ خود ساختہ دائرے میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں،
آپ کی توجہ اور تکریم کے مستحق نہیں ہیں۔ اور ان مصنفوں کو بھی ابھی سے معلوم ہو جانا
چاہیے کہ ان کی جہالت کی حقیقت کیا ہے اور وہ کس درجہ فضول اور لغو باتیں کہہ رہے
ہیں۔ ان کے بھاری بھرکم القاب اور قد آور شخصیتوں اور چہار دانگ عالم میں اڑتی ہوئی

---

[1] ان مملکتوں کی آزادی سے پہلے یہ تحریریں لکھی گئی ہیں۔

شہرت سے دھوکہ نہ کھایئے بلکہ آپ کا اولین اقدام یہ ہونا چاہیئے کہ ان کے دلوں پہ کچھ کے لگایئے تاکہ وہ بیدار ہو، ان کے اندر گرمی و حرارت کی رُوح پھونکئے تاکہ وہ اُٹھ کھڑے ہوں اور انہیں اپنے اس رب کے نام سے واقف کرایئے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے جن کی تہ تک یہ تمام ظاہری علوم و فنون اب تک نہ پہنچ سکے۔ ہمیشہ یہ بات یاد رکھئے کہ آپ کی حیثیت قائد کی ہے، آپ دلوں کے روحانی امراض کو دور کرنے والے ڈاکٹر ہیں اور یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ آپ کی اولین ذمہ داری دلوں کو زندہ کرنا اور ہمتوں اور ارادوں کو بلند اقدار کی طرف مہمیز کرنا ہے۔

دعوت اور وعظ

میں چاہتا ہوں کہ داعیانِ دین کو معلوم ہو جائے کہ وعظ و نصیحت کے سلسلے میں بھی ان کا طریقہ کار وہی ہوگا جو تحریر و تصنیف کے سلسلے میں ہوگا۔ اور دونوں ہی حالتوں میں ان کی ذمہ داری وہی ہے جو انبیاء کی تھی یعنی لوگوں کے دل بدلے جائیں تاآنکہ اللہ تعالیٰ ان کے فساد اور بگاڑ کو دور کر دے۔ ہر وہ وعظ جو یہ مقصد اپنے سامنے نہ رکھتا ہو، بیکار ہے اور باطل عمل ہے۔

میرے بھائی!

آپ کا تمام تر مقصد بس اتنا نہ ہو کہ نت نئے شگوفے کھلا کر سامعین کو ہنسا دیا جائے اور مزاحیہ باتوں اور قصّوں سے محفل کو کشت زار زعفران بنا دیا جائے تاکہ لوگ کہنے لگیں کہ یہ بڑا ماہر واعظ اور نصیحت گو ہے اور یہیں پر آپ کی ذمہ داری تمام ہو جائے نہ خطابت سے آپ کا مقصد یہ ہو کہ جمہور عوام کو تسلی کی نیند سلا دیں اور تھوڑی دیر تک

انہیں ایسی باتوں میں لگائے رکھیں جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔

نہ آپ کا معاملہ اس شخص کا سا ہونا چاہیئے جو لوگوں سے باتیں کہتے ہوئے ڈرتا ہے چنانچہ ان کو بہت کم مخاطب کرتا ہے گویا کہ اسے اندیشہ ہے کہ وہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے وہ ان کے سامنے تاریخ کی داستانیں، گزرے ہوئے لوگوں کی حکایتیں اور قرآن کریم کی آیات کے نزول کے اسباب بیان کرتا ہے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا نہ ان سے کوئی متعین مقصد یا منزل ہی سامنے آتی ہے۔ اس کی ان باتوں کا مقصد بس اتنا ہوتا ہے کہ لوگ اس کے گرد چوپال جمائیں اس کی باتیں غور سے سُنیں پھر نشستند گفتند برخواستند کے مصداق بن جائیں اور ان کا عملی زندگی پر کوئی اثر پڑے یا نہ پڑے، اس سے اسے کوئی غرض نہ ہو بس اس نے ان کی صحبت میں کچھ اوقات بسر کیے اور ایک طرح کا جذباتی لگاؤ اور انسیت پیدا ہو گئی۔ اس قسم کا وعظ محض سلبی ہے جس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیئے نہ اس طرح کے وعظ کی آپ کے پیغام کے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔

آپ کا پیغام تو یہ تقاضا کرتا کہ آپ حکمت کے ساتھ عوام کے جذبات کے تاروں کو چھولیں۔ ان کے وجدان اور شعور کو جھنجھوڑدیں، ان کے احساسات و خیالات کو اللہ کی طرف موڑ دیں، پھر جب موسم سازگار ہو اور ان کے دل آپ کی باتوں کے لئے نرم پڑ جائیں تو جو چاہیئے ان سے کام لیجیے۔ ان کے سامنے اپنا نصب العین رکھئے اور ان کے دلوں کی آرزوؤں اور امنگوں کو اس مقصد کی طرف موڑ دیجیے۔ جو آپ کو محبوب ہے، انشاءاللہ وہ آپ کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔

میرے مخلص بھائی!

اس خشک وعظ سے دامن کش رہیئے جس میں کوئی زندگی نہ ہو۔ اور اس طول طویل تقریر سے پرہیز کیجئے جس کا کوئی مقصد نہ ہو اور کسی ایسے موقف کو اختیار نہ کیجئے جہاں سے شکار حاصل کرنے کا آپ کا ارادہ نہ ہو آپ ایک ماہر شکاری ہیں، آپ اپنا جال پھینک دیجئے اور جو شکار پھنستے ہیں انہیں دوسری وادی میں منتقل کرنے کا نظم کیجئے۔ اور وہ وادی اخوان المسلمون کی وادی ہے، اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کی وادی ہے۔

کسی وقت سلبی وعظ کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے لیکن عام حالات میں، جبکہ بیداری و ہوشمندی کی باتیں ہو رہی ہوں اور عوام کو فساد اور بگاڑ کے پھندے سے نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہو، یہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ جب بیداری آجائے گی، اللہ کی شریعت نافذ ہو جائے گی اور لوگ فساد سے بچ نکلیں گے تو اس وقت سلبی وعظ کا دور آئے گا اور عوام کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ متنبہ کیا جائے گا، خدا کے خوف کے ذریعہ برائیوں سے روکا جائے گا۔ اس وقت انہیں حرکت و انقلاب، تبدیلی و تغیر پر آمادہ نہیں کیا جائے گا نہ انہیں کسی وادی میں منتقل کرنے کی بات ہوگی۔ اس وقت واعظ کی حالت اس ڈاکٹر سے ملتی جلتی ہوگی جو صحیح سالم جسم کی حفاظت میں لگ جاتا ہے اور طب کے اس مشہور اصول کو اختیار کرتا ہے کہ "پرہیزی علاج کرنے سے بہتر ہے"

میرے بھائی!

یہ ہے دعوت اور یہ ہے داعیانِ دین کی شان! اور یہ ہے فہم کی حیثیت! تو اپنی دعوت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے اور اللہ اپنی طاقت کے ذریعہ آپ کی تائید کرے گا اور ہمیں اور آپ کو سیدھے راستے کی رہنمائی کرے گا۔

دوسرا باب

داعی کا مزاج

تمہید

داعی کے مزاج سے ہماری مراد وہ عقلی روحانی اور نفسی ذخائر ہیں جن کی اسے ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ایک داعی کو مندرجہ ذیل ہتھیاروں سے مسلح ہونا چاہیئے:

۱۔ حقیقت پسندانہ عقلیت، جو محسوس اور عملی لحاظ سے قائل کر سکے محض نظریاتی نہ ہو۔

۲۔ رُوحانی زندگی جسے مادہ پرستی سے ماوراء ہو کر گزار سکے اور یہ رُوحانیت اجتماعی ہو لیکن لوگوں کو رہبانیت کی طرف مائل نہ کرتی ہو نہ انہیں اسباب و وسائل کو چھوڑ دینے کی تلقین کرتی ہو ورنہ یہ اللہ کی سُنّت اور اس کے قوانین سے جہالت ہوگی۔

۳۔ ایجابی فطرت، جو اقدامات پر آمادہ ہو، سلبی نہ ہو۔

کبھی کبھی یہ ہتھیار داعیان دین کے مزاج اور ان کی سرشت میں داخل ہوتے ہیں اور طبعی طور پر وہ ان سے مسلح ہوتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ جو لوگ طبعی طور پر ان چیزوں کے مالک نہیں ہوتے انہیں تجربہ اور مشق کے ذریعہ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جو لوگ جدّ و جہد کریں گے انشاء اللہ خالی ہاتھ واپس نہیں ہوں گے۔

پہلی فصل

حقیقت پسند عقلیّت

ہم پیچھے کہہ چکے ہیں کہ داعی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اُمت کو ایک دائرے سے نکال کر دوسرے دائرے میں داخل کر دے اور یہ حد درجہ مشکل کام ہے۔ انسان بڑا جھگڑالو اور لڑاکو واقع ہوا ہے، وہ بہت جلد سرکشی اور نافرمانی کی طرف پلٹ جاتا ہے، اس کی نکیل اس کی خواہشات کے ہاتھوں میں رہتی ہے اسی لئے داعی کی ذمہ داری بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایک انسان کو اس کی ناپسند راہ پر لانے سے زیادہ آسان یہ نظر آتا ہے کہ ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا دل خیر یا شر جس چیز کی دعوت دیتا ہے اُس پر فوراً لبیک کہہ دیتا ہے اور اس راہ میں جتنی مشقتیں آئیں، جتنا پیسہ خرچ کرنا پڑے سب برداشت کرتا ہے بلکہ یہ ساری چیزیں اس کی نگاہ میں مرغوب و محبوب بن جاتی ہیں!

دل ہی وہ عجیب و غریب طاقت ہے جو اس سرکش اور نافرمان شخص کی لگام اپنے قبضہ میں رکھ سکتی ہے اور یہ اس شخص کی خوش نصیبی اور سعادت ہے، اس لئے ایک حکیم داعی اس بات کی پوری کوشش کرے گا کہ وہ اپنی ساری توجہ اور پوری طاقت اسی

دل کو مخاطب کرنے، اس کی پسند و ناپسند کو موڑنے اور اس تک نفوذ حاصل کرنے پر صرف کرے یہاں تک کہ جب وہ اس کی عنان پر قابض ہو جائے تو نرمی و سہولت، خوشی و مسرت کے ساتھ اس اصلاح کی طرف موڑ دے جو وہ چاہتا ہے۔

قرآن کا اسلوب

لیکن اس دل کو مخاطب کیسے کریں؟ اور کس اسلوب میں رُوحانی اور ربانی حقائق اس کے سامنے پیش کریں؟ یہ ایک سوال ہے جسے حل کرنا ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو اپنے افکار و نظریات خالص عقلی و فکری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ علت و معلول اور اسباب و مسببات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیں، نظر و فکر کی گہرائیوں میں اُتر کر کلیات و جزئیات اور مختلف مفروضات اور حقائق کی چھان بین کریں اور انہیں عوام کے سامنے پیش کریں اس اسلوب کے ذریعہ لوگوں سے ہرگز مخاطب نہ ہوں کیونکہ یہ طریقہ کار عوام کے اندر تحریک پیدا نہیں کر سکتا نہ ان کے دل کے تاروں کو چھیڑ سکتا ہے۔ سچا داعی وہ ہے جو علمی اور واقعی پہلوؤں سے بحث کرتا ہے اور اللہ کی سُنت اور اس کے قوانین کو ہمہ وقت اپنے سامنے رکھتا ہے اس میں کوئی تصنع یا تکلف یا اُلجھاو پیدا نہیں کرتا۔

آپ دیکھتے نہیں، اللہ تعالیٰ جب حقائق و معانی اور فکر و فلسفہ کی باتیں ہم سے کرتا ہے تو انہیں محسوس طریقے پر اور بالکل علمی انداز میں ہمارے سامنے رکھتا ہے، نظری اور فکری حیثیت سے انہیں پیش نہیں کرتا؟ مثال کے طور پر خدا کی ایک صفت قدرت ہے وہ جب اسے بیان کرتا ہے تو اس کی کنہ و حقیقت، کیفیت و نوعیت اور

مخفی اسرار اور تجریدی حقائق سے بحث نہیں کرتا بلکہ اسے اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں اسے دیکھی جا سکتی ہے، سمندروں میں، پہاڑوں پر، درختوں اور ان کے پھولوں پر، چاند اور سورج میں، اور زمین و آسمان کی ہر چیز میں جہاں نظر جا سکتی ہے اس کی قدرت صاف نظر آ رہی ہے۔ یہ عملی اور محسوس طریقۂ اظہار ان حقائق کے ادراک اور ان کے اعتراف کے لئے کافی ہے۔

وہ ہمیں موت و حیات کے فلسفے نہیں سُناتا بلکہ ان چیزوں کا مشاہدہ کراتا ہے جو روزمرہ ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتی ہیں، پیدائش اور موت، جوانی اور بڑھاپا اور مہد سے لحد تک کے حالات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم ان پر غور کریں اور ان سے عبرت حاصل کریں اور اللہ سمجھتا ہے ــــــ اور وہ بالکل صحیح سمجھتا ہے ــــــ کہ بس اتنی مقدار ہمارے لئے کافی ہے کیونکہ ہماری عقلی طاقت اس سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتی، نہ اس سے ماوراء سے ہمارا مادی اور رُوحانی نفع متعلق ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ بقا اور دوام سے محبت کرتا ہے، بلندی و برتری کی رغبت رکھتا ہے، جنس لطیف کی طرف میلان رکھتا ہے، اسی طرح کی دوسری بہت سی خواہشات اس کے وجود میں پنہاں ہیں تو کیا اللہ نے کوئی فلسفیانہ کتاب نازل کی ہے جس میں ان حقائق کی عمیق تشریح کی گئی ہو اور ان کا احاطہ کیا گیا ہو؟ یہ صحیح ہے کہ اس نے کتاب اُتاری ہے لیکن یہ کتاب کتابِ فطرت ہے، کتابِ زندگی ہے جو انسان کے ہر دن، ہر گھنٹہ بلکہ ہر منٹ کے اسرار و رموز کی پوری تشریح کرتی ہے۔ انسان کے تمام اعمال اس کی ان قوتوں اور خواہشات کی تفسیر ہیں جو اس کے اندر مخفی ہیں۔

اسلوب منظر نگاری کی ضرورت

مفروضات اور حقائق کی تہوں میں رہنے والے یہ افراد قوانین حیات سے روگردانی کرکے خود اپنا بگاڑ کرتے ہیں اور پھر لوگوں کے مزاج کو بگاڑنے کی بھی کوشش کرتے ہیں لیکن آپ داعیٔ دین ہیں ——— لوگوں کو برائیوں سے روکنا چاہتے ہیں، فاسد تہذیب و تمدن کی مضرتوں سے انہیں بچانا چاہتے ہیں اور اچھائیوں کی دعوت دیتے ہیں اور نیک اور صالح تہذیب و تمدن کی راہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں اس لئے حقائق کو پیش کرنے میں آپ اللہ کی سنّت کی پیروی کیجئے اور اپنی دعوت بالکل محسوس طریقے سے اور عملی انداز میں پیش کیجئے۔ آپ کی دعوت دو پیروں سے چلتی ہوئی، زمین پر دوڑ بھاگ کرتی ہوئی اور لوگوں کے اندر اثر و نفوذ کرتی ہوئی نظر آئے۔ یہ واحد طریقہ ہے جس سے دلوں میں زندگی پیدا کی جاسکتی ہے اور عقل میں تحریک لائی جاسکتی ہے اور جب انسان کے قلب و دماغ میں زندگی اور حرکت دوڑنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ زندگی عود کر آئی جو آپ کو مطلوب ہے۔ خدارا خالص نظریاتی طریقۂ کار اپنانے سے گریز کیجئے کہ اس سے لوگ اُکتا جائیں گے اور آپ سے بچھڑ جائیں گے۔

منظر نگاری اور تصویر کشی کے وہ اسلوب جو دلوں میں آپ کی دعوت کو راہ دیں گے ان میں سے چند ایک کا تذکرہ یہاں ہو رہا ہے:

۱ ——— قصّہ گوئی

قصّوں اور داستانوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے گوشوں کی منظر کشی کرتی ہیں، آپ کے سامنے عظیم شخصیات، ان کی سرگرمیوں اور ان کے اخلاق،

ان کے افکار و رجحانات اور ان کا طبعی و زمانی ماحول سب کچھ پیش کر دیتی ہیں اور یہ ساری چیزیں ان کے اعمال و تصرفات اور باہم معاملات کے لبادے میں ہمارے سامنے رکھتی ہیں۔ جب آپ ان اعمال و تصرفات پر نظر ڈالتے ہیں اور بحث و مباحثہ اور گفتگو کرتے ہیں تو دلوں میں چھپی ہوئی طبیعتوں اور میلانات سے واقف ہو جاتے ہیں اور ان میں سے جو لوگ اچھے اور اہلِ خیر ہوتے ہیں ان کے لئے آپ کا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے لیکن ظالموں، فاجروں اور بدکاروں کے لئے آپ کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ داستان سُنتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا آپ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اپنے کانوں سے ان کی باتیں سُن رہے ہیں اور ان کے درمیان رہ رہے ہیں۔

ان قصّوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نفس ان کی طرف مائل ہوتے ہیں اور انہیں سُننا پسند کرتے ہیں۔ تجسّس اور جاننے کی فطرت سامعین کے کان، اس کی آنکھوں اور اس کے ذہن کو قصہ کے بقیہ حصے کی طرف متوجہ رکھتی ہے اور انسان قصّے کے اگلے مرحلے کو جاننے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔

قصہ اپنی ان دو امتیازی خصوصیات کی وجہ سے داعیانِ دین کے لئے بہترین وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے اس سے وہ اپنی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں اُتار سکتے ہیں۔ پہلی خصوصیت کے پیشِ نظر یہ تعلیمات اور پیغامات زندہ اور عملی شکل میں اس طرح سے پیش کی جا سکتی ہیں جو وجدان کو زیر و زبر کر دے اور احساسات میں اُبھار پیدا کر دے۔ اور دوسری خصوصیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے انسانی دلوں کو اپنے پیغام کو سُننے کے لئے بے چین اور بیتاب بنایا جا سکتا ہے اور انہیں ساری باتیں بحسن و خوبی پہنچائی

جاسکتی ہیں۔

میرے بھائی! اس اسلوب کو اختیار کیجئے۔ یہ اللہ کی سُنّت ہے جسے اس نے خود قرآن کریم میں اختیار کیا ہے۔ اس نے اپنے رسول کو بہترین داستانیں سنائی ہیں اور ان میں تعلیمات و مواعظ کا سمندر بند کر دیا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (ہود: ۱۲۰)

(اور اے نبیؐ، یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی)

تمام بہترین قصے قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں —— اللہ تعالیٰ قرآن کے لئے آپ کا سینہ کھول دے اور اس کی تعلیمات سے آپ کی بصیرت کو منور کر دے —— اس کے ذریعہ عقیدہ کو مستحکم کیا گیا، اخلاقی نظام تکمیل کو پہنچا اور ان کی بنیاد پر اسلامی تہذیب کے ارکان کھڑے ہوئے جو تمام تہذیبوں میں مکمل ترین اور جامع ترین تہذیب تھی۔

قرآنی قصے کی ایک مثال

ہم یہاں آپ کے سامنے مثال کے طور پر سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا قصہ بیان کرتے

ہیں اگر اس قصے کے بلند و بالا مقاصد اور حقائق کا ہم احاطہ نہ کر سکیں تو آپ ہمارا دامن نہ پکڑیں۔

ہُدہُد نے سُلیمانؑ سے بتایا کہ مملکتِ سبا میں شرک اور ضلالت کی حکمرانی ہے۔ چنانچہ آپ نے وہاں پیغام بھجوایا کہ وہ لوگ ربُّ العالمین کی اطاعت تسلیم کرلیں لیکن انہوں نے مال و منال کے ذریعہ آپ کو ٹالنا چاہا۔ پر ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ آپ نے مال و منال لینے سے انکار کر دیا اور انہیں فوجی چڑھائی کی دھمکی دی۔ اس وقت وہ لوگ سلیمانؑ کے زیرنگیں آگئے اور مسلمان ہو گئے۔

اس قصہ میں اللہ تعالیٰ مادّیت اور رُوحانیت کے بنیادی قواعد بتاتا ہے جو کسی بھی آئیڈیل حکومت کے لئے لازمہ ہیں۔

۱۔ قوت اور علم

کوئی بھی بڑی مملکت دو اہم ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے: ایک ستون قوت و طاقت کا ہے اور دوسرا علم کا۔

قوت کا مطلب ہے کہ فوجیوں کی کثرت ہو، بہترین تربیت اور اعلیٰ پایہ کی ٹریننگ ہو اور ہتھیاروں اور اسباب و وسائل کا بہترین ذخیرہ ہو۔

علم اصل میں ذہنوں اور دلوں کی روشنی ہے اور ان تمام قوانین طبعیات اور وجود و بقا کے اصولوں کی معرفت کا ذریعہ ہے جو کائنات کی تسخیر کے لئے ضروری ہیں اور جن سے مملکت کو کسی نوع کا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور علمِ نافع درحقیقت خدا کا علم ہے۔

یہ مملکت کا بنیادی اُصول ہے جس کا تذکرہ اللہ نے بیشتر مقامات پر کیا ہے:

قَالُوٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ

مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(بقرہ : ۲۴۷)

(وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں، وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔" نبی نے جواب دیا "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی وجسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے)

لیکن اللہ نے اقتدار کی بنیادوں کا کوئی نظریاتی خاکہ ہمارے سامنے نہیں رکھا بلکہ ہم سے اس نے عملی اقتدار اور آئیڈیل مملکت کا ذکر کیا۔ تاکہ ان صفات کو حقائق کی روپ میں ہم دیکھ سکیں اور اس عظیم اقتدار کے نقوش میں انہیں تلاش کر سکیں اور اگر اس پایہ کی سلطنت قائم نہیں کر سکتے —— اور کبھی بھی اس طرح کی سلطنت ہم قائم نہیں کر سکتے —— تو اس کو نمونہ تو بنا سکیں اور ہماری جتنی طاقت اور صلاحیت ہو اس کے بقدر ہم اس سے اخذ کر سکیں۔

قصۂ سلیمانؑ میں طاقت کا تذکرہ

اللہ ہمارے سامنے عملی اقتدار کا خاکہ رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے سب سے

پہلے ان صفات کا تذکرہ کیا پھر سلیمانؑ کی مملکت کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کر دیا تاکہ مجد و شرف کی تعمیر میں ہم عملی انسان بن سکیں، محض نظری اور کلامی سفسطوں میں نہ اُلجھے رہیں۔ آیئے دیکھیں کہ قوت سے کیا مراد ہے؟ اور کس قسم کی فوج ان کے پاس تھی؟ اللہ فرماتا ہے:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (نمل: ۱۷، ۱۸)

(سلیمانؑ کے لئے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ یہ سب جب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ”اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو“)

سلیمانؑ اپنی فوجی طاقت سے اچھی طرح واقف تھے وہ جانتے تھے کہ اس کے مقابلے میں دُنیا کی کوئی طاقت ٹھہر نہیں سکتی اس لئے ملکہ سبا کا ہدیہ اور اس کے بھیجے ہوئے تحائف واپس کرتے ہوئے سفیر سے کہا:

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (نمل: ۳۷)

(واپس جا ان کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ

وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے
کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے)

دیکھئے میرے بھائی ! اس مختصر عبارت میں اللہ تعالیٰ نے فوج کی کتنی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ اس میں فوجی زندگی کے تمام لوازم اور ضروریات آگئی ہیں، فوجوں کی تعداد، نظم وضبط اور ڈسپلن، مخلوقات کے دلوں میں اس کا رعب، حتیٰ کہ معمولی سے معمولی جانوروں میں پائی جانے والی دہشت، دوسری فوجوں کا اس کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ کرنا، اپنے دشمنوں پر تمام مقامات پر اس کا غالب رہنا، یہ سارے پہلوان چند آیتوں میں سمو دیئے گئے ہیں۔ کتنا عظیم اور بزرگ و برتر ہے خدا! اور کتنی بلند حیثیت ہے اس کے کلام کی! اللہ اکبر!

قصہ سلیمانؑ میں علم کا ذکر

پھر اس قصے میں علم کا ذکر کہاں ہے؟ اور اس پیغام کا ذکر کہاں ہے جسے انہوں نے تمام بندوں تک پہنچایا؟ اللہ کا یہ فرمان پڑھئے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(نمل : ۱۵)

(اور ہم نے داودؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ: "شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی)

یہاں جس علم کی طرف اللہ نے اشارہ کیا ہے اس کی تفسیر خود سلیمانؑ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ مجھے مختلف زبانیں سکھائی گئی ہیں اور تمام علوم کی تعلیم دی گئی ہے:

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭاِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ (نمل: ۱۶)

(اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا اور اس نے کہا، "لوگو، ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں بے شک یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے)

پرندوں کی بولی وغیرہ، آپ خود دیکھتے ہیں کہ ہُدہُد سے گفتگو کرنا اور چیونٹی کی باتوں کو سمجھ لینا، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس میں ماہر تھے۔

دوسرے علوم میں آپ کی مہارت کا علم ہمیں اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے ہوتا ہے۔ یعنی آپ کو ہر طرح کا علم دیا گیا تھا۔

ہمیں اُمید ہے کہ اوپر والی آیت میں "فضل مبین" پر غور کریں گے۔ عنقریب اس فضل کی تشریح آئے گی کہ فضل سے مراد علم ہے جس کا سلیمان علیہ السلام نے اعتراف کیا تھا۔

اس علم کا عملی نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام تمام طبعی قوانین اور اس کی مختلف طاقتوں پر قابض تھے تاکہ انہیں مملکت کے مفاد کے لئے استعمال کر سکیں۔ آگے کا قصہ ہمیں یہی بتاتا ہے:

جب ملکہ سبا اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ سلیمانؑ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو مال و منال کے لئے کام کرتے ہیں اور یہ کہ اگر وہ اسلام نہ لائے تو انہیں کچل کر رکھ دیں گے، تو ملکہ ایک بڑے وفد کے ساتھ سلیمانؑ کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے روانہ ہوئی۔ راستے میں تھی کہ سلیمانؑ کو خیال آیا کہ کوئی متحیر کن چیز ہونی چاہیئے جس سے ملکہ اور اس کے درباری حیرت زدہ رہ جائیں اور ایمان کے لئے ان کا دل نرم پڑ جائے چنانچہ آپ نے اپنے فوجیوں سے کہا، جن میں عجیب و غریب طاقت والی اور اسرار و رموز سے آگاہ مخلوقات موجود تھیں:

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۫ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (نمل: ۳۸ تا ۴۰)

(سلیمانؑ نے کہا، "اے اہلِ دربار، تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟" جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا، "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں

اور امانت دار ہوں"۔ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا:
"میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں"۔ جونہی کے سلیمانؑ
نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا۔ وہ پکار اُٹھا "یہ میرے رب کا فضل
ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں۔ اور
جو کوئی شکر کرتا ہے، اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے ورنہ کوئی
ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے"۔)
آپ نے دیکھا یہاں فضل سے مراد بلاشبہ علمی قوتیں ہیں۔ پھر اسی سورہ میں
آپ یہ آیت بھی پڑھتے ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ (نمل: ۱۵)

(اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا)
ایک دوسری سورہ میں آپ یہ آیت بھی دیکھتے ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ
وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ (سبا: ۱۰)

(ہم نے داؤد کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا (ہم نے حکم دیا کہ) اے
پہاڑو، اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا۔
ہم نے لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیا)
دیکھا آپ نے علم اور فضل دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوئے ہیں۔
پاک ہے اللہ کی ذات جس نے تمام اسرار و نوامیس کو اپنے بندوں کے لئے مسخر کر دیا
اور انہیں حکومت کی خلعت سے نوازا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (انبیاء : ۱۰۵)

(اور زبور میں نصیحت کے بعد ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے)

میرے خیال میں علم اور طبعی قوتوں کی تسخیر کی شہادت کے لئے اتنی آیات کافی ہیں ورنہ دوسری آیات میں بھی تخت سلیمان کے لئے طبعی قوانین کی تسخیر کا تذکرہ موجود ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۗ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۗ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۗ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۗ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾ (سبا: ۱۲، ۱۳)

(اور سلیمانؑ کے لئے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک ہم نے اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اس کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا، اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے۔ وہ اس کے لئے بناتے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تصویریں، بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں — اے آلِ داود

عمل کرو شکر کے طریقے پر، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں)

یہ ہے اس قصہ میں علم اور قوت کا تذکرہ، میں نے اپنی حد تک مکمل تفصیل سے کام لے کر اسے بیان کر دیا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

۲ — پیغام

حکومت کا ایک پاکیزہ پیغام اور مقدس نصب العین ہونا چاہیئے جس کے حصول کے لئے اور اس میں اپنی قوت اور علم کو لگانے کے لئے وہ جدّ و جہد کرے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ پیغام اور نصب العین کیا ہو؟ کیا اقتدار کی توسیع، مقبوضات میں اضافہ اور کمزوروں کی سرزمین پر اپنا قبضہ بڑھانے کے لئے جدّ و جہد کی جائے؟ کیا آپ کا ضمیر یہ ماننے کے لئے تیار ہے کہ یہ ڈکیتی اور فتنہ فساد ہی پاکیزہ مقصد ہے؟ علم خداوندی اس سے کہیں پرے ہے کہ ان گھٹیا چیزوں کے لئے مسخر ہو اور خدا کی شان سے یہ بعید تر ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کے لئے اتنے ناپاک مقصد اور پیغام کی منصوبہ بندی کرے۔ وہ پاکیزہ مقصد اور مقدس پیغام جس کے لئے با اخلاق اور با اصول حکومت جیتی اور جس کے حصول کے لئے جدّ و جہد کرتی ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی وحدانیت کو عام کیا جائے، اس پر ایمان لانے کے لئے تمام انسانوں کو اکٹھا کیا جائے اور اس سرزمین کو ہر قسم کی گندگی اور شرک سے پاک کر دیا جائے تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو اور اطاعت پوری کی پوری اسی کے لئے خالص ہو کر رہ جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے تمام وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ سیاسی، تشریعی اور علمی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جس سے افراد انسانیت اس مقصد کے سایہ تلے رہ سکیں، اگر یہ نظام احسن طریقے سے برپا ہو جائے تو فبہا اور اگر عام وسائل اس

کے لئے ناکافی ہوں اور قوت اور ہتھیار کا استعمال ناگزیر ہو جائے —— جو اس صورت میں بہترین طریقہ کار ہوگا —— تو اسے بھی استعمال کیا جائے اب جو شخص ہماری باتوں کو مان لے اور اللہ کی اطاعت تسلیم کر لے تو ہمارے اور اس کے حقوق و فرائض یکساں ہوں گے ورنہ اس سرزمین کو دین کے دشمنوں سے پاک کر کے دم لیں گے :

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (بقرہ : ۱۹۳)

(تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی نہیں)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

(انفال : ۳۹)

(ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ فتنہ سے باز آجائیں تو ان کے اعمال دیکھنے والا اللہ ہے)

یہ ہے وہ بلند و بالا مقصد جسے خدا پرست با اصول مملکت کا ہدف ہونا چاہیئے۔ اور اللہ نے مسلمانوں کی تعریف کی اور ان کے حق میں گواہی دی کہ وہ اسی لئے زندہ رہتے ہیں تاکہ کفر و شرک کی آلائشوں سے اس سرزمین کو پاک کر دیں اور ایمان باللہ کے ستونوں کو کھڑا کر دیں :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(آلِ عمران : ۱۱۰)

(اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

سورہ کہف میں ذوالقرنین کا تذکرہ ہے جنہیں اللہ نے اقتدار سے نواز رکھا تھا اور ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے ان کی تعریف اللہ نے اس لئے کی کہ انہوں نے اپنی طاقت برے لوگوں کو سزا دینے اور اہلِ ایمان کی ہمت افزائی اور ان کی مدد کرنے میں صرف کی :

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ۝ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝

(سورہ کہف : ۸۶ تا ۸۸)

(ہم نے کہا "اے ذوالقرنین، تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے" اس نے کہا "جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا اور جو ان میں سے

ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کے لئے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے"۔)

اور یہ سختی اپنی جگہ بہت مناسب اور موزوں ہوگی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو اس مقصد کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ قصوں میں اس نے اس کی عملی تصویر خوب کھول کھول کر اور غایت درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ قصۂ سلیمانؑ میں ہُدہُد کا یہ قول دیکھئے:

إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ۝ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝ (نمل: ۲۳، ۲۴)

(میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمراں ہے، اس کو ہر طرح کا سر و سامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے شیطان نے ان کے اعمال ان کے سامنے خوشنما بنا دیئے اور انہیں شاہراہ سے روک دیا اس وجہ سے وہ سیدھا راستہ نہیں پاتے)

عقیدہ اور عمل دونوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو مملکت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور سلطنت کا نہایت بُرا انجام ہوتا ہے اور کیا زندگی صالح عقیدہ اور عمل صالح کے بغیر بھی درست ہو سکتی ہے؟ ہُدہُد نے عقیدہ و عمل کی خرابی کا تذکرہ کرنے کے بعد اس نیک اور صالح عقیدے کا ذکر کیا جس کی خاطر افراد اور جماعتوں کو زندگی گزارنی

چاہیے۔ وہ آگے کہتا ہے:

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ (نمل: ۲۵، ۲۶)

(وہ یہ سیدھی راہ نہیں پاتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو، اللہ، کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرش عظیم کا مالک ہے)

اور ہم دیکھتے ہیں کہ خود سلیمانؑ اس مقصد کے لئے کام کرتے ہیں اور اس کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ ملکہ سبا کو جو خط لکھا اس میں آپ نے اسے اسلام کی دعوت دی:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ (نمل: ۳۰، ۳۱)

(یہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے، مضمون یہ ہے کہ "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔")

اور سلیمانؑ انہیں اسلام قبول کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس کے لئے مسلح طاقت اور فوج کی دھمکی بھی دیتے ہیں یہاں تک کہ ملکہ آخر میں پکار اٹھتی ہے:

رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾ (نمل : ۴۴)

(اے میرے رب، میں اپنے نفس پر (آج تک) بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کرلی)

میرے بھائی! کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہ پاکیزہ سلطنت اسی بلند اور ارفع نصب العین کے لئے زندہ رہی، اسی کی خاطر کام کرتی رہی؟ اور کیا خدا کے بیان کردہ اس تصویری فیچر میں یہ مقصد نہایت خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ نہیں موجود ہے؟

۳ — سربراہِ مملکت کا ایمان اور ہر چیز کی نگہداشت

اس قصہ کی تیسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ مملکت کا نظام مکمل اسی وقت ہوگا جب سربراہِ مملکت اس کے مقصد و نصب العین سے واقف ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کررہا ہو دوسری طرف وہ ہوشمند اور بیدار مغز ہو، اپنی رعیت کے چھوٹے بڑے تمام معاملات کی نگرانی کرتا ہو، ذمہ دارانِ حکومت کا سختی سے محاسبہ کرتا ہو، اگر یہ صفات اس کے اندر نہ پائی جائیں تو مملکت کی طاقت ڈھیلی پڑجائے گی اور اس کی گرہ کھل جائے گی۔

یہ حقیقت ایسی ہے جس کے قبول کرنے میں کوئی شک یا تردد نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قرآن پاک سے اس کی شہادت دینے کے لئے بہت زیادہ آیات کی ضرورت نہیں ہے البتہ قصہ سلیمانؑ کی تصویر کشی سے کچھ چیزیں اخذ کرلیتے ہیں:

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾ (نمل : ۲۰)

(سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا، "کیا بات ہے کہ میں فلاں ہدہد

کو نہیں دیکھ رہا ہوں کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟)

کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سلیمان علیہ السلام اپنی رعیت کی پوری نگرانی کرتے تھے، ان کی دیکھ ریکھ کرتے تھے نظر انداز نہیں کرتے تھے؟ جو شخص ایک پرندے کے غائب ہو جانے کی خبر رکھے، وہ بھلا اس سے بڑی اور اہم چیزوں کی خبر کیوں نہ رکھےگا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مملکت کے دُور دراز گوشوں کی رکھوالی کرتے اور اس کے تمام معاملات پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ پھر اس سے آپ کی بیدار مغزی اور شدید حس کا بھی پتہ چلتا ہے لاکھوں کے بیچ میں آپ نے یہ سوال کیا تھا کہ ہُدہُد کہاں ہے؟ اگر ناممکن نہیں تو عام انسان کے لئے یہ مشکل ضرور ہے کہ وہ لاکھوں کے مجمع میں ایک فرد کی غیر حاضری کو محسوس کرے لیکن اس طرح کی چیزیں انبیاء کے لئے بہت آسان ہوتی ہیں۔ وہ تمام چیزوں کو خدا کی طرف سے ودیعت کردہ الہامی بصیرت سے دیکھ لیتے ہیں، صرف بصارت سے کام نہیں لیتے بلکہ اس کے ساتھ بصیرت بھی کام کرتی رہتی ہے۔ وہ ہر حال میں بیدار مغزی اور ہوشمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے تاکہ ان تمام چیزوں اور مخلوقات کی نگہبانی کر سکیں جو اللہ نے انسان کے حوالے کی ہیں۔

پھر اس کے بعد دیکھئے وہ کس طرح ہُدہُد کو ڈانٹتے ہیں، اس کی غیر حاضری پر اس سے جواب طلب کرتے ہیں اور اسے سزا کی دھمکی دیتے ہیں؟ جبکہ اس بھاری بھرکم لشکر کے درمیان ہُدہُد کی قیمت ہی کیا تھی؟ اور ہُدہُد کے موجود ہونے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا اور اس کی غیر حاضری سے آپ کا کیا بال بیکا ہو سکتا تھا؟ لیکن نہیں، میرے بھائی، آپ ایک حکیم قائد تھے۔ آپ خوب سمجھتے تھے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی ایک اہمیت

ہے اور اس کی اپنی ذمہ داری ہے جسے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی سپاہی غائب ہو جائے یا بیکار بیٹھ رہے تو عمل کی ترتیب اور اس کے نظام میں خلل واقع ہوگا اور کام بگڑ جائے گا۔ اسی لئے غائب ہونے یا کوتاہی کرنے کے جرائم حساس قائد کے سینے میں کھٹکنے لگتے ہیں چنانچہ وہ اس کا سخت محاسبہ کرتا ہے اور نوبت سزا تک جا پہنچتی ہے بلکہ پھانسی اور قتل کا عذاب بھی سامنے آجاتا ہے:

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (نمل: ۲۱)

(میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی)

یہاں بہت سی مفید باتیں نکالی جا سکتی ہیں اور بہت سے نکتے سامنے لائے جا سکتے ہیں لیکن ہم یہاں اس اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان ؑ کی ہوشمندی کی مثال ہمارے لئے منتخب کی ہے تاکہ وہ ہمیں بتائے کہ جو شخص ان چھوٹے چھوٹے معاملات کا اتنا خیال رکھتا ہو، وہ بڑے اور اہم معاملات کا کتنا درجہ خیال رکھتا ہوگا اور جو معمولی غلطی پر اتنا زبردست مواخذہ کر رہا ہو وہ بڑی غلطیوں پر کتنا زبردست محاسبہ کرتا ہوگا۔

پھر آپ نے ہُدہُد کی معذرت کو سر بسر تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے تحقیق اور تفتیش کے لئے باقی رکھا:

سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (نمل: ۲۷)

(سلیمان ؑ نے کہا) ”ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے)

رہی یہ بات کہ مقصد اور نصب العین پر آپ کا ایمان کتنا مستحکم تھا، اس کے لئے کتنے سرگرم کار تھے اور مال و دولت اور دوسری چیزوں سے کتنے بیزار تھے؟ اس کا جواب قصہ کے آغاز سے لے کر آخر تک ہر جگہ ہمیں ملتا ہے۔ آپ کا مقصد محض اللہ کی رضا تھا، ہر چیز کو اللہ کے لئے مسخر کر لیا تھا، اور مال و دولت سے بے نیازی کے سلسلہ میں اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ملکہ سبا کے تحائف اور ہدایا واپس کر دیئے اور انہیں جواب دیا کہ:

أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللَّهُ خَيْرٌ مِّمَّا آتَاكُم ۚ بَلْ أَنتُم بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ ۝ ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُم بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُم بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُم مِّنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ ۝ (نمل: ۳۶، ۳۷)

(کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے)

اللہ تعالیٰ نے ذو القرنین کے بارے میں بھی اسی طرح کی باتیں نقل کی ہیں:

قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي

بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ (کہف : ۹۴، ۹۵)

(اُن لوگوں نے کہا کہ "اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لئے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟" اس نے کہا "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے، تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں")

۴ — مملکت کے نصب العین پر افراد کا مستحکم ایمان

چوتھی چیز جو اس قصہ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رعیت کے ہر فرد کا مملکت کے نصب العین پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یہ امر لازم ہے کہ اپنے آپ کو اس نصب العین کے لئے وقف کر دے۔ مملکت کے تمام مقاصد اور اس کی بلند و بالا سرگرمیاں دھری رہ جاتی ہیں اگر مملکت کے افراد اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی اور سمت میں کسی دوسری منزل کی طرف گامزن ہوں۔ اس قصہ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہدہد اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہے، اپنے مقصد پر اس کا گہرا ایمان ہے اور پورے عزم و شعور کے ساتھ سلیمانؑ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ہمیں ہدہد کے اس طرز گفتگو پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اس گفتگو میں کسی گناہ گار یا کوتاہ دست کا احساس شامل نہیں ہے بلکہ اس شخص کی طرح ہمکلام ہوتا ہے جو مطمئن ہو اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مستعد ہو۔ پھر تو اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ بڑی عظیم ہستی سے مخاطب ہے چاہے وہ جن و انس کے حکمراں سلیمانؑ ہی ہوں۔

اے لوگو! اے نوجوان بھائیو! اپنی ذمہ داریوں کو پہچانو اور اپنے نصب العین

کی راہ میں صدق دل سے آگے بڑھو اس لئے کہ جس اُمت کے افراد ہُدہُد کے برابر نہ ہوں گے وہ گرد و غبار کی طرح اُڑ جائے گی اور جس اُمت کے ہُدہُد آدمیوں سے بہتر ہوں وہ اُمت آسمان کی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔

اس کے بعد اس قصہ میں کیا بیان ہوتا ہے؟ مملکت سبا میں عقیدہ و عمل میں فساد برپا ہے جس کی وجہ سے ایسے ہی افراد تربیت پا کر نکلتے ہیں جن کے عقل ہوتی ہے نہ حمیت۔ بلقیس ملکۂ سبا انہیں اس اہم معاملہ میں مشورہ کرنے کے لئے جمع کرتی ہے تو وہ کوئی بہترین رائے نہیں دے پاتے بلکہ پکار اُٹھتے ہیں:

اَلْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝ (نمل: ۳۳)

(فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے)

خود ملکۂ سبا کوئی قطعی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اسی لئے اس نے درباریوں سے کہا تھا کہ:

مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ (نمل: ۳۲)

(میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں)

درباری کوئی ایسی رائے نہ دے سکے جسے وہ قبول کرتی۔ اس قسم کے آدمیوں کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی اور یہ خرابی محض خراب عقیدہ اور فاسد نظام عمل کی پیداوار ہے۔ اس لئے بھائیو! عقیدہ خالص کرو اور عمل پیہم میں لگ جاؤ۔

⁂ ⁂ ⁂

ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ میں چار ایسی چیزوں کا ذکر ہے جن کی بنیاد پر کوئی عظیم مملکت تعمیر ہو سکتی ہے:

۱— قوت اور علم

۲— ارفع پیغام اور بلند نصب العین

۳— صدر مملکت کا ایمان اور ہر چیز پر اس کا کڑی نظر رکھنا

۴— افراد مملکت کا اپنے نصب العین پر ایمان اور اپنے فرائض کا شدید احساس

میرے مخلص بھائی! مجھے بتایئے اگر کوئی قصہ گو ان عظیم حقائق کی تصویر کھینچنا چاہتا تو کیا وہ اتنے زور و قوت اور اس درجہ وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر سکتا؟ یا اس قدر مختصر لیکن جامع انداز میں منظر نگاری کر پاتا؟

ہم یہاں اعجاز قرآن پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ ورنہ احکامِ تعبیر، ترکیب کی مہارت اور ارشادات کی صحیح سمت پر گفتگو کرنا پڑے گی یا پھر ان معانی اور صحیح قوانین کے دوام پر کلام کرنا پڑے گا جو اس قصہ میں شامل ہیں کیونکہ یہ اعجاز قرآن کے اسرار میں شامل ہے۔ اتنی بڑی مملکت کے مکمل انتظام کی اتنی صحیح اور جامع تعبیر کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اس کا احاطہ تو بس وہی خدا کر سکتا ہے جس نے ہر چیز کی تخلیق کی ہے اور اس کا احاطہ کیا ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (ملک: ۱۴)

(کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بیں اور باخبر ہے)

کتنی سچی بات کہی ہے اللہ تعالیٰ نے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۸)

(کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مدد گار ہی کیوں نہ ہوں)

میں کہتا ہوں کہ یہاں مقصد اعجازِ قرآن کو ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ قصوں اور داستانوں کی فطرت اور ان کے مزاج کی وضاحت مقصود ہے۔ وہ باریک سے باریک معانی کو بیان کرنے اور انہیں عملی واقعات میں تصویری شکل میں پیش کرنے میں کتنے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ اس قصہ کی تحلیل و تجزیہ ہم جس قدر کر چکے ہیں وہ ہمارے مقصد کے حساب سے کافی ہے۔ اب ہم پورے قصہ پر پھر ایک نظر ڈال لیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰي وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ

الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى
الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا
اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَمَكَثَ غَيْرَ
بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ
بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِيَتْ
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ اَلَّا
يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ
مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ
تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۝ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا
اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ
اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝
قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً
اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ
شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝ قَالَتْ
اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ

اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ
بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ
سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۡ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ
اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ
فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ
اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ
يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ
مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ
وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ
الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا
رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڜ لِيَبْلُوَنِيْٓ
ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ
كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ
اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَتْ
قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝ قِيْلَ لَهَا
ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ
سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۥ قَالَتْ

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾ (نمل : ۱۵ تا ۴۴)

"ہم نے داؤد و سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ "شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اور داؤدؑ کا وارث سلیمانؑ ہوا اور اس نے کہا" لوگو، ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں، بے شک یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے۔" سلیمان کے لئے جنّ اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ یہ سب جب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا " اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔" سلیمانؑ اس بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا — "اے میرے رب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔"

(ایک اور موقع پر) سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا "کیا بات ہے کہ میں فلاں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں ؟ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہو گی۔" کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے آکر کہا:

"میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی علم لے کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اُس قوم کی حکمراں ہے۔ اُس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے، شیطان نے ان کے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے ہیں اور انہیں شاہراہ سے روک دیا ہے، اس وجہ سے وہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اُس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں، جو عرشِ عظیم کا مالک ہے۔"

سلیمانؑ نے کہا "ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔"

ملکہ بولی "اے اہلِ دربار، میری طرف ایک بڑا خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سُلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے مضمون یہ ہے کہ "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔"

(خط سُنا کر) ملکہ نے کہا "اے سردارانِ قوم، میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو، میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں۔" اُنہوں نے جواب دیا "ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں آگے فیصلہ آپ کے

ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے"۔

ملکہ نے کہا کہ "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں"۔

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمانؑ کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تمہیں مبارک رہے (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔

سلیمانؑ نے کہا "اے اہل دربار، تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں اِس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں"۔ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں"۔ جونہی کہ سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور

جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"

سلیمانؑ نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو، دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں ہے جو راہِ راست نہیں پاتے۔"

ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ کہنے لگی "یہ تو گویا وہی ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔" اس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی، کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لئے اس نے اپنے پائینچے اٹھا لئے۔ سلیمانؑ نے کہا "یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔" اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔")

پورا قصہ پڑھنے کے بعد آپ کچھ مزید حقائق کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوتے ہیں مثال کے طور پر اس میں استعمار کی حقیقت بیان کی گئی اور مستعمرین کی نقاب کشائی کی گئی ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ (نمل: ۳۴)

(بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں)

یہ ہر زمان و مکان کے سامراج کی عادت اور فطرت رہی ہے۔ اس خصلت بد سے وہ کبھی علیحدہ نہیں ہوئے۔

دوسری طرف ملکۂ سبا کی ذہانت و فطانت ملاحظہ ہو۔ وہ سامراجی ذہنیت اور کردار کا ادراک رکھتی ہے اور ان کی اس بڑی خصلت کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اسی طرح وہ سلیمانؑ کے معاملہ کو آزما کر دیکھنا چاہتی ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ انہیں مال و منال دے کر چُپ نہیں کرنا چاہتی بلکہ ان کا امتحان لینا چاہتی ہے یا وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو باج و خراج کے لئے کام کرتے ہیں یا ایمان و عقیدہ کی خاطر کام کرتے ہیں جس کی انہوں نے دعوت دی ہے، اگر ان کا تعلق اول الذکر گروہ سے ہوا تو جزیہ اور ٹیکس کی ادائیگی پر راضی ہو جائیں گے ورنہ ہدیہ لوٹا دیں گے اور تلوار کی طاقت کو ہی فیصلہ کُن سمجھیں گے۔ چنانچہ جب ملکہ پر حقیقت حال واضح ہو گئی تو یہ اس کی ذمہ داری قرار پائی کہ اس مردِ مومن سے بیعت کرنے میں تردد نہ کرے کہ حکمت کا تقاضا یہی تھا۔

اور یہی ہوا۔ ہدیہ جب سلیمانؑ نے واپس کر دیا تو وہ تاڑ گئی کہ یہاں معاملہ عقائد اور ایمان کا ہے جو داد و دہش اور مال و منال سے نہیں نبھ سکتا۔

اسی طرح اس وقت بھی اس کی ذکاوت اور ہوشیاری اجاگر ہوتی ہے جب اس کا تخت سلیمانؑ کے دربار میں پہنچ جاتا ہے۔ اس میں بہت سی کمی بیشی کے باوجود جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا آپ کا عرش بھی ایسا ہی ہے؟ تو وہ یہ نہیں کہتی کہ ہاں وہی ہے، کیونکہ اسے وہ اپنے ملک میں چھوڑ کر آئی تھی اور دور دراز مسافت تھی جسے

اتنی جلدی طے کرنا عام انسانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ نہیں، میرا تخت نہیں ہے، کیونکہ اس کے بہت سے نقوش اور خصوصیات جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ نہ اس نے یہ کہا کہ میں نہیں جانتی، کیونکہ یہ تو ذہن کی بلادت اور بیوقوفی ہوتی، چنانچہ اس مشکل مرحلے سے یہ حکیمانہ جواب دے کر نکل گئی "یہ تو گویا وہی ہے"

اس کے علاوہ اس قصہ میں اور بہت سے باریک نکات ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے ہم نظر انداز کئے دیتے ہیں۔

میرے بھائی! قرآن کے ان قصوں کو پڑھئے۔ ان کے اغراض و مقاصد اور معانی و حقائق کا مطالعہ کیجئے اور انہیں اپنی دعوت کی تبلیغ و اشاعت میں وسائل کے طور پر اختیار کیجئے کیونکہ ان قصوں سے آپ کو وہ مدد ملے گی جو دوسرے قصوں سے کبھی نہیں مل سکتی۔

نبوی قصوں کی ایک مثال

دعوت و تبلیغ کی راہ میں جن قصوں سے آپ کو مدد لینی ہے ان میں وہ قصے بھی شامل ہیں جنہیں نبی اکرم نے بیان کئے ہیں اور معانی و حقائق کی تشریح و توضیح کے لئے اگلوں کی داستانوں سے منتخب کیا ہے۔ لیکن ان قصوں کا مرتبہ قرآنی قصوں سے بعد کا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک مثال بیان کرتے ہیں۔

اللہ واحد پر ایمان یا صالح عقیدہ مندرجہ ذیل چیزوں کے بل پر زندہ رہتا اور نشوونما پاتا ہے:

۱- اس پر ثابت قدم رہا جائے اور اس راہ کی اذیتوں کو برداشت کیا جائے۔

۲- انسان جو کچھ جاہ و منصب، مال و منال رکھتا ہے انہیں اس کی راہ میں قربان کردے اور جو چیز بھی اس کے آڑے آئے اُسے چھوڑ دے۔

۳- عقیدہ کا حامل شخص اپنے عقیدہ کی نشر و اشاعت میں بہترین وسائل و ذرائع اور محکم اور نفع بخش تدابیر اختیار کرے چاہے اس کی قیمت اپنی جان کی شکل ہی میں چکانی پڑے۔

یہ ایک لطیف حقیقت ہے یا یوں کہیئے کہ زندگی کی وہ اہم ترین حقیقت ہے جس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور ان سچے حقائق میں یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کے بارے میں جان جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے مخلص ہے، اپنے ایمان میں سچا ہے تو اسے ایسے اسرار و رموز عطا کرتا ہے جو کرامات سے جا ملتے ہیں۔ یہ دو حقیقتیں ہیں بلکہ ایسے دو قوانین ہیں جن پر صحیح زندگی منطبق ہوتی ہے۔ جس نے اللہ کی دوستی اور اس کی وفاداری کا حق ادا کیا، وہ اللہ کی سُنّت پر قائم رہا اور اللہ نے اس کے پیغام کو دنیا میں بھی کامیابی سے ہمکنار کیا اور آخرت میں بھی اسے کامران کیا۔ لیکن کیا یہ حقیقت اور گفتگو مجرد اثبات و استدلال سے دلوں میں اُتر جائے گی؟ نہیں، استدلال اور اثبات کے علاوہ ایک اور چیز درکار ہے، وہ یہ کہ اُس کی تشریح کی جائے اور بہترین انداز میں اس کی تصویر کشی کی جائے۔ رسولِ اکرمؐ نے اس سلسلہ میں قصّوں سے جو وضاحت کی ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ آپ نے سابقین کے ایسے قصّے منتخب کر کے ہمیں سنائے ہیں جو اس حقیقت کی پوری تشریح اور منظر نگاری کرتے ہیں۔

امام مسلم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم لوگوں سے پہلے ایک بادشاہ تھا اور اس کے پاس ایک جادوگر رہتا تھا۔ جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس نے بادشاہ سے کہا: میں بوڑھا ہو چلا ہوں، قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہوں، ایک بچہ میرے حوالے کر دیجئے تاکہ اسے جادو سکھا سکوں۔ بادشاہ نے اس کی بات مان لی اور ایک بچہ جادو سیکھنے کے لئے اس کی خدمت میں لگا دیا۔ بچہ جب جادوگر کے پاس آتا تو اس کے راستے میں ایک راہب کا گھر پڑتا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا، اس کی باتیں سنیں اور بہت اچھی معلوم ہوئیں،

پھر تو اس کا معمول ہو گیا۔ جب بھی وہ جادوگر کے پاس جاتا راہب کے یہاں سے ہو کر گزرتا، اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھتا اور جب جادوگر کے پاس پہنچتا تو وہ اسے مارتا۔ ایک دن اس نے راہب سے اس کی شکایت کی تو اس نے یہ تدبیر بتائی کہ: جب جادوگر سے ڈر محسوس ہو تو کہہ دو کہ گھر والوں نے روک لیا تھا اور جب گھر والے پوچھیں تو کہہ دینا کہ جادوگر نے روک لیا تھا۔ اب اس بچے کا یہ معمول بن گیا۔ ایک دن راستہ میں ایک بڑے جانور سے مڈبھیڑ ہو گئی جس نے لوگوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ بچے نے سوچا: آج مجھے معلوم ہو جائے گا کہ راہب افضل ہے یا جادوگر افضل ہے؟ چنانچہ اس نے ایک پتھر اٹھالیا اور کہا: اے میرے رب! اگر راہب کا مشن جادوگر کے کام سے زیادہ تجھے محبوب ہے تو اس پتھر کے اثر سے اس جانور کو مار ڈال۔ یہ کہہ کر اس نے

پتھر پھینک مارا۔ جانور مر گیا اور لوگ آنے جانے لگے۔ وہ راہب کے پاس آیا اور ساری داستان کہہ سنائی۔ راہب نے کہا: بیٹے، تو آج مجھ سے افضل ہے، تو جتنا آگے جا چکا ہے، میں اسے دیکھ رہا ہوں، اب تیری آزمائش کا دور شروع ہونے والا ہے۔ اگر تیری آزمائش ہو تو میرا نام و نشان کسی کو نہ بتانا۔ وہ نوجوان اندھاپن، برص اور دوسرے امراض کا علاج کرتا تھا اور بہتیرے آدمیوں کو اس سے شفا مل گئی تھی۔ بادشاہ کے ایک مقرب کو جو اندھا تھا، اس کا پتہ چل گیا۔ وہ بہت سے ہدایا اور تحائف لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور گزارش کی: یہاں جو کچھ تم مال و منال دیکھ رہے ہو یہ سب تمہارا ہے بشرطیکہ تم مجھے شفا دے دو۔ نوجوان نے کہا: "میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا دینے والا تو اللہ ہے" یہ بندے کی عاجزی اور خدائے تعالیٰ کے فضل و احسان کا انتہائی اعتراف ہے اور یہ ایمان باللہ کے تقاضوں میں شامل ہے۔ پھر نوجوان —— جو مال و دولت کا حریص نہ تھا —— نے کہا: اگر تم اللہ پر ایمان لے آؤ تو میں اللہ سے دُعا کروں گا کہ وہ تجھے شفا دے دے۔ وہ مقرب مسلمان ہو گیا اور اللہ نے اسے شفا دے دی۔ دوسرے دن وہ دربار میں پہنچا اور بادشاہ کے قریب بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے حیرت سے پوچھا: کس نے تمہاری بینائی واپس کی؟ مقرب مسلمان نے کہا: میرے رب نے۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا میرے علاوہ بھی کوئی تمہارا رب ہے؟ اس نے کہا: میرا اور تمہارا رب اللہ ہے۔ بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور برابر سزائیں دیتا رہا یہاں تک کہ

مجبور ہو کر اس نے اس نوجوان کا پتہ دے دیا ——— پھر
اُس نوجوان کو بلایا گیا اور بادشاہ نے کہا: میرے بیٹے تمہاری جادوگری
اتنے عروج پر پہنچ چکی ہے کہ وہ اندھے، کوڑھی اور تمام بیماروں کو شفا دیتی
ہے۔ نوجوان نے کہا: میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا تو صرف اللہ کے
ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ نے خفا ہو کر اسے گرفتار کروا دیا اور برابر سزائیں دیتا
رہا یہاں تک کہ اسے راہب کا پتہ بتاتے ہی بن پڑی۔ چنانچہ راہب کو
بلوایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ: اپنے دین سے واپس ہو جا۔ لیکن اس نے
انکار کیا۔ بادشاہ نے ایک آری منگوائی اور اس سے اس کے سر کے
دو ٹکڑے کر دیئے "یہ عقیدہ پر ثابت قدمی اور اس کی راہ میں مصائب
جھیلنے کی بہترین مثال تھی۔" پھر بادشاہ کے مقرب کو بلوایا گیا اور اس
سے بھی مطالبہ کیا گیا کہ اپنے دین سے مرتد ہو جا۔ لیکن وہ اپنے دین پر
جما رہا چنانچہ آری سے اس کے بدن کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے گئے "یہ ثابت قدمی و
استقلال کے ساتھ عقیدہ کی راہ میں جاہ و منصب اور اس کے جلو میں
حاصل ہونے والی دولت اور اعزاز کی قربانی تھی۔" پھر نوجوان کو بلوایا گیا اور
اور اس سے بھی مرتد ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن وہ بھی اپنے مسلک پر اڑا
رہا۔ بادشاہ نے اسے اپنے چند آدمیوں کے حوالہ کر دیا کہ اسے فلاں
پہاڑ پر لے جاؤ اور اس کی چوٹی پر پہنچ کر اس سے دین سے مرتد ہونے کا
مطالبہ کرو اگر یہ تمہارا مطالبہ مان لے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے نیچے پھینک
دو۔ لوگ اسے لے کر گئے اور پہاڑ پر چڑھ گئے۔ نوجوان نے دُعا کی: اے اللہ

تو میرے لئے ان کے مقابلے میں کافی ہے، میں تیری مرضی پر راضی ہوں۔
اللہ نے پہاڑ کو ایک زبردست جھٹکا دیا اور وہ سب نیچے جا گرے۔" یہ
اللہ کے محبوب بندوں کی کرامت کا اظہار تھا۔" وہ نوجوان پھر بادشاہ کے پاس
آیا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا: تمہارے ساتھی کہاں گئے؟ اس نے کہا:
اللہ نے مجھے ان سے بچالیا۔ پھر بادشاہ نے اسے اپنے چند آدمیوں کے
حوالے کر دیا اور حکم دیا کہ اسے ایک کشتی میں سوار کر لو اور سمندر کے بیچ میں
لے جاؤ اگر یہ اپنے دین سے واپس نہ ہو تو اسے سمندر کی موجوں کے
حوالے کر دو۔ وہ لوگ اسے لے کر چلے۔ نوجوان نے پھر دُعا کی: اے اللہ
تو میرے لئے ان کے مقابلے میں کافی ہے، میں تیری مرضی پر راضی ہوں۔
چنانچہ کشتی ان سب کو لے کر ایک طرف جھک گئی اور وہ سب غرق ہو گئے۔"
یہ بھی کرامت ہے۔" نوجوان پھر بحفاظت بادشاہ کی خدمت میں پہنچا۔
بادشاہ نے پھر پوچھا: تمہارے ساتھیوں کا کیا ہوا؟ اس نے کہا: اللہ
نے مجھے ان سے بچالیا۔"

یہاں پہنچ کر اللہ نے نوجوان کو تدبیر سمجھائی تاکہ وہ تمام انسانوں کو
ایمان کی دعوت دے سکے اور انہیں ان کے شرک اور فاسد عقیدہ سے
پھیر سکے۔ یہ تدبیر ایسی تھی جس میں اس کی ہلاکت یقینی تھی لیکن وہ نوجوان اپنی
سعادت اس بات میں سمجھتا تھا کہ اپنے عقیدہ کو بہترین وسائل اختیار کر کے
پھیلائے بلکہ وہ اپنی حقیقی زندگی اور مکمل سعادت اس بات کو سمجھتا تھا کہ
وہ راہِ خدا میں کام آجائے اور اپنے آپ کو شہادت کے لئے پیش کر دے۔

کیونکہ اسے اعتماد تھا کہ اس کے پیچھے عقیدہ کو زندگی ملے گی۔ دیکھئے اس نے بادشاہ
سے کیا کہا: "تم مجھے اس وقت تک قتل نہیں کرسکتے جب تک میری بات نہ مان
لو۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ کیا؟ اس نے کہا: لوگوں کو ایک بڑے میدان
میں جمع کرو اور مجھے ایک تنے پر لٹکا دو پھر میرے ترکش سے ایک تیر نکالو
پھر تیر کو کمان پر چڑھاؤ اور بِسمِ اللّٰہِ رَبِّ الْغُلَامِ (اُس اللہ کے نام سے
جو نوجوان کا رب ہے) کہہ کر تیر چلا دو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو مجھے قتل کردو گے"
یہ ہے وہ تدبیر جو اُس نوجوان نے اختیار کی۔ اس نے سوچا کہ لوگ ایمان باللہ
کا عملی مشاہدہ کرلیں اور اس خدا کی قدرت کو دیکھ لیں جس کا نام لے کر ہی
بادشاہ اس عجیب وغریب نوجوان کو قتل کرسکا جس کو قتل کرنے کے لئے
تمام وسائل ناکام ہو چکے تھے جب لوگ اللہ کی اس قدرت کو دیکھیں گے تو
سمجھ پائیں گے کہ نوجوان کا وہ رب، جس پر وہ ایمان لایا ہے وہی اصل
رب ہے اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور یہی ہوا۔ وہ بیوقوف
بادشاہ یہ نہ سمجھ سکا کہ نوجوان کو قتل کرنے کے لئے لوگوں کا اکٹھا کرنا اس
کے مفاد میں نہیں ہے۔" چنانچہ بادشاہ نے لوگوں کو ایک میدان میں
جمع کیا۔ نوجوان کو درخت کے تنے پر لٹکا دیا۔ پھر اس کے ترکش سے ایک
تیر نکالا تیر کمان پر چڑھائی پھر کہا: اللہ کے نام سے جو نوجوان کا رب ہے۔
اور تیر چلا دی۔ تیر نوجوان کی کنپٹی میں لگی، اس نے کنپٹی پر تیر کی جگہ اپنا
ہاتھ رکھا اور اللہ کو پیارا ہو گیا اور لوگ پکار اُٹھے: ہم ایمان لائے نوجوان
کے رب پر۔ بادشاہ آیا تو اس سے کہا گیا: آپ کس چیز سے ڈرتے تھے؟

بخدا آپ کو جس چیز کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہی۔ لوگ ایمان لے آئے۔ یہ سن کر بادشاہ نے درختوں کے جھنڈ میں گڈھا کھودنے کا حکم دیا چنانچہ گہرا گڈھا کھودا گیا اور اس میں آگ روشن کی گئی اور بادشاہ نے حکم دیا: جو اپنے دین سے توبہ کرے اسے آگ میں ڈال دو۔ چنانچہ لوگوں نے حکم کی تعمیل کی یہاں تک کہ ایک عورت کی باری آئی جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا، وہ آگ میں داخل ہونے سے ہچکچانے لگی تو بچے نے کہا: اے ماں اپنے موقف پر جمی رہو کیونکہ تم حق پر ہو۔"

دیکھا آپ نے حضور اکرم ؐ نے اس قصہ کا کتنا اچھا انتخاب کیا ہے؟ اور فضائل و محاسن کی کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے! اور اس سے دلوں پر کتنے زبردست اثرات پڑتے ہیں؟

اس لئے میرے بھائی! اپنی تعلیمات کی تشریح و توضیح اور لوگوں کے دلوں میں انہیں بٹھانے کے لئے قصہ گوئی کے اسلوب کو اختیار کیجئے۔ بلکہ عملی زندگی میں اس سے لوگوں کے اندر رغبت پیدا ہوگی اور وہ میدان عمل میں ثابت قدم رہیں گے قصہ گوئی، جیساکہ آپ نے دیکھا، کتاب الٰہی میں موجود ہے اور رسول اکرم ؐ کی سُنت میں بھی یہ چیز ملتی ہے۔

فرضی قصّے

اگلوں نے دعوت و تبلیغ کے میدان میں داستان گوئی کے اس اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے قرآنی قصوں، رسول اللہ ؐ کی بیان کردہ داستانوں سے وعظ و نصیحت کا کام لیا ہے اور خود بھی ایسے قصے بنائے ہیں جن سے مقصد کو حاصل کیا جا سکے

یعنی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان کی دعوت دی جا سکے اور لوگوں کو اس پر مجتمع کیا جا سکے۔

ہم یہاں فرضی قصوں کے ذخیرہ سے ایک مثال نقل کر رہے ہیں تاکہ آپ کے لئے نمونہ کا کام دے سکے جب آپ ایسے قصّے وضع کرنے چلیں یا انہیں جمع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

ایک آدمی محض اللہ کی رضا کے لئے کام کرتا ہے اس کے نتیجے میں اللہ اس کی تائید فرماتا اور اس کو تقویت پہنچاتا ہے اور وہ اپنی راہ کی تمام رکاوٹوں پر غالب آجاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے یا مال حاصل کرنے کے لئے یا مادّی منفعت کی لالچ میں عمل کرتا ہے، ایسے شخص کو اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ اللہ اُس کی اعانت سے دست بردار ہو جاتا اور اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے اس کے نتیجے میں وہ ہر جگہ شکست کھاتا ہے۔

یہ اللہ کا قانون ہے جو اس دُنیا میں چل رہا ہے۔ جب اللہ کی فوج اس قانون کے تقاضوں پر عمل کرتی ہے تو ہر جگہ غالب اور کامیاب رہتی ہے چاہے اس کے مقابلے میں اس سرزمین کی تمام طاقتیں اُٹھ کھڑی ہوں، لیکن عقل میں یہ حقیقت کیسے اُترے؟ اور دل اس کے لئے کیسے آمادہ ہو جبکہ اس کی کوئی شکل نہ ہو جو انسانی زندگی میں ہیں اس کی اہمیت جتا سکے؟ لوگوں نے اس کے لئے ایک قصہ گھڑا اور یوں بیان کیا:

بنی اسرائیل کے کسی گاؤں میں ایک عبادت گزار صالح نوجوان رہتا تھا اور اسی گاؤں میں ایک پرانا درخت تھا جس کے بارے میں شیطان نے لوگوں کو بہکا دیا تھا کہ وہ بڑا مبارک درخت ہے اس کے عجیب وغریب اسرار ہیں۔ چنانچہ عوام اس کے بہکاوے میں آکر اس کے قریب ہونے لگے اور اسے تقدیس اور احترام کا وہ مقام دینے لگے جو

اللہ واحد کے لئے مخصوص ہے۔ نوجوان عابد اس شرک پر بڑا غضبناک ہوا اور اس درخت کو جڑ سے کاٹ ڈالنے اور لوگوں کو شیطان کی برائی سے نجات دلانے کا اس نے عزم کر لیا اوزار لئے اور اس درخت کی طرف چلا۔ ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ شیطان نے راہ روک لی اور اس سے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ نوجوان نے کہا: اس درخت کی طرف۔ پوچھا: وہاں کیا کرنا ہے؟ نوجوان عابد نے کہا: اسے کاٹنا ہے۔ شیطان نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: لوگ اس درخت کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش شروع کر دی ہے ـــــ نوجوان عابد یہاں مخلص تھا اور محض اللہ کی رضا کے لئے یہ کام کرنے جا رہا تھا اس میں اس کا کوئی دُنیوی فائدہ نہ تھا ـــــ شیطان نے کہا: تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں تم کو یہیں روک دوں گا۔ اور یہ کہہ کر اس نے عابد کا گریبان پکڑ لیا ـــ نوجوان عابد کو غصہ آیا اور اُس نے شیطان کو پکڑ کر تنکے کی طرح ہاتھوں میں اُٹھا لیا اور زمین پر پٹخ دیا پھر اس کے سینے پر کود کر چڑھ گیا اور اس کا گلا دبانے لگا یہاں تک کہ اس کا دم گھٹنے لگا اور جان پر بن آگئی۔ تب شیطان لگا چکنی چپڑی باتیں کرنے اور معذرت کرنے۔ اس سے معافی مانگی اور اپنی غلطی پر پشیمانی کا اظہار کیا اور برابر عجز و درماندگی کا مظاہرہ کرتا رہا یہاں تک کہ نوجوان عابد کو اس پر ترس آگیا اور اسے آزاد چھوڑ دیا۔ پھر شیطان نے نوجوان کی طرف دوستی کے ہاتھ بڑھائے اور اس سے کہنے لگا: میں آپ کو اس درخت کے کاٹنے سے منع نہیں کرتا، لیکن جناب، میں چاہتا ہوں کہ ایک دو دن مزید اسے چھوڑ دیں، مجھے اس سے کچھ کام ہے پھر جب میں اپنی ضرورت پوری کر لوں تو مجھے کوئی پروانہ ہوگی کہ یہ درخت باقی رہتا ہے یا کاٹ دیا جاتا ہے۔ پھر آپ کو آزادی ہوگی آپ چاہیں تو کاٹ دیں گے اور اگر چاہیں گے تو

باقی رکھیں گے۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے، میری غلطی معاف کر دی ہے اور میری زندگی واپس لوٹا دی ہے اور مجھے نئے سرے سے عمر عطا کی ہے اب اگر مزید مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں اور فضل و کرم کے ڈونگرے برسانا چاہتے ہیں تو اس درخت کو ایک یا دو دن چھوڑیں تا آنکہ میری ضرورت مکمل ہو جائے۔ اور اگر آپ پسند کریں تو اس کے بدلے میں ہر دن آپ کو ایک دینار دے دیا کروں گا۔ اس طرح شیطان برابر نرم باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ عابد اس درخت کو باقی رکھنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں سوچا: میرا کیا نقصان ہو جائے گا، اگر چند دن اور اسے رہنے دوں تا کہ کچھ دینار حاصل ہو جائیں پھر میں اسے کاٹ دوں گا؟ اور نوجوان عابد نے شیطان سے اتفاق کر لیا اور ہر ایک اپنے کام میں لگ گیا۔ اگلے دن شیطان کا قاصد آیا، دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹائی اور اس محتاج عابد کو ایک دینار دے کر چلتا بنا پھر تو اس کی بہار آ گئی، اس نے اسے اپنی ذات پر اور اپنی ماں پر خرچ کیا اور اس سے گوشت، گھی، روٹی اور میوہ خریدا، دوسرے دن قاصد دوسرا دینار دے گیا جس سے عابد نے اپنے لئے اور اپنی ماں کے لئے لباس خرید لیا، اس طرح دن گزرتے رہے، دیناروں میں اضافہ ہوتا رہا اور نوجوان عابد مادی نعمتوں میں غرق ہو گیا پھر تو اس درخت سے نظریں پھیر لیں جس کی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کی جاتی تھی۔

کسی دن شیطان کا قاصد ناغہ کر گیا اور اسے دینار بھی نہ ملا۔ نوجوان عابد دن بھر اس کا انتظار کرتا رہا لیکن اسے کچھ نہ ملا تو اس نے اپنے دل میں سوچا: ہو سکتا ہے کہ میرا دوست سفر پر چلا گیا ہو یا کسی وجہ سے اسے بھول ہو گئی ہو۔ پھر تو تیسرا اور چوتھا دن بھی بیت گیا اور نوجوان عابد طرح طرح کے حیلے اور بہانا تراشتا رہا اور اپنے

دل کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا یہاں تک انتظار کرتے کرتے اکتا گیا اور دینار و درہم کی طرف سے قطعی مایوس ہو گیا۔

تب اسے وہ درخت یاد آیا اور اسے کاٹنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ اپنے اس ساتھی کو مزہ چکھا سکے جس نے اس کا یہ اعزانیہ بند کر دیا تھا۔ اوزار اُٹھائے اور درخت کی طرف چلا۔ راستے میں شیطان سے ملاقات ہو گئی تو اس نے پوچھا: کدھر جا رہے ہو جوان؟ اس نے کہا: اس درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں جسے اللہ کو چھوڑ کر پوجا رہا ہے کیونکہ تم نے روزینہ دینار دینا بند کر دیا ہے —— یہاں پہنچ کر نوجوان کی نیت بدل گئی اور اللہ کی خاطر نہیں بلکہ دینار نہ پانے کی وجہ سے غصہ ہو کر درخت کو کاٹنے کا ارادہ کیا ہے —— شیطان نے کہا: افسوس ہے تجھ پر، تو وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا، میں تیرا راستہ روکوں گا۔ اور اس نے عابد کا گریبان پکڑ لیا، غصہ میں آ کر عابد نے شیطان کو پکڑا اور پہلے کی طرح اسے اُٹھا کر زمین پر پٹخنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا کہ یہ تو پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہے۔ پھر شیطان نے اسے تنکے کی طرح اوپر اُٹھا لیا اور زمین پر دے مارا اور اس کے سینے پر چڑھ گیا اور گلا دبانے لگا یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے لگی پھر تو عابد لگا شیطان سے منت وزاری کرنے۔ اس سے معافی مانگی اور اپنی غلطی معاف کرنے کی درخواست کی اور عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کیا اور وعدے اور قسمیں کھائیں کہ اس درخت کو اب کبھی نہ کاٹے گا اور شیطان نے اس کی عاجزی و درماندگی اور یہ وعدہ قبول کر لیا کہ اب وہ اس درخت کا رخ نہ کرے گا لیکن اس سے یہ بھی تسلیم کروالیا کہ وہ اس درخت کے بارے میں وہی کچھ کرے گا جو تمام لوگ کرتے ہیں یعنی آمادگی کے ساتھ کفر پر اُسے تیار کر لیا۔

جب عابد کی گلو خلاصی ہوئی تو شیطان کا شکریہ ادا کرنے لگا اس لئے کہ اس نے اس کی زندگی واپس کی تھی۔ پھر اس نے شیطان سے پوچھا: مجھے ایک بات پر بڑا تعجب ہے، پہلے دن تو میرے ہاتھوں میں تنکے کی طرح تھا اور میں نے تجھے چت کر دیا تھا لیکن آج تو پہاڑ سے زیادہ وزنی ہے اور میں تیرے ہاتھوں میں تنکا ہو گیا، آخر اس میں راز کیا ہے؟ شیطان نے جواب دیا: پہلے دن تیری ناراضگی خدا کے لئے تھی اس لئے خدا نے تجھے وہ قوت عطا کی جس نے مجھ جیسے شخص کو جس نے بڑے بڑے گرانڈیل اور طاقتور پچھاڑے تھے، چت کر دیا لیکن آج تیری ناراضگی دینار کے لئے ہے تو اللہ نے تیری قوت چھین لی اور تجھے آزاد چھوڑ دیا اور درہم و دینار کے حوالے کر دیا جس میں کوئی قوت و طاقت نہیں ہوتی چنانچہ میں نے تجھے شکست دے دی۔ نوجوان عابد بڑا شرمندہ ہوا اور اس نے اپنی گردن جھکالی۔

میرے بھائی! آپ نے دیکھا قرآن دعوت الی اللہ کا کام کرتا ہے اور ایسے قصے بیان کرتا ہے جو اس دعوت کی تعلیمات کو اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح رسولِ اکرمؐ اسی اسلوب کو اختیار کرتے ہیں اور اسلاف صالحین داستانوں اور قصوں کی مدد سے ان تعلیمات کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں تو آپ کو بھی اس اسلوب کو اختیار کرنا چاہیئے انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

٢ — ضرب الامثال

مَثَل اس مختصر مگر جامع اور حکیمانہ قول کو کہتے ہیں جس کے سچ ہونے میں کوئی تردد نہ ہو جسے لوگ پسند کرتے ہوں اور جو ان کے درمیان رائج اور ان کی باتوں میں

جاری وساری ہو۔

قدیم زمانے سے ہی لوگوں کی امثال سے شہادت دینا فطرت رہی ہے۔ ان میں سے کسی کو کسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا، کوئی بات بیان کرنا ہوتا یا اسے سُنانا ہوتا تھا اور اس کے مشابہ کوئی مثال ہوتی تو وہ اس سے استدلال کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے اسے رکھ دیتا اس لئے نہیں کہ اس سے کلام کی سچائی میں کوئی اضافہ ہو جاتا بلکہ اس لئے کہ لوگ مثل سے مانوس ہوتے اور اس سے وضاحت اور خوبصورتی میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ کوئی نیا مفہوم جس کے سلسلے میں کوئی قدیم مثل موجود ہو، لوگ بہت جلد اس کی روشنی میں اس مفہوم کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتے ہیں پھر اس پر اُس کا انطباق کر لیتے ہیں اور جس صورتِ حال کی حکایت کی جارہی ہو وہ سامعین کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور وہ اس سے مطمئن ہوجاتے اور اسے قبول کر لیتے ہیں اور اسی کو ضرب المثل کہا جاتا ہے۔

میرے بھائی! ہم آپ کو وصیت کرتے ہیں کہ اپنی دعوت سے لوگوں کو متعارف کرانے کے لئے ضرب الامثال کا خوب استعمال کیجئے۔ عوامی مثالوں کو سامنے رکھئے اور انہیں وہ شاہ کلید بنالیجئے جس سے دلوں کے تمام بند دروازے کھل جائیں اور آپ کی دعوت کو وہاں خوش آمدید کہا جاسکے۔

مثال کے طور پر لوگوں سے یہ نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور جس قدر ان کے بس میں ہو احکامِ الٰہی کی اطاعت کریں۔ غلو اور افراط سے اپنے آپ کو تنگی میں نہ ڈالیں۔ آپ انہیں بتائیں کہ یہی وہ محفوظ طبعی طریقہ ہے جس سے وہ اپنی منزل کو پہنچ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر نفل روزوں میں اگر وہ غلو سے

کام لینے لگیں اور اللہ نے جن پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے انہیں تقشف کے جوش میں چھوڑ دیں، تہجد، شب بیداری اور استغفار میں دن رات لگے رہیں تو اس سے دل میں اُکتاہٹ پیدا ہو جائے گی اور ردِ عمل کے طور پر وہ اللہ سے یکسر دُور کر دے گی یا انسان ان چیزوں میں غلو کرنے سے مختلف امراض کا شکار ہو جائے گا جو اس کے بدن کو کمزور کر دیں گے اور نتیجہ کے طور پر اسے عبادت سے روک دیں گے اور اس کی لذت سے اسے محروم کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اعتدال و توازن سے کام لے تو نہ اسے اکتاہٹ ہوگی نہ عبادت کا یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ اس گفتگو کے وقت اگر آپ عوام میں رائج اس مثل کو دُہرا دیں تو ان کی خوشی کا کیا عالم ہوگا کہ:

کِشْکَارٌ دَائِمٌ وَلَا عَلَامَةٌ مَقْطُوعَةٌ

(جو کی روٹی جو ہمیشہ ملتی رہے وہ اس باریک آٹے والی چپاتی سے بہتر ہے جو ناغہ کر کے ملے)

یہ عربی مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب یہ کہنا ہو کہ تھوڑی چیز جو ہمیشہ ملتی رہے اس کثیر مقدار سے بہتر ہے جو کبھی کبھی دستیاب ہو۔ آپ اسی مثل کو استعمال کر کے تھوڑی عبادت جو پابندی سے انجام دی جائے، اسے جو کی روٹی کے مشابہ قرار دیں گے اور بکثرت نفل عبادات جن کا سلسلہ برابر باقی نہ رہے انہیں اس چپاتی کے مماثل قرار دیں گے جو ناغہ کر کے ملے۔

ضربُ المثل جدّت اور چستی پیدا کرتا ہے

ضرب المثل نام ہے اس بات کا کہ ایک حالت کی تشبیہ کسی ایسی چیز سے دی جائے

جو مشابہت میں اس سے بہت قریب ہو اور بہت زیادہ مماثل ہو۔ اور یہ تشبیہ دل و دماغ میں التفات اور توجہ کی تحریک پیدا کرتی ہے اس سے انسان ایک نئی بات سے مانوس مثل کی صورت کی طرف متوجہ ہوتا اور ان دونوں کے درمیان مشابہت اور مطابقت تلاش کرتا ہے اور پل بھر میں وہ بات سمجھ لیتا ہے مزید کسی وضاحت یا تشریح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسری اور تحریکات کی طرح اسی ماہرانہ نفسی تحریک کا بھی بہت اثر پڑتا ہے اس سے دلوں میں ایک بیداری اور ذہنوں میں جدت اور چستی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ امثال کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دلوں کو موہ لیتے ہیں، سیدھے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں اور ان کی لطافت اور تراوٹ کبھی ماند نہیں ہوتی" اور اس کے اثرات کا اندازہ سامعین کے چہروں، ان کی نظر اور پیشانی کی چمک سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اور کم از کم یہ تو دیکھا ہی جاسکتا ہے کہ انہیں سامنے رکھ دینے سے سامعین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔

ابن المقفع کہتا ہے:

"اگر کلام امثال کے ذریعہ ہو تو گفتگو پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور مختلف قسم کی باتوں کی گنجائش اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔"

ابراہیم نظام کہتے ہیں:

"امثال میں چار خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو کسی اور کلام میں نہیں پائی جاتیں: ۱۔ مختصر الفاظ ۲۔ صحیح مفہوم ۳۔ عمدہ تشبیہ ۴۔ بہترین کنایہ"

امثال کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم داعیانِ دین کو اس پر زور دیتے ہیں کہ وہ انہیں

استعمال کریں۔ بلکہ یہ اس کا استعمال اس داعیٔ دین کے لئے ضروری سمجھتے ہیں جو لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اپنی دعوت کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہو اور اس کے لئے اس راہ کو پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر کرنا چاہتا ہو۔

ضربُ الامثال کی قسمیں

۱۔ اَلْعِقْدُ الْفَرِیْدُ کے مصنف نے اکثم بن صیفی سے مروی امثال کے باب میں یہ مثل بھی نقل کی ہے "لِکُلِّ نَبَاءٍ مُّسْتَقَرٌّ" ، (ہر خبر کے لئے ایک جائے قرار ہے) اگر یہ صحیح ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں استعمال کیا ہے۔

یہاں ایک اخوانی بھائی نے سوال کر دیا[1]: کیا جاہلی کلام قرآن میں شامل ہو سکتا ہے؟ اس کے دوست نے جواب دیا: یہ ایک مثل ہے اور ہر مثل حکمت ہے اور حکمت مومن کی متاع گمشدہ ہے وہ اسے جہاں پائے سب سے زیادہ خود اس کا حقدار ہے۔ اور یہ حکمت کے خلاف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جاہلی حکیم کی زبان کو استعمال کر لیا۔ اللہ نے اپنے بعض بندوں سے ایسی باتیں کہلوا دی ہیں جو انبیاء کے لئے مخصوص ہوتی ہیں پھر وحی آئی تو اس نے بھی ان تعلیمات کو پیش کیا۔

خود رسول اکرمؐ اپنی احادیث میں مروی امثال بیان کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔

۲۔ قرآن پاک اور احادیثِ رسولؐ کی عبارتوں میں امثال کی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں

---

[1] واضح رہے کہ یہ کتاب ان لیکچرس پر مشتمل ہے جو اخوان کے حلقوں میں دیئے گئے۔

چنانچہ وہ لوگوں کی زبان پر جاری ہوگئیں اور اس سے امثال کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور تقدس حاصل ہوگیا مثال کے طور پر:

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (مومنون: ۵۳)

(ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے)

اور بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا (یوسف: ۶۵)

(ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے)

اور مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (حٰمٓ السجدہ: ۴۶)

(جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لئے اچھا کرے گا)

علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں بہتیری قرآنی عبارتیں نقل کی ہیں جو آج ضرب الامثال بن چکی ہیں جو شخص ان کی ضرورت محسوس کرے وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے۔

احادیث کے بے شمار فقرے ضرب المثل بن چکے ہیں مثال کے طور پر:

لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ

(مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا)

اور إِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا أَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا أَبْقَى

یعنی جو مسافر اپنی سواری کی طاقت سے بڑھ کر اس پر سفر کرتا ہے وہ سختی و تندی کی وجہ سے اپنی سواری کو ہلاک کر دیتا ہے اور وہ راستے ہی میں رہ جاتا ہے۔ اس طرح سے اسے دو خسارے برداشت کرنا پڑتے ہیں نہ تو وہ مسافت طے کر پاتا ہے نہ اپنی سواری ہی زندہ و سلامت رکھ پاتا ہے۔ یہ بات آپؐ نے اس شخص سے کہی تھی جو عبادت میں

اتنا زیادہ مشغول رہتا تھا کہ اس کی وجہ سے اپنی دونوں آنکھیں گنوا بیٹھا تھا۔

۳۔ امثال کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کوئی باریک اور مخفی چیز ہو یا اس کے کسی گوشہ پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہو اور اسے کسی ایسی حسّی چیز سے تشبیہ دی جائے جس سے لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں متعارف ہوں۔ ضرب المثل کی یہ قسم قرآن کریم اور سُنّتِ رسولؐ میں بکثرت استعمال ہوئی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ (رعد: ۱۷)

(اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے)

یہ منظر ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے، زمین کی وادیاں سیراب ہوتی ہیں، ہر وادی میں اس کی صلاحیت کے مطابق پانی جمع ہو جاتا ہے اور سیلاب کے اوپر بہت زیادہ جھاگ جم جاتی ہے لیکن اس منظر نگاری کا مقصد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ محض ظاہری معنیٰ کی وضاحت کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اسی آیت کے آخر میں وہ کہتا ہے:

كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ (رعد: ۱۷)

(اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملہ کو واضح کرتا ہے)

اور كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۝ (رعد: ۱۷)

(اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے)

سوال یہ ہے کہ یہاں کس چیز کی مثال بیان کی جارہی ہے؟

صحیحین کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ نے مجھے جس ہدایت اور علم سے نوازا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش ہو جسے زمین کا ایک حصہ پوری طرح جذب کرلے ..... الخ

رسول پاک ؐ کی احادیث سے ہمیں قرآن پاک کی تفسیر کو سمجھنا چاہیئے۔ یہاں اس حدیث میں آپؐ جس ہدایت اور علم سے نوازے گئے اس کی مثال بارش سے دیتے ہیں۔ اور ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اس تفسیر نبوی کی روشنی میں قرآنی آیت یا مثل کو چار چیزوں پر مشتمل سمجھیں:

۱۔ ہمارے پاس اللہ کی جانب سے علم اور ہدایت نازل ہوئی ہے جس کی مثال مبارک بارش کی ہے۔

۲۔ جن لوگوں کے پاس یہ ہدایت آئی ہے ان کی مثال اس سرزمین کی ہے جس پر بارش ہوتی ہے۔

۳۔ یہ الہامی ہدایت انسانوں کے دلوں میں اور ان کے ظاہری اعمال پر حاوی ہے جس طرح بارش کا پانی زمین کی وادیوں اور اس کی گہرائیوں میں بہتا ہے۔ اور انسانی دل ودماغ اپنی تنگی و فراخی کے لحاظ سے اللہ کی ہدایت اور اس کے علم کو قبول کرتے یا ٹھکرادیتے ہیں جس طرح زمین کا ہر حصہ اپنی تنگی یا کشادگی کے لحاظ سے بارش کی ایک مقدار روک لیتا ہے یا بہہ جانے دیتا ہے۔

۴۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اس مثل کا سب سے سبق آموز پہلو نہیں ہے بلکہ سب سے قابلِ عبرت وہ چیز ہے جس کا ذکر اللہ نے اپنے اس قول میں کیا ہے:

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط

(پھر جب سیلاب اُٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے)

زبد اس جھاگ کو کہتے ہیں جو پانی کی سطح پر بہتا رہتا ہے جو کسی کام کا نہیں ہوتا البتہ جو چیز لوگوں کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے وہ تہ میں برقرار رہتی ہے یعنی پانی۔ یہاں حق اور باطل کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ باطل اپنے بے وقعت، غیر نفع بخش اور سریع الفنا ہونے میں جھاگ کی مانند ہے جبکہ حق اپنے نفع بخش، پائدار اور مستحکم ہونے میں پانی کی طرح ہے جس کے بغیر دریاؤں اور سمندروں میں کوئی زندگی نہیں رہ سکتی:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ط فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝ (رعد: ۱۷)

(اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے)

یہ اس مثل کے عناصر ہیں، آپ ان کی مزید تشریح بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان عناصر کے بنیادی اُصولوں سے باہر نہ ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ جب اللہ عزّ وجلّ نے آسمان سے پانی اُتارا اور اس کائنات میں اس سے ہر چیز کو زندگی عطا کی تو اس کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہوا کہ روحانی زندگی کی حیات اور اُس کی بقاء اور نشوونما کا بھی انتظام کرے۔

میرے بھائی! ہر انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک تو اس کا ظاہری جسم ہے

دوسرا باطنی وجود ہے اس لئے حکمت یہ نہیں ہے اور نظامِ تخلیق سے ہم آہنگ بھی نہیں ہے کہ جسموں کی حیات اور ان کی نشوونما کا تو انتظام کرے لیکن اس کائنات میں روح کے معاملہ کو یونہی چھوڑ دے۔ اللہ کی ذات سے اس درجہ لاپرواہی بعید ہے۔ یہ گفتگو جو آغاز کے طور پر ہوئی اور جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے، ان ملحدین کے شبہات کو دُور کر دیتی ہے جو نبوت کا انکار کرتے ہیں اور آسمان سے کسی پیغام کے نزول کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔

یہ چیز جسے اللہ نے دلوں اور روحوں کے لئے نازل کیا ہے اس چیز کے بالمقابل ہے جسے جسموں کے لئے نازل کیا ہے، اور وحی ہے جس کا سلسلہ آدم سے شروع ہو کر حضرت محمدؐ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وحی دلوں کی رُوح ہے، ان کی زندگی کا راز ہے، اگر دل اس وحی کا لبادہ اوڑھ لے تو زندہ اور روشن اور ضوفشاں رہتا ہے اور یہ دلوں کے لئے وہی کام کرتی ہے جو پانی اجسام کے لئے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (شوریٰ: ۵۲)

(اسی طرح (اے نبیؐ)، ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح تمہاری طرف وحی کی ہے تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے مگر اس رُوح کو ہم نے روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں جسے ہم چاہتے ہیں)

اس کلام سے بہت سے اسرار و رموز کے پردے اُٹھتے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے پانی کو دیکھتے ہیں اور تجربہ و مشاہدہ سے انسانی زندگی، حیوانی زندگی اور نباتاتی زندگی

پر اس کے اثرات کو جانتے ہیں۔ لیکن جو چیز اللہ نے دلوں اور روحوں کی زندگی کے لئے نازل کی ہے وہ کیا ہے؟ ہم اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، نہ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو سکتے ہیں بلکہ ہم اس کی کوئی شکل یا کیفیت بھی نہیں تصور کر پاتے۔

چونکہ یہ غموض اور پوشیدگی ثابت شدہ ہے اس لئے اسے نمایاں کرنے کی کوشش بھی بیکار ہے کیونکہ یہ انسان کے بس میں نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں اسے رُوح کہا ہے اور کائنات کے اجسام میں دوڑنے والی یا وحی کے اندر مضمر روح کی حقیقت سے پردہ اٹھانا ناممکن ہے۔ اسی پوشیدگی اور غموض کی تو اللہ نے مثل بیان کی ہے اور اسے زمین، بارش اور نباتات اور ثمرات کی محسوس مثالوں سے ہمارے سامنے رکھا ہے تاکہ ہم اپنے حواس سے اس کا ادراک کر سکیں۔ اگر ہمارے حواس اور ہماری مُدرکانہ قوتیں اس چیز کا ادراک کر سکتیں تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف اشارہ ضرور کرتا یا اسے عام انداز میں ہمارے سامنے بیان کرتا جس کے الفاظ میں کوئی مجاز یا تمثیل نہ ہوتی۔

یہ راز میرے بھائی، وہ کلام نہیں ہے جو آپ قرآن پاک میں پڑھتے ہیں بلکہ اس کلام کے اندر چھپی ہوئی رُوح ہے جسے کوئی ادراک نہیں کر سکتا۔

۲- یہ تو پہلے عنصر کے سلسلہ میں چند مجمل باتیں تھیں، اب دوسرے عنصر پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں:

دلوں کی زندگی ہدایتِ الٰہی ہی میں ہے، اس کے بغیر ان کی زندگی کا کوئی تصور نہیں جس طرح زمین کی زندگی اور اس کی شادابی آسمان سے نازل شدہ پانی پر منحصر ہے پانی کے علاوہ کسی اور چیز سے زمین کا زندہ و شاداب رہنا ناممکن ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ سونا، چاندی، ہوا، آگ اور کسی اور چیز سے اس کے اندر زندگی آجائے یہ خاصیت

صرف پانی میں ہے۔ جو لوگ اپنے دلوں کو الہامی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر خود ساختہ اصولوں یا رُوح سے خالی علوم و فنون کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہتے ہیں یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مال و متاع کی کثرت دلوں کو زندہ رکھتی ہے وہ وہم میں مبتلا ہیں بلکہ موت کی وادیوں کا سفر کر رہے ہیں کیونکہ یہ جن چیزوں کی خواہش کر رہے ہیں انہی میں دلوں کی موت ہے اور جس چیز سے بے نیازی برت رہے ہیں اسی میں زندگی ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (انعام: ۱۲۲)

(کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لئے تو اس طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں)

اور یہ برباد اور تباہ لوگ مردہ ہی رہیں گے، زندگی کے قریب نہیں پھٹک سکتے جب تک یہ زندگی کے حقیقی سرچشمے سے دُور رہیں گے جیسے زمین مُردہ پڑی رہتی ہے یہاں تک کہ اللہ کی رحمت بارش لے کر آتی ہے تو وہی زمین مردہ لہلہا اٹھتی ہے اور اس کے ظاہر و باطن میں زندگی اور روئیدگی کے اثرات اور برکتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو آواز دے رہا ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ

بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (حدید: ۱۷)

(خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھادی ہیں، شاید کہ تم عقل سے کام لو)

یہاں زمین سے مُراد دلوں کی زمین ہے کیونکہ اس آیت سے فوراً پہلے اللہ نے ایمان واسلام اور دلوں میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کے سلسلے میں گفتگو کی ہے فرمایا ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (حدید: ۱۶)

(کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جُھکیں اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت اُن پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں)

ہم اس مفہوم کو قرآن کریم کی ان بکثرت آیات سے ثابت کر سکتے ہیں جن میں زمین کو بارش کے ذریعہ زندہ کرنے پر گفتگو ہے۔ اس آیت کے پہلے یا بعد میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دلوں کی زندگی اور ان کی پاکیزگی اور نبوت اور کتاب کے نزول پر بات ہو رہی ہے لیکن طوالت کے خوف سے اس استدلال کو نظر انداز کرتے ہیں۔

یہ زندگی کوئی حیوانی طاقت نہیں ہے جو ہمارے اعضاء وجوارح میں دوڑ رہی ہو اور اس سے ہم حرکت کر رہے ہوں جیسے تمام حیوانات حرکت کرتے ہیں بلکہ اس زندگی سے مراد وہ روحانی طاقت ہے جو ہمارے اندرون میں روحانی وجود میں جاری وساری ہے جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔

اور اس طاقت کا تعلق حیوانی طاقتوں کی طرح کھانے اور پینے سے نہیں ہے بلکہ اللہ کی نازل کردہ وحی اور پیغام میں پوشیدہ وہ خفیہ سیال ہیں جو اس روحانی وجود میں سرایت کرتے ہیں تو اس میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے اور زندگی حلول کرجاتی ہے ورنہ یہ وجود ایک بے جان چھلکا ہے جس میں کوئی زندگی نہیں ہوتی چاہے اس شخص کی ظاہری حالت میں آپ کو کتنی ہی طاقت اور تازگی محسوس ہو۔

یہاں ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی جب اس روحانی وجود میں حلول کرے گی تو اس کی علامت کیا ہوگی ؟ پانی جب زمین سے ملتا ہے اور اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے تو اس کے محسوس اثرات کا مشاہدہ ہم کھیتی اور پھل پھول میں کرتے ہیں تو کیا اس زندگی — جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں — کی ظاہری علامات نہیں ہیں جن کو دیکھ کر اس کی زندگی کا احساس کیا جا سکے ؟

کیوں نہیں، اس کی بہت سی علامتیں ہیں جو قرآن کریم اور سنت رسول میں ملتی ہیں۔ اور یہ علامت عبارت ہے ایسے جذبات ووجدانات کے مجموعہ سے جو اس سے پہلے اس کے اندر ناپید تھے۔ ہم یہاں مثال کے طور پر چند چیزوں کا تذکرہ کریں گے :

۱— اس زندگی کی ایک علامت یہ ہے کہ آدمی اپنے دنیوی حصے پر اطمینان اور انشراح کا احساس کرتا ہے۔ اور اس انشراح اور اطمینان کا انحصار کم یا بیش مادی فوائد

پر نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ راز ہے جو آدمی کے وجدان کے اندر پھوٹتا ہے جس کا کوئی تعلق اس عالمِ کمیات سے نہیں ہوتا جسے حیز احاطہ کئے ہوئے ہوتا ہے یا مادی فوائد جس کی شماری کرتے ہیں یا وزن اور پیمانہ جس کی قدر و قیمت ٹھہراتے ہیں۔ یہ شخص ان تمام اسباب و وسائل سے بے نیاز خوش اور اپنے دنیوی نصیبے پر صابر و شاکر ہوتا ہے۔

۲۔ کارگاہِ حیات میں جو ذمہ داریاں ادا کرتا ہے اور جو کچھ دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت کرتا ہے اسے بہت معمولی اور آسان سمجھتا ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝

(طلاق : ۴)

(جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملے میں سہولت پیدا کر دیتا ہے)

کیونکہ وہ ان ذمہ داریوں کو محض حیوانی طاقت کے ذریعہ انجام نہیں دیتا بلکہ اس رُوحانی قوت سے بھی استفادہ کرتا ہے جو اس کے وجود میں حیوانی طاقت ہی کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔

۳۔ مال و دولت، جاہ و منصب، محنت و پیشہ اور وطن و ملک کے تمام اجتماعی نظریات اور امتیازات اس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہر رنگ و نسل کے انسان کو وحدت کی لڑی میں پرویا ہوا دیکھتا ہے جن کے حقوق اور اجتماعی فرائض بالکل یکساں اور برابر ہوتے ہیں۔

۴۔ وہ اپنے دل میں برائی کی تمام شکلوں سے نفرت کرتا اور انہیں مردود سمجھتا ہے اور برائی کرنے والوں کو حد درجہ حقیر گردانتا ہے اسی طرح بھلائی اور اچھائی کی

تمام شکلوں کو پسند کرتا اور بھلائی کا کام کرنے والوں سے محبت کرتا اور ان کی طرف کشش اور لپک محسوس کرتا ہے چاہے وہ دُنیا کے کسی خطے میں رہتے ہوں۔

۵۔ ہر انسان کا نفس مختلف قسم کی خواہشات اور رغبتیں رکھتا ہے، کھانا کپڑا، شاندار مکانات، بہترین فرش اور قیمتی سامان، خوش حالی اور عیش کوشی کے اسباب و وسائل، جاہ و منصب اور مال و دولت کی حرص، بچوں بیویوں اور خاندان سے محبت وغیرہ ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس کی طرف قرآن کریم بھی اشارہ کرتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (آل عمران: ۱۴)

(لوگوں کے لئے مرغوبات نفس — عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں — بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دُنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہترین ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے)

یہ ہے انسان کی فطرت، اس کی خواہش اور چاہت، اُس وقت ان چیزوں کے بارے میں انسان کا رویہ کیا ہو گا جب اس کے اندر اس زندگی کا راز حلول کر جائے جس کی بابت ہم گفتگو کر رہے ہیں؟ جب ایک انسان زندگی کا یہ راز پا لے گا تو ان

چیزوں کی طرف آسودگی اور اطمینان کی نظر ڈالے گا۔ وہ جب کھانے پینے کی طرف جدّوجہد کرے گا تو حریص اور لالچی کی طرح نہیں بلکہ بس اتنا ہی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جو اس کی روزی روٹی کے لئے کافی ہو، لذت اور عیش کوشی کی خواہش اسے پریشان نہیں کرے گی۔ اور جب لباس پہنے گا تو بدن کو چھپانے کے لئے، اس لئے نہیں کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں اور جب ان خواہشات کی تکمیل میں مصروف ہوگا جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات میں اشارہ کیا ہے تو ان چیزوں پر آسودگی کی نگاہ ڈالے گا جسے آپ زہد وقناعت کہہ سکتے ہیں یا بے نیازی و برتری کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے لیجئے بہر حال یہ بات آپ کے ذہن سے غائب نہ ہو کہ یہ ایک ایسی حالت ہے جو اس آسودگی اور اطمینان کے مشابہ ہے جو وجدان پر طاری ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس زندگی کی یہاں بات ہو رہی ہے اور جو انسان کے روحانی وجود میں سرایت کر جاتی ہے، وہ انسان کے سامنے خوشی، لذت، مسرت، نعمت اور آسودگی کے ایسے حالات اور ماحول لاتی ہے جو انسان کے لئے کافی اطمینان بخش ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ زندگی حیوانی زندگی کی تمام لطف اندوزیوں، اس کی تمام خواہشات اور حقیر و کمتر رغبات کو رخصت کر دیتی ہے اور انسان کا وجدان اس خوبصورت اور آسودہ صورت حال میں مشغول ہو جاتا ہے جس کے لئے عالمِ غیب کی مدد کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی صورت حال کے بارے میں

امام ابن تیمیہؒ نے کہا تھا:

"مجھ پر کچھ اوقات ایسے گزرتے ہیں جن پر میرا دل خوشی سے ناچنے لگتا ہے —— اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت جس صورتِ حال سے میں ہمکنار ہوتا ہوں اگر اہلِ جنت اسی صورتِ حال سے ہمکنار ہوں گے تو

ان کی زندگی بڑے مزے کی ہوگی۔"

۶ — میں نے آپ کے سامنے ان پانچ کیفیتوں کا ذکر کیا ہے جن سے انسان اس وقت ہمکنار ہوتا ہے جب اس کے روحانی وجود میں روحانی زندگی داخل ہوجاتی ہے۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ: اس زندگی کی سب سے نمایاں علامت یہ ہے کہ انسان اس زندگی کی بدولت اپنی خاص و عام سیرت میں ان کیفیات اور احساسات کی عملی تفسیر بن جاتا ہے۔ دل میں پرورش پانے والا یہ پودا اعمال و افعال کی دُنیا میں برگ و بار لاتا ہے، معاملات و مشاہدات میں اپنے ثمرات و اثرات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پھر تو انسان واقعات کی دُنیا میں زندہ و متحرک ہوجاتا ہے، رزم گاہ حیات میں بہترین مثال قائم کرتا ہے اور مختلف دلوں اور دماغوں پر اپنے گہرے اثرات قائم کرتا ہے۔ وہ ان تمام صورتوں اور حالات میں منافقت نہیں کرتا، نمود و نمائش کا مظاہرہ نہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ قول و فعل میں تضاد اور نفاق نہیں کر سکتا اور نہ دکھاوے کے لئے کام کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ وجدانی راز کا اثر پذیر ہے جو اسے قابو میں رکھتا اور مہمیز کرتا ہے۔ اس وجدان کے ساتھ اس کا معاملہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اٹھے، حرکت میں آئے اور عمل کرے مکمل طور پر راضی برضا ہو اور غایت درجہ کے سرور اور اطمینان سے سرشار ہو۔

یہاں زندگی معاملات دُنیا سے الگ تھلگ رہنے اور اسے شیاطین انس کے حوالے کردینے کا نام نہیں ہے نہ زندگی ان شہوات کی غلامی کا نام ہے جو انسان کے ہیولے کو اِدھر اُدھر بھٹکاتی پھرے، آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کرتی رہے اور ایک دوسرے پر دست درازی کراتی رہے، نہ زندگی ان بیکار اور ناکارہ

جسموں میں ہوتی ہے جو حریر و دیباج پہنتی اور مرغ و ماہی کے نوالے نگلتی ہیں بلکہ یہاں زندگی سے مراد ان پاکیزہ اور محترم نفوس کی زندگی ہے جو اللہ کے اذن سے بڑھتی ہیں بلکہ اس خفیہ وجود کی زندگی مراد ہے جو زندہ رہتا اور ترقی کرتا ہے اور دلوں کے پوشیدہ حصوں میں پروان چڑھتا ہے جسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں اور یہ زندہ وجود افراد اور قوموں کی زندگی میں سب کچھ ہوتا ہے ۔ یہی انسان کے اندر علم کا خزانہ ہوتا ہے اور حیات و قوت کا سرچشمہ ہوتا ہے، عزت و کرامت اور آزادی و حریت کا منبع ہوتا ہے اور ہر بہترین اخلاق اور اعلیٰ قدر کا مصدر ہوتا ہے اور اس وجود میں زندگی صرف اس ہدایت اور علم سے آسکتی ہے جو اللہ نے نازل کی ہے۔

یہ مبارک باطنی زندہ وجود ہی وہ پاکیزہ کھیتی ہے جو ہماری بشریت کی سرزمین میں اُگتی اور پروان چڑھتی ہے اور اسے سیراب زندگی کے وہ اسرار و رموز کرتے ہیں جو اللہ نے قرآن کریم میں نازل کیے ہیں ۔ اور یہ زندہ وجود وہی ہے جو رسول اللہ کی نگرانی میں صحابہ کرامؓ کی انسانی زندگی میں اُگا اور برگ و بار لایا ۔ جسے وحی الٰہی سے سیراب کیا گیا تو وہی مردہ وجود لہلہا اٹھا اور برگ و بار لانے لگا ۔ اس باطنی وجود کے اندر طاقت آتی گئی، سختی اور استحکام بڑھتا گیا یہاں تک وہ میٹھے پھل دینے لگا اور اللہ نے اس کی تعریف یوں کی :

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (فتح : ۲۹)

(گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی، کاشت کرنے والوں کو وہ خوش

کرتی ہے)

یہ ہے وہ زندگی جو مطلوب ہے۔ یورپ اور امریکہ کی زندگی نہیں، جس کے لئے جاہل و نادان ہر جگہ رال ٹپکاتے پھرتے ہیں۔

ان کافر و ملحد اور سرکش ملکوں میں درحقیقت انسان نہیں رہتے، سرکش شیطان رہتے ہیں جنہوں نے خانہ خالی پر ڈیرہ جما رکھا ہے۔ شکل و صورت تو انسانوں کی سی ہے لیکن اندر شیطان اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے جو انہیں ہر وادی میں شر پھیلانے کے لئے متحرک رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ تخریب و فساد پر تلے ہوئے ہیں۔ تعمیر کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تخریب کیا جائے، ایجادات واکتشافات ہلاکت و بربادی کے لئے استعمال ہو رہی ہیں، ہتھیاروں کا ذخیرہ صرف اس لئے کر رہے ہیں تاکہ کمزوروں کا گلا دبا سکیں، ان کے یہاں مال و دولت کی فراوانی اس لئے ہو رہی ہے تاکہ زمین میں فتنہ و فساد مچائیں اور ان چیزوں کا زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

⁘ ⁘ ⁘

۳ — عنصر ثالث کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وادیاں تنگ بھی ہوتی ہیں اور کشادہ بھی۔ جو سب سے زیادہ کشادہ ہوتی ہے وہی سب سے زیادہ پانی بھی جمع کرتی ہے۔ اور سب سے زیادہ اہمیت اسی وادی کی ہوتی ہے جو زیادہ سمائی رکھتی ہو، خوب گہری ہو، کشادہ ہو اور زمین کو پانی سے سیراب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے دونوں جانب پھلوں اور درختوں کی کثرت ہو گی، اس کے ارد گرد کھیتوں اور باغات کا پھیلاؤ ہو گا اور لوگوں کے

دل اس کی طرف کھنچیں گے۔

یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ اللہ کے پیغام کو قبول کرنے میں ان میں بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پیام الٰہی سے لبالب بھر جاتے ہیں، خوب ذخیرہ کرتے ہیں اور خلق کثیر کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور کچھ لوگ اس پیغام کو قبول کرتے ہیں یا پہلے طبقہ کی طرح وہ سمائی نہیں رکھتے جو ان کے پاس ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر ان کی اہمیت اور قدر و منزلت میں بھی فرق واقع ہو جاتا ہے چنانچہ سب سے زیادہ اہمیت اس شخص کی ہوتی ہے جو اللہ کی تعلیمات کو سب سے زیادہ محفوظ کرے اور خلق خدا کو اس سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں تقویٰ کا درخت جنم لیتا ہے اور ارد گرد کے ماحول کو ہدایت اور خیر سے نوازنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے طریقہ کار کو اختیار کرنے اور اس کی پیروی کرنے کے لئے لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیروکاروں کی کثرت پر خوش ہوتے اور ان پر فخر کرتے تھے اور ان کی تعداد مسلسل بڑھانے پر ابھارتے رہتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر وادی کی محدود طاقت ہوتی ہے جس کے حساب سے وہ پانی اکٹھا کرتی ہے۔ اگر پانی اس کی وسعت اور صلاحیت سے زیادہ ہو جائے تو سیلاب آجاتا ہے اور تباہی و بربادی اور جان و مال کا اتلاف ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر انسان کی صلاحیت اور طاقت محدود ہوتی ہے اور اسی محدود طاقت کے اندر رہ کر وہ ہدایت و علم کو قبول کرتا ہے اگر آدمی اپنی طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھانے کی کوشش کرے تو اکتاہٹ اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے، اللہ کے راستے سے

رک جاتا ہے یا شک و شبہ میں مبتلا ہونے لگتا ہے اور ایسے حالات اس کے سامنے آنے لگتے ہیں جنہیں سمجھنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتا۔ حدیث پاک ہے:

اِنَّ ھٰذَا الدِّیْنَ مَتِیْنٌ فَاَوْغِلْ فِیْہِ بِرِفْقٍ فَاِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَھْرًا اَبْقٰی

(اور یہ دین بڑا مستحکم اور باوقار ہے، اس میں نرمی کے ساتھ داخل ہو کیونکہ ضرورت سے زیادہ سختی کرنے والا مسافت طے کر پاتا ہے نہ سواری کو زندہ چھوڑتا ہے)

اگر کسی وادی اور تالاب میں اس کی وسعت سے زیادہ پانی اکٹھا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے طبعی قانون اور طریقہ کار ہی کارگر ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اسے کھودا جائے، اس کی صفائی کی جائے، مزید گہرا اور وسیع کیا جائے۔ یہی معاملہ دلوں کی وادی کا بھی ہے ان کے اندر گہرائی اور وسعت اسی وقت آسکتی ہے جب ان کا اصل مالک چاہے۔ اور ان کا اصل مالک صرف اللہ ہے۔ حدیث ہے:

"بندوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہوتے ہیں، اگر چاہے تو انہیں کج کر دے اور چاہے تو انہیں سیدھا کر دے۔"

قرآن میں ہے:

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ج (قصص: ۵۶)

(اے نبیؐ، تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)

اور تیسری بات یہ ہے کہ سیلاب کا پانی آنے سے پہلے تالاب خشک پڑا رہتا ہے ہوائیں مٹی، کوڑے کرکٹ لید اور گوبر، پتیاں اور چھلکے، چمڑے اور دوسری ہلکی چیزیں اڑا کر لاتی ہیں اور تالاب کو پاٹ دیتی ہیں لیکن سیلاب کا ایک ریلا آتا ہے اور ان ساری چیزوں سے تالاب کو پاک کر دیتا ہے اور تالاب کی تہ ان چیزوں سے صاف ہو جاتی ہے اور یہ ساری چیزیں پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہیں پھر باہر نکل جاتی ہیں۔ یہی معاملہ الہامی ہدایت کا ہے جب وہ دلوں میں جڑ پکڑتی ہے تو انہیں پاک وصاف کر دیتی ہے، طبیعت کی تمام گندگیاں اور خباثتیں دھو دیتی ہے اور ان میں سے کوئی چیز دلوں کی تہہ میں باقی نہیں رہ جاتی بلکہ رفتہ رفتہ یہ ساری برائیاں زوال کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

دلوں میں ایک ایسا مبارک وجدان جنم لے لیتا ہے جو ماضی کی کوتاہیوں اور غلطیوں پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور یہ شرمندگی اور افسوس برائیوں کو دھونے اور تطہیر کرنے کا بہترین وسیلہ ہے اور اس وجدان کے کنارے سے چھوٹے بڑے تمام گناہ اور غلطیاں بہہ جاتی ہیں جیسے سیلاب کی جھاگ غیر ضروری اور غیر نافع عناصر کو بہا لیجاتی ہے اس طرح یہ بدرد دھیرے دھیرے قابل نفرت بن جاتا ہے اور اس نئی نعمت کے ملنے پر وہ اللہ کے شکر اور اس کی حمد میں لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا وجدان ماضی کی غلطیوں سے بالکل نجات پا جاتا ہے جیسے سیلاب اس جھاگ سے نجات پا جاتا ہے جو اس کے اوپر بہتی رہتی ہے

اس سے ایک لطیف اشارہ اس بات کا بھی ملتا ہے کہ انسان کے ذہن ودماغ میں شیطان اپنا قبضہ جما لیتا ہے لیکن اللہ کی وحی آتی ہے اور اسے اس شیطانی قبضہ سے نجات دلاتی ہے۔ ہر نفس کے ساتھ شیطان لگا رہتا ہے جو اسے برائی اور گناہ پر اکساتا رہتا ہے۔ جو نفوس ہدایت الٰہی سے محروم ہوتے ہیں ان کے ساتھ شیطان کی

گندگیاں زیادہ لگی رہتی ہیں اور ان کی باطل خواہشات اور غلط رغبتیں گندگی اور نجاست میں انہیں زیادہ لت پت کر دیتی ہیں اور گناہوں اور غلطیوں کے مسلسل ارتکاب کی وجہ سے ان پر زنگ لگ جاتا ہے۔

لیکن بارانِ رحمت کا کوئی چھینٹا پڑتا ہے تو وہ پاک و صاف ہو جاتی ہیں اور ان کی مسرت اور خوشی واپس آجاتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کے پیارے صحابہؓ کی جاہلیت کے دور میں یہی حالت تھی۔ یہ مختلف قسم کی وادیاں تھیں جن میں کم یا بیش جاہلیت کی گندگیاں موجود تھیں لیکن جب وحی الٰہی کی بارش ہوئی تو یہی وادیاں ہدایت سے بھر گئیں اور علم و حکمت سے لبالب ہو گئیں۔

یہ اللہ کی سُنّت ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے کہ ہر نفس پر شیطان کا کم یا بیش غلبہ رہتا ہے، دل کی وادی اس کے غلبہ سے اسی وقت نجات پا سکتی ہے جب اس میں ہدایت اور علمِ الٰہی کا سیلاب آجائے۔ تاریخی شہادت کے لئے حضرت عمر بن خطابؓ کی زندگی ہمارے سامنے ہے جاہلیت کے دَور میں آپ کی زندگی کیسی تھی اور اسلام کے دور میں کیسی ہو گئی، ان دونوں کا تقابلی مطالعہ ہماری گفتگو کو ثابت کر دے گا۔ بلکہ ہم تو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ اللہ نے خود رسول اکرم صؐ کے دل کو شیطان کی یافت اور اس کی رسائی سے پاک کر دیا تھا۔ بچپن ہی میں فرشتوں نے آپ کے قلب مبارک کو چاک کر کے خراب حصّے کو نکال دیا تھا اور اسے ایمان و حکمت سے بھر دیا تھا بلکہ یہ واقعہ نبوت کے بعد بھی پیش آیا۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کی امتیازی صفت یہ ہو گئی کہ اللہ نے آپ کی پاکیزہ وادیٔ قلب کو پاک رکھا اور اسے برابر پاک کرتا رہا تاکہ اس مبارک اور پاکیزہ وادی میں پاکیزہ رسالت کی وحی نازل ہو سکے اور اس نُور کو

سہار سکے جو جبریلؑ لے کر نازل ہوتے تھے جس سے وادیٔ قلب نور ہی نور ہو جاتی ہے:

نُورٌ عَلٰى نُورٍ ۗ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (نور: ۳۵)

(نور پر نور، اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے)

اس لطیف اشارے سے علم نفس، اس کی تکوین و تشکیل کی فطرت اور خیر و شر کو قبول کرنے کی استعداد کے سلسلہ میں بڑی قیمتی معلومات اخذ کی جا سکتی ہیں لیکن یہ بحث سائیکالوجی سے متعلق ہے اور یہاں ہم اسے زیر بحث نہیں لائیں گے۔

اس اشارہ سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے فضل کے امیدوار ہیں اور اصلاح و توبہ سے مایوس نہیں ہیں وہ بڑے نفع میں ہیں اس لئے کہ کتاب اللہ میں ایسی تعلیمات موجود ہیں جو ان کے سینوں کو تسکین اور شفایابی دے سکتی ہیں اور ان کے دلوں کو پاک کر سکتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ ان تعلیمات پر نظر جمائے رہیں اور ان کے حقائق سے سیراب ہوتے رہیں۔

جھاگ اور باطل

۴۔ یہ جھاگ جو سیلاب میں پانی کی اوپری سطح پر بہتی رہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور یہاں کس چیز کی مثال میں اسے بیان کیا گیا ہے؟

جھاگ دراصل وہ سفید بلبلے ہیں جو پانی کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں جب پانی زمین کی شگاف یا سوراخ میں داخل ہوتا ہے اور اس کے ذرات میں سرایت کر جاتا ہے، یا

تالاب اور وادی کے دونوں کناروں پر بہتے رہتے ہیں جب سیلاب پانی کو گھمائی دیتا ہے یا کسی وجہ سے سیلاب میں اضطراب پیدا ہوجاتا ہے تب اس کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن یہ بلبلے جلد ہی پھوٹ جاتے ہیں اور جھاگ بیٹھ جاتی ہے۔

اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ دراصل کارگاہِ حیات میں حق کے مقابلہ میں باطل کی حیثیت واضح کرنا چاہتا ہے:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۵ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝ (رعد: ۱۷)

(اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے)

اوپر کی سطروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو پانی سے تشبیہ دی ہے اور انسانی دلوں کی مثال جب ان میں علم و ہدایتِ الٰہی کا نور ضوفشاں ہوجائے ان وادیوں سے دی ہے جن میں سیلاب کا پانی بھر جائے اور اس آخری جزو سے مثال کے عناصر مکمل ہوجاتے ہیں جس میں باطل کو پانی کے اوپر بہنے والی جھاگ سے تشبیہ دی ہے۔

جھاگ اور اس کی تشکیل کے عناصر

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ جھاگ ایک عارضی

سیّال ہے لیکن اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں سے آتا ہے اور اس کی اصلیت کیا ہے؟

اس سوال کا جواب باطل کی بے وقعتی اور اس کا ہلکا پن بھی واضح کر دے گا۔

جھاگ پانی کا کوئی عنصر نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ پانی کی سطح پر رہتی ہے۔ تو وہ تشکیل کیسے پاتی ہے اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ کوئی بنیادی چیز ہے جس کا عناصر ارض سے گہرا تعلق ہے؟

اس سلسلے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بس اتنا کہ یہ ایک عارضی طور پر ظاہر ہونے والی چیز ہے جو پانی کے اوپر پھولی ہوئی گیسوں اور گرد و غبار سے مرکب ہوتی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے جڑ جاتی ہیں اور ان کے درمیان ربط وہ نرمی پیدا کرتی ہے جو پانی سے مستعار لیتی ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی وجود ہے جو قابل لحاظ ہو؟

پانی سے مستعار لی ہوئی نرمی یا تراوٹ ہے جو بہت جلد بکھر جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا سارا تار و پود منتشر ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔

یہی معاملہ حق کے معاملہ میں باطل کا ہے۔ حق کے وجود میں ہر چیز کی اصلیت ہے اور باطل کی کوئی اصلیت اور اس کا کوئی وجود نہیں۔ حق کے مقابلے میں اس کی حیثیت بس وہی ہے جو جھاگ کی پانی کے مقابلے میں ہے۔ باطل محض وہم و خرافات اور اہواء و خواہشات کے دھوکہ اور مظہر کا نام ہے جو لوگوں کے سامنے اصلیت کے اس لباس میں آتا ہے جس میں حق جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور امر واقعہ کی بعض محسوس شکلیں اور صورتیں اختیار کر لیتا ہے جس سے کوتاہ بین اور سیدھے سادے لوگ

دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ لیکن حُسنِ انجام اسی چیز کے لئے ہے جو بقا کے عناصر اور نفع رسانی کی خصوصیات رکھتی ہوں۔ جب آپ نے دیکھ لیا کہ جھاگ کے بلبلے پانی کی تراوٹ مُستعار لیتے ہیں تو صرف اس چیز کو چھپانے کے لئے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، تو اسی طرح باطل جب مصنوعی لباس پہنتا ہے تو ایسی ہی چیز کی تقویت کے لئے پہنتا ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجے میں آپ اس حقیقت تک پہنچے ہوں گے کہ باطل کا وجود بالکل بے وقعت ہے اور عارضی بلبلوں سے بھی زیادہ فانی ہے۔

"اور گرد و غبار جو آپس میں جڑ جاتے ہیں اور ان کے درمیان پانی سے مُستعار لی ہوئی تراوٹ ربط پیدا کر دیتی ہے"

یہ اسی لاشئی سے جڑے ہوئے مظاہر کی نہایت سچی تعبیر ہے۔ یہاں ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ جب یہ گرد و غبار جمع ہو جائیں گے تو کوئی چیز بن جائیں گے۔ اس کے لئے قارئین کو جھاگ کے بلبلوں کا ایک ذخیرہ کرنا چاہیئے پھر انہیں ہاتھ میں لے کر دیکھیں کہ پانی کی تراوٹ ختم ہونے کے بعد ان کے ہاتھ میں کیا بچتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو کچھ بھی بچے گا وہ وہی عناصر ہوں گے جن سے اس لاشئی کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اسی مثال پر باطل کے عناصر کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

اہلِ حق کی نگاہ میں باطل کی حیثیت

جب ہمارے ذہن میں یہ تمام مناظر بیٹھ جاتے ہیں تو ہمیں باطل میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ نہ اس کے اندر کوئی ایسی طاقت نظر آتی ہے جو اس کے وجود کو سہار سکے

کو اسے اس طاقت کے بقدر جو جھاگ کے اندر پائی جاتی ہے۔

جب یہ حقائق آپ کے نزدیک ثابت ہو جائیں گے — اور یہ ایسا نظریہ ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے — تو آپ کے ذہن میں بصیرت کی ایک ایسی طاقت اور واضح روشنی قائم ہو جائے گی جس سے اشیاء کی حقیقت واضح ہو سکے گی اور جس کے ہوتے ہوئے ظاہر کی چمک دمک سے انسان دھوکہ نہ کھائے گا۔ اور جس شخص کے اندر یہ روشنی آجائے گی اس کے لئے حق اور باطل میں تمیز آسان ہوتا حد درجہ آسان ہو جائے گا اور باطل کے اثرات کو تباہ کرنے کے لئے اسے اس سے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی جتنی پانی کی سطح پر جھاگوں کے ایک بڑے ذخیرے کو تباہ کرنے میں کرنی پڑتی ہے۔ لیکن میرے بھائی! مجھ سے یہ نہ پوچھئے کہ یہ کیسے ہوگا؟ بلکہ خود اپنے آپ سے یہ پوچھئے اور اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ کے اندر وہ روشنی کتنی ہے جس سے ہم اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرتے ہیں؟ اور اہل تقویٰ کی فراست اور خصوصیات آپ نے اپنے اندر کس قدر پیدا کر لی ہیں؟ ان سوالوں کا جواب پانے کے بعد پہلے سوال کے جواب کی آپ کو ضرورت نہ رہے گی۔ آپ کو احساس ہو جائے گا کہ کس بڑھتی ہوئی جھاگ کی حقیقت یا باطل کی تیزی ان باتوں پر منحصر ہے جن کے ذریعہ اللہ ان کو تس نہس کرتا ہے اور انہیں ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ جب یہ باتیں پا لئے جائیں گے اور حق کی روشنی ان کی بصارت و بصیرت کو جلا بخشے گی تو باطل کی ذلت و رسوائی بڑی آسان ہوگی جیسے کوئی اپنا ہتھیار جھاگ سے کھیل کرے یا اسے اپنے قدموں سے روند دے یا اسے اپنے منہ کی پھونکوں سے اڑا دے یا اپنے ہاتھوں سے انہیں توڑ پھوڑ دے۔

اس مفہوم کی روشنی میں ہم اللہ کے اس قول کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں :

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

(آل عمران : ۱۹۶، ۱۹۷)

(اے نبیؐ ! دُنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے ، یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بد ترین جائے قرار ہے)

آخرت میں جس بُرے انجام سے دوچار ہوں گے وہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور اس دنیا میں انہیں جو اقتدار حاصل ہے، مقبوضات میں آئے دن اضافہ ہوتا جاتا جا رہا ہے اور ان کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں تو ان کی حیثیت اس جھاگ کی سی ہے جس کی اہمیت بس طفلانہ ذہن کے مردوں میں ہوتی ہے ۔ حالانکہ اس کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کا وجود بے معنیٰ ہوتا ہے یہاں دراصل مومنین کو لطیف انداز میں اُبھارا گیا ہے جو راہِ حق کے خطرات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے :

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۙ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (بقرہ : ۲۴۹)

(پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے ،

تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انہوں نے کہا: "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے)

یہاں ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ قرآن میں باطل کی شان و شوکت، فوج و لشکر، زینت و آرائش یا سیرت و عمل کی شان کم کرنے یا اس کے بے وقعتی اور بے قدری کو ظاہر کرنے کے لئے جس قدر آیات آئی ہیں ان سب سے استشہاد کریں آپ کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ ہمیشہ اپنے ذہن میں قرآن کریم کی اس آیت کو رکھیں:

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط (رعد: ۱۷)

(پھر جب سیلاب اُٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے)

اس آیت میں باطل کی کمتری و بے وقعتی کی جتنی اچھی توضیح اور عملی تصویر کشی ممکن ہو سکتی تھی، موجود ہے۔

باطل خواہشات اور جھاگ کی گیسیں

تو کیا جھاگ کی حقیقت اور اس کی اصلیت پر گفتگو تمام ہو چکی؟

نہیں میرے بھائی! اب بھی ہم گفتگو مکمل نہ کر سکے ہیں۔ ابھی گفتگو کا جو حصہ باقی ہے وہ پچھلی بحثوں سے زیادہ اہم ہے۔ ان گیسوں کا ذکر ابھی باقی ہے جن کے فساد پر جھاگ وجود میں آئی ہے اور جب گرد و غبار سے وہ لاشئ مل گئی تو یہ گیسیں کیا ہیں؟

سائنس کہتی ہے کہ یہ گیسیں دراصل ان اجسام کی عفونت اور گندگی سے تشکیل پائی ہیں جو فساد اور خرابی کے بعض عوامل اور محرکات کے سبب خراب ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کتنی بہترین تصویر کشی کی ہے اور تمثیل دی ہے!

ان بدبودار اور متعفن گیسوں کے مقابلے میں اس مثال میں آدمی کی ناجائز خواہشات اس کی شہوتیں اور سطحی اور گھٹیا جذبات کو رکھا گیا ہے۔ جس طرح جھاگ اور اس کے بلبلوں کی تشکیل و تعمیر میں ان گیسوں کو اساس کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح آدمی کی خواہشات اس کی شہوتیں، دنیاوی ساز و سامان سے شیفتگی اور محبت ہی اس سرزمین میں ہر باطل کے وجود کی اساسیات ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کے اندر وہ کون سی چیز ہے جس سے بدبو پیدا ہوتی ہے اور فساد اور تبدیلی اس پر اثر انداز ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں اس سے بدبودار گیسیں اٹھنے لگتی ہیں یا فاسد شہوات اور باطل مرغوبات کی پھبن آتی ہے؟!

میرے مخلص بھائی! انسان کے اندر اوپر سے یہ بدبو نہیں پیدا ہوتی بلکہ یہ بدبو اور پھبن اس کی جبلت میں داخل ہے۔ اسے اللہ نے حقیر پانی، بدبودار مٹی اور بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔ لوگوں کی خواہشات میں جو دنارت اور خسیت آپ کو نظر آرہی ہے وہ دراصل اسی مٹی کی خسیت اور حقیر پانی کی سطحیت اور گھٹیا پن کی وجہ سے ہے اور اس کی مرغوبات ہوائے نفس میں جو بدبو اور پھبن اٹھ رہی ہے وہ بھی دراصل اسی کیچڑ میں پوشیدہ بدبو کی وجہ سے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس بدبودار مٹی سے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے بالمقابل پستی و دنارت، رسوائی و ذلت اور گناہ و ضلالت میں مبتلا رہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ محض خدا کی رحمت ہے کہ یہ نیا اور صاف ستھرا پانی تالاب میں آتا ہے تو اس کی مضرتوں اور نقصانات کو کم کر دیتا ہے یا سرے سے زائل کر دیتا ہے اور اس کے بعد اس تعفن سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا، نہ اس کی مکروہ بدبو کسی کو پریشان کرتی ہے نہ اس کے مہلک جراثیم کسی کے لئے وبالِ جان بنتے ہیں یہ تو وادیوں اور تالابوں کے پانی کی خصوصیات ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ دلوں کی وادی میں انسانی عفونت اور سڑاند کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کس چیز کا ذخیرہ کرتا ہے اور طبیعتوں کی غلط خواہشات اور فاسد رغبتوں سے اسے پاک کرنے کے لئے کیا انتظام کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ قارئین یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اب تک ہم نے جو کچھ بحث کی ہے وہ مثل کے عناصر کے اندر رہ کر کی ہے اس سے بالشت برابر بھی نہیں نکلے ہیں۔ ہم آغازِ کلام ہی سے تشبیہات اور نظائر پر گفت گو کرتے چلے آئے ہیں اور ان احکام سے ہدایت طلب کرنے کی خاطر ایک کو دوسرے پر قیاس کرتے آئے ہیں جو اللہ نے اس معجز نما تصویر کشی کے ذریعہ ہمیں دیئے ہیں۔ اس لئے اس وقت جو سوال ہمارے سامنے ہے، اس کا جواب دینے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ ہمیں بدبودار مٹی سے پیدا کیا ہے اس لئے اپنی اس مقدس رُوح کے پاکیزہ فیضان سے اس کا تدارک کرنے کی اس نے تدبیر بھی بتائی ہے جو اس نے ہماری دلوں کی وادیوں میں ڈال دی ہے اور ہمارے اندرون میں اسے سمو دی ہے اور ہماری مردنی کو زندگی سے، گندگی کو پاکیزگی سے تبدیل کرنے کا انتظام کر دیا ہے اور ساری عفونتوں اور گندگیوں کو دھو دیا ہے۔ آخر کوئی بات تو تھی کہ اللہ سُبحانہٗ تعالیٰ نے اس جدید وجود کی تکریم کے لئے اس سے کم تر کسی چیز کو پسند نہ کیا کہ

اس کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

پھر اللہ نے انسان کے اندر اس نورانی فطرت کی تخلیق پر اکتفا نہ کیا بلکہ صدیاں اور عمریں گزرنے کے ساتھ اپنی اس ہدایت اور روشنی سے اسے تقویت بھی پہنچاتا رہا جو وہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر نازل کرتا تھا اسی حقیقت کی طرف اس آیت کا یہ حصہ اشارہ کر رہا ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِھَا (رعد: ۱۷)

(اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا)

دلوں کی وادی کی سیرابی کے لئے انتظام کرنے والا وہی خدا ہے جس نے ان وادیوں اور تالابوں کو پاک کرنے اور انہیں سیراب کرنے کے لئے پانی کو نازل کیا ہے۔

انسان کی طینت میں نقص کی خصوصیات

ہم پیچھے جان چکے ہیں کہ جھاگ محض بلبلے کو کہتے ہیں یا یہ ایک ایسا گھٹیا منظر ہے جس میں کوئی نفع نہیں، کوئی قوت نہیں نہ کوئی بقا اور استحکام ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس منظر کا سبب کیا ہے؟ یہاں ہم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ہم ان گیسوں کی نوعیت پر گفتگو کریں جن سے جھاگ وجود میں آتی ہے اور نہ انتشار اور بدبو کی کیفیت پر کلام کرنے سے ہمیں کوئی مطلب ہے جو ان گیسوں کا محرک بنتی ہے۔ بلکہ ہمیں مطلب تو ان مقاصد سے ہے جو ان بہترین امثال کے ذریعہ بیان کئے

گئے ہیں، ہمیں دلچسپی خواہشات وشہوات اور ان سے اٹھنے والی پھبن سے ہے اور اسی سے متعلق ہماری گفتگو ہوگی۔

اس بد بو اور پھبن کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے اوصاف ہیں جو ہمارے سامنے پوری مہارت کے ساتھ اس مٹی کے مزاج کو بتاتے ہیں جن سے ہماری بشریت کی تخلیق ہوئی ہے۔

ہم فلسفہ اور مفروضات میں گئے بغیر حقائق کا سامنا کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ: یہ مردہ مٹی ہے جو پانی کی محتاج ہے تاکہ اس کے اندر زندگی دوڑ سکے یا وہ محض سلبی بشریت ہے جس میں ایجاب اور فاعلیت کی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی، وہ کمزور ہوتی ہے اس کے اندر طاقت نہیں ہوتی، وہ ذلیل ہوتی ہے عزت کا اس کے ہاں کوئی تصور نہیں ہوتا وہ محتاج اور فقیر ہوتی ہے، غنا اور مالداری اسے چھو کر نہیں جاتی۔ وہ پست اور بے وقعت ہوتی ہے اس کی کوئی قیمت اور قدر نہیں ہوتی وہ جاہل ہوتی ہے علم کا کوئی ذرہ اس کے پاس نہیں ہوتا۔ تو اس مٹی کا مزاج کیا ہو سکتا ہے؟ یا وہ یہ جبلت ہے جس سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے، البتہ یہ مزاج سلبی ہوتا ہے جو ایجاب اور اس کی خصوصیات کی کسی چیز پر مشتمل نہیں ہوتا۔

معنوی موت اور اس کی حقیقت

یہ مکمل محتاجی اور دامن کا یکسر خالی ہونا ہی اس مٹی کا مزاج ہے اور قرآن میں جب معنوی موت کا ذکر آتا ہے تو اس سے یہی مراد ہوتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ذات ایسی نہیں ہے جو تمام سلبی صفات سے منزہ اور تمام ایجابی صفات سے مزین ہو اسی بابک

مفہوم کی طرف قرآن پاک کی اس آیت میں اشارہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝ (فاطر: ۱۵)

(لوگو، تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے)

بندے ہر حیثیت سے اللہ کے محتاج ہیں، علم اور قوت میں بھی محتاج ہیں، عزت اور اقتدار میں بھی اسی کے محتاج ہیں، رفعت و سربلندی کے اسباب کے لئے بھی اس کے محتاج ہیں غرضیکہ ان تمام اوصاف کے لئے اس کے محتاج ہیں جن کی اللہ نے اپنی ذات کے سلسلے میں تعریف کی ہے اور جن سے متصف ہونا ہمارے لئے محبوب ہے اور جن کی طرف شوق و رغبت سے لپکنا ہماری فطرت میں داخل ہے۔

کمال کی طرف

یہ گفتگو صفاتِ خداوندی کی بحث کو بھی اپنے اندر سمیٹنا چاہتی ہے لیکن ہم اس بحث کو شروع نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تو یہاں اس سلبیت پر اپنی بات کو مرکوز رکھیں گے جو ہماری فطرت میں ودیعت ہے۔ اور یہی سلبیت آدمی کی طبیعت میں نقص، محتاجی اور بے مائیگی کے فطری احساس کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ ایسا احساس ہے جس کا ادراک اُس کے ظاہری اور سطحی حواس نہیں کر سکتے لیکن اس کی باطنی عقل شدید طور پر اس کا اثر قبول کرتی ہے چنانچہ بغیر کسی شعور کے آدمی اپنے آپ کو چند چیزوں سے دلچسپی محسوس کرتا ہوا پاتا ہے انہیں کو ہم خواہشات اور شہوات کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر آدمی مال جمع کرتا ہے لیکن اس سے ضروریات کی تکمیل یا حق کی

حمایت اور باطل دشمنوں کی سرکوبی وغیرہ کوئی مقصد اس کے سامنے نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک فطری دل چسپی ہوتی ہے یا اس مٹی کی صدائے بازگشت ہوتی ہے جو احتیاج کے علاوہ اور کسی چیز کی مالک نہیں ہوتی ۔ ایک غریب مال اس لئے نہیں جمع کرتا کہ وہ اس سے اپنی ضرورت پوری کرے گا بلکہ اس کا مقصد اس بے مایگی کو دور کرنا ہوتا ہے جو اس کی جبلت میں داخل ہوتی ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ خود مال اس کی ذرہ برابر ضرورت کو بھی پوری نہیں کر سکتا اس لئے کہ اس کا اصل مالک تو اللہ ہے، خدا کی واجبی صفات ہی اس پیاس کو دور سکتی اور اس بھوک کو مٹا سکتی ہیں ۔ وہی اس محتاجی کو غنا سے، اس نقص کو کمال سے اور اس کی موت کو حیات سے تبدیل کر سکتی ہیں ۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بیچارہ غریب کسی حد پر نہیں ٹھہرتا، کبھی اسے شکم سیری کا احساس نہیں ہوتا اس لئے کہ حقیقی چشمہ کو چھوڑ کر کہیں اور سے سیراب ہونے کی کوشش کر رہا ہے جیسے کوئی بھوکا بچہ ہو جو اپنی ماں کا پستان نہ پا سکے اور خود اپنی انگلی منہ میں ڈال لے ظاہر ہے اس سے اس کی بھوک پیاس دور ہونے سے رہی !

انسان مال و دولت میں دل چسپی لیتا ہے، زینت و آرائش کے اسباب و وسائل فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اپنی تعریف اور بلندی سے محبت کرتا ہے اور اختیار و ترجیح میں اپنی ذاتی رغبت و انانیت کا ساتھ دیتا ہے یا ہم پلہ لوگوں پر برتری غلبہ اور سر بلندی جتاتا ہے اور دوسری تمام خواہشات کی تکمیل میں ناحق جد و جہد اور دوڑ دھوپ کرتا ہے اور ان تمام سرگرمیوں میں بے شمار غلطیوں، مظالم اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے، اپنے خلاف اور دوسرے اللہ کے بندوں کے خلاف جرائم کرتا ہے اور اس سرزمین پر غلبہ و تفوق کے تقاضے کے تحت اس کے جرائم سمٹتے سکڑتے اور پھیلتے رہتے

ہیں۔ ظلم کرنے والا کبھی ایک فرد ہوتا ہے اور کبھی پوری اُمت مل کر ظلم کرتی ہے۔ جرائم کبھی ظاہری اور مادّی ہوتے ہیں اور اندرونی اور معنوی جیسے کنجوسی، چاپلوسی، قیادت کا غرور اور الوہیت کا خبط وغیرہ یا مجمل انداز میں یوں کہہ لیجیے کہ وہ کبھی حرص وطمع اور لالچ کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے قارون اور اس کی صفت کے دوسرے افراد کی حرص، بخل اور سینت سینت کر رکھنے کا مرض، اور کبھی بڑائی اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے فرعون کا تکبر کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرنے اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں) کا نعرہ بلند کرنے سے باز نہ رہ سکا اور آسمان پر سیڑھیاں لگانے کا مطالبہ کر بیٹھا تاکہ وہاں بھی اپنی مضحکہ خیز الوہیت کے اوہام کے جال بچھائے۔

انسان ان تمام امور میں یا ان میں سے بعض میں دل چسپی لیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کے محرکات کیا ہیں؟ اسے نہیں معلوم، البتہ ان چیزوں میں اسے لذت، فرحت، خواہش نفس کی تکمیل اور شہوت کی تعمیل کا احساس ہوتا ہے اور بس۔ رہی یہ بات کہ وہ کون سے محرکات ہیں جو اسے ان کاموں پر ابھارتے ہیں تو اس کا سرا اس سلب محض کی طبیعت یا مکمل محتاجی و محرومی سے جا ملتا ہے جو دنارت کی جگہ رفعت عجز کی جگہ قدرت، نقص کی جگہ کمال، جہالت کی جگہ علم، بے مائیگی کی جگہ مایہ وشکم سیری اور فقر کی جگہ یافت اور استغناء لانا چاہتی ہے۔ اس کی ازلی فریاد ہے جو اندرونی شعور کی گہرائیوں میں گونج رہی ہے جسے انسان کے کان سُن سکتے ہیں نہ ان کا ذہن اس کی طرف متوجہ ہو پاتا ہے وہ اس کی اس روحانی دنیا کی فریاد ہے جو اس کے قریب ہی زندگی کے لئے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے لیکن وہاں تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے، لیکن اِدھر حضرتِ انسان کا حال یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ سیرابی کے سچے سرچشموں کی طرف رجوع

کرتا، ان چیزوں کا رخ کرتا ہے جن میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

چنانچہ ان خواہشات اور شہوات کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ محروم فطرت کے خواب ہیں جو سوئے ہوئے بچے کے شعور میں کلبلا رہے ہیں اور وہ اپنی انگلی اپنے منہ میں ڈال لیتا ہے حالانکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ لیکن جہاں ان دونوں اعمال میں مشابہت ہے کہ چھوٹا بچہ اور حضرت انسان دونوں ایک ایسا کام کرتے ہیں جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور نقصان ہی ہوتا ہے وہیں دونوں میں بڑا فرق بھی ہے جو شخص جان بوجھ کر اپنی مرضی اور اختیار سے اپنے لئے خیر کو ناپسند کرتا ہے اس کے درمیان اور اس شخص کے درمیان جو بلا ارادہ ایسا کر ڈالتا ہے، عظیم تفاوت ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ۝ (مومن: ۱۰)

(جن لوگوں نے کفر کیا ہے، قیامت کے روز ان کو پکار کر کہا جائے گا، آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آ رہا ہے، اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے)

حیرت کا شکار

میرے بھائی! حق و باطل کا معرکہ پورے وجود کا معرکہ ہے، اور جو شخص اس معرکہ کی داستان قلم بند کرے، اس کے لئے بہت سی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اندیشہ ہے اور تنگی و پریشانی میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہے اس لئے میں حد درجہ متحیر ہوں اور شدید درماندگی محسوس کر رہا ہوں کہ اس عظیم مشن کے کس پہلو کو اختیار کروں اور کس پہلو کا ذکر نظر انداز

کردوں ؟ میں ان خوفناک گہرائیوں کے سامنے کھڑا ہوں جن کی کوئی تہ نہیں ہے یہ گہرائی حق وباطل کی کشمکش کے ساتھ بڑھتی چلی گئی ہے یہاں تک کہ عالم مادہ سے بڑھ کر عالم آخرت تک پہنچ چکی ہے۔ اب تک جو کچھ ہم نے پیش کیا ہے اس کے بعد اب کتاب مبین کی آیات ہی بچتی ہیں جن کا ہمیں سہارا لینا ہے اور جن کے الفاظ کی غایت اور مدلول پر رکنا ہے یا جن کے اشارات کے مقاصد پر نظر رکھنی ہے۔ مثال کے طور پر حق و باطل کی کشمکش کے سلسلے میں قرآن نے جو گفت گو کی ہے، ہم نے جس شئی کی وضاحت کی ہے اس کی روشنی میں ان تمام آیات کے مقاصد اور غایات کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح قرآن نے خواہش نفس پر گفت گو کی۔ ہے جو انسان کو ہلاکت کی وادیوں میں جا گراتی ہے، ان بیکار کوششوں پر بھی کلام کیا ہے جسے پیاسا پانی سمجھ بیٹھتا ہے، خسارہ میں رہنے والے افراد سے بحث کی ہے اور ان لوگوں کی خصوصیات گنائی ہیں جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ان کے مال واولاد کے ذریعہ عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور خواہش نفس کے پیروکاروں کی حماقت اور ارباب دانش کی پختہ عقلی یعنی آخر الذکر مردہ تھے تو اس نے انہیں بخش دی، جب کہ اول الذکر مردہ ہیں کوئی بات نہیں سنتے، بارش جو کسانوں کو خوش کر دیتی ہے، کھیتی جس کے انکھوے نکلتے ہیں، جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، موٹی تازہ ہو جاتی اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر کسان پھولے نہیں سماتے —— قرآن نے ان سب موضوعات پر تفصیل سے گفت گو کی ہے اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے عناوین سے بحث کی ہے جن کا ذکر طویل ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہترین مثل ایک مبارک عینک ہے جو ہماری نگاہوں اور بصیرتوں کے سامنے بہت سارے حقائق رکھ دیتی ہے جب ہم اس کی روشنی میں قرآن کی ہر آیت پر غور کرتے ہیں۔

باطل اور جھاگ کی تین چیزوں میں مشابہت

(۱)۔ پہلی مشابہت یہ ہے کہ دونوں عارضی مظاہر ہیں جن کی اصل اور نسبت کا کوئی پتہ نہیں۔ ان میں سے کسی کا وجود اصلی اور بنیادی نہیں جسے قابل اعتناء قرار دیا جا سکے۔

(۲)۔ ان میں سے ہر ایک بے فائدہ اور بے کار ہے اور اس سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

(۳)۔ دونوں بہت جلد زوال اور فنا کا شکار ہو جاتے ہیں، ان میں سے کسی کو ثبات اور دوام حاصل نہیں ہے۔

کسی کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ حق کی اصلیت اور باطل کی بے وقعتی کی اتنی اچھی تصویر کھینچ دے جتنی قرآن نے کھینچ دی ہے اسی طرح کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ حق کا احترام اور اس کی عظمت کا تصور کرنے اور دوسری طرف باطل کو بے وقعت سمجھنے اور اسے گمراہی خیال کرنے میں اس معجزنما طریقے سے آپ کو ابھار سکے جو اس الہامی تصویر نگاری نے ابھارا ہے۔ اس لئے آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں اور کسی بھی شخص سے یہ امید نہ لگائیں کہ وہ قرآن کی اس منظر نگاری میں کچھ اضافہ کر سکے گا۔ قدیم وجدید کے تمام انسانوں —— جن میں عالم بھی ہیں اور جاہل بھی، فلسفی بھی ہیں اور غیر فلسفی بھی —— نے اپنے فلسفہ اور اس کی حقیقت پر اتنی آسانی، فراخی، ایجاز و وضاحت کے ساتھ غور نہیں کیا جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام حکیم پر کیا ہے۔

لغزش انسانی سرشت میں داخل ہے

اب تک کی ہماری گفتگو سطح پر اٹھنے والی جھاگ اور اس باطل سے متعلق تھی جو دلوں کی وادی میں سطح آب پر تیرتا رہتا ہے اور انسانوں کی واقعاتی دنیا پر محیط ہے چنانچہ انہیں حق سے روکتا اور اپنے کو ان کے سامنے مزین اور خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ بہت سے لوگوں سے متعلق ہے لیکن ایک دوسرے فریق کا تذکرہ ابھی باقی ہے۔

ایک مومن کی وادی جب وحی الٰہی اور حکمت سے بھر جاتی ہے جو عارضی لغزشوں اور کوتاہیوں سے یکسر خالی نہیں ہو جاتی بلکہ یہ اس کی ظاہری سطح پر تیرتی رہتی ہیں پھر زوال کا شکار ہو جاتی ہیں اور حق و خیر کا نافع چشمہ باقی بچ رہتا ہے۔ یہ انسانی طبیعت ہے۔ یہ اللہ کی مشیت ہے کہ اس نے ہمارے اندر خطا اور نسیان کو باقی رہنے دیا اور ہماری فطرت میں ایسی چیزوں کو چھوڑ دیا جو ہمیں دنیوی زندگی سے جوڑے رکھیں اس لئے گناہ اور غلطی ہماری بشریت کا لازمہ ہیں۔ اسی طرح ترقی اور پاکیزگی کی صلاحیت بھی اس کے اسرار میں شامل ہے۔ اللہ نے ہر انسان کے اندر تقویٰ اور فسق و فجور دونوں کی گنجائش رکھی ہے اور بندے کے اوپر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے نفس کو تقویٰ کے ذریعہ سے پاکیزہ رکھے یا فسق و فجور کے ذریعہ اسے دبا دے۔ لیکن تقویٰ اور خدا پرستی کی چاہے کتنی ہی منزلیں طے کرلے اور مراقبہ اور خشیتِ الٰہی سے کتنا ہی مسلح ہو جائے، نفس کی لغزشوں سے ہمیشہ نجات نہیں پا سکتا اور دنیاوی بلبلوں کی کشش سے دائمی طور سے نہیں بچ سکتا۔ ضروری ہے کہ اس سے غلطیاں سرزد ہوں اور وہ دُنیا کی طرف لپکے۔ زمانے نے دل کو مختلف تبدیلیوں اور اُلٹ پھیر کی آماجگاہ بنا رکھا ہے جیسے کوئی وادی اور ندی نالہ موجیں مارتا رہتا

ہے جب اس میں پانی موجود رہتا ہے۔ اور دلوں کی اس گردش اور الٹ پھیر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سطح آب پر کچھ بلبلے اٹھیں گے۔ رسول اکرمؐ نے دل کی مثال اس طرح دی ہے "دلوں کی الٹ پھیر اس ہانڈی کی طرح سے ہے جو جوش کھا رہی ہے" تو کیا ہانڈی جوش کھائے گی اور سطح پر جھاگ اور بلبلے نمودار نہیں ہوں گے؟ یہاں دلوں کی جھاگ سے مراد انسان کی غلطیاں اور اس کی لغزشیں ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ کے رسولؐ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم لوگ گناہ نہ کروگے تو اللہ تمہیں فنا کر دے گا پھر وہ ایسی قوم کو لائے گا جو گناہ کرے گی پھر مغفرت چاہے گی اور اللہ انہیں معاف کرے گا۔"

کوئی انسانی نفس ترقی اور کمال کے اس معیار تک نہیں پہنچ سکتا جس پر رسول اکرمؐ فائز تھے اس کے باوجود احادیث میں آتا ہے کہ آپؐ کی نگاہ اپنے کپڑوں کے نقش ونگار پر جا پڑی جب کہ آپ نماز میں تھے، پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو اس کپڑے کو اتار پھینکا اور فرمایا: اس کپڑے نے مجھے نماز سے غافل کر دیا تھا۔

ایک دوسری حدیث آتی ہے کہ آپ سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے، منبر پر کھڑے ہوئے تو اس پر نظر پڑ گئی، آپ نے اسے نکال کر پھینک دیا اور فرمایا: "میری ایک نگاہ اس انگوٹھی پر تھی اور دوسری تمہارے اوپر" اور یہ واقعہ سونے چاندی کی حرمت سے پہلے پیش آیا تھا۔

بلکہ احادیث میں تو یہاں تک آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میرے قلب پر بدلیاں چھا جاتی ہیں" مصباح کے مصنف نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

"یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دُنیاوی معاملات آپ کی توجہ کو ہٹادیتے تھے اور یہ دُنیا اگرچہ بہت اہم ہے لیکن آخرت کے مقابلے میں اس کی وہی حیثیت ہے جو کھیل کی ذکرِ الٰہی کے مقابلہ میں ہے۔"

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خطرات جو رسول اللہ کے قلب مبارک پر تیرتے رہتے تھے، آپ کی وادی میں اثر انداز ہوجاتے تھے؟ جب کہ رسولِ اکرمؐ الہامی ندیوں میں سب سے بڑی ندی اور خدائی جزیروں میں سب سے بڑا جزیرہ تھے؟ آپ دیکھتے نہیں کہ یہ خطرات کتنی جلدی زائل ہوجاتے ہیں اور رسولِ اکرمؐ ان کی طرف فوراً متوجہ ہوجاتے ہیں اور کپڑا اور انگوٹھی اتار کر پھینک دیتے ہیں، چنانچہ یہ خطرات اسی طرح رفوچکر ہوجاتے ہیں جس طرح پانی کے اوپر کی تیرنے والی جھاگ فنا ہوجاتی ہے۔

بعض مومنین کے دلوں پر جھاگ زیادہ تھی — اللہ انہیں معاف کرے اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرے — اور بعض مسلمانوں کے دلوں پر یہ جھاگ کم تھی اور ایسے لوگ کم تھے انہیں کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام: ۹۰)

(اے نبیؐ، وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے (انہی کے راستہ پر تم چلو)

میرے مخلص بھائی! یہ وہ محنت ہے جو اس مثل سے استخراج کے سلسلہ میں کی جاسکتی تھی۔ اگر اس مثل سے میں بہت سے حقائق نہ نکال سکا ہوں گا تو یہ قلیل بھی آپ کے لیئے کافی ہے اس سے علمِ الٰہی کی وسعت اور اس کے کلمات کی لامحدود پہنائیوں کے باوجود آپ استفادہ کرسکتے ہیں۔

یہ سارے حقائق کتاب الٰہی کے ایک جملے میں بند ہیں پھر بھلا یہ معجزہ کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟ اس ایک جملے میں اور صرف ایک مثل میں علم و حکمت کے دریا بہا دیئے گئے ہیں:

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

(نور: ۳۵)

(وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے)

رسول اکرمؐ کے ضرب الامثال

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے میدان میں اس اسلوب کو اختیار کرتے تھے اور مثالیں بیان کر کے لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ آپ مخفی معنوی امور کی محسوسات سے تشبیہ دیتے تھے جس سے وہ ذہنوں میں بیٹھ جاتے بلکہ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے تھے۔

ہم آپ کے بیان کردہ امثال میں سے صرف ایک مثل کا یہاں تذکرہ کریں گے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن ذکریاؑ کو پانچ باتوں کا حکم دیا کہ وہ ان پر خود بھی عمل کریں اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دیں۔ چنانچہ قریب تھا کہ وہ اس میں کچھ سستی کر جائیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ان پانچ باتوں پر خود بھی عمل کریں اور بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیں تو یا تو آپ اس فریضے کی انجام دہی کریں یا میں ہی اسے انجام دے دوں۔ تو یحییٰؑ نے کہا: اگر تم مجھ پر سبقت لے گئے تو مجھے اندیشہ

ہے کہ عذاب میں نہ مبتلا کر دیا جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے تمام لوگوں کو بیت المقدس میں اکٹھا کیا۔ مسجد بھر گئی اور لوگ برجیوں پر بھی بیٹھ گئے تو آپؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم دیا ہے کہ ان پر خود بھی عمل کروں اور تم کو بھی عمل کرنے کا حکم دوں:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ جس نے شرک کیا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے اپنے سونے یا چاندی سے ایک غلام خریدا اور اس سے کہا: یہ میرا گھر ہے اور یہ میرے کام ہیں تو کام کرو اور پیداوار مجھ تک پہنچاؤ۔ چنانچہ وہ کام کرنے لگا لیکن پیداوار اپنے مالک کے علاوہ کسی اور کے یہاں پہنچانے لگا تو تم میں سے کون پسند کرے گا کہ اس کا غلام یہ روش اختیار کرے؟

۲۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نماز کا حکم دیتا ہے تو جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تو ادھر اُدھر سے توجہ ہٹا لو کیونکہ بندہ جب نماز میں یکسو ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنا رُخ بندے کے چہرے کی طرف کئے رہتا ہے۔

۳۔ میں تمہیں روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہوں اس لئے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جماعت کے ساتھ ایک آدمی ہو جس کے پاس مشک کی تھیلی ہو تو اس جماعت کا ہر فرد ہشاش بشاش رہتا ہے اور اس کی خوشبو انہیں خوش رکھتی ہے۔ اور روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بڑھ کر پاکیزہ ہے۔

۴۔ اور میں تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو اس کے دشمنوں نے گرفتار کر لیا ہو اور اس کے ہاتھ اس کی گردن میں باندھ دیئے

ہوں اور اسے گردن مار دینے کے لئے حاضر کیا ہو لیکن وہ کہے : میں اپنی جان بخشی کے عوض کم و بیش ہر طرح کا مال دینے کے لئے تیار ہوں ۔ اس طرح وہ اپنی جان ان سے چھڑا لے ۔

۵ ۔ اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اللہ کو یاد کرو کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے تعاقب میں اس کے دشمن تیزی سے نکل پڑے ہوں یہاں تک کہ وہ ایک مضبوط قلعے تک پہنچ گیا اور اس میں داخل ہو کر اس نے اپنی جان بچا لی ۔ اسی طرح بندہ شیطان کی چالوں سے اپنی جان بغیر ذکرِ الٰہی کے نہیں بچا سکتا ۔"

یہ ایک لمبی حدیث ہے جس کی روایت امام احمد اور ترمذی دونوں نے کی ہے ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان پانچ باتوں میں سے ہر ایک کو مثل کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور جو خیر اور انسان کی نجات اس میں پوشیدہ ہے وہ کھل کر سامنے آ جاتی ہے ۔

توحید یہ ہے کہ آپ اپنی محبت اور خوف اور امید کا ایک ہی مرکز و محور بنائیں اور وہ اللہ ہے ۔ انسان اپنی زندگی میں انہی اہم جذبات اور ان کی شاخوں کے اشارے سے تصرف کرتا ہے اگر ان جذبات کو وہ اللہ کے لئے خالص کر دے تو اس کی ہر چیز اللہ کے لئے خالص ہو جاتی ہے پھر اس کا قول و فعل، اس کی سیر و تفریح، اس کا کھانا پینا، اس کا صبح و شام چلنا پھرنا، اس کی نماز اور قربانی اور اس کی زندگی و موت سب خدائے تعالیٰ کے لئے خالص ہو کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہی ہم سے چاہتا ہے اور اسی مقصد کے لئے اس نے ہماری تخلیق کی ہے اور یہی توحید کا مفہوم ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے محبت، خوف اور امید کے یہ تینوں جذبات آپ کے اندر اسی لئے ودیعت کی ہیں کہ انہیں خدا کی طرف آگے بڑھائیں

ان کی حیثیت ان مبارک دھاگوں کی ہے جو آپ کا تعلق خدا سے قائم رکھیں اور آپ کو اُس سے جوڑے رکھیں۔ اگر آپ ان جذبات کو کسی اور کے ساتھ وابستہ کرلیں اور انہیں خدانخواستہ کسی اور ذات یا شخص کے حوالہ کردیں تو آپ نے ان کی قدر نہیں پہچانی، انہیں غیر مناسب جگہ میں رکھ دیا اور خالق کے علاوہ کسی اور ہستی کے لئے انہیں مسخر کردیا اور یہ عین انکار، جہالت اور اندھا پن ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کی تفسیر اس مثال میں کی گئی ہے یعنی اس کی حالت ایسی ہی ہے کہ کسی شخص نے اپنے پیسے سے غلام خریدا اسے اپنا گھر، اپنی کھیتیاں یا اپنے باغ یا اپنے کارخانے دکھادیئے اور اس سے کہا کہ یہ میری کھیتیاں یا کارخانے ہیں ان میں کام کرو اور پیداوار جو کچھ ہو انہیں میرے گھر پہنچادیا کرو۔ غلام کام کرنے لگا لیکن پیداوار مالک کے علاوہ کسی اور کو دینے لگا۔ بھلا کون ایسا شخص ہوگا جو اس طرح کے شخص کو اپنا غلام یا خادم رکھے گا؟

اگر ہم میں سے کوئی اس طرح کا غلام رکھنا پسند نہیں کرتا ہے تو بھلا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کیسے پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے جذبات اور ان کے پیداوار اعمال اس کو چھوڑکر کسی اور کے لئے خالص کردیں؟

یہ مثال بڑی اطمینان بخش اور مُسکت ہے۔ سینوں کو کھول دیتی ہے اور عقیدۂ توحید کو بڑی مضبوطی سے دلوں میں اتار دیتی ہے۔

اسی طرح روزے کو سمجھایا ہے۔ روزہ کیا ہے؟ ظاہری ومخفی، حسّی ومعنوی تمام سہولتوں سے اپنے نفس کو روک رکھنے۔ اور اللہ کے پاس موجود خیر اور پاکیزگی کو طلب کرنے کا نام ہے یہ ہے مکمل روزے کا مفہوم۔

اس مفہوم کی روشنی میں روزہ ایک پروگرام ہے جس پر عمل کرنے سے انسان کی

صفات میں ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے۔ وہ محسوسات اور شہوتوں کے جذبات اور محرکات سے بلند ہو کر اس ارادہ کی حکمرانی میں آجاتا ہے جو معنویات یعنی اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں سرگرم رہتا ہے۔ اس حدیث قدسی کا مفہوم یہی ہے:

يَدَعُ طَعَامَهُ وَشَهْوَاتِهِ مِنْ اَجْلِي

(اس نے میری رضا کی خاطر اپنے کھانے اور شہوتوں سے پرہیز کی ہے)

یعنی ان محسوسات کو چھوڑنے کی واحد غرض یہ تھی کہ ان کے مقابلے میں میری رضا میرے احسان اور میری رحمت و عفو سے ہمکنار ہو۔

اس طرح انسان کا باطنی وجود ان ملکوتی حقائق سے ترتیب پاتا ہے جو پاکیزگی و صفائی، بلندی و روشنی میں خدائی صفات سے منسوب ہوتے ہیں۔ روزہ دار کا ظاہری جسم تو گوشت اور خون ہی سے مرکب ہوتا ہے لیکن پاکیزگی اور صفائی کا ایک ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے جو اس کی شیریں باتوں، نیک اعمال اور بلند اخلاق کے ذریعہ باہر پھوٹا پڑتا ہے۔ یہ ہے وہ مفہوم جو اس مثال میں بیان کیا گیا ہے کہ روزہ دار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشک کی تھیلی لئے پھرتا ہو جس سے خود بھی محظوظ ہوتا ہے اور ساتھ کے دوسرے افراد بھی محظوظ ہوتے ہیں اور روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ اللہ کو پسند ہے۔

صدقہ کہتے ہیں اس عمل کو کہ انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ مال کی محبت اور اس کو روکے رکھنے کی حرص اس فطرت میں داخل ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اللہ کی راہ میں صدقہ نکالنا دراصل ایک طرح کا نفسیاتی دباؤ ہے جس کا انسان مقابلہ کرتا ہے اور جس کے ذریعہ اپنے دل کی بخالت اور تنگ دلی کا علاج کرتا ہے۔ مثل ہے

اس کا تعلق یہ ہے کہ چونکہ انسان کے دل میں ہر طرح کی صلاحیتیں اور بلند باطنی حواس موجود ہیں اس لئے وہی انسان کے وجود کی اصل حقیقت ہے اور یہ اس دل کا توشہ جسے وہ جمع کرتا ہے اور اس کی وہ شراب جو اس کے اندر مستی پیدا کر دیتی ہے، حقیقت میں ذکرِ الٰہی ہے۔ اور اس کے اس عمل اور دوڑ دھوپ کا میدان، جس سے اس کی روحانی زندگی میں جلا آسکے اور عزت وسعادت کے درجات تک وہ پہنچ سکے، اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنا اور خیر کے کاموں میں سبقت کرنا ہے۔ اور شیطان ہر وقت گھات میں لگا رہتا ہے اور انسان کی غفلت کی تاک میں رہتا ہے موقع پاتے ہی اس کے اندر باطل خواہشات کی در اندازی کر دیتا ہے جو اس کے دل اور اس کی صلاحیتوں سے چمٹ جاتی ہیں اور اس کی مستی ونشاط کے سرچشموں سے اسے کاٹ دیتی ہیں۔ وہ نفس کے اندر تنگ دلی اور کنجوسی کے جراثیم داخل کر دیتا ہے اور دُنیا اور اس کے اسباب سے محبت ابھار دیتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ہر ایجابی واقدامی خصوصیت سے عاری ہوتا چلا جاتا ہے اور کسی بھی بلند اخلاقی اور شرافت وسخاوت کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہ جاتی پھر تو وہ اپنے آپ کو بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے اور یہی انسان کی تباہی کا راستہ ہے۔ اور اس وقت نجات کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہ جاتی کہ انسان پھر سے پچھلے مقام کی طرف رجوع کرے، تنگ دلی اور بخالت کی تمام دیواروں کو گرا دے اور اللہ کی راہ میں صدقہ کر کے مالِ دُنیا سے محبت کو اپنے دل سے نکال دے اور زندگی کی مستی اور اس کے نشاط سے ہمکنار ہو جائے، اعلیٰ قدروں اور بلند اخلاق کی طرف بڑھنے والے عزائم کو پرورش کرے یعنی شیطان کی چال کو ناکام بنا دے۔ یہی ہے وہ مفہوم جو اس مثل میں بیان کیا گیا ہے کہ میں تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیتا ہوں کیونکہ اس کی

مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو اس کے دشمنوں نے قید کر دیا ہو ہاتھ گردن میں باندھ دیے ہوں تو وہ کہے : میں اپنی جان بخشی کے عوض اپنی تمام دولت نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس طرح فدیہ دے کر وہ اپنی جان چھڑا لے۔

ذکرِ الٰہی انسانی نفوس کی زندگی کی بنیاد اور اس کی قوت کا ستون ہے اور شیطان انسان کا سب سے خطرناک اور بدترین دشمن ہے وہ برابر اسے اللہ سے پھیرنے کی تدبیریں کرتا رہتا ہے، اس کے اندر شر کی وسوسہ اندازی کرتا ہے اور شہوتوں کو خوشنما بنا کر اس کے سامنے پیش کرتا ہے اگر انسان اس کی بات مان لے تو وہ خدا کو بھول بیٹھتا ہے اور خدا اسے بھلا دیتا ہے اور الہامی زندگی کا سلسلہ اس سے منقطع ہو جاتا ہے، نتیجہ میں اس کا دل کمزور ہو جاتا یا مر جاتا ہے پھر اس کے پاس طاقت نام کی کوئی چیز نہیں رہ جاتی اور دل مردہ انسان کو روحانی طاقت سے کبھی ہمکنار نہیں کر سکتا۔ زندگی دل میں ہوتی ہے، یہ دھڑکتی ہوئی نبض یا بہنے والے خون کا نام نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری زندگی خیر و صلاح کے لئے نرمی اور حق و صداقت کی طرف پیش رفت کا نام ہے۔ اگر دل کے اندر یہ زندگی موجود ہے تو پھر انسان حق و خیر کا بیباک سپاہی بن کر جیتا ہے پوری زندگی میں اخلاقی اصولوں کا دامن تھامے رہتا ہے، شر کی طاقتوں کے خلاف سراپا جہاد بن جاتا ہے اور باطل فوجوں کے لئے شعلہ جوالہ بن جاتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ (توبہ: ۱۲۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں)

فتنہ وفساد کی تخم ریزی کرنے والوں پر غیظ وغضب کی بجلی بن کر گرتا ہے اور ان کے تمام خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ اس زندگی کے سوا جو بھی زندگی ہے وہ اُن مردوں کی زندگی ہے جو زندوں میں محض ظلم یا جہالت کی وجہ سے گنے جاتے ہیں۔ اور دل زندہ اپنی زندگی بلکہ بہادری و بے خوفی کا راز اللہ کے حضور سے اخذ کرتا ہے اور شیطان کے نزدیک اس سے زیادہ مبغوض اور قابلِ نفرت چیز اور کوئی نہیں ہے۔ وہ کسی بھی لمحے انسان کو زندگی کے حقیقی سرچشموں سے دور رکھنے میں نہیں چوکتا اور اسے ذکر الٰہی سے غافل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ انسان دراصل اس کے دلِ زندہ کا نام ہے جس کے پاس یہ دل نہ ہو وہ انسان نہیں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جس کا دُنیا میں اور آخرت میں بھی کوئی وزن نہیں ہے۔

دل مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اس لئے رحمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ وہ ہمیں اس اہم خطرہ کی طرف متوجہ کرے اور اس سے بھاگ کر ذکر الٰہی کے قلعہ میں پناہ لینے کی تلقین کرے:

فَفِرُّوٓا إِلَى ٱللَّهِ ۖ إِنِّى لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ (ذاریات: ۵۰)

(پس دوڑو اللہ کی طرف، میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبر کر دینے والا ہوں)

حدیثِ قدسی ہے:

"میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور اس کے دونوں ہونٹ میری یاد میں ہلتے ہیں۔"

اور جو اللہ کی معیت میں ہوتا ہے وہی طاقتور اور غالب ہوتا ہے جس کی قوت کے سامنے بڑے سے بڑا دشمن نہیں ٹھہر سکتا چاہے جن وانس سارے کے سارے مل کر اس سے مقابلہ کرنے پر اُتر آئیں، یہی مفہوم ہے اس حدیث قدسی کا:

"میرا بندہ ہر وہ بندہ ہے جو مجھے یاد کرتا ہے جب وہ اپنے کسی ہمسر دشمن سے بھڑتا ہے۔"

جب یہ معزز اور متبرک معیت انسان کو ہر طرح کی طاقت سے نوازتی ہے تو لازماً اسے ہر اس شیطان یا انسان سے محفوظ رکھے گی جو اسے نقصان پہنچانا چاہے گا۔ یہی مفہوم ہے اس مثل کا کہ:

"اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی شخص کے تعاقب میں دشمن دوڑ رہا ہو یہاں تک کہ ایک مضبوط قلعہ تک اس کی رسائی ہوگئی اور اس میں داخل ہو کر اس نے اپنی جان بچالی، اسی طرح بندہ شیطان کی چالوں سے اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب وہ اللہ کو یاد کرتا ہو۔"

عام امثال

یہاں دو مثالیں بیان کی گئی ہیں ایک قرآن پاک سے اور دوسری سُنّت سے۔

اب ہمیں چند ایسے امثال بیان کرنے ہیں جو اس بلند پایہ کے نہیں ہوں گے،

فرض کیجئے آپ عوام کے سامنے اللہ کے تعزیری قوانین اور اس کے عادلانہ حدود پر گفتگو کر رہے ہیں کہ کس طرح اسلام نے ان حدود کے ذریعہ برائی کا استیصال کیا اور جرائم کی بیخ کنی کی۔ پھر آپ نے سوچا کہ ان کم عقلوں کو بھی سمجھاتے چلیں جو یہ اعتراض

کرتے ہیں کہ ان حدود میں وحشت و بربریت ہے اور ظلم ہے۔ تو ایسے موقعہ پر آپ بھی وہی جواب دے سکتے ہیں جو ایک اخوانی بھائی نے دیا۔ اس نے کہا: ایک دور اندیش حکیم اور ڈاکٹر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مریض کا ایسا علاج کرے جس سے اس کی بیماری دور ہو اور اس کو مکمل صحتیابی نصیب ہو۔ اگر علاج کا تقاضا یہ ہو کہ اسے تلخ دوائی پلائی جائے تو اس میں کوئی تردّد نہ کرے۔ اگر وہ ایسے موقعہ پر تلخ دوائی نہیں پلاتا ہے تو وہ مریض کے ساتھ خیانت اور غدّاری کرتا ہے۔

اور اگر علاج کا تقاضا یہ ہو کہ وہ اس کا پیٹ چاک کرے یا اس کے کسی عضو کو کاٹ دے تو یہ بڑی جہالت کی بات ہوگی کہ ہم اسے سنگدلی اور بربریت کہیں۔ یہ تو حد درجہ رحمت اور شفقت ہوگی کہ مریض بے چارے کی زندگی اور صحت واپس آجائے۔

اور اگر علاج کا تقاضا یہ ہو کہ اس کی زندگی بچانے کے لئے اس کی ایک انگلی یا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے تو حکمت و عمل کا تقاضا یہی ہے کہ اسے جلد از جلد جسم سے الگ کر دیا جائے جسے ظاہر بیں نگاہیں سنگدلی اور بربریت کہہ رہی ہیں۔

اگر ڈاکٹر کے اس فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا بلکہ مصلحت اور مفاد کی رو سے اسے ضروری سمجھا جاتا ہے تو ان معترضین کو یہ کیسے سوجھتی ہے کہ وہ دُور اندیشی اور حکیم قانون ساز پر اعتراض کریں جو قانون کے نفاذ کے ذریعہ انارکی اور برائی کا استیصال کرنا چاہتا ہے؟ کیا ایک طبیب اور قانون ساز میں کوئی فرق ہے؟ پہلا جسمانی امراض کا علاج کرتا ہے جبکہ دوسرا معاشرے کے امراض کی بیخ کنی کرتا ہے۔ ڈاکٹر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مریض کو بیماری سے نجات دلائے، اس کے لئے بہتر قواعدِ صحت بنائے جس کی اتباع مریض اپنے کھانے پینے میں، سونے جاگنے میں حتیٰ کہ پوری زندگی میں رضا کارانہ طور پر کرے۔

نظر ڈالتا ہے اور اسی لحاظ سے احکام اور حقوق واجب کرتا ہے۔ سوسائٹی اسلام کی نگاہ میں ایک عمارت ہے جس کے ستون عقیدہ، اقتصاد اور عمل ہیں۔ یہاں اقتصاد سے مراد عوامی دولت ہے، یہ دولت اصل میں اللہ کی ہے اور اس کی جانب سے سوسائٹی کو عطا ہوئی ہے تاکہ عقیدہ کے مطالبات کی تکمیل اس کے اداروں اور نقوش کی تقویت اور ان کے دفاع میں اسے استعمال کیا جاسکے۔ نتیجہ کے طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ نقطۂ نظر پرورش پاتا ہے کہ عوامی دولت ان کے عمومی مسائل کے لئے سرمایۂ گزارہ ہے اور اس سے ان کی عوامی ضروریات تکمیل پاتی ہیں اور یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے سارے لوگوں کی فکر اور وجدان وابستہ ہے اور ہر شخص اپنے دل میں اپنی زندگی میں مال کی اہمیت پر ایک گہرا احساس اور دوٹوک نقطۂ نظر رکھتا ہے، اس کی بقاء پر خوش ہوتا ہے اسے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے کی تدابیر کرتا ہے اور اسے بربادی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اس لئے کہ وہ دراصل اپنے کو تباہی سے بچا رہا ہوتا ہے اسی طرح اس اجتماعی تضامن اور تحفظ میں پوری ملت جسد واحد نظر آتی ہے جس کے ایک عضو میں تکلیف ہو جائے تو درد اور بخار میں سارے اعضاء شریک ہوتے ہیں۔ یہ ہے "باہمی تعاون" کی حقیقت۔ تعاون یا تضامن محض کوئی تجویز نہیں ہے جسے کوئی مصلح پیش کر دے نہ محض کوئی قانونی فلسفہ ہے جو اجتہاد کرنے والے یا قانون بنانے والے کے ذہن کی پیداوار ہو یہ تو ایک "معنوی کائناتی حقیقت" ہے جسے اللہ عزّ وجلّ پر ایمان ویقین سینوں میں پیدا کرتا ہے۔ یہاں مسئلہ اچھے یا برے قانون کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے تمام افراد میں اس احساس کی وحدت کیسے پیدا کی جائے اور دلوں میں اس کی حقیقت کو کیسے راسخ کیا جائے اسی طرح کہ ہر فرد اپنے یقین و وجدان کے ساتھ عمومی دولت کی حفاظت کرے اور یہ نکتہ ہمیشہ اپنے

اسی طرح قانون ساز کی بھی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کو اس کے امراض سے نجات دلائے اور اس کے لئے بہترین قواعد و آداب اور نفسیاتی، اجتماعی، سیاسی اور مالی وغیرہ ایسے حدود تجویز کرے جن سے انتشار اور انارکیست کے عناصر کی بیخ کنی ہو سکے، معاشرے کی تعمیر ممکن ہو سکے اور لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ اور امان حاصل ہو سکے۔

جس طرح ہم ڈاکٹر کی کامیابی کا پیمانہ مریض کی صحتیابی اور اس کی تندرستی کی بحالی کو قرار دیتے ہیں اسی طرح ضروری ہے کہ ہم قانون ساز کی کامیابی کو اس تحفظ، انتظام اور انسانی ترقی اور روحانی بلندی سے ناپیں جو معاشرے میں پنپ رہی ہوں۔

جس طرح ایک ڈاکٹر سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ تلخ دواؤں کا استعمال اسی وقت کروائے گا جب کسی اور دوا کے استعمال سے بات بنتی نظر نہ آ رہی ہو اور اعضاء کو کاٹنے اور پھاڑنے پر اسی وقت آمادہ ہو گا جب اس کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اسی طرح مشترع یا قانون ساز سے ہمیں یہ پوری امید رکھنی چاہیئے کہ وہ انسانی معاشرے پر سختی اسی وقت کرے گا جب انسانی طبیعتوں کی آزادی سے معاشرہ کو نقصان پہنچے گا یا اس کے خاص و عام مفادات کو ٹھیس لگے گی اور بڑی سزاؤں کا نفاذ اسی وقت کرے گا جب ہلکی اور معمولی سزائیں برائی کو اکھاڑنے اور عدوان و سرکشی کو ختم کرنے میں ناکام ثابت ہوں گی۔

اور اسی طریقہ کار کو اسلامی قانون ساز ہستی یا انسانی معاشرہ کے ڈاکٹر نے اختیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر چوری کی حد نافذ کرنے سے پہلے اس نے حکومت کے جمع کردہ مال میں ہر محتاج کا حق ٹھہرایا جو دراصل اللہ کی دولت ہے، اگر وہ بے روزگار ہو تو اگر وہ تجارت کرنے والوں میں ہے تو حکومت اسے قرض دے گی یا مزدوروں اور

صنعت کاروں میں سے ہے تو حکومت اس کے لئے کام تلاش کرے گی یا کام نہ ملنے تک اسے بقدر ضرورت گزارہ مہیا کرے گی، اگر اسے جانی یا مالی نقصان ہو جائے تو حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے سہارا دینے کی کوشش کرے اور اگر وہ بوڑھا ہو جائے اور کام کرنے کے لائق نہ رہ جائے اور اس کے پاس گزارے کے لئے دولت بھی نہ ہو تو بیت المال سے اس کے حقوق ادا کئے جائیں گے۔ اگر وہ وفات پا جائے اور بے یار و مددگار کمزور اولاد چھوڑ جائے جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو تو حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ ان کے نان و نفقہ اور تعلیم کا بندوبست کرے تا آنکہ وہ اللہ کے فضل سے بے نیاز اور مالدار ہو جائیں۔

یہ ہے وہ رُوح جو اس مسئلہ میں کام کر رہی ہے۔ اگر حکومت کا بیت المال محتاجوں اور مستحق لوگوں کی ضروریات کا کفیل نہ بن سکے تو حکومت کو قانون بنا کر یا ہتھیاروں کے بل پر بزور مال داروں سے اتنی دولت وصول کرنی چاہیئے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو سکے۔ اب اس سے زیادہ کون سا نظام انسانوں کے لئے سہولیات مہیا کر سکے گا؟ اور اس کے بعد اگر شریعت یہ کہتی ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ (مائدہ: ۳۸)

(اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔)

تو یہ عین حکمت اور انتہا درجے کے عدل کا تقاضا ہے۔

شارع حدود اور قصاص کے بارے میں سوسائٹی کی تعمیر کے نقطۂ نظر سے جرائم پر

ذہن میں رکھیے کہ اس عوامی دولت کا اس کے مفادات سے گہرا تعلق ہے اور اس کی ترقی اور بلندیٔ رتبہ سے اس کا زبردست رشتہ ہے۔

جب یہ احساس زائل ہو جاتا ہے، یہ یقین سرد پڑ جاتا ہے، باہم تعاون کے محرکات کمزور پڑ جاتے ہیں اور اخوّت و وحدت کے رابطے ڈھیلے ہو جاتے ہیں تو خود غرضی اور انفرادیت اس کی جگہ لے لیتی ہے اور مفاد پرستی پوری سوسائٹی میں، حسد و حرص، افتراق و انتشار اور غیروں کے جان و مال کی حلّت کے جراثیم پھیلا دیتی ہے پھر کسی کی جان محفوظ نہیں رہتی، کسی کی آبرو اور عزّت کسی وقت بھی لٹ سکتی ہے، اگر ایسی صورت میں حاکمِ وقت پہلی ہی فرصت میں اس انتشار کی طرف توجہ نہ دے اور شر کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش نہ کرے تو یہ خطرہ پھیل جاتا ہے اور پوری عمارت کے ستون متزلزل ہونے لگتے ہیں، پھر کوئی سوسائٹی نہیں رہتی نہ کوئی عقیدہ محفوظ رہتا ہے۔ بس چوروں اور ڈکیتوں کی جماعتیں لوٹ مار کرتی نظر آتی ہیں، قانون کی خلاف ورزیاں کرتی ہیں اور تہذیبِ جدید کے نت نئے آلات اور تباہ کن اسلحہ جات سے مسلّح ہوتی ہیں یہ ہے اسلام کی میزان میں قوموں کی ہلاکت کی حقیقت۔ اب اگر اسلام چور کا ہاتھ کاٹ کر پورے معاشرے کو محفوظ رکھتا ہے اور مال و دولت کی ملکیت کی پوری حفاظت کرتا ہے تو یہ کسی فردِ واحد کی سرکشی اور مال پر اس کے ناجائز قبضہ پر ہی نہیں نظر ڈالتا بلکہ اس بڑے خطرہ پر اس کی نگاہیں مرکوز رہتی ہیں جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔

یہ حکیمانہ روح اسلام کے تمام احکام و قوانین اور حدود و تعزیرات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ یہ ہر فطرت کے طبعی حقوق معتدل ترازو میں تول کر عطا کرتا ہے نہ اسے محروم رکھتا ہے نہ حد سے آگے بڑھنے دیتا ہے اور اگر کسی فرد کو رعایتیں دیتا ہے تو اس کی

حدود اور نافرمانی کی صورت میں اس کی سزائیں اس کا گریبان پکڑ لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ کہتا ہے کہ:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ

(نساء: ۳)

(جو عورتیں تم کو پسند آئیں، اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو)

تو ہر وہ شخص جو زنا کا مرتکب ہو اس کے لئے کوڑے یا پتھر مار کر ہلاک کر دینے کی سزا بھی نافذ کرتا ہے۔

اب اگر ہمارے قانون ساز اور ان معترضین کے قانون ساز کی کامیابی دیکھنی ہو تو ہم ایک دوسرے سے پوچھیں کہ ہماری شریعت نے فقراء اور محتاجین کو کس قدر شکم سیر کیا ہے اور ان کے قانون نے کس حد تک پیش رفت کی ہے؟ چوروں کی جڑ کاٹنے میں ہم کس حد تک کامیاب ہیں اور ان کی کامیابی کا کیا حال ہے؟ ہمیں سوال کرنا چاہیئے کہ ہم نے عورتوں کو پاکیزہ اور ناموس کو محفوظ رکھا لیکن تم لوگوں نے کیا کیا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ برائی کا استیصال کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو؟ سوسائٹی کو ان تمام رذائل سے پاک کر دیا ہے؟ اور شادی بیاہ کے مسئلوں کو حل کر دیا ہے؟ اور ان میدانوں میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے کیا تم اس حد تک پہنچ سکے؟

کیا تم اس کا جواب اثبات میں دے سکتے ہو جبکہ غیر شادی شدہ بوڑھے اور جوان تم سے اپنے مسائل کا رونا رو رہے ہیں اور اپنی عزت و ناموس کے لئے بے چین اور پریشان ہیں تو کیا یہ لوگ امن و امان میں ہیں؟ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تمہارے قوانین اور تمہاری

سزاؤں نے برائی کا استیصال کر دیا ہے؟ اور گھٹیا اور کمینہ افراد کو اعتدال اور عفت کی حدود سے چمٹے رہنے کا پابند بنا دیا ہے؟

اگر نہیں ـــــ اور یقیناً نہیں ـــــ تو وہ قانون ساز ناکام یا غدّار ہے۔ اس قانون ساز کی مثال اس ڈاکٹر کی سی ہے جو مریض کو صحتیاب کرنے میں ناکام ہو چکا ہو یا خیانت کا ارتکاب کر بیٹھا ہو۔ اس کی شیریں دوائیں اس کے منہ پر مار دیجئے کیونکہ وہ اپنے مریض کا علاج کرنے میں ناکام رہا یا اس نے کوتاہی سے کام لیا ـــــ ہم تو بس ایک ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جو صحتمند ہو تمام برائیوں سے اور امراض سے پاک وصاف ہو، اس راہ میں جس علاج کی بھی ضرورت ہوگی، حکمت و مصلحت کے ساتھ اس کو اختیار کرنا واجب ہوگا۔ ورنہ فتنہ و فساد اور انتشار و انارکیت پھیل جائے گی:

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥٠﴾ (قصص: ۵۰)

(اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے، اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا)

فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿٤٩﴾ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ

حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (مائدہ : ۴۹، ۵۰)

(پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو بتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے)

یہ مثل جو قانون ساز کو ڈاکٹر سے تشبیہ دیتی اور ان میں سے ہر ایک کے عمل کو دوسرے کے مقابلہ میں رکھ کر تجزیہ کرتی ہے۔ دلوں میں معنیٰ و مفہوم کو پوری طرح جاگزیں کر دیتی ہے اور ہر انکاری یا ہٹ دھرم کو خاموش کر دیتی ہے۔

واقعاتی امثال

ضرب الامثال کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ حادثات و واقعات کو عبرت پذیری کے لئے بیان کیا جائے۔ اور اس میں اور داستان گوئی میں بڑا فرق ہے۔ قصے اور داستانیں اس لئے بیان کی جاتی ہیں تاکہ ان سے مفہوم واضح ہو جائے اور تعلیمات ذہنوں میں بیٹھ جائیں، قصہ بیان کرنے کا مقصد دراصل حقائق کی توضیح اور انہیں عملی شکل میں زندہ روپ دینا ہے۔ لیکن حادثات و واقعات کو عبرت پذیری کے لئے بیان کرنے کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو قصوں کے بیان کرنے کا ہوتا ہے بلکہ یہاں مقصود محض انجام کی یاد دہانی اور آخری نتیجہ پر غور کرنے کی دعوت دینا ہے دلوں کو ان کی بد روش سے ڈرا کر باز رکھنا

اور ان کے برُے انجام سے متنبہ کرنا یا خوش انجامی کی بشارت سنانا اور اس کی ترغیب دینا مقصد ہوتا ہے۔ ضرب الامثال کی یہ قسم ہم قرآن کریم سے اخذ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے بہترین مقامات پر اس کو استعمال کیا ہے۔

اللہ کی نعمت کی ناشکری اور اس کے حقوق کی عدم ادائیگی، اس نعمت سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے اور اس کے بعد زندگی بڑی تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ اللہ کی سُنّت ہے جو اس کی مخلوقات میں رائج ہے، ہم قرآن کریم میں اسے پڑھتے ہیں اور اس کا مصداق زندگی کے روزمرّہ معاملات میں دیکھتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ (ابراہیم: ۲۸)

(تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور (اپنے ساتھ) اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (نحل: ۱۱۲)

(اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اُس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان

کے کرتوتوں کا یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھاگئیں)

اہلِ عرب مملکتِ سبا اور اس کے باشندوں کی خوشحالی و فارغ البالی سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ وہ سیلاب کیسے آیا تھا جس نے ان کی زمینیں تلپٹ کردی تھیں، ان کے مکانات اجاڑ دیئے تھے، ان کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا تھا اور انہیں سخت کوش زندگی کی تلاش میں دشت نوردی کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اہلِ عرب میں یہ ضرب المثل بن گیا تھا چنانچہ ہر وہ جمعیت جو منتشر ہوگئی ہو اس کی مثال وہ یوں بیان کرتے تھے کہ تَفَرَّقَتْ اَیْدِیْ سَبَاٍ (یہ لوگ سبا کی طرح منتشر ہوگئے۔) چونکہ اہلِ عرب ان ساری باتوں سے واقف تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے عبرت آموزی کے لئے ان کے حالات بیان کیے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِىْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۥ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَىْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَىْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۝ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۚ وَهَلْ نُجٰزِىْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝ (سبا: ۱۵، ۱۶، ۱۷)

(سبا کے لئے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور بائیں، کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجالاؤ اس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے آخرکار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور

باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا۔ اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔)

ضرب الامثال کی یہ قسم عوام میں بہت رائج ہے۔ یہ ان کے نصائح و مواعظ میں بہت استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کی مثالیں نقل کر کے اسے طویل بنانا صحیح نہیں ہے۔ افراد اور قوموں کے حادثات و واقعات میں طالبان عبرت کے لئے بہت کچھ سامان موجود ہے البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ حادثہ جتنا زیادہ قریبی ہوگا، اور ذہنوں میں موجود ہوگا اس کا اتنا ہی اثر زیادہ پڑے گا اور عبرت آموزی کے لئے اتنا ہی زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔

علامتی کہانیوں کا استعمال

ضرب الامثال کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ علامتی قصوں اور کہانیوں کا استعمال کیا جائے۔ یعنی ایسے قصے بیان کئے جائیں جن کا ظاہری مفہوم مراد نہ لیا جائے بلکہ مطلوب اسی قصے میں پوشیدہ ہو جس کی طرف کہانی ختم کرنے کے بعد اشارہ کیا جائے یا اس کا آغاز کرنے سے پہلے ہی اسے بتا دیا جائے۔ اور ہم داعی کو اس اسلوب کے بکثرت استعمال کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس لئے کہ اکثر ایسے مقامات اور موڑ دعوت کی زندگی میں آتے ہیں جن میں کھل کر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی ایسے موقعوں پر قصوں اور کہانیوں کی مدد سے اشارے اور کنائے کی زبان میں اپنی بات کہنی پڑتی ہے۔ پھر اس میں جدت، ندرت اور دل و دماغ کی دلچسپی کا سامان بھی پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کہانی کار اپنی کہانی میں ایسی باتیں

کہہ دیتا ہے جو عام طور پر غیر مانوس ہوتی ہیں، عقل میں آنے والی نہیں ہوتیں لیکن ان سے قصے اور کہانی میں جان پڑ جاتی ہے، اس کا مزہ اس کی حلاوت اور اس کی جدت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور عقل اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور جب قصہ یا کہانی اختتام پذیر ہوتی ہے عقدہ کھل جاتا ہے اور رموز و کنایات واضح ہو جاتے ہیں تو عقل و دماغ میں اور دل و ذہن میں روشنی دوڑ جاتی ہے اور دل اس کی معقولیت پر مطمئن ہو جاتا ہے —— بھلا اسے اطمینان کیوں نہ ہوگا جبکہ آپ نے ایک چیز کی تفسیر دوسری چیز سے کی ہے اور غیر معقول حالات اور باتوں کو معقول بنا کر پیش کیا ہے اور اس کی گواہی میں انسان کی ان تمام غیر معقول حرکتوں اور افعال کو رکھ دیا ہے جنہیں وہ انجام دیتا ہے لیکن اسے شعور نہیں ہوتا۔ جب سننے والا اس زبردست تضاد کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے تو اس کی عجیب حالت ہو جاتی ہے اور اس کے اس احساس اور اضطراب کو پیدا کرنے میں آپ کی باتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

ہم تھوڑی سی تمہید کے بعد ضرب الامثال کی اس قسم یعنی علامتی امثال کا ایک نمونہ یہاں پیش کریں گے۔

اکثر لوگ دنیوی زندگی کی زینت و آرائش سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اس کی ظاہری چمک دمک سے مسحور ہو کر اسے اپنی زندگی کا مقصد اور اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز و محور بنا لیتے ہیں، اس کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرتے، اسی کے غم میں گھلتے نظر آتے اور اسی کو جمع کرنے اور اضافہ کرتے رہنے میں مست رہتے ہیں اور اسی میں اپنے تمام اوقات اور احساسات کا سرمایہ لٹا دیتے ہیں۔ آخرت کی طرف ان کا دھیان بالکل نہیں جاتا اور اس کے لئے کوئی کام کرنے کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ ایک طرف وہ دنیا کو ناز و نعمت سے آراستہ پاتے ہیں تو دوسری طرف آخرت انہیں تنگ، بے آب و گیاہ صحرا اور بربادی و بیکاری کا

مرکز نظر آتی ہے۔ یہ انسان کی کج فہمی، اس کی فاسد تدبیر اور اپنے اس انجام سے لاپروائی کا نتیجہ ہے جس سے اسے بہر صورت دوچار ہونا ہے۔

یہ ایک صحیح اور لاریب حقیقت ہے لیکن اسے سیدھے سادھے طریقے سے اسی طرح بیان کر دیا جائے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے تو غفلت کے پردوں میں پڑے ہوئے مست و بے خوف انسانوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ مفہوم ہم مشہور زاہد ابو حازم کی اس نصیحت میں بھی پاتے ہیں جو انہوں نے سُلیمان بن عبد الملک کو کی تھی۔ اس نے پوچھا: اے ابو حازم! ہم موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: "اس لئے کہ تم نے اپنی دُنیا بنائی ہے اور اپنی آخرت کو اُجاڑ رکھا ہے اور ہر انسان آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہونے سے گھبراتا ہے۔"

اس نصیحت کا دلوں پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے لیکن وہ تاثیر اس میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ذیل کے قصّوں میں موجود ہے جب آپ اس کے پُر کشش اسلوب میں اس مفہوم کو بیان کریں گے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایک سلطنت کے باشندوں کا یہ معمول تھا کہ کسی شخص کو متعیّن مدّت کے لئے بادشاہ بناتے اور جب اس کی بادشاہت کی مدّت ختم ہو جاتی تو پہلے سے طے شدہ شرط کے مطابق اسے بے آب و گیاہ صحرا میں چھوڑ دیتے، جہاں اسے زندگی کی کوئی چیز دستیاب نہ ہوتی۔ کھانا پانی دور دور تک نہ ملتا نہ کہیں سے اس تک پہنچانا ممکن ہوتا۔ نتیجے کے طور پر وہ بے چارہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا ——————

—————— ایک بار ان کے پاس سے ایک اجنبی سیّاح کا گزر ہوا اس نے ان لوگوں کو حیرت و اضطراب اور پریشانی میں مبتلا دیکھا تو وجہ پوچھی۔ اُنہوں نے

بیک زبان ہو کر کہا: ہمیں کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جسے ہم بادشاہ بنالیں، نہ کوئی ہمارے ملک کا نہ باہر کا شخص ہماری بادشاہی کو قبول کرتا ہے تو کیا تم ہم پر بادشاہی کرنے پر راضی ہو؟ اُس شخص نے کہا: کیوں نہیں؟ کیا کوئی عقلمند شخص اس سے انکار کر سکتا ہے؟ ان لوگوں نے پوچھا: کیا تم کو وہ شرط معلوم ہے جو ایسے بادشاہ کو ماننا ضروری ہے؟ اور کیا تم جانتے ہو کہ اس کا آخری انجام کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا: تم لوگ کیا شرطیں لگاتے ہو؟

لوگوں نے کہا: فلاں اور فلاں شرطیں ہیں۔ آدمی کو بڑی حیرانی ہوئی، تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر پوچھا کیا اس کے علاوہ کوئی اور بھی شرط ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں، بس یہی شرط ہے۔ اس نے پھر سے سوچا، غور و فکر کیا، وہ بڑا دُور اندیش اور زیرک تھا اس نے بہت دیر کے بعد سر اُٹھایا اور کہا: میں بادشاہی قبول کرتا ہوں۔

یہ سیّاح ملک کے انتظامات کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ اس نے حکیمانہ سیاست اپنائی، لوگوں کے اندر عدل و انصاف قائم کیا اور لوگ خوش ہو گئے اور ان کے معاملات درست ہو گئے، ان کی دولت میں اضافہ ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بادشاہی کی زینت و آرائش اور سلطانی کے ٹھاٹ باٹ میں وہ کھو کر اپنے اس انجامِ بد سے غافل نہیں ہو گیا جس کا اسے بے آب و گیاہ صحرا میں انتظار میں تھا۔ اس نے اس صحراء کی آبادکاری کا نظم قائم کیا اور اس کے لئے جدّ و جہد شروع کر دی۔ وہاں انجینیروں اور معماروں کا ایک وفد بھیجا تاکہ وہاں باغات، نہروں اور محلات کی منصوبہ بندی کرے۔ وہاں مزدور، اوزار، مویشی اور تمام ضروری اسباب و وسائل مہیا کئے اور جلد ہی یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ نہریں جاری ہو گئیں، تالاب کھدوا دیئے گئے، ان میں شیریں پانی بھر دیا گیا، پیڑ پودے لگا دیئے گئے،

کسان مختلف قسم کی فصلیں بونے اور کاٹنے لگے بادشاہ کے لئے وہاں ایک خوبصورت محل اور دوسرے لوگوں کے لئے جو وہاں رہنا پسند کریں، چھوٹے چھوٹے محلات تعمیر کر دیئے گئے یہاں تک کہ وہ بے آب و گیاہ صحرا جنت کا سماں پیش کرنے لگی۔

دن گزرتے رہے، مملکت کے عوام بادشاہ کی ان سرگرمیوں سے ناواقف تھے یہاں تک کہ بادشاہی کی مدت ختم ہوگئی تو لوگ اس کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اے بادشاہ آپ کی مدت ختم ہو چکی ہے اس لئے آپ صحرا کی طرف کوچ کر جائیں۔ بادشاہ نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اسے قبول کر لیا اور مسکرا اٹھا۔ لوگوں کو اس کی ثابت قدمی سے بڑی خوشی ہوئی کہ اسے ذرا بھی پریشانی لاحق نہ ہوئی نہ اس کی نگاہ ڈر کی وجہ سے پیلی ہوئی۔ لوگ اسے لے کر صحرا کی طرف چل پڑے۔ انہیں بڑا تعجب تھا کہ بادشاہ اتنا زیادہ مطمئن اور خوش کیوں ہے کیونکہ انہیں اس خوشی کا راز معلوم نہ تھا۔ جب وہ لوگ صحراء میں داخل ہوئے تو وہاں باغات، نہروں اور کھیتوں کی ایک جال پھیلی ہوئی دیکھی اور اس نازو نعمت کے ساتھ محلات اور رہائش گاہیں بھی نظر آئیں، وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ کی طرف دوڑے اور اس سے اس مسحور کُن منظر کی حقیقت دریافت کی تو اس نے کہا: مجھ سے پہلے جن لوگوں نے بادشاہی کی وہ چند روزہ لذت میں مست رہے اور اپنے اس آخری انجام سے غافل رہے، اس کی شناعت اور ہولناکی سے بے خبر رہے جس کی وجہ سے وہ سب فنا ہو گئے لیکن میں اس انجام سے کبھی ایک پل کے لئے بھی غافل نہ ہو سکا مجھے اس کی برابر فکر لگی رہی اور میں اس کا انتظام کرتا رہا، یہاں تک کہ جب بادشاہی کی مدت ختم ہوگئی تو میں اس جنت نما مقام تک منتقل ہو گیا جس میں نعمت و خوشحالی اور بہترین اسباب و وسائل موجود ہیں۔

مملکت کے باشندے اس بادشاہ کی کارگزاریوں سے خوب خوش ہوئے اور پکار اُٹھے: اے دُور اندیش بادشاہ! آپ حکمت وعقل والے شخص ہیں، آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ہمارا بادشاہ ہونے کے لائق نہیں ہے۔ واپس چلئے اور تختِ سلطنت پر متمکن ہوجایئے ہم آپ کی اطاعت و فرماں برداری بجالائیں گے۔

آپ اس قصے میں کچھ غیر معقول باتیں پائیں گے لیکن خیال اور تصور انہیں عمدہ سمجھے گا۔ جیسے اہلِ مملکت کی یہ شرط کہ جو بھی بادشاہ ہوگا ایک متعین مدت کے بعد اسے معزول کردیا جائے گا اور لامحالہ اسے صحرا میں جانا پڑے گا، یہ شرط بڑی عجیب سی ہے عقل اسے قبول نہیں کرتی لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ ہم میں سے ہر شخص اس دنیوی زندگی کو یقیناً چھوڑ کر جانے والا ہے اور متعین مدت کے بعد اس کی زینت و آرائش سے محروم ہوجانے والا ہے۔ اسے قبر کی وحشت اور تنہائی سے لازماً دوچار ہونا ہے۔ تو کیا یہ اس بادشاہ کی حالت سے کم تعجب خیز ہے جو شان سلطانی سے صحرا کی تنہائی میں منتقل کردیا جاتا تھا؟ آپ دیکھتے نہیں کہ کس قدر ان دونوں حالتوں میں مطابقت ہے؟ اس سے ذہن مطمئن ہوجاتا ہے اور انسانی عقل کچھ عجیب وغریب حقائق سے متنبہ ہوتی ہے جس سے وہ پہلے غافل تھی۔ یہ مثل اس کے ذہن کے پردے کو ہٹا دیتا ہے اور اس کی غفلت کو چاک کردیتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس طرح کے قصوں کو بیان کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اس رمزیاتی قصہ کے بقیہ حصوں کا تجزیہ کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ خود واضح ہیں ـــــ،

آپ بہت سے افسانوی اور خیالی قصوں کو اس مقصد کے لئے بیان کرسکتے ہیں بشرطیکہ اپنے مطلب اور مقصود کے لئے ان کا انتخاب کرسکیں۔ میں نے مشہور روسی فلسفی ٹالسٹائی

کی ایک کہانی اس کی کتاب میں پڑھی اور وہ مجھے بہت پسند آئی۔

اس نے اپنی کتاب میں مالداروں کے طبقہ پر زبردست چوٹ کی ہے جو حکومت کے اسباب و وسائل پر قابض تھے ان پر حملہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ خوش حال اور خوش پوش لوگ زندگی میں کوئی کام نہیں کرتے، مزدوروں پر بوجھ بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ مزدور طبقہ ہی سماج کا عاجز و درماندہ اور غریب ترین طبقہ ہے اس کے باوجود حکومت اور اختیارات خوش حال طبقہ کو ملتے ہیں اور محتاجی و رسوائی دوسروں کے حصے میں آتی ہے یہ خوش حال لوگ بھلا زندگی کو کیا دیتے ہیں؟ زندگی تو نام ہے محنت اور عمل کا، کشمکش اور جدّ و جہد کا، زمین کی تہوں سے رزق نکالنے یا ہتھوڑوں کی ضرب سے کمائی کرنے کا نام زندگی ہے جو شخص محنت کرے کمائی میں اسی کا حصہ ہے، جو بوئے وہی کاٹے اور جو کام کرے کھانے کا حق بھی اسی کو ہے تو یہ خوش حال لوگ کون سا کام کرتے ہیں؟ یہ تو اپنی صبح و شام نعمتوں اور لذتوں میں گزار دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنا دن سستی و کاہلی، لہو و لعب اور گپ شپ میں گزار دیتا ہے اور رات کھیل و تفریح، شب باشی اور خرمستی میں گنوا دیتا ہے۔ ان میں سے کس چیز کو کام کہا جاسکتا ہے جسے زندگی پسند کرتی ہو؟ ان میں سے کون سی حرکت زمین میں کاشت کرنے اور ہتھوڑا پیٹنے کے برابر ہے؟ یا ان کا کون سا اقدام پیداوار میں اضافہ اور دولت میں بڑھوتری کا ذریعہ ہے؟ حیرت ہوتی ہے ان کاہلوں اور خرمستوں پر! یہ لوگ مال کثیر، زر و جواہر کے ڈھیر، حکومت کے اختیارات پر کس طرح قابض ہو جاتے ہیں جبکہ کوئی کام یا محنت نہیں کرتے؟

اس زندگی کا بہترین حصہ تو صرف کام کرنے والوں کو ملنا چاہیئے۔ زندگی کے تمام فرزندوں کی اپنی ذمہ داری ہے جسے بہرحال اُسے ادا کرنا ہے اور یہ ذمہ داری مفید

کام کرنے اور اس ایجابی جدوجہد کو اختیار کرنے کی ہے جو ایسی قوت اور طاقت پیدا کرتی ہے جو اس کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ زندگی افراد کو اسی قدر اجرت اور معاوضہ دیتی ہے جس قدر یہ اس کو طاقت اور حیات دیتے ہیں۔ یہاں کام اور اجرت کا تناسب برابر رہتا ہے یہ لوگ جس قدر کام کرتے ہیں اسی قدر معاوضہ بھی پاتے ہیں۔ جو لوگ سب سے زیادہ کام کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ حصہ کے حقدار بھی ہوتے ہیں لیکن یہ عاجز و درماندہ طبقہ بھلا زندگی کو کیا دیتا ہے؟ اور سستی و کاہلی اور خدا کے بندوں پر اپنی خدائی جمانے کے سوا اور کون سا کام کرتا ہے؟ تو کیا زندگی کا قانون بگڑ گیا ہے؟ وہ کاہلوں، خرمستوں کو تو نواز رہا ہے اور کام کرنے والے اور خون پسینہ بہانے والوں کو محروم رکھتا ہے؟ زندگی کا قانون اتنا پسماندہ نہیں ہے؟ عاجز و درماندہ لوگوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ مزدور طبقہ کے رحم و کرم پر زندگی گزاریں اور اسی کی سخاوت اور جود و کرم کے محتاج رہیں لیکن معاملہ آخر الٹ کیسے گیا؟ صورت حال برعکس کیسے ہو گئی؟ اور محتاجی بھوک مری اور کمزوری و محرومی تو مزدور طبقہ کا نصیبہ بن گئی اور مال و دولت، اختیارات اور حکومت بیکار بیٹھ رہنے والوں کی جھولی میں کیسے گر گئی؟

یہ بیکار بیٹھ رہنے والے لوگ چونکہ کام نہیں کرتے اور دولت و ثروت اور حکومت و اختیارات ان کے گھر کی لونڈی بنی رہتی ہے اس لئے کاش یہ کام کرنے والوں کی تعریف کرتے رہتے —— ان کے حقوق کی حفاظت و پاسداری کرتے، انہیں عزت و مرتبہ دیتے اور ان کے کھانے کپڑے کا نظم کرتے —— لیکن کیا اس سے کوئی فائدہ پہنچنے والا تھا؟ یہ لوگ زندگی کو کچھ نہ دے سکنے کے باوجود اپنی غیر معمولی پوزیشن کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کام کرنے والے مزدوروں کی پیٹھوں کو حکومت کے کوڑوں سے داغدار

بھی کرتے رہتے ہیں اور اقتدار پر قابض ہونے کی وجہ سے ان کا گلا گھونٹتے رہتے ہیں، انہیں حقیر سمجھتے ہیں اور آباؤ اجداد سے ملنے والا کبر و سرکشی اُن کے اوپر آزماتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدوروں کی آنکھیں دھنسی ہوئی ہوتی ہیں، چہرے پیلے پیلے نظر آتے ہیں، پیٹ پچکے ہوئے ہوتے ہیں، جسم تھکن سے چُور اور بیماریوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ یہ درماندہ و شکستہ خوش حال لوگ مزدوروں کے کندھوں سے چمٹ کر ان پر سواری کر رہے ہیں اور چونکہ انہیں اندیشہ ہے ان کی قربانیاں انہیں اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں گی لیکن ان کی گردن پکڑے ہوئے ہیں اور دھمکی یہ دے رہے ہیں کہ اگر انھوں نے سرکشی اور نافرمانی کا اظہار کیا تو گلا گھونٹ دیں گے، ان بدنصیبوں کی داستان بہت طویل ہے اور اسی طرح یہ مزدور طبقہ کو پریشان کرتے رہیں گے۔

ٹالسٹائی نے غالباً اسی طرح کی باتیں لکھی ہیں۔ اتنی بات لکھنے کے بعد وہ الف لیلوی داستان کا ایک حصہ سُناتا ہے اور اس سے اپنی باتوں کا استشہاد کرتا ہے وہ کہتا ہے:

ان بیکار و ناکارہ افراد کا اپنے مزدوروں کے ساتھ وہی معاملہ ہے جو الف لیلہ میں ایک نوجوان کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ایک نوجوان تھا بڑا طاقتور، مضبوط اعضاء کا مالک مگر بڑا رحیم اور رقیق القلب، ایک خوبصورت اور وسیع مرغزار میں رہتا تھا۔ ایک دن اس کا گزر ایک بونے کے پاس سے ہوا جو بیمار تھا، کمزور اور نحیف، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ہاتھ بہت چھوٹے جیسے بندر کے ہوں، پنڈلیاں بہت کمزور جیسے رسّی ہوں۔ جب اس نے اس طاقتور نوجوان کو دیکھا تو آواز دی اور اس سے اپنی بیماری اور بھوک کی شکایت کی۔ منت و زاری کی اور یہ درخواست کی کہ اسے ایک دوسری جگہ پہنچا دے کیونکہ اس کے اندر چلنے کی بالکل سکت نہیں ہے۔ نوجوان کو اس کی حالتِ زار پر ترس آگیا اور اسے اپنے

دونوں کندھوں پر سوار کر لیا۔ لیکن جیسے ہی بونا اس کے اوپر سوار ہوا اپنی دونوں نحیف ٹانگیں نوجوان کی گردن کے گرد حمائل کر دیں اور اس سے کہا: نوجوان، تم مجھے ہمیشہ اٹھائے پھروگے، مجھے لے کر آؤ جاؤ گے میں تمہارے کندھے پر ہمیشہ سوار رہوں گا، مجھے لے کر نہر پر جاؤ گے میں تمہارے کندھے پر بیٹھے بیٹھے پانی پیوں گا، میں تمہیں ایک لمحہ بھی آرام کے لئے نہیں دے سکتا، تم مجھ سے ایک سیکنڈ بھی نجات نہ پاسکو گے اور دیکھو، مجھے اتار پھینکنے کا کبھی خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا اور کام تمام کر دوں گا۔ پھر نوجوان کی گردن پر اپنی پنڈلی سے دباؤ ڈالا جس سے اسے نیم جان کر دیا وہ چلا اٹھا خون اس کے چہرے پر آگیا اور اس کی دونوں آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ بونے سے درخواست کرنے لگا کہ اسے زندہ چھوڑ دے اور وہ اس کی اطاعت کرتا رہے گا، چنانچہ بونے نے اسے موت سے بچالیا۔ پھر تو بیچارہ نوجوان ہمہ وقت اس مصیبت کو اپنے کندھے پر ڈھوتا پھرتا رہا۔ اسے آرام اسی وقت ملتا جب بونا اجازت دیتا، کھانا وہی کھاتا جو اس سے بچتا، رفتہ رفتہ اس کی صحت بگڑتی گئی، اس کی زندگی وبالِ جان بن گئی اور دنیا اس پر تنگ ہو گئی لیکن بونے کو اس کی کوئی فکر لاحق نہ ہوئی کہ اس فرماں بردار سواری کا کیا حشر ہو رہا ہے!

طائرانہ امثال

امثال کی ایک قسم وہ بھی ہے جو چڑیوں اور جانوروں کی زبان سے نقل کی جاتی ہے اس طرح کی حکایتوں کا بھی سامعین کے دلوں پر اچھا اثر پڑتا ہے اس لئے کہ اس طرح کی باتیں انہی سرچشموں سے آتی ہیں جہاں حکمت و دانش نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

ہم یہاں بس ایک حکایت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک گوریا کو جال میں پھنسایا تو اس نے شکاری سے کہا: اے شخص، مجھے لے کر کیا کروگے؟ اس نے کہا: میں تجھے ذبح کروں گا پھر اسے آگ پر پکاؤں گا اور کھاؤں گا۔ گوریتے نے کہا: لیکن میں ننھی سی جان ہوں، تمہاری بھوک مٹا سکتی ہوں نہ تمہیں موٹا کر سکتی ہوں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو میں تمہیں تین بہترین باتیں بتاؤں گی۔ ایک بات میں تمہارے ہاتھ پر ہی بتاؤں گی، دوسری بات اس وقت بتاؤں گی جب میں اُڑ کر درخت پر جا بیٹھوں گی اور تیسری قیمتی بات اس وقت بتاؤں گی جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاؤں گی۔ شکاری نے کہا: ٹھیک ہے۔ سُناؤ۔ گوریتے نے کہا: پہلی بات یہ ہے کہ جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر افسوس نہ کرو۔ چنانچہ شکاری نے اسے آزاد چھوڑ دیا جب وہ درخت پر جا بیٹھی تو کہا: جب تم ایسی بات سُنو جسے عقل باور نہ کرتی ہو تو اسے صحیح نہ سمجھو۔ پھر وہ اڑ کر پہاڑ پر جا بیٹھی اور بولی: اے بدنصیب! اگر تو مجھے ذبح کرتا تو میرے پیٹ میں تیس ۳۰ درہم پاتا۔ شکاری یہ سُن کر ہاتھ ملنے لگا اور حسرت و افسوس سے ہونٹ چبانے لگا۔ پھر اس نے کہا: تیسری بات بتاؤ۔ گوریتے نے کہا: اے بھولے بھالے! کتنی جلدی تو پچھلی دو نصیحتوں کو بھول گیا، میں تجھے تیسری بات کس بنیاد پر بتاؤں؟ کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر افسوس نہ کرو لیکن تو افسوس کر رہا ہے۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اگر کوئی ایسی بات سُنو جو عقل کے خلاف ہو تو اسے تسلیم نہ کرو اور تو ہے کہ تجھے یقین ہے کہ میرے پیٹ میں تیس درہم تھے حالانکہ میرا پورا وزن مل کر بھی اتنا نہیں ہو سکتا۔

اس قصہ سے ان لوگوں کے مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے جو کسی چیز کو محض نظری طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں جب وہ میدان عمل میں آتے ہیں تو خواہشات اور ہوائے نفس

کا ان پر غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی منطق اور اپنی حکمت فراموش کر دیتے ہیں کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انسان معمولی پرندوں کے استہزاء کا بھی نشانہ بن جائے؟!

۳- آثارِ قدیمہ کی طرف توجّہ

باعمل اور بانظر عقلیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ آثار قدیمہ، پُرانی یادگاروں اور کھنڈرات پر توجہ دیتی ہے، وہاں تھوڑی دیر کے لئے ضرور ٹھہرتی ہے کسی غافل و جامد اور غیر متحرک شخص کی طرح نہیں بلکہ زندہ و متحرک اور بیدار شعور والے کی طرح وہاں رکتی ہے، ان سے سرگوشی کرتی ہے اور وہاں کے لیل و نہار کی داستانیں سُنتی ہے۔ جو شخص ایسی باعمل اور بانظر عقلیت کا مالک ہو گا وہ ان گرے پڑے کھنڈرات میں ماضی کی زندگی کے نقوش تلاش کرے گا، ان کی عظمتِ پارینہ کی وجوہ تلاش کرے گا اور ان میں نئی رُوح پھونکنے کی کوشش کرے گا۔ وہ ماضی کے لوگوں کے حرکات و سکنات کا جائزہ لے گا، ان کی باتوں پر دھیان دے گا، ان کے معاملات کا مطالعہ کرے گا اور خیر و شر کے جذبات کے درمیان ان کے اضطراب اور بے چینی پر غور کرے گا، اگر وہ ان سب چیزوں کا اہتمام کرے گا اور دلِ زندہ کا مالک ہو گا اور اس کی ذاتی زندگی درست ہو گی تو یہ محسوس کرے گا کہ آج جو لوگ زندہ ہیں، ہمارے درمیان گھوم پھر رہے ہیں، مردہ لاشیں ہیں جو بوسیدہ ہو چکی ہیں اور اسی طرح زمانے کے ساتھ گھسٹتی رہیں گی جب تک خدا چاہے گا، تو اس کا دل نرم ہو جائے گا، اس کا ذہن پگھل جائے گا اور اس کے وجود میں گداز پیدا ہو جائے گا گویا اس کے اوپر غفلت اور جمود کے ہزاروں پردے پڑے ہوئے تھے جو کھسک گئے۔

اے عظمتِ ماضی کی یادگارو! ذرا اپنے مکینوں کی خبر بھی دے دو۔ بتاؤ تو سہی

ان کے دل کیسے تھے؟ ان کے جذبات و احساسات کیا تھے؟ کیا وہ اپنے انجام سے بے خبر تھے؟ لہو ولعب اور تفریحات میں مست رہتے تھے؟ یا وہ اللہ کو یاد کرنے والے تھے؟ آخرت کی طرف برابر سفر کر رہے تھے اور منزل مقصود نگاہوں کے سامنے تھی؟

اے زندہ لوگو! یہ آثارِ قدیمہ اور یہ پرانی یادگاریں تمہیں بتا رہی ہیں کہ ان کے مکین اپنی منزل کو پہنچ گئے اور وہ زندگی سے بہت قریب تھے اور تم لوگ بھی انہیں کی طرح اپنی آخری منزل کو لامحالہ پہنچوگے اس لئے اپنے اس سفر کے لئے تقویٰ کا توشہ جمع کرلو اور ان چیزوں کا ذخیرہ کرلو جو تمہارے دلوں کی اصلاح کرسکیں اور انہیں اخروی زندگی کی حقیقت سے ہم آہنگ کرسکیں اور اس کی نعمتوں سے ہمکنار کرسکیں۔ اور دیکھو، ایسا نہ ہو کہ تم سفر شروع کرو اور تمہارے ہاتھ زادِ راہ سے خالی ہوں۔

جب آثارِ قدیمہ اور تاریخی یادگاروں کے پاس ہم یہ جذبات لے کر کھڑے ہوں گے اور ان کی آوازوں پر کان دھریں گے تو وہ ہمیں اس وسیع وعریض کائنات میں ہمارا مقام یاد دلائیں گے، ہمیں خالقِ ارض وسماء کے وجود اور مخلوقات میں اس کے فیصلوں کے نفاذ پر متوجہ کریں گے۔

میرے بھائی! آپ داعی ہیں۔ آپ کی پہلی ذمہ داری دل کو بیدار کرنا، اس کی مردنی کو زندگی سے بدلنا ہے اور جب آثارِ کائنات پر اس طرح توجہ دیں گے تو یہ مقصد بخوبی حاصل ہوسکے گا۔ آپ کی ان تاریخی یادگاروں کی سیر کا مقصد یہ نہ ہو کہ کچھ تاریخی و تحقیقی مطالعہ کرلیا جائے اور پچھلے لوگوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلی جائیں کہ وہ اس طرح کھانا پکاتے تھے، زینت وآرائش کے یہ سامان رکھتے تھے، لمبے کپڑے پہنتے تھے یا مختصر لباس زیب تن کرتے تھے، وہ اسی طرح کھیتیاں کرتے تھے جس طرح ہم کرتے ہیں اور

ان کی عبادات و مراسم ہماری ہی طرح کے تھے وغیرہ اس طرح کے جو تحقیقی و تاریخی کام کیے جاتے ہیں، پھر مطالعہ یا سفر کا مقصد یہیں تک آکر ختم ہو جاتا ہے اور طالب علم چند بے جان معلومات کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔

ہم محض قدیم یا جدید لوگوں کے آثار و نقوش کی تلاش پر اکتفا نہ کریں بلکہ ہر نقش اور کاریگری کا مطالعہ کریں چاہے اس کی تخلیق کرنے والے زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہیں۔ قدیم و جدید آثار اور غیروں کے کارناموں اور یادگاروں ہر ایک میں عبرت و نصیحت کا وافر سامان موجود ہے جس سے صرف وہی دل فائدہ اٹھا سکتا ہے جو واقعی سمجھنا اور سیکھنا چاہتا ہو ان میں سے ہر ایک پر قضا و قدر الٰہی ثبت ہے، وہ آپ کو وجود و بقاء اور تغیر و انقلاب کا قانون سنائے گا۔ اور جب آپ ان آثار اور یادگاروں کی باتیں سنیں گے اور ان سے اپنے دلوں کی دھڑکن میں اضافہ اور نفس میں ایک ہیجان محسوس کریں گے پھر حکمت و مہارت اور عاجزانہ انداز میں اسے لوگوں کے سامنے پیش کریں گے تو دلوں کے دروازے کھلیں گے، پتھر پگھل جائیں گے، جذبات میں تازگی آئے گی اور عقل و بصیرت میں روشنی پھوٹے گی۔

ہم یہاں ہر اس شخص کو پیش نظر رکھ کر گفتگو نہیں کریں گے جو ان آثار کی سیر کر رہا ہو بلکہ داعیانِ دین سے متعلق چند اہم امور کی طرف توجہ دلائیں گے اس لئے مجھ سے اس بات کی توقع نہ رکھئے کہ میں آپ کے سامنے ٹھوس تاریخی حقائق، جامع و مختصر ادب کا بہترین مرقعہ پیش کروں گا جو ادباء اور شعراء کی تسکین کر سکے اور علماء آثار اور تاریخ کے میدان کے ماہرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال سکے۔ ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ داعیانِ دین قواعد و فنون کا مطالعہ کریں یا دوسروں کو ان چیزوں کی تعلیم دیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ

دلوں کو نرم کر سکیں اور فکر و نظر کو اُبھار سکیں۔ اور جو کچھ ہم نے اوپر تحریر کیا ہے وہ منزل کا پتہ دیتا ہے۔

آثارِ قدیمہ پر کھڑے ہونے اور شب و روز کی گردش میں غور و فکر کرنے کی یہ تعلیم ہم قرآن کریم سے پاتے ہیں جو ہر داعیٔ دین کے لئے بہترین وسائل دعوت فراہم کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو حکم دیتا ہے کہ ہم زمین میں سیاحت کریں، ماضی کے آثار پر غور کریں اور ان کی چھوڑی ہوئی یادگاروں کا جائزہ لیں:

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ (انعام: ۱۱)

(ان سے کہو، ذرا زمین میں چل پھر کے دیکھو، جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے)

وہ ہمارے سامنے غور و فکر کی راہیں کھولتا ہے۔ کہتا ہے:

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

(روم: ۹)

(کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے

اُن کے پاس اُن کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے، پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے)

وہ مزید عبرت پذیری کے لئے خاص طور سے ان لوگوں کے آثار پر غور کرنے کا حکم دیتا ہے جن پر اس کا عذاب نازل ہوا۔ جب انہوں نے نافرمانی اور سرکشی کی روش اپنائی تو انہیں ہلاک کر دیا اور قیامت تک کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ (قصص: ۵۸)

(اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی اس کے وارث ہو کر رہے)

اس آیت میں دلوں کو ریزہ ریزہ کر دینے والی کتنی زبردست عبرت ہے! اور حی و قیوم ہستی کے سامنے انسانوں کو کس طرح سجدہ ریز کر دیتی ہے!

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ (حجر: ۲۳)

(زندگی اور موت ہم دیتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں)

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ (حجر: ۲۴)

(پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں)

اللہ تعالیٰ ان محلات و قصور اور آثار و قرائن کی طرف متوجہ اس لئے کرتا ہے تاکہ دیکھنے والا شخص ان محلات اور ان کے مکینوں سے سرگوشی کر سکے، جو کچھ دنوں تک شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن پھر تہس نہس کر دیے گئے:

فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝

(حج: ۴۵)

(کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہیں)

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَّعْقِلُونَ بِهَا أَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُونَ بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝

(حج: ۴۶)

(کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا اُن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں)

بلکہ اللہ تو کہتا ہے کہ یہ غور و فکر موجب ہدایت ہے اور ہمیں ان محلات اور علاقوں میں نشانیوں کو ڈھونڈھنے کی دعوت دیتا ہے جو ماضی کے نقوش کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ اپنی خاموشی کے باوجود سننے والوں کے لئے پیغام رکھتے ہیں:

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُونِ

يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (سجدہ : ۲۶)

(اور کیا ان لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ آج چلتے پھرتے ہیں؟ اس میں بڑی نشانیاں ہیں، کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟)

اللہ تعالیٰ پوری وضاحت سے ہمیں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کی تباہی و بربادی اور ان کے محلات اور گھروں کی ویرانی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے احکام سے روگردانی کی، اپنی طاقت وصلاحیت پر ناز کیا، حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور اسے نیچا دکھانے کے لئے خفیہ سازشیں کیں، لیکن جو اہل ایمان ان کے درمیان رہتے تھے، تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کر رہے تھے، انہیں اس تباہی سے بچا لیا۔ یہ اندازِ بیان حد درجہ مؤثر کن اور عبرت انگیز ہے:

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (سورۂ نمل : ۵۰ تا ۵۳)

(یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا؟ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو، ان کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے

اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں اور بچا لیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے)

اور آخر میں آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان آثار و کھنڈرات کو واعظ کے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے اور انہیں غافلوں اور خرمستوں کے خلاف حجت قرار دیتا ہے:

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۭ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ (ابراہیم: ۴۴ تا ۴۷)

(اے نبیؐ، اُس دن سے تم انہیں ڈرا دو جبکہ عذاب انہیں آ لے گا، اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ: "اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔ (مگر انہیں صاف جواب دیا جائے گا کہ) "کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے؟ حالانکہ تم اُن قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا اور ان کی مثالیں دے دے کر ہم تمہیں

سمجھا بھی چکے تھے، انہوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں، مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں۔"

پس اے نبیؐ، تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کئے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔)

بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ ان گزرے ہوئے لوگوں کے نام اور ان کی غلطیوں کو دوٹوک انداز میں بیان کرتا ہے۔ ایک تاریخی یادگار اور پھر اس سے متعلق فرد یا قوم کا نام اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ دلوں میں نصیحت وعبرت جاگزیں ہو سکے۔ مثال کے طور پر قوم لوطؑ کا قصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قریۂ سدوم میں حضرت لوطؑ کو نبی بنا کر بھیجا۔ یہ قوم مردوں اور لڑکوں سے بدفعلی کرنے میں ماہر تھی، فحاشی اور بے حیائی کا ایک سیلاب تھا جو پوری قوم کے اندر اُمڈ آیا تھا۔ نبیؐ نے انہیں اس فعل بد سے روکنے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے مان کر نہ دیا تو ایک زبردست دھماکے نے ان کو آ لیا اور اللہ نے ان کی بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔ ان کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ﴿۷۵﴾ (حجر: ۷۵)

(اس واقعہ میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو صاحب فراست ہیں)

بہت سے واقعات قارئین پڑھتے ہیں تو ان کی صحت میں شک ہونے لگتا ہے لیکن یہ واقعہ مبنی برحق وصداقت اور عبرت ونصیحت سے بھرپور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو تباہ وبرباد کر دیا، ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پوری بستی زمین کی تہ میں

غرق ہوگئی اور ایک دریا بہہ نکلا جسے آج ہم بحیرۂ مردار (DEAD SEA) کے نام سے جانتے ہیں۔ پوری قوم تباہ ہوگئی اور انہیں کے یادگار کے طور پر اس دریا کا نام پڑ گیا۔ اور یہ واقعہ عین گزرگاہِ عام[1] پر پیش آیا جو ہر آنے جانے والے کو دعوت غور و فکر دیتا ہے۔

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اللہ نے انہیں مختلف سزاؤں کے ذریعہ ہلاک کر دیا اور اس بستی کی رہائش گاہ کو ایک بدبودار سمندر میں تبدیل کر دیا جو بے حد بدنما اور بو اور مزہ کا خراب ہے اسے عین گزرگاہ عام پر رکھا جس سے شب و روز سفر کرنے والے گزرتے ہیں۔" (جلد ۴ ص ۳۰)

علامہ شیخ عبدالوہاب نجار اپنی کتاب "قصص الانبیاء" کے صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بحیرہ لوط یا بحیرہ مردار اس حادثہ سے پہلے موجود نہ تھا، یہ سمندر اس زلزلہ اور دھماکہ سے رونما ہوا جس نے پوری بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور سطح سمندر سے لگ بھگ چار سو میٹر نیچے دھنسا دیا۔"

آگے استاذ مرحوم لکھتے ہیں:

"پچھلے دو سالوں سنہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کی تحقیقات ہمیں بتاتی ہیں کہ لوگوں نے

---

[1] حجاز سے شام اور عراق سے مصر جاتے ہوتے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقہ میں آج تک نمایاں ہیں۔ (از ترجمہ قرآن مجید از مولانا مودودی علیہ الرحمۃ سورۂ حجر حاشیہ ۱)

بحیرۂ مردار کے کنارے قومِ لوط کی بستیوں کے کچھ آثار و قرائن بھی تلاش

کر لئے ہیں۔

سچ کہا ہے اللہ بزرگ و برتر نے:

(اس واقعہ میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو صاحب فراست ہیں)

ہم نے یہاں کسی قدر طول بیانی سے کام لیا ہے تاکہ مومن و مسلم کے ایمان و یقین میں

اضافہ ہو اور ملحد و کافر کے شک و تذبذب کا ازالہ ہو سکے۔

اہلِ عرب اپنے سفر شام میں ان آثار و دیار سے گزرتے تھے اور آتے جاتے ان

پر ٹھہر کر غور کرتے تھے۔ اللہ نے فرمایا:

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِىْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا

يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ (فرقان: ۴۰)

(اور اس بستی پر تو ان کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی،

کیا انہوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہوگا؟ مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی

توقع ہی نہیں رکھتے)

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاِنَّكُمْ

لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(صافات: ۱۳۳ تا ۱۳۸)

(اور لوطؑ بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو

جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک

بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔

آج تم شب و روز اُن کے اُجڑے دیار پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟

ایک دوسری قوم کا تذکرہ بھی یہاں مفید ہوگا۔ جسے تاریخ قومِ عاد کے نام سے جانتی ہے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں پہاڑوں میں رہتی تھی۔ اللہ نے اسے ایک شدید آندھی کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا:

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝ (حاقہ: ۶، ۷، ۸)

(اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن اُن پر مسلط رکھا (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں، اب کیا اُن میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے؟)

اس تباہ شدہ قوم کے بس مکانات اور کھنڈرات باقی بچے جنہیں عرب مسافرین شب و روز دیکھتے ہیں اور وہ بھی آج ریت کے انبار تلے دبے ہوئے ہیں۔ ان پر جو عذاب نازل کیا گیا تھا اس کی تفصیل قرآن اس طرح بیان کرتا ہے:

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (احقاف: ۲۴، ۲۵)

(پھر جب انہوں نے اُس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے : "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا۔" نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لئے تم جلدی مچا رہے تھے، یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں درد ناک عذاب چلا آرہا ہے، اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔" آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں)

پھر اللہ تعالیٰ ہمیں خطاب کرتا ہے جس طرح ہمیں ایسے موقعوں پر اپنے دل سے خطاب کرنا چاہیے وہ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

(احقاف: ۲۶)

(اُن کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے، اُن کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے مگر وہ کان اُن کے کسی کام نہ آئے نہ آنکھیں، نہ دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور اُس چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے)

اس کے ایک آیت بعد اللہ تعالیٰ مزید عبرت انگیزی کے لئے فرماتا ہے:

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾ (احقاف : ۲۸)

(پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنالیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے)

میرے بھائی! دیکھئے اللہ نے آثارِ کائنات پر غور وفکر کرنے کا کیسا مکمل طریقہ کار بتایا ہے اور آنکھ، کان اور دل ودماغ کو غور وفکر اور مشاہدہ کا مکلف بنایا ہے تاکہ وہ عبرت حاصل کریں اور اللہ کی آیات پر غور کر کے بہتری کا سامان ڈھونڈیں۔ لیکن یہ بھی دیکھئے کہ دل ودماغ، آنکھیں اور قلوب انسان کو اس وقت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جبکہ وہ آیاتِ الٰہی کا منکر ہو۔ اور یہاں آیات سے مُراد بس قرآن کریم کی آیتیں ہی نہیں ہیں جن کی ہم تلاوت کرتے ہیں بلکہ اس میں وہ نشانیاں بھی شامل ہیں جن کا ہم کائنات میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس موضوع کے اطراف وجوانب کا اس سے زیادہ احاطہ کرنا ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آثار کائنات پر غور وفکر کو آقائے نامدار ؐ اور ہر داعئ دین کے لئے سُنّت قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ؐ یہ سمجھتے تھے کہ ظالموں کے کھنڈرات پر ٹھہرنا اور ان کا ایسا مشاہدہ کرنا جس سے انسان کا دل نہ پگھل سکے، ان کی آنکھیں اشکبار نہ ہو سکیں اور یہ مشاہدہ اور وقوف عبرت سے خالی اور جامد ہو، تو یہ اللہ کے غضب اور اس کی ناراضگی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے جس کی

تشریح وتائید کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود اس پر غور کریں حقیقت خود بخود نمایاں ہو جائے گی۔ حضورِ اکرمؐ اس الہامی طریقہ کار کو اپناتے تھے اور اپنے پیارے صحابہ کو بھی اس بات کی تعلیم دیتے تھے کہ وہ کس طرح ان آثار کے پاس کھڑے ہوں۔

رسول اکرمؐ غزوہ تبوک کے لیے نکلے۔ راستے میں مدائن یا دیار ثمود پڑتا تھا جو جو دراصل پہاڑوں کی چٹانوں کو تراش کر بنایا گیا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ صالحؑ کی بعثت سے پہلے ان کی کیا حالت تھی اور آپ کی بعثت کے بعد ان لوگوں نے مخالفت اور سرکشی کی روش اپنائی اور اپنے رب سے بغاوت کرنے پر مصر رہے جس کے نتیجے میں زبردست آندھی چلی، زور کا کڑکا آیا اور یہ لوگ چڑیوں کی طرح اپنے گھروں میں دبکے موت کی نیند سو گئے۔

جب رسولِ اکرمؐ دیارِ ثمود کے قریب ہوئے ——— جو آج بھی عبرت کا مرقع ہیں ——— تو ان ظالموں کی یادگار اور ان کے پچھلے کرتوت آنکھوں کے سامنے آ گئے اور ان کے یہ کرتوت حد درجہ قابلِ نفرت تھے اس لئے آپؐ نے اپنے چہرے پر کپڑا ڈال لیا، اپنی سواری تیز کر دی اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ:

"ان ظالموں کی بستیوں سے جب تمہارا گزر ہو تو روتے ہوئے گزرو مبادا کہ تمہیں بھی وہ عذاب آ لگے جس سے یہ دوچار ہوئے۔"

ہم نہیں سمجھتے کہ زندہ طبیعت اور حساس وجدان کی اس سے بڑی علامت یا شعور کی بیداری کی اس سے بڑی نشانی اور کوئی ہو سکتی ہے کہ آپ نے اپنے کپڑے کو اپنے چہرے پر ڈال لیا اور اپنی سواری تیز کر دی۔

حضورِ اکرمؐ کے قلب مبارک میں تعلیمات خداوندی زندہ اور طاقتور رہتی تھیں، ایک

لمحہ کے لئے آپ کے دل و دماغ سے اوجھل نہ ہوتی تھیں آپ کسی ایسے منظر کے محتاج نہ تھے جو آپ کے قلب مبارک کو بیداری عطا کرے۔ یہ مناظر آپ کے قلب میں گردش کرتے رہتے تھے جس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ آپ کی آنکھیں کتنی جلدی چیزوں کے حسن و قبح کو پکڑ لیتی ہیں اور اطمینان یا عدم اطمینان کا اظہار کر دیتی ہیں۔ یا آپ اپنے دوست سے ملاقات کرتے ہیں تو کتنی جلدی آپ کے چہرے پر ترو تازگی آجاتی ہے یا کسی قابل نفرت دشمن سے ملتے ہیں تو فوراً آپ کا چہرہ ناگوار ہو جاتا ہے رسول اکرمؐ کے قلب مبارک میں ظلم اور ظالم اور کفر اور کافر سے بڑھ کر نفرت کسی چیز کے لئے نہ تھی یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی دیارِ ثمود پر آپ کی نظر پڑی اور قلب مبارک نے اس کا احساس کیا فوراً ہی ان کی غفلت، آیاتِ الٰہی سے اعراض و بے نیازی، صلاح و رشد کی مخالفت، اپنے اوپر ان کا ظلم کرنا اور حقیقت زندگانی سے ان کا ناواقف ہونا، سب کچھ آپ کی نگاہوں کے سامنے آگیا اور جیسے ہی یہ ساری چیزیں ذہن میں آئیں، دل و دماغ پر کراہت اور نفرت کے آثار ہویدا ہو گئے، فوراً اللہ سے پناہ چاہی، اپنا کپڑا چہرے پر ڈال لیا اور اپنی سواری تیز کر دی۔ کوئی حد ہے اس بیدار مغزی اور ہوشمندی کی! کوئی مثال ہے اس احساس اور شعور کی؟!

لیکن آپ کے پیارے صحابہؓ کی یہ حالت نہیں تھی۔ وہ تذکیر اور یاد دہانی کے محتاج تھے ان کے بارے میں آپ کو خدشہ تھا کہ یہ بلند و بالا عمارتیں اور کوہ پیکر محلات انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیں گے، یہ ان کی صورت گری اور نقش نگاری میں پھنس کر عبرت پذیری سے غافل ہو جائیں گے جس کے نتیجہ میں یہ اللہ کی نگاہ میں اور اپنے دشمنوں کی نظر میں حقیر اور بے وقعت ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ نے ان سے پوچھا: ”تم کیوں ایسی قوم کے

پاس جاتے ہو جس پر اللہ کا غضب نازل ہو چکا ہے؟" ایک شخص نے جواب دیا: "ہم انہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اے اللہ کے رسولؐ!" آپؐ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں اس سے زیادہ خوش کن بات نہ بتاؤں؟ تمہارے درمیان ایک ایسا شخص ہے جو تم سے پہلے اور تمہارے بعد میں ہونے والی باتوں کو بتاتا ہے۔۔۔۔ راہ راست پر رہو، راست روی اختیار کرو کیونکہ اللہ کو تم پر عذاب نازل کرنے میں کسی چیز کی پروا نہ ہوگی اور اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جو اپنے آپ سے کسی چیز کو نہ ہٹا سکیں گے۔"

اور سارے صحابہ کو متنبہ کیا۔ فرمایا:

"ان عذاب یافتہ قوموں کے پاس سے جب بھی تمہارا گزر ہو تو تمہاری آنکھیں بہہ رہی ہوں اگر تم ایسا نہ کر سکو تو ان کے پاس ہرگز نہ آؤ مبادا تمہیں بھی وہ عذاب آ لگے جس نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔"

اور سچی بات یہ ہے کہ یہ بڑی اہم حقیقت ہے۔ ظالموں کے آثار اور ان کی یادگاروں پر خوش ہونا، غیر شعوری طور پر ان کے ظلم و ستم پر خوش ہونا ہے اور اپنے دل پر غیر شعوری طور سے فساد اور جمود طاری کرنا ہے۔ جبکہ انسان نام ہے اس کے دلِ زندہ اور ضمیر ہوشمند کا، اگر اس دولت گراں مایہ سے وہ محروم ہو جائے تو اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی پھر وہ اپنے سے کسی چیز کا دفاع نہیں کر سکتا۔

میرے بھائی! آپ دیکھئے کہ اللہ کے رسولؐ ہماری زندگی اور بیداری کے کس درجہ حریص تھے! اے میری قوم کے لوگو! جو شخص زندگی کی تلاش میں ہے اسے زندگی کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز رسولؐ سے حاصل کرنا چاہیئے۔ بخدا میرا قلم ساتھ نہیں دیتا کہ رسولِ اکرمؐ کے اس موقف کو یہیں چھوڑ کر کتاب کے بقیہ اجزاء پر دھیان دوں۔

سابقہ ادوار اور ان کی پرانی یادگار چیزوں کی طرف انسان کا متوجہ ہونا اس کی فطرت میں داخل ہے اس لئے ہمیں اس فطرت اور اس کے مفید پہلوؤں کو استعمال کرنا چاہیئے جب پچھلے ادوار یا ماضی کی عمارات کے بارے میں چل نکلے تو اس گفتگو کو ہمیں دل کو زندہ کرنے اور اسے رب کی طرف واپس کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ اگر پچھلے ادوار اچھے رہے ہوں تو ٹھیک ہے اور اگر شر و فساد اور فسق و عصیان کے دور رہے ہوں تو ہمیں ان پر افسوس کرنا چاہیئے اور ان سے توبہ کرنا چاہیئے کہ اسی سے دل زندہ ہوں گے۔ لیکن اگر وہ ادوار خیر یا شر کسی چیز کے حامل نہ ہوں تو دورِ حاضر سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے پھر اس سے عبرت کا پہلو نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بچپن میں اپنے باپ خطاب کی بکریاں مکہ کی گھاٹیوں میں چرایا کرتے تھے اس وقت وہ بچے تھے۔ اپنے باپ سے بہت ڈرتے تھے کیونکہ وہ بڑا سخت اور سنگدل شخص تھا انہیں ہر وقت پریشان کئے رہتا تھا۔ لیکن حالات بدلے، دعوت الی اللہ کی کرن پھوٹی تو عمرؓ بھی اس روشنی سے فیضیاب ہوئے پھر دعوت کا کام پھیلنے لگا، مدینہ کی طرف ہجرت ہوئی تو حضرت عمرؓ بھی مکہ چھوڑ کر مدینے جا بسے۔ ماہ و سال بیتتے رہے۔ رسول اکرمؐ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور اس کے بعد ابو بکرؓ بھی اپنے رب سے جا ملے اس وقت اسلام کا چہار دانگِ عالم میں ڈنکا بج رہا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ امیر المومنین بنائے گئے، مسلمانوں کے جملہ امور کے نگہبان اعلیٰ۔ اور حضرت عمرؓ مکہ کی ان پرانی گھاٹیوں کو بھول گئے جہاں وہ اپنے باپ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔
ایک بار اپنے رفقاء کے ساتھ حج کے لئے مکہ تشریف لے گئے تو انہیں گھاٹیوں سے گزر ہوا، فوراً قلبِ حساس اور ذہن باشعور نے ادراک کر لیا، وہیں کھڑے ہو گئے،

بچپن کے سارے واقعات ذہن کے اسکرین پر آنے لگے کہ وہ کس طرح اپنے دوستوں کے ساتھ بکریاں چراتے تھے اور آج کس طرح خدا کے فضل وکرم سے سلطنت کے امیر ہیں زمانے کی اس گردش اور تقدیر الٰہی کے اس الٹ پھیر پر انگشت بدنداں رہ گئے، عبرت و نصیحت کا پہلو فوراً نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اپنے ساتھیوں سے کہا:

"میں نے اپنے آپ کو ان گھاٹیوں میں پایا ہے، میں خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا وہ بڑا سنگدل تھا مجھے ہر وقت پریشان کرتا تھا۔۔۔۔ لیکن آج میری حالت یہ ہے کہ مجھ سے بالاتر کوئی فرد نہیں ہے"

پھر وہ اپنے ان نرم جذبات کا اظہار اس شعر کے ذریعہ کرتے ہیں:

لَا شَيْءَ مِمَّا تَرَىٰ تَبْقَىٰ بَشَاشَتُهُ
يَبْقَى الْإِلٰهُ وَيَفْنَى الْمَالُ وَالْوَلَدُ

(جو چیزیں تم دیکھ رہے ہو ان کی تروتازگی باقی رہنے والی نہیں ہے، باقی رہنے والی ذات صرف خدا کی ہے اور مال و اولاد فنا ہو جائیں گے)

میرے بھائی! اس سے آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آثار اور تاریخی یادگاروں کا تذکرہ کس قدر مفید ہے اور انہیں ذہن میں رکھنے سے کس قدر فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور ہم اللہ سے اس کی توفیق طلب کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں اس لئے کہ اس میں ہوشیاری ودُور اندیشی اور زندہ و اثر پذیر طبیعت کی ضرورت پڑتی ہے۔

۴۔ معنوی اقدار کی ظاہری شکلوں پر زور

باعمل عقلیت کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ معنوی چیزوں کی ظاہری شکلوں اور ان کے محسوس آثار پر زور دیتی ہے، اور واقعات کی زبان میں لوگوں کو مخاطب کرتی ہے۔

اس لئے ایک داعیٔ دین کی ذمہ داری ہے کہ جب وہ اچھائی اور برائی، حق اور باطل، خیر اور شر وغیرہ موضوعات پر گفتگو کرے تو ان معنوی اقدار کی تحلیل و تجزیہ سے پرہیز کرے مجرد علمی بحثوں سے اجتناب کرے اور نظریاتی فلسفوں، مفروضات اور تخمینات کی بھول بھلیوں میں سامعین کو نہ بھٹکائے بلکہ ان معنوی اقدار کی صورتوں اور ان کے عملی آثار و اثرات پر گفتگو کرے، اسی چیز کو لوگ اخذ کر سکتے اور سمجھ سکتے ہیں اسی کو محسوس کر سکتے اور اسی سے اثر قبول کر سکتے ہیں اور اسی پر ان کی دنیا و آخرت کے بننے اور بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے، لیکن اگر ہم مثال کے طور پر اخلاق پر گفتگو کریں اور اس کی حقیقت و ماہیت پر فلسفیانہ بحث شروع کر دیں تو اس سے عوام الناس کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی نہ اس پر ان کی دنیاوی و اخروی فلاح کا انحصار ہوگا۔ اخلاق کے سلسلے میں عوام کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ دل میں اس کے اچھے اثرات محسوس کریں اور عالم واقعہ میں اس کا بہترین پھل سامنے آئے۔

یہ اصول ہمیں قرآن کریم سے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ عمدہ اخلاق ہیں جن سے کوئی قوم متصف ہو کر اس کی رضا حاصل کر سکتی ہے تو اس کی اصلیت و ماہیت اور منفی و مثبت پہلوؤں پر بحث نہیں کرتا جیسا کہ فلسفۂ اخلاق کی کتابوں کا شیوہ ہے بلکہ وہ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جسے سارے لوگ

آسانی سے سمجھ سکیں اس لیے کہ وہ ان کے سامنے واقعاتی اور عملی صورت میں انہیں پیش کرتا ہے فرماتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ (فرقان: ۶۳ تا ۷۵)

(رحمٰن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دُعائیں کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اس کا عذاب تو جان کو لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔" جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بُخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پُکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں —— یہ کام جو کوئی کرے، وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ اِلّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لاکر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے —— (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر اُن کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سُنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے، جو دُعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا —— یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے اور آداب و

تسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا)

آپ اس فصیح و بلیغ کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں پائیں گے جو آپ کے ذہن پر گراں بار ہو یا آپ کی اُکتاہٹ اور تھکاوٹ کا باعث بنے بلکہ اس کے برعکس ان چند آیات میں معانی کا بحرِ بیکراں ٹھاٹیں مار رہا ہے، بلند و برتر حقائق کا انبار موجود ہے لیکن اتنا واضح و روشن ہے کہ سورج بھی مات کھا جائے حتیٰ کہ ایک ناواقف شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ امر واقعہ سے جو چیزیں بھی قریب ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں۔

میں یہاں اس خوبصورت سیاق کا تجزیہ کرنا نہیں چاہتا جس میں سارے فضائل زندہ و متحرک موجود ہیں۔ انسان کی چلت پھرت، دوڑ دھوپ، گفتگو اور مباحثہ، قیام و سجود اور مناجات الٰہی، معیشت میں اعتدال اور ناجائز خواہشات سے اجتناب کی صورت میں ساری نیکیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ میں تو اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سیاق میں وہ قوت تاثیر ہے جو انسان کو بیدار کر دے اور اسے ان اعلیٰ فضائل کی پیروی پر آمادہ کر دے۔ اور یہ اعجاز کلام کی وہ طاقت ہے جو عقلوں کی حدود سے ماوراء ہے چہ جائیکہ وہ اس کی تہ میں پہنچ سکیں۔

رسول اکرمؐ کا اُسوۂ حسنہ

یہ امر طبیعی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو یہ حکیمانہ تعلیم ودیعت کی گئی تھی اور یہ راست طریقہ کار آپ کے مزاج میں ڈال دیا گیا تھا چنانچہ آپؐ نے اپنے صحابہ کو مفروضات اور تخمینات کے ذریعہ تعلیم نہیں دی بلکہ وہ عملی طریقہ اختیار کیا جسے اللہ نے متعین کیا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کے مندرجہ ذیل طریقہ ہائے تعلیم ملتے ہیں:

۱۔ آپ چشم دید مشاہدے کے لئے کسی چیز کی ظاہری ہیئت کی طرف اشارہ کرتے یا اس کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر اس سے اپنی بات مستنبط کرتے تھے۔ مثال کے طور پر آپ اپنی احادیث پاک میں اس بلند حقیقت کو بار بار دُہراتے تھے کہ لوگ افراد کی قدر و قیمت اندرونی صلاحیتوں اور باطنی خوبیوں کے ذریعہ لگائیں ان کی ظاہری شکلوں پر نہ ریجھیں۔ اس کے لئے آپ علمی طریقہ کار اپناتے تاکہ یقین کامل ہو جائے اور فقراء و محتاجین کو بھی انشراح حاصل ہو۔ ایک بار آپ کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ آپ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے اس کے بارے میں پوچھا: تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: یہ نہایت معزز شخص ہے۔ بخدا، اگر یہ پیام نکاح بھجوائے تو اس لائق ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے اور اگر شفاعت کرے تو اسے تسلیم کر لیا جائے۔ آپؐ خاموش رہے۔ پھر ایک دوسرے آدمی کا آپ کے پاس سے گزر ہوا تو آپؐ نے دوبارہ پوچھا: اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ شخص اگر پیامِ نکاح بھجوائے تو اس لائق نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اسے ٹھکرا دی جائے اور اگر کوئی بات کہے تو نہ سُنی جائے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: یہ شخص پہلے کے مقابلے میں رُوئے زمین کے تمام افراد سے بہتر ہے۔"

یہاں یہ چیز قابل غور ہے کہ اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فقر یا غنیٰ میں دو برابر درجے کے آدمیوں کے درمیان تقابل نہیں کیا، اور اگر آپ ایسا کرتے اور دو محتاجین کے درمیان کرتے اور ان میں سے ایک کو دوسرے پر افضل قرار دیتے تو مفہوم کی وضاحت کے لئے یہ مقابلہ کافی ہوتا، اسی طرح اگر آپ دو مالداروں کے درمیان تقابل کرواتے

تو بھی معنیٰ و مفہوم کی وضاحت کے لئے یہ کافی ہوتا لیکن اللہ کے رسولؐ نے ایسے مالدار جس کا اندرون خراب اور ظاہر بڑا خوش نما تھا اور ایسے فقیر کے درمیان جس کا اندرون بہت بہتر اور ظاہر بے وقعت تھا، تقابل کر وا دیا۔ اور یہ حکمتِ نبوی کا کمال تھا کہ آپ نے ان دونوں کے درمیان فرقِ عظیم کو نہایت واضح کر دیا۔ اسی مفہوم کی وضاحت کے لئے ایک دن آپ نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا: کیا تم سمجھتے ہو کہ مال کی کثرت کا نام غنا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! فرمایا: تو کیا مال کی کمی کو فقر سمجھتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں، اے رسول اللہؐ! آپؐ نے فرمایا: "غنا تو دراصل دل کا غنیٰ ہے اور محتاجی تو دل کی محتاجی کو کہتے ہیں"

یہ سوالات ہیں جو اللہ کے رسولؐ نے اپنے ایک شاگرد سے کئے ہیں اور شاگرد نے اپنے علم کی حد تک اس کے جوابات دیئے لیکن پھر دُنیا کے سب سے بڑے معلم حضرت رسول اکرمؐ نے غنا اور فقر کی صحیح تعریف بتائی، لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ رسولؐ نے اسی پر اکتفا کیا؟ نہیں بلکہ نفس کے جمود کو توڑنے کے لئے آپ نے کچھ اور سوالات بھی کئے۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر آپؐ نے مجھ سے قریش کے ایک آدمی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا تم فلاں شخص کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں، پوچھا: تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے جواب دیا: جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ بخشش کرتا ہے اور جب وہ کہیں پہنچ جائے تو اسے عزت افزائی سمجھی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر آپؐ نے مجھ سے اہلِ صفہ کے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا کہ تم اسے جانتے ہو؟ میں نے کہا: بخدا، میں اسے نہیں جانتا۔ چنانچہ آپ اس کی تعریف و توصیف کرتے رہے یہاں تک کہ غائبانہ طور سے اس کا مکمل تعارف ہو گیا تو آپ نے پوچھا: تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے کہا: وہ اصحاب صفہ کا ایک غریب شخص ہے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ روئے زمین کے تمام افراد سے دوسرے

کے مقابلے میں بہتر ہے۔

احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف صورتوں سے آپؐ نے اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

ہم یہاں بس ایک مثال اور نقل کرتے ہیں:

ایک بار رسول اکرمؐ کا بازار سے گزر ہوا۔ بازار ایک چھوٹی موٹی دنیا ہے کوئی خریداری کرتا ہے تو کوئی بیچتا ہے، ایک اپنے سامان کا بھاؤ اور قیمت کا اعلان کرتا ہے تو دوسرا اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، آپس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ہوتا ہے غرضیکہ ہر ایک اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے ایک شخص نفع کمانے کی دھن میں رہتا ہے تو دوسرا سستا سامان خریدنے کی فکر میں رہتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے سوچا کہ لوگوں کو اس دُنیا کی قدر و قیمت بتائی جائے جس پر یہ ٹوٹے پڑ رہے ہیں، اس سے پہلے انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دنیا کا یہ سرو سامان نہایت قلیل ہے اور اللہ کی نگاہ میں ایک مچھر کے پر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ ایک تعلیم تھی جو محض احکام و قواعد کو بیان کرتی تھی۔ اب اللہ کے رسولؐ نے اسے عملی شکل میں لوگوں کو دکھانا چاہا اور اس سے نفرت پیدا کرانی چاہی چنانچہ کن کٹی بکری کی لاش سے گزر ہوا تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے پوچھا: تم میں سے کون اسے ایک درہم کے عوض خریدنا پسند کرے گا؟ لوگوں نے جواب دیا: بھلا ہمارا اس سے کیا تعلق؟ ہم اسے لے کر کیا کریں گے؟ آپؐ نے پوچھا: کیا تم اسے لینا پسند کرو گے؟ لوگوں نے کہا: بخدا اگر یہ زندہ ہوتی تو اس میں یہ عیب موجود تھا کہ یہ کن کٹی ہے پھر اسے مردہ حالت میں لینا کون پسند کرے گا؟ تب آپؐ نے فرمایا: "بخدا یہ دُنیا اللہ کی نگاہ میں اس سے کہیں زیادہ بے وقعت ہے جتنی تم لوگوں کی نگاہ میں یہ بکری بے وقعت ہے۔"

جس طرح اللہ کے رسولؐ نے علمی موازنہ اور تقابل کے مختلف پہلوؤں کو اختیار کر کے اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی اسی طرح اس کے کراہت انگیز اور قابلِ نفرت مناظر کے پاس متعدد بار کھڑے ہو کر اس مفہوم کو ذہنوں میں بٹھایا اور دُنیا سے نفرت پیدا کی۔

۲۔ حضور اکرمؐ کا ایک طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ مخفی اور باریک معانی کو واضح کرنے کے لئے ان کے ظاہری اثرات و نتائج — جو دل میں محسوس کئے جا سکیں اور کسی انسان پر پوشیدہ نہ رہیں — کو نمایاں کرتے اور ان کی طرف لوگوں کی توجہات مبذول کراتے۔

اللہ کے رسولؐ سے اس طرح کے بے شمار سوالات کئے گئے کہ گناہ کیا ہے؟ ایمان کسے کہتے ہیں؟ اور نیکی کی تعریف کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات نہایت باریک اور مخفی ہوتے ہیں اور ان چیزوں کی حقیقت اور اصلی ماہیت سے انسان واقف ہونا چاہتا ہے، دیکھئے اللہ کے رسولؐ ان سوالات کا کیا جواب دیتے ہیں۔؟

خود آپ بتائیے کہ اگر اس طرح کے سوالات کسی فلسفی یا بڑی یونیورسٹی سے سند یافتہ پروفیسر سے کئے جائیں تو وہ کیا جواب دے گا؟ یہ پروفیسر لائبریریوں کا رُخ کرے گا، موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرے گا ان سے علماء کے اقوال نکالے گا، ان میں حذف و اضافہ کرے گا پھر اپنی پسند اور تسکین کے مطابق کسی بحث کا استخراج کرے گا۔ فلسفی سے پوچھیں گے تو وہ خالص فلسفیانہ انداز میں آپ سے گفتگو کرے گا جس سے معاملہ مزید پیچیدہ ہو جائے گا اور اگر تفصیل بیانی سے کام لے گا تو تحلیل و تجزیہ کا انبار لگا دے گا، مفروضات اور تخمینوں کا ڈھیر کر دے گا جن سے آپ کو استخراج کرنا ہو گا اور آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے

کہ اس ڈوری کا تو کوئی سرا ہی نہیں ہے اور اس سے یہ سوال کر کے آپ کو ندامت ہو گی لیکن سید العارفین اور سارے جہان کے معلمؐ کو دیکھئے، وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

”گناہ یہ ہے کہ جب تمہارے دل میں کوئی چیز کھٹکے تو اسے چھوڑ دو کہ وہی گناہ ہے جس کے بارے میں تمہیں اچھا نہ لگے کہ لوگ اس سے واقف ہوں“

ایمان کی تعریف آپؐ نے اس طرح کی:

”جب کسی برائی کا ارتکاب کرنے کے بعد تم رنجیدہ ہو جاؤ اور نیکی کر کے خوش ہونے لگو تو تم مومن ہو“

وابصہؓ بن معبد کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو دیکھا، میں آپ سے تمام نیکیوں کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے مجھے حکم دیا کہ: اے وابصہ! قریب ہو جاؤ۔ میں آپ کے قریب ہو گیا یہاں تک کہ میرے گھٹنے آپؐ کے مبارک گھٹنوں سے مس کرنے لگے تب آپؐ نے پوچھا: اے وابصہ! کہو کیا پوچھنے آئے ہو؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ، مجھے بتائیے۔ آپ نے پوچھا: کیا نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھنے آئے ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے اپنی تین انگلیاں ایک ساتھ کھڑی کیں اور ان سے میرے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے جس پر تمہارا ضمیر مطمئن ہو جائے اور قلب آمادہ ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور ضمیر اس پر آمادہ نہ ہو چاہے دنیا جہان کے لوگ اسے ٹھیک کہیں“

میں یہاں کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ خود اپنے

نفس سے پوچھیں کہ یہ جواب کس قدر صحیح اور اطمینان بخش ہے جو ان معانی سے قلبی تعلق کو جوڑ دیتا ہے۔ تو میرے بھائی! آپ اس فطری علمی طریقۂ کار کو اختیار کیجیے۔ یہ ایسا طریقۂ کار ہے جو غیر مؤثر اور غیر مفید بحثوں سے اجتناب کرتا ہے اور ان تمام احساسات کو محیط ہے جو ان سب کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں اور جن کی قوت سے انسان نیکی یا بدی کی طرف بڑھتا ہے —،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"دل میں دو قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں ایک طاقت وہ ہوتی ہے جو خیر اور نیکی کی طرف اسے مائل کرتی اور حق کی تصدیق کرتی ہے، جس شخص کے اندر یہ طاقت ہو وہ جان لے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔ دوسری طاقت شیطان کی طرف سے ہوتی ہے جو بدی اور بے حیائی کی طرف اسے موڑتی ہے اور حق کی تکذیب کرتی ہے اور اسے خیر سے روک دیتی ہے، جو شخص اس طاقت کو اپنے اندر محسوس کرے وہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگے۔"

پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝

(البقرہ: ۲۶۸)

(شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے)

دل کی کھینچا تانی ہوتی ہے اور اس کا اثر سینے پر پڑتا ہے۔ فرشتہ جب زور ڈالتا ہے تو خیر و رشد کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور حق کی تصدیق ہوتی ہے اور شیطان جب دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے تو شر کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے اور حق کی تکذیب، الحاد و تشکیک کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ دیکھئے تو سہی میرے بھائی! کس قدر حیرتناک ہے یہ تعلیم! کتنا مؤثر ہے یہ انداز ترتیب! اس سے انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا ہے اور جذبات و احساسات کے تجزیہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگر اس کے اندر خیر کے جذبات پائے جائیں تو اسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ اللہ کے فضل سے ہے اور اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور اگر اس کے اندر شر اور بدی کے احساسات پائے جائیں تو اللہ سے پناہ مانگے، شیطان مردود کی چالوں سے دُور بھاگے:

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(بقرہ: ۲۶۸)

(شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔)

میرے بھائی! میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آیئے اس تعلیم کے جمال اور اس رحمت کے کمال کا مشاہدہ و مطالعہ کریں جو رسول اکرم ؐ کے قلب مبارک میں موجزن تھی۔ خدا بھلا کرے اس بندہ باکمال کا جس نے اپنے دل کے معمولی سے معمولی خیالات کا مطالعہ کیا اگر وہ خیر و رشد کی طرف مائل دکھائی دیئے تو ان پر لبیک کہا، انہیں بروئے کار لائے اور ان پر

ہمارے پیارے رسولؐ کی پوری سیرت پڑھ جائیے آپ کو کہیں یہ بات نظر نہ آئے گی کہ آپ نے اپنے لئے کسی چیز کا ذخیرہ کیا ہو، جتنی حدیثیں پیچھے گزر چکی ہیں ان سب کا مطالعہ کر کے مجھے بتائیے کہ آپ نے اپنے لئے کیا چاہا؟ آپ نے ساری دوڑ دھوپ ہمارے لئے کی، ہماری تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی، شیطان کی چالوں کو ناکام بنانے اور ہمیں فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کے لئے زندگی بھر گھلتے رہے۔ بڑے پیار و محبت سے کہتے کہ میری حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کسی باپ کی اپنے بچے کے سامنے ہوتی ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے دنیا سے کیا لیا؟ آپ دنیا سے چلے گئے اس حال میں کہ زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پوری زندگی حق کی تعلیم دیتے رہے، خیر و رشد کی رہنمائی کرتے رہے، دلوں کو زندہ و بیدار کرتے رہے اور ان ساری کوششوں کے پیچھے ہمیں ایک ایسا دل نظر آتا ہے جو محبت و شفقت سے معمور تھا، رحمت و الفت کا پیکر تھا ہماری سعادت کا حریص تھا، ایسا حریص کہ ہم اس کے ایک ایک کلمہ اور ایک ایک عمل میں اس کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ حریص، جتنا ایک باپ اپنے بیٹوں کی بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ درود و سلام ہو ہمارے پیارے رسول پر! رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں آپ کی روح مبارک پر!

ہم پھر کہتے ہیں کہ کون ایسا شخص ہوگا جو یہ عجیب و غریب تعلیم دے، جو آپ کی بھلائی کے لئے طفل مار گزیدہ کی طرح بلکے اور آپ کو خطرات و نقصانات سے بچانے کے لئے اسی قدر مضطرب ہو؟ ہر دل کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو میں ایک طاقت ہوتی ہے۔ ایک فرشتے کے ہاتھ میں ہوتی ہے دوسری شیطان کے ہاتھ میں، اور دونوں طرف سے

عمل کیا اور اگر ان میں شر کی معمولی سی جھلک بھی دکھائی دی تو مجاہدہ و تربیت اور تزکیہ کے ذریعہ انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

۳۔ آپؐ نے ان معانی و حقائق کو ان کے قریب ترین عملی اوصاف کے ذریعہ بیان کئے جن سے ان کی مکمل وضاحت ہو گئی یا ان کی حقیقت کی تمثیل سامنے آ گئی چاہے وہ وصف مرغوب خاطر ہو یا قابل نفرت۔ جو شخص لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے وہ اپنے چہرے کا پانی بہا دیتا ہے اور کسی انسان کی معزز ترین چیز اس کا چہرہ ہے۔ دیکھئے رسول اکرمؐ اس وصف کو کس طرح بیان کرتے ہیں جس سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور بھیک مانگنے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص برابر بھیک مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اللہ کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں رہ جاتی۔"

دوسری حدیث ہے:

"بھیک مانگنا اور طلب کرنا یہ وہ خراشیں ہیں جن سے آدمی اپنا چہرہ بگاڑ لیتا ہے تو جو شخص اپنا چہرہ بگاڑنا چاہے اسے آزادی ہے اور جو اسے محفوظ رکھنا چاہے وہ بھیک مانگنا چھوڑ دے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں: میں نے عباسؓ سے کہا کہ نبیؐ سے کہو وہ تمہیں صدقات کی وصولی کے لئے عامل بنا دیں۔ چنانچہ انہوں نے نبیؐ سے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا:

"میں تمہیں لوگوں کے گناہوں کے دھوون پر عامل نہیں بنا سکتا۔"

دیکھئے یہ وصف کتنا صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے نبیؐ نے براہِ راست تعلق پیدا کر دیا کہ:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا

(توبہ: ۱۰۳)

(اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ۔)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک آدمی کا تذکرہ کیا گیا جو رات بھر سوتا تھا یہاں تک کہ صبح تک پڑا رہتا تھا تو آپؐ نے فرمایا:

"وہ آدمی ایسا ہے جس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صبح سویرے نہیں اٹھ سکتا، خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے سے گھبراتا ہے اس سے دُعا و استغفار کرتے ہوئے جھجکتا ہے وہ غافل و نادان ہے خیر کی حقیقت سے ناواقف ہے، اوقات کی قدر و قیمت سے لاعلم ہے، وہ ایسا شخص ہے جو شیطان کی مٹھی میں ہے اور اس نے اس کے دونوں خالی کانوں میں پیشاب کر دیا ہے رات کے تہائی پہر خدا کی اس آواز پر غفلت برتنے کی وجہ سے شیطان اس کا مذاق اُڑا رہا ہے کہ: ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اس کے گناہ بخش دوں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کر لوں؟ ہم شب و روز کے کسی لمحہ بھی خدا کی یاد سے غفلت برتنے سے پناہ مانگتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جمعہ کی نماز ادا کرنا مسکینوں کا حج کرنا ہے۔"

دیکھئے یہ وصف کتنا مبنی بر صداقت ہے اور جمعہ کی اصل حقیقت و اہمیت پر کتنی اچھی روشنی

ڈالتا ہے۔ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں اور کعبہ بھی اللہ کا گھر ہے لیکن اس کا امتیاز یہ ہے کہ یہ قدر و منزلت اور برکت کے لحاظ سے تمام گھروں سے بڑا ہے جمعہ کے دن مسجدوں کا قصد کرنا دراصل اللہ کی زیارت کے لئے ہوتا ہے جس طرح مکہ معظمہ میں حج کے ذریعہ اس کی زیارت نصیب ہوتی ہے البتہ دونوں کے احترام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے مسکین بندوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا ہے جو اپنی زبوں حالی کی وجہ سے حج اکبر سے محروم رہتے ہیں تو انہیں حج اکبر کا ثواب مل جاتا ہے۔ مبارک ہیں یہ مساکین، جو اس سرزمین میں اللہ کا کنبہ ہیں اور لوگوں کی سخاوت و حمایت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اے اللہ، ان پر اپنی رحمت کے طفیل ہم پر بھی رحمت فرما اور ہمیں اپنے حبیب پاکؐ کے پرچم تلے ان کے زمرہ میں شامل فرما۔

رسول اکرمؐ اپنی ایک حدیث میں کہتے ہیں :

"جنت کے باغات کی سیر کرو اور اس سے دل بہلاؤ۔"

لوگوں نے تعجب سے پوچھا: یہاں دُنیا میں جنت کے باغات کہاں ہیں؟ فرمایا:

"یہ ذکر کی مجلسیں ہیں، صبح و شام اللہ کا ذکر کرو اور اس کی برابر تذکیر کرتے رہو۔"

ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ ذکر الٰہی وہ ہوائیں ہیں جو ملکوت الٰہی کے باغات سے چلتی ہیں جو اسی دُنیا میں جنت کا مزہ اور اس کا لطف مہیا کر دیتی ہیں۔ کسی مرد نیک نے کیا خوب کہا ہے کہ :

"جو شخص اس دُنیا میں جنت کی رہائش اختیار کرنا پسند کرے وہ ذکر کی مجلسوں میں پابندی سے جائے۔"

اسی سلسلے میں ایک اور بزرگ کہتے ہیں کہ :

"اس دُنیا میں بھی ایک جنت ہے جو اس دنیا میں داخل نہ ہو سکا وہ آخرت کی جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکے گا۔"

یہ سارے مقولے اسی حقیقی وصف سے ماخوذ ہیں جس کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کی حقیقت اجاگر کی ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے کہ:

"مسلمان کا شیطان اس طرح مضمحل ہو جاتا ہے جس طرح تم میں سے کسی کا اونٹ سفر میں مضمحل ہو جاتا ہے۔"

دیکھئے کتنی سچی تصویر اور کتنا انوکھا انداز ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان جو برابر سفرِ الٰہی میں بڑھتا جاتا ہے، اطاعتوں کا ذخیرہ کرتا جاتا ہے، نیک اعمال اور باقیات صالحات کا اندوختہ کرتا ہے اور ذکرِ الٰہی کے قلعہ میں محصور رہتا ہے، اس پر شیطان کبھی قبضہ نہیں کر سکتا اور اسے اس کی منزل سے دُور نہیں کر سکتا۔

ہر انسان پر ایک شیطان مہد سے لحد تک مسلط رہتا ہے لیکن ایک مسلمان جو صراطِ مُستقیم پر گامزن رہتا ہے اس کا شیطان تھک جاتا ہے، اسے سُستی اور پژمردگی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ تھک ہار کر زبان نکال دیتا ہے۔ ایک مسلمان کو حزم و احتیاط اور کوشش و محنت پر اُبھارنے کے لئے اس سے بہتر وصف کا بیان ممکن نہیں ہے۔

یہ چند احادیث ہیں جو بعض خوبیوں اور برائیوں پر مشتمل ہیں اور ان کی حالت اور وصف بیان کرتی ہیں۔ یہاں ہم نے انہیں بطور مثال بیان کیا ہے تاکہ علمی عقلیت کا چوتھا مظہر نکھر کر سامنے آجائے اور دعوتِ اسلامی کا ایک اہم اسلوب واضح ہو جائے۔

یہ تمام اوصاف ـــــ جیسا کہ آپ نے دیکھا ـــــ اپنی دو بنیادی خوبیوں کی وجہ سے

ممتاز نظر آتے ہیں ایک ممتاز صفت ہے حقیقت کے اظہار میں مکمل سچائی سے کام لینا اور دوسری صفت ہے، پسند یا ناپسند، نفرت یا محبت کے جذبات کو اتنا ابھار دینا کہ بُرائی سے واقعی نفرت ہو جائے اور نیکی کو اپنانے کا داعیہ پیدا ہو جائے۔ لیکن میرے بھائی آگاہ باش! آپ کبھی بھی یہ گمان نہ کریں کہ یہ تمام اوصاف فقط ترغیب و ترہیب کے لئے ہیں، یہ کسی عام انسان کی صفت تو ہو سکتی ہے، لیکن رسولِ اکرمؐ کے شان سے یہ بعید تر ہے آپ نے کبھی اپنی خواہش نفس کی باتیں نہیں کیں اور جب بھی بولے ناپ تول کر بولے، آپؐ نے مکمل سچائی سے کام لیا، حقائق کو اخذ کیا اور آپ کے سامنے رکھ دیا۔ بس پھر آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ ان اوصاف کو آپ تمثیل اور اعجاز کا کرشمہ نہ سمجھیں جیسا کہ بعض کم عقل کبھی سوچنے لگتے ہیں اس لئے کہ رسول اکرمؐ کے عظیم مرتبہ کے سامنے ہم اور آپ اور بڑے سے بڑا ذوالمرتبت شخص کوئی حیثیت نہیں رکھتا نہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ آپ کے احترام میں مداخلت کرے اور آپ کے کلام کی تاویل کرے اور بغیر کسی واجب کے وہ اسے ظاہری مفہوم سے ہٹا دے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر کچھ اور مُراد لیا ہوتا تو تشبیہ، ضرب الامثال، مختلف قسم کے استعارے اور زبان و بیان کی نکتہ آفرینیاں اس کے لئے کافی تھیں۔

اور جب بھی حالات متقاضی ہوئے، اللہ کے رسول نے تشبیہات، ضرب الامثال استعاروں اور کنایوں کی زبان میں گفت گو کی ہے اور اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے میرے بھائی! اللہ کے رسول کے کلمات اور کلامِ الٰہی کو سمجھنے کے لئے اسی طریقۂ کار کو اپنایئے اس سے آپ کے عقیدہ میں پختگی آئے گی اور آپ کا دین و ایمان محفوظ رہے گا۔

یہ گفت گو میں اس لئے کر رہا ہوں تاکہ کوئی شخص کتاب اللہ کی رسّی کو چھوڑ نہ بیٹھے

اور اپنی مرضی کے مطابق ان محسوس اوصاف کے ذریعہ فضائل بیان کرنے لگے جو اپنے مصنوعی بیان میں شیریں ہوں اور برائیوں کو ان اوصاف کے ذریعہ واضح کرنے لگے جسے تدریجی فن پسند کرے۔ نہیں، ایسا کسی صورت میں ابھی مناسب نہیں ہے۔ ہم حق کی وضاحت کر رہے ہیں اس لئے ہم پر فرض ہے کہ اس سرچشمہ سے ان صفات کو سیراب کریں جہاں سے ہم نے حق کو سیکھا ہے یعنی کتاب وسُنّت سے۔ تاکہ حق سے تجاوز ہو کر خطا کی طرف قدم نہ بڑھ جائے اور آپ کے کلام میں تناقض پیدا ہو جائے۔ یہی محتاط لوگوں کا معاملہ ہوتا ہے تو آپ اس کو اختیار کیجئے اور ہر اس وصف کو بیان کرنے میں انہیں کے طریقۂ کار کی پیروی کیجئے جس سے آپ سب لوگوں کے ذہنوں اور ان کے دماغوں تک حقائق کو قریب کرنا چاہتے ہوں۔

ہم یہاں سلف کے کلام کے چند نمونے نقل کریں گے جس سے بات سمجھنے میں آپ کو آسانی ہوگی۔ مثال کے طور پر عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:

"مومن کا شیطان کمزور ہوتا ہے۔"

یہ وصف اس حدیث سے ماخوذ ہے جو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔ اسی مفہوم کو قیس بن حجاج یوں بیان کرتے ہیں:

"میرے شیطان نے مجھ سے کہا: "میں تمہارے اندر جب داخل ہوا تھا تو میں اونٹ کی طرح لمبا تڑنگا تھا لیکن اب میں گوریا کی طرح بے وزن ہو کر رہ گیا ہوں۔" میں نے پوچھا: ایسا کیونکر ہوا؟ اس نے کہا: تم مجھے اللہ کے ذکر سے پگھلا رہے ہو۔"

یہ گفتگو مومن اور شیطان کے درمیان ہونے والے معاملے کی وضاحت کرتی ہے

اور رسول اکرمؐ کے ارشاد مبارک سے سرِ مو تجاوز بھی نہیں کرتی۔

ایک دوسری مثال کو لیجئے۔ اور یہ رسول پاکؐ کے اس حدیث سے ماخوذ ہے جس میں آپؐ نے صدقات کو گناہوں کا دھوون بتایا ہے۔

عمر بن خطابؓ کے غلام اسلمؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن ارقمؓ نے کہا: امیرالمومنین سے میرے لئے کوئی اونٹ مانگ لیجئے جس پر میں سواری کر سکوں۔ اسلمؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا: ہاں، صدقے کا ایک اونٹ موجود ہے۔ لیکن عبداللہ بن ارقمؓ نے اس اونٹ کو نہیں لیا کیونکہ وہ مالِ غنیمت کا اونٹ چاہتے تھے یا جسے خرید اگیا ہو یا مصالح عامہ کے لئے روک رکھا گیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے صدقے کا اونٹ نہ لینے کی وجہ بتاتے ہوئے اسلمؒ سے کہا: مجھے بتاؤ کہ اگر گرمی کے دنوں میں موٹے بدن والا ایک شخص غسل کرے اور زیرِ ناف اور زیرِ بغل حصوں کو دھوئے پھر اس دھوون کو تمہیں پینے کے لئے دے تو کیا تم اسے پینا پسند کرو گے؟ اسلمؒ کہتے ہیں کہ میں غضبناک ہو گیا اور میں نے پوچھا: خدا تمہارا بھلا کرے کیوں اس طرح کی باتیں مجھ سے کر رہے ہو؟ تب عبداللہ بن ارقمؓ نے کہا: صدقہ کا مال وہ دھوون ہے جو لوگوں کے گناہوں کے دھلنے کے بعد بچ رہتا ہے۔

میرے بھائی! یہ اسلاف کلام رسول کو حقیقت کے آئینے میں دیکھتے تھے جس سے ان معانی کی اصل حقیقت نظر آجاتی تھی اور وہ آئینہ باشعور اور مُدبر دل کا ہوتا تھا۔ پھر اپنے دل سے جو چاہتے اخذ کر لیتے اور اس میں حسب ضرورت تصرف کر لیتے جیسا کہ آپ ابھی مشاہدہ کر چکے ہیں۔

اس طرح کی کچھ چیزیں آگے زیرِ بحث آئیں گی سے ہم اور آپ اس حق پر مجتمع ہو سکیں گے جس پر صحابہ کرام اور اسلاف صالحین جمع تھے۔

۵- عالمِ غیب کا عالمِ شہود سے تقابل

اللہ تعالیٰ نے جنّت اور جہنّم کا تفصیلی ذکر کیا ہے، حساب کتاب اور میزان کو بیان کیا ہے۔ اور روزِ حشر کا پورا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح لوگ خدا کے سامنے پیش ہوں گے اور حسرت و ندامت سے ہاتھ مل رہے ہوں گے کس طرح زمین پر زلزلہ آئے گا اور کتنی زبردست ہولناکی ہوگی، اس نے رحمت و نقمت کے فرشتوں پر بھی گفتگو کی ہے، عرش، کرسی، لوح و قلم اور دوسری حقیقتیں بھی بیان کی ہیں جن کے وجود پذیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ان حقائق کو دیکھ سکتے ہیں نہ انہیں محسوس کر سکتے ہیں اس لئے کہ ہم ان قوتوں سے محروم ہیں جو ان بلند حقائق کا ادراک کر سکتیں۔ جیسے کوئی پیدائشی طور پر سونگھنے کی طاقت سے محروم ہو تو عطر، مُشک اور پھولوں کی پاکیزہ خوشبو بھلا وہ کیسے محسوس کر سکے گا؟ اس لئے کہ اس کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جو ان خوشبوؤں کو اخذ کر سکے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ خلافِ معمول اپنی مخلوق میں سے کسی کو ان غیبی حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہے تو وہ حجاب اُٹھا دیتا ہے اور وہ بندہ وہ تمام چیزیں دیکھ لیتا ہے جو اللہ اسے دکھانا چاہتا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ (جن، ۲۶، ۲۷)

(وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لئے) پسند کر لیا ہو تو اس کے آگے اور پیچھے

وہ محافظ لگا رہتا ہے)

ان غیبی حقائق کا جو اجمالی تذکرہ قرآن میں آیا ہے، رسول پاکؐ کی احادیث نے ان کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اگر ہم اسے لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کر سکیں کہ ان کے دل اس سے متاثر ہوں اور ان کے دماغ اسے اخذ سکیں تو ہم پوری انسانیت کو ایک بڑی خطرناک بُرائی سے بچا سکتے ہیں اور اللہ کی توفیق سے اس کے سامنے دُنیا و آخرت کی سعادت کے دروازے کھول سکتے ہیں۔ آج لوگ آخرت سے غافل ہیں۔ بہتیرے زندگی بعد موت کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں اور جنات، ملائکہ اور دوسری ماورائے مادہ چیزوں کا انکار کر رہے ہیں۔ اس انکار و الحاد اور تشکیک نے انہیں خیر کے دروازوں تک رسائی حاصل کرنے سے روک رکھا ہے۔ وہ بس مادی تہذیب اور اس کی متاع قلیل پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی میں پاگلوں کی طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس پر دیوانوں کی طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور یہ مقابلہ آرائی اور خوں ریزی اپنی اُس آخری انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ درندے بھی ان سے زیادہ انسانیت نواز دکھائی دیتے ہیں:

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ‌ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ‌ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ۝ (فرقان: ۴۴)

(کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں)

اس لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں اس غیب پر ایمان لانے کی دعوت دیں جس کا وہ انکار کر چکے ہیں، اور زندگی بعد موت کے جملہ حقائق سے انہیں روشناس کرائیں تاکہ ان

کی انسانیت، ان کی سلامتی و آشتی اور ان کی فلاح و سعادت باز یافت ہو سکے۔

لیکن ان ساری چیزوں کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہم کتنی خوبصورتی سے ان حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے پیش کرنے کا انداز ایسا ہو جو دلوں کو لگ جائے وہ بتدریج ہوش میں آجائیں یا اچانک نیند سے بیدار ہو اٹھیں۔

عوام کی ایک قلیل تعداد ایسی ہوتی ہے جو اپنے کو اہل فکر سمجھتی ہے۔ وہ اس بات کے ضرورت مند ہوتے ہیں کہ علمی اسلوب میں حقائق ان کے سامنے پیش کئے جائیں اور منطقی دلائل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ اگر آپ کے اندر صلاحیت ہو تو انہیں انہی کی منطق سے سمجھانے اور انہی کی زبان میں بات کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن جمہور عوام کو متاثر کرنے اور ان کے اندر نفوذ حاصل کرنے کا قریب ترین وسیلہ یہ ہے کہ ان تمام حقائق کو ان کے بالمقابل عملی دُنیا کے حالات کا انتخاب کر کے پیش کریں۔ ایک حقیقت اور اس کے مشابہ دنیوی حالت دونوں کو ایک ساتھ ان کے سامنے بیان کریں اور ان دونوں کے درمیان جو مشابہت پائی جاتی ہے اسے اجاگر کریں۔ اس سے دلوں کے پردے چاک ہوں گے، غفلت دُور ہوگی اور اندر تک رسائی حاصل ہوگی۔ ہم یہاں پیہم اور بکثرت تذکیر کی وصیت کرتے ہیں اس لئے کہ وقفہ طویل ہو جائے گا تو ساری باتیں بھولی بسری ہو جائیں گی اور دل سخت ہو جائیں گے۔

ایک بار ایک اخوانی بھائی نے بڑی اچھی بات سُنائی۔ اس نے کہا: ایک بڑے بادشاہ نے ایک بار اپنی مملکت میں ایک نئے عہدے کی تقرری کا ارادہ کیا۔ اور وہ عہدہ ملک کے کسی علاقے میں نیابت اور جانشینی کا تھا، چنانچہ مملکت کے امراء و دانشور اس منصب کو حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے، مختلف قسم کی تلمیحات سے اس منصب کی

رغبت کا اظہار کیا اور برابر اس سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے یہاں تک کہ بادشاہ نے ایک انوکھا اعلان کیا کہ وہ ایسے شخص کا انتخاب کرے گا جوان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا، وہ عوام النّاس سے ہوگا جسے لوگ بالکل اہمیت نہ دیتے ہوں گے، اور ان تمام امرا، اور رکبارِ مملکت کو اس بات کا مکلف ٹھہرایا کہ بادشاہ کے حکم کے احترام میں وہ اس کی تعظیم کریں گے چنانچہ تمام امراء نے بادشاہ کے حکم کے آگے سر اطاعت جھکا دی، لیکن ایک شخص بغاوت پر اتر آیا، غصہ سے اس کا سینہ کھولنے لگا اور کبر وغرور نے اسے اندھا کر دیا اس کی غیرت وپندار نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس پست اور بے وقعت شخص کے سامنے وہ سر جُھکائے اور اس کی تعظیم کرے، چنانچہ اس نے بادشاہ کے حکم کو ٹھکرا دیا اور نتیجے میں بادشاہ نے اسے اپنی نعمت سے محروم کر دیا اور اس کے خلاف اپنے غم وغصہ اور ناراضگی کا اعلان عام کر دیا۔ یہ راندۂ درگاہ شخص بہت تلملایا اس نے چیلنج کیا کہ جس شخص کو آپ نے مجھ پر ترجیح دی ہے اس کے کارنامے جلد ہی دیکھ لیں گے۔ میں اس کی اور اس کے بیٹوں کی نگاہ میں محبوب بن جاؤں گا اور وہ تیرے حکم سے دُور جا پڑیں گے اور ان میں سے اکثر میرا ساتھ دے کر آپ کے غضب کا نشانہ بنیں گے اور آپ انہیں اپنی قربت اور منصب وجاہ سے محروم کر دیں گے۔

بادشاہ اس نووارد جانشین اور اس کی نسل پر حد درجہ مہربان تھا چنانچہ انہیں بار بار یاد دلاتا رہا کہ یہ راندۂ درگاہ شخص تمہارا دشمن ہے، اس سے دور رہو اور اس کی کسی بات کو تسلیم نہ کرو ورنہ اگر تم نے اس کی اطاعت کی تو نتیجہ اس جاہ ومنصب اور میری نعمتوں سے محرومی کی شکل میں نمودار ہوگا اور تم خوار ہو کر رہ جاؤ گے۔

وہ اخوانی بھائی کہتا رہا: بھائیو! لیکن یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ نووارد جانشین

اور اس کی نسل بہت جلد اس دشمن کی عداوت کو بھول گئی اور ان میں سے بہتیرے بادشاہ کی تنبیہوں سے صرفِ نظر کرنے لگے اور اس دشمن کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے جن میں اندر سے زہر بھرا ہوا تھا۔ جب ان میں سے کوئی دشمنی کی طرف مائل ہوتا تو بادشاہ کی نظر میں اپنا مقام کھو دیتا اور پھر اس کے غضب کا نشانہ بن کر راندۂ درگاہ ہو جاتا۔ تو کیا یہ عقلمندی و دور اندیشی ہے؟ اور کیا یہ بادشاہ کی نعمتوں کا شکرانہ اور اس کی قدر افزائی ہے؟ کیا عقلمندی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنے بدترین دشمن کی اطاعت کریں جسے بادشاہ نے دربار سے نکال دیا تھا؟ کیا اسے دور اندیشی کہیں گے کہ یہ لوگ اس کے قریب ہوں چہ جائیکہ کسی ایسے معاملے میں اس کی اطاعت کریں جو ان کے آقا کی غضبناکی کا باعث ہو؟

اخوانی بھائی یہاں پہنچ کر کچھ رُکا پھر دوبارہ اس نے گفتگو کا آغاز یوں کیا:

بھائیو! آپ کو اس واقعہ پر حیرت ہو رہی ہوگی اور آپ اسے بعید از قیاس قرار دے رہے ہوں گے حالانکہ یہ عملی دنیا میں وقوع پذیر ہو چکا ہے اور ہم سب اس واقعہ کا شکار ہیں جسے ہم محال قرار دے رہے ہیں۔ وہ عظیم و با جبروت بادشاہ خدا کی ذات ہے وہ اہم منصب، نیابت یا خلافت ارضی کا ہے اور امراء مملکت سے مراد فرشتے ہیں جن سے اللہ نے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے اس پر حیرت کا اظہار کرکے گویا اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں ترجیح دی جائے اور اس عز و شرف کا حقدار انہی کو سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً پوچھا تھا کہ کیا آپ ایسے لوگوں کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین میں فساد مچائیں گے اور خوں ریزیاں کریں گے:

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (البقرہ: ۳۰)

(کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں)

گویا وہ ان بلند خصوصیات کی طرف اشارہ کر رہے تھے جن سے وہ متصف تھے اور جن کی وجہ سے وہ اس نئے منصب کے اہل تھے لیکن اللہ نے انہیں یہ جواب دیا کہ:

اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ (بقرہ: ۳۰)

(میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے)

اللہ تعالیٰ نے اس پسندیدہ شخص کی حقیقت کا اعلان کیا کہ وہ بس ایک مٹھی مٹی سے بنے گا اور تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کی تعظیم کریں اس لئے کہ اللہ نے اسے معزز اور لائق تعظیم قرار دیا تھا:

اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ ۝ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ۝ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اِسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِیۡنَ ۝ قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ ۝ قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ ۝ قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِیۡمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَیۡكَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ (ص: ۷۱ تا ۷۸)

(جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: "میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے

آگے سجدے میں گر جاؤ۔" اس حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا۔ رب نے فرمایا: "اے ابلیس، تجھے کیا چیز اسے سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو بڑا بن رہا ہے یا تو ہے ہی کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے؟" اس نے جواب دیا "میں اُس سے بہتر ہوں۔ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔" فرمایا: "اچھا تو یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے اور تیرے اوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے۔"

میرے بھائیو! یہ ہے اس بدترین دشمن سے ہمارا معاملہ! جسے خود اللہ نے ہمارے سامنے بیان کیا ہے لیکن ہمارا حال کیا ہے؟ ہم اس نووارد نائب اور اس کی نسل کے بارے میں جس چیز کو محال قرار دے رہے تھے، ہم خود اسی کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں، وہ نووارد نائب اور اس کی ذریت تو ہم ہیں اور اس نے جو غلطی کی تھی ٹھیک وہی غلطی ہم بھی دوہرا رہے ہیں۔

دشمن غضبناک ہوگیا۔ اس نے خدا کو چیلنج کیا:

رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

(حجر: ۳۹، ۴۰)

(میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اُسی طرح اب میں زمین میں ان کے لئے دل فریبیاں پیدا کرکے ان سب کو بہکا دوں گا سوائے تیرے اُن بندوں کے کہ جنہیں تو نے ان میں سے خاص کرلیا ہو)

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُم مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

(اعراف : ۱۷، ۱۸)

(آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا: "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت اُن سب سے جہنم کو بھر دوں گا)

بھائیو! دیکھئے شیطان ہمیں ہلاک کرنے اور خدا کی نعمتوں سے محروم کرنے کے لئے کتنا بے چین اور مضطرب نظر آتا ہے۔ یہ سب اس کی اُس عداوت اور دشمنی کا نتیجہ ہے جو اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب وہ اوندھے منہ ہمیں جہنم میں گرا دے۔ افسوس ہے کہ تا حیات یہ غصہ اور دشمنی ٹھنڈی پڑنے والی نہیں، نہ یہ حسد کی آگ کبھی سرد پڑ سکتی ہے ——،

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ہمیں مسلسل اس دشمن سے آگاہ کرتا رہتا ہے اور اس کی چالوں سے ہوشیار کرتا رہتا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ

(اعراف : ۲۷)

(اے بنی آدم، ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح

اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا)

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (فاطر: ٦)

(درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لئے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لئے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں)

وہ ہمیں مسند خلافت کی اہمیت جتاتا اور شیطان کی دوستی کرنے سے ڈراتا ہے:

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ (کہف: ٥٠)

(اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں)

اللہ نے اس کی کبھی نہ بجھنے والی عداوت اور چھل کپٹ کی ہمارے سامنے تصویر کھینچ دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ برابر دنیا میں اپنا شکار ڈھونڈھتا رہے گا، بندگانِ خدا کو راہِ حق سے بھٹکاتا رہے گا اور انہیں خدا کی رحمت سے محروم کر کے عذابِ جہنم کی طرف ڈھکیلتا رہے گا یہاں تک کہ جب اس کی مراد بر آئے گی تو وہ جہنم کی ہولناکیوں اور انسان کی سزاؤں سے لطف لے گا اور اس وقت انسانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہے گا:

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ

وَعَدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (ابراہیم : ۲۲)

(اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کئے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کئے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو، یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا، میں اس سے بری الذّمہ ہوں، ایسے ظالموں کے لئے تو دردناک سزا یقینی ہے)

پھر اخوانی بھائی انسان کی غفلت و لاپروائی کا رونا رونے لگا کہ یہ انسان اپنے پیغام اور خلافتِ ارضی کی ذمّہ داری سے کس قدر دُور ہے دوسری طرف شیطانِ مردود سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے جس کا کام بس تباہی و بربادی مچانا اور فساد پھیلانا ہے۔

پھر وہ کہنے لگا کہ ہم اللہ کی تنبیہات اور اس کی وعیدوں سے کوئی خوف نہیں کھاتے اور آخر میں اس نے اپنی بات یہاں ختم کی کہ ہم کو غفلت کے ان دبیز پردوں کو چاک کرنا ہوگا، خوف و خشیت، تقویٰ و طہارت اور محبتِ الٰہی کی زندگی بسر کرنی ہوگی،

اور اللہ کے ذکر و شکر پر قائم رہنا ہوگا۔

یہ چیز پیچھے بیان کی ہوئی ضرب الامثال کی قسم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اس لئے کہ وہاں ہم نے جو بات کہی تھی وہ یہ کہ معنوی باتوں کو واقعات سے تشبیہ دی جائے لیکن یہاں عالمِ غیب کی چیزوں کو عالمِ شہود کی چیزوں سے کسی درجہ میں پائی جانے والی مشابہت کی وجہ سے تقابل کرنا مقصود ہے۔ ابھی پیچھے جو دونوں قصے بیان ہوئے وہ نعوذ باللہ خیالی دُنیا سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک واقعہ ملأ اعلیٰ میں واقع ہو چکا ہے اور دوسرے کے اس مادی دُنیا میں واقع ہونے کے امکانات ہیں۔ اس تقابل سے ہم غائب کو حاضر سے قیاس کر سکتے ہیں تا آنکہ ابہام اور اجمال کی باریکیاں چھٹ جائیں جو غیب کی باتوں کے ارد گرد محیط ہیں۔ دل ان کا مشاہدہ کرلے اور ایسا معلوم ہونے لگے گویا انسان انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے جیساکہ حارثہؓ رسول اکرمؐ سے فرماتے ہیں:

"اے اللہ کے رسولؐ! میرا دل دُنیا سے اُچاٹ ہوگیا ہے میں راتوں کو جاگتا ہوں اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں لگتا ہے کہ میں اپنے رب کے عرش کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور جنت میرے دائیں جانب ہے اور جہنم میرے بائیں جانب ہے اور پُل صراط میرے قدموں کے نیچے ہے۔"

یہاں مثال کے طور پر ایک اور واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عاقبت اندیش بادشاہوں کی عادت تھی کہ وہ ان مخلصین اور محنت کرنے والے افراد کی ہمسری کرتے تھے جو بغیر کسی مادی لالچ کے کام کرتے تھے۔

یہ مخلص اور سچے لوگ جو اپنے آقا کو خوش رکھتے تھے، اس کے دل میں مقامِ بلند رکھتے تھے، اور جب آقا کے دربار میں ان کا آنا ہوتا تو بادشاہ ان پر سخاوت و دریا دلی کا

خوب خوب مظاہرہ کرتا، انہیں ہدایا و تحائف دے کر خوش کر دیتا، اپنے درباریوں کو ان کے استقبال کے لئے بھیجتا اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتا۔ یہ تو اس دُنیا کا حال ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مخلصین کی تعظیم خدائے ذوالجلال کے دربار میں ہوگی۔

قرآن پاک کی یہ آیت پڑھئے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰــتِهِمْ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (رعد: ۲۲ تا ۲۴)

(اور جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لئے ہے۔ یعنی ایسے باغ جو اُن کی ابدی قیام گاہ ہوں گے، وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور اُن کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لئے آئیں گے اور ان سے کہیں گے "تم پر سلامتی ہے، تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا، اُس کی بدولت آج تم اِس کے مستحق ہوئے ہو۔)

رسولِ اکرمؐ مومنین صالحین کی اس قدر افزائی کی مزید توضیح اس طرح کرتے ہیں:

"خلق خدا میں سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے مہاجر فقراء ہوں گے جو ہر نازک موڑ پر کام آتے ہیں اور جن کے ذریعہ آفات و مصائب سے بچا جاتا ہے، ان میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس حال میں کہ اس کی خواہش اس کے سینے ہی میں دبی ہوتی ہے، اسے پورا کرنے کی وہ قدرت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے جن فرشتوں کو چاہے گا حکم دے گا، کہ: انہیں لاؤ، زندہ کرو، فرشتے کہیں گے: ہم آپ کے عرش کے باشندے ہیں، آپ کی مخلوق میں سب سے اچھے ہیں تو کیا ہمیں آپ یہ حکم دے رہے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو لے کر آئیں اور انہیں بڑھ کر سلام کریں؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ کہے گا: یہ لوگ میرے بندے تھے میری عبادت کرتے تھے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے، ان کے ذریعہ ناپسندیدہ چیزوں سے لوگوں کی حفاظت ہوتی تھی اور یہ ہر نازک موڑ پر کام آتے تھے، ان میں سے کسی کی موت ہوتی تھی تو اس حال میں کہ اس کی خواہش اس کے سینے میں دبی ہوتی تھی، اسے پورا کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ ملائکہ ان کے استقبال کو آگے بڑھیں گے اور ہر دروازے سے ان کے پاس داخل ہوں گے اور یہ کہہ رہے ہوں گے:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (رعد: ۲۴)

(تم پر سلامتی ہے تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اُس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو)

اس واقعہ کے دو پہلو ہیں ایک کا تعلق ملأ اعلیٰ سے ہے اور دوسرا اسی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے جس سے ہم سب مانوس ہیں لیکن غیب اور شہود کے اس تقابل سے دل کو مسرّت ہوتی ہے اور نفس کے اندر اس بات کی آمادگی پیدا ہوتی ہے کہ وہ غیب کے حقائق سے لطف اندوز ہو۔

یہ نہ سمجھئے کہ ہم نے اس باب میں تمام ضروری امور کا احاطہ کر دیا ہے بلکہ ہم نے تو فقط دروازہ کھولا ہے اور راہ کی رہنمائی کر دی ہے یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی ذہانت و فطانت سے اس تقابل کو انتہا پر پہنچا دیں۔ مثال کے طور پر آپ کے سامنے شاہانِ وقت ہیں جو انہی مال دار اور ذی وجاہت افراد کی تکریم کرتے ہیں جو اپنے اخلاص و عمل کا مظاہرہ کرتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ اس پیمانے سے کبھی نہیں ناپتا۔ اس کے یہاں تو اصل معاملہ انسان کے دل کے ساتھ ہوتا ہے یہاں تک کہ حدیثِ بالا کے مطابق جنت میں داخل ہونے والے مہاجر فقراء ہوں گے جن کی غربت و مفلسی کا یہ عالم ہو گا کہ ان کی حاجت ان کے سینے ہی میں دبی رہ جائے گی۔

اس طرح تقابل کے اور بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں جن کا ذکر کریں گے تو طوالت سمع خراش ثابت ہو گی۔

ہم میں سے بہتوں کو یاد ہو گا کہ مرشدِ عام استاذ حسن البنا شہید لوگوں کو وعظ و تلقین کرتے وقت تقابل کے اس ہتھیار کو استعمال کرتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ ہم میں سے کسی کا معاملہ پھنس جاتا ہے اور عدالت میں مقدمہ کی تاریخ پڑ جاتی ہے تو وہ برابر اس میں پریشان رہتا ہے ہمیشہ اس کی فکر اسے دامن گیر رہتی ہے، ایک لحظہ کے لئے بھی یہ مسئلہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ بڑے بڑے دانشوروں

سے مشورہ کرتا ہے، کاغذات کی تیاری کا کام شروع کر دیتا ہے، وکیل رکھتا ہے، گواہ ڈھونڈھتا ہے اور تاریخ آتی ہے تو مختلف قسم کے جذبات و احساسات، اندیشے اور امکانات لے کر عدالت میں حاضر ہوتا ہے اور ان ساری تدبیروں کے باوجود فیصلہ اس کے خلاف ہوتا ہے اور اس پر مالی تاوان کی ادائیگی لازم کی جاتی ہے یا چند ماہ یا چند سال کی قید کی سزا سُنائی جاتی ہے تو اس کے سامنے اس بات کا موقعہ رہتا ہے کہ اس سے اوپر کی عدالت میں اس مقدمہ کو لے جائے اور جب وہاں بھی اسے ناکامی ہوتی ہے تو آخر میں سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیتا ہے اور تاریخوں کے تعین کے ساتھ ہی اس کے اندیشے اور خدشے بڑھتے جاتے ہیں۔

استاذ شہید کہتے تھے کہ:

میرے بھائی، جب اس معمولی سے مقدمے میں تمہارا یہ حال ہوتا ہے تو اس وقت تمہاری پریشانی کا عالم کیا ہوگا جب اس سے کہیں بڑا مقدمہ درپیش ہوگا یعنی قرآن کریم کی دعوت و تبلیغ کا۔ اور جن کی موجودگی میں یہ فیصلہ سُنایا جائے گا، خود رسول اکرمؐ ہوں گے۔ تاریخ کا دن خود یوم قیامت ہوگا اور جج کوئی انسان نہیں ہوگا بلکہ آسمان و زمین کا خالق اور مقتدر و باجبروت خدا ہوگا، گواہ تمہارے ہاتھ پاؤں۔ بدن اور زبان ہوں گے اور فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا جس کو چیلنج نہ کیا جا سکے گا نہ اس پر نظر ثانی کی درخواست کی جا سکے گی اس لئے کہ اس جج کا فیصلہ ہوگا جو غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے، وہاں کوئی تاوان ہوگا نہ زرفدیہ، نہ فیصلے کے نفاذ میں کوئی دیر ہوگی۔ ایک طرف جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے اور دوسری طرف جنت ہوگی جس کی کشادگی آسمان اور زمین کے برابر ہوگی جو خدا ترس لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

مرشد عام اپنی بات کی تائید میں قرآن پاک اور احادیث رسولؐ کے ٹکڑے بھی نقل کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چند سطریں حقیقت کی توضیح کے لئے کافی ہیں۔

۶۔ آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرنا

میرے بھائی!

یہ پوری کائنات آپ کے سامنے ہے جو اللہ کی نشانیوں سے بھری ہوئی ہے، جب آپ اپنی دونوں آنکھوں سے اسے دیکھیں گے، کانوں سے اسے سُنیں گے، زبان سے اس کا مزہ چکھیں گے، ناک سے اس کی بُو سونگھیں گے، اس کی وادیوں میں اپنے پیروں سے چلیں گے اور اس کی چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے استعمال کریں گے تو آپ اس کائنات سے جڑے رہیں گے اور وہ آپ سے جُڑی رہے گی آپ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکے گا۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ قوت حس اور اس کے ادراک کے تحت واقع ہونے والے امور میں سے ہے جس میں انکار یا کج بحثی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں آسمان و زمین کو، چاند اور سورج کو پہاڑوں اور دریاؤں کو، کھیتوں، چوپایوں اور انسانوں کو دیکھ رہا ہوں، ان کے جسموں کو دیکھ رہا ہوں، ان کی آوازوں کو سُن رہا ہوں، ان کی بُو کو سونگھ رہا ہوں، انہیں اپنے ہاتھوں سے چھُو رہا ہوں اور وہ مجھے چھو رہے ہیں، میں ان کے اندر نفوذ کر رہا ہوں اور وہ میرے اندر نفوذ کر رہے ہیں تو گویا آپ ایسی چیز کو بیان کر رہے ہیں جسے آپ نے لمس کیا ہے،

جو آپ کی قوتِ حس اور تمام انسانوں کی قوتِ حس کے تحت واقع ہوئی ہے۔

ہم نے کائنات سے کیا سمجھا؟

ہمیں یہ حق حاصل کہ اوپر کی گفتگو سے یہ منطقی نتیجہ نکال سکیں کہ انسان کو لازماً ان چیزوں کا احاطہ کرنا ہے جن سے وہ متعلق ہے یا جو اس سے متعلق ہیں اور اس نے ان چیزوں کے اندر نفوذ کیا ہوگا ——— اور وہ چیزیں اس کے اندر نفوذ کر چکی ہوں گی۔ اس نے ان چیزوں پر گہری نظر ڈالی ہوگی، ان پر غور و فکر کیا ہوگا اور ان کے اسرار و رموز تک اس کی رسائی ہوگئی ہوگی نیز اس نے چیزوں کی قدر و قیمت پہچان لی ہوگی۔ کیا یہ وہ پہلی چیز نہیں ہے جس کا اس نے اس عالم وجود میں مطالعہ کیا ہوگا؟ اور کیا ان کی معرفت وہ اوّلین حقیقت نہیں ہے جو اس کے علوم و معارف کے خزینے میں موجود ہوگی؟

ہمارا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ انسان ان چیزوں کا اصطلاحی معنوں کے مطابق بالاستیعاب علمی احاطہ کرے کیونکہ یہ بہت مشکل کام ہے ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس کی نظر ان چیزوں کی تعمیر و تشکیل کی باریکیوں اور ان کے عجائب پر جائے تاکہ اس کاریگری اور محیر العقول کارنامہ کے جلال و جمال تک رسائی ہوسکے۔ یہ ہے وہ نتیجہ جو ہم نے اوپر کی تحریروں سے نکالا ہے بلکہ اوّلین مشاہدہ سے منطقی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے تو کیا انسان اس منطقی نتیجہ تک پہنچ سکا ہے؟ کیا اس عالم وجود میں غور و فکر کے سطحی اور عوامی مشاہدہ سے بلند ہو کر ہمہ گیر غور و فکر ——— جو تحیر اور تعجب کے جذبات و عواطف کو مہمیز لگا سکے ——— تک پہنچ سکا ہے؟ یا اس نے ایک غافل و احمق کی نظر و فکر پر اکتفا کر لیا ہے اور آگے قدم بڑھانے کے لیے تیار نہیں ہے؟!

انسان کی طفولیت

اس نے بچپن میں آسمان کو دیکھا تھا اور آج جب کہ جوان ہو چکا ہے، آسمان کو دیکھ رہا ہے لیکن جوانی کی یہ نظر کیا بچپن کی نظر سے کچھ مختلف ہے؟ اس نے بچپن میں دیکھا تھا کہ یہ ایک نیلی لمبی چھتری ہے جو پوری دُنیا کو چھائے ہوئے ہے تو کیا جوان ہونے کے بعد اس نے اس پر کچھ غور و فکر کیا؟ کیا اس کی پہنائیوں اور وسعتوں، اور عظمت و جلال پر اس نے نگاہ دوڑائی؟ مثال کے طور پر کیا اس نے یہ کوشش کی کہ آسمان کو اپنے ہاتھ سے پکڑے تاکہ اسے اچھی طرح یہ یقین ہو جائے کہ وہ آسمان کو اخذ نہیں کر سکتا؟ کیا اسے اس بات کی چنداں فکر لاحق ہوئی کہ انسان کی بنائی ہوئی مصنوعات اور اس عظیم الشان آسمان میں خدا کی بنائی ہوئی حیرت انگیز چیزوں کے درمیان وہ تقابل کرے تاکہ اس معجز نما نشانی کی اہمیت اس کے دل پر نقش ہو سکے؟ کیا اس نے اپنے دل کی آنکھوں سے اس عجیب و غریب اور نادر الوجود مخلوق کا مشاہدہ کیا کہ وہ اس زبردست خالق کو تلاش کر سکتا جس نے اسے وجود بخشا ہے اور جو آنکھوں سے غائب اور پوشیدہ ہے؟ کیا ایامِ جوانی میں اس نے اس طرح ان چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے؟ یا بچپن ہی کی طرح اسے دیکھتا اور نظر انداز کرتا رہا ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان نے آسمان اور دوسری تمام آیاتِ الٰہی پر بچہ کی طرح ہی نظر ڈالی ہے اور اس سے آگے کوئی اقدام وہ نہیں کر سکا ہے۔ اس جہت سے انسان ابھی تک بچہ ہی ہے، بوڑھا بچہ۔ اس نے عالمِ وجود پر نگاہ ڈالنے میں کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں کی ہے بلکہ انسانیت اپنی طویل ترین تاریخ میں اس میدان میں ابھی تک اتنا آگے نہیں بڑھ سکی ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ اس نے طفلانہ غور و فکر اور اوّلین سادگی کے مرحلہ سے آگے

قدم رکھا ہے۔

نظر نظر کا فرق

انسانیت اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب سادہ غور و فکر کے مرحلہ سے بحث و تجسس اور تحقیق و تفتیش کے مرحلے میں منتقل ہو جائے جس سے اس کی آنکھیں اور دل و دماغ وا ہو سکیں اور اس آیت کی عظمت و ہیبت سے متاثر ہو سکیں نیز اس میں پائی جانے والی عبرت و موعظت سے مستفید ہو سکیں یعنی یہ نظر اور غور و فکر اس طرح سے ہو کہ اشیاء کے خالق حقیقی اور صانع اصلی سے رشتہ جڑ جائے۔

اس طرح کی نظر اور غور و فکر انسانیت کو آگے بڑھاتی اور اسے کمال کی طرف لے جاتی ہے یہ نظر خود انسان کا بلکہ اس کے باطنی وجود کا پتہ دیتی ہے اگر یہ نظر جامد ہو اور تعطل کا شکار ہو تو یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ صاحبِ نظر جمود و تعطل کا مارا ہوا اور شعور و تدبر سے عاری ہے۔

اور اگر نظر زندہ و توانا ہو تو یہ انسان کی اندرونی زندگی کی توانائی و تازگی کی علامت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص اثرات کو قبول کرنے والا وجدان رکھتا ہے اور مختلف عمدہ احساسات و جذبات کو مہمیز لگانے والا دلِ زندہ کا مالک ہے۔

میرے بھائی! دیکھئے تو سہی، انسان کتنا غافل و نادان ہے بلکہ اس کی باطنی قوتوں پر کس درجہ بلادت چھائی ہوئی ہے کہ وہ آسمان کو دیکھتا ہے، اس کے اطراف و جوانب پر نگاہیں دوڑاتا ہے لیکن جلال و عظمت کا کوئی احساس اس کے اندر نہیں ابھرتا! وہ سورج کو دیکھتا ہے کہ آسمان میں مسخر ہے لیکن اس کے وجدان پر کوئی تحیر

اور ہیبت طاری نہیں ہوتی! بلکہ ان تمام چیزوں کی طرف اسی طرح دیکھتا ہے جیسے ان کی کوئی اہمیت نہ ہو بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کی نگاہ میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے —،

انسان بچہ ہے چاہے کتنی ہی عمر میں بتا چکا ہو! انسانیت ابھی اپنے پہلے دور میں ہے چاہے کتنی ہی نسلیں گزر گئی ہوں۔ جی ہاں یہ ابھی طفولیت کا دور ہے جس میں انسان آپ کی ہمدردیوں اور غم خواریوں کا محتاج ہے، یہ دورِ طفولیت ایسا ہے جس میں انسان انہی چیزوں کو سمجھ پاتا ہے جو اس کے ارد گرد محدود دائرے میں پائی جاتی ہوں لیکن جو چیزیں باصلاحیت اور بڑے لوگوں کے درمیان موجود ہیں ان سے اس بچے کو ابھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ کسی بچے کو نہیں دیکھتے، اس کے سامنے بڑی عمر کے لوگ مختلف معاملات پر گفتگوئیں کرتے ہیں، وہ ان کی باتیں سُنتا ہے لیکن انہیں نہیں سمجھتا نہ ان سے اسے کوئی دلچسپی ہوتی ہے اس لئے ان سے بے نیازی برتتا ہے لیکن جوں ہی وہ بچوں کو کھیلتے یا باتیں کرتے ہوئے دیکھتا ہے، بڑی تیزی سے ان کی طرف لپک پڑتا ہے، ان کی باتیں سمجھتا ہے ان کے درمیان گھل مل جاتا ہے اور ان کی خوشیوں میں شریک ہو جاتا ہے۔

یہ انسان — نہیں بلکہ بڑی عمر کے بچے — حیرت زدہ رہ جاتے ہیں جب مارکونی ان کے درمیان اعلان کرتا ہے کہ وہ عنقریب اٹلی میں بٹن دبائے گا تو آسٹریلیا میں چراغ جگمگا اٹھیں گے، اور مارکونی کے اس اعلان کو یہ لوگ اپنی شب و روز کی محفلوں کا موضوع بحث بنا لیتے ہیں اور اس عجیب و غریب ایجاد پر اس کی حد درجہ تکریم کرتے ہیں [1]

---

[1] یہ سطریں چوتھی دہائی کے آغاز میں لکھی گئیں (مصنف)

لیکن آسمان روزانہ ان کے سامنے کروڑوں چراغ روشن کرتا ہے، جس میں نہ کوئی بٹن ہے جسے دبانا پڑے، نہ تیل کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی بجلی کی۔ اب بتایئے کہ ان میں سے کون سی خبر زیادہ حیرت انگیز، زیادہ لائق تعجب اور زیادہ قابلِ احترام و تکریم ہے؟۔

لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بوڑھے بچے آسمان کے چراغوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتے نہ انہیں اپنی شب و روز کی گفتگوؤں میں کوئی جگہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال کے روشن کردہ یہ چراغ، اس کی عظمت و قدرت اور اس کے جلال و کمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس اشارہ کو بڑے آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں، بوڑھے بچے انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔

یہ مہلک مرض ہے

میرے بھائی! اگر حیرت و استعجاب میں پڑنا ہے تو اس انسان کی طفولیت پر سر دھنئے جس کے سینے میں شعور کے عوامل بھرے پڑے ہیں آیاتِ الٰہی پر بس ایک بار نظر کرکے منتظر ہیں کہ ان میں حرکت و اضطراب جاگ اٹھے اور دل میں نمود و ارتقاء اور زندگی و تر و تازگی دوڑ جائے۔ اور اگر آپ کو تعجب ہو رہا ہے تو اس انسانیت پر تعجب کیجئے جو کھلی فضاؤں میں آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہوئے جی رہی ہے، آسمان کی بوقلمونیاں دیکھ رہی ہے، اس زمین کے اوپر زندگی بسر کر رہی ہے جس میں پہاڑ ہیں، بڑے بڑے سمندر ہیں، خوفناک صحرا اور چٹیل میدان ہیں، نباتات، حیوانات، جمادات اور دوسری تمام مخلوقات کے اندر پائی جانے والی نشانیوں سے یہ سرزمین بھری پڑی ہے لیکن

اس کے باوجود انسانیت غفلت اور جمود کے تحت صدیوں سے جی رہی ہے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کسی چیز کا وجود نہیں ہے نہ اوپر سے کوئی چیز نظر آ رہی ہے۔ اگر آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیاں مخفی ہوتیں یا انہیں ڈھونڈھنے میں ذہنی ورزش کرنی پڑتی تو اس اعراض و بے نیازی بلکہ اندھے پن کے لئے معذرت تلاش کر لیتے لیکن یہ نشانیاں بالکل ظاہر اور عیاں ہیں آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں، حواس انہیں محسوس کر رہے ہیں، ہر طرف انسان کو ان سے سابقہ پیش آتا ہے اور ہر وقت وہ نشانیاں انسان پر مسلط رہتی ہیں۔

کیا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے کہ انسان اس کے باوجود ان نشانیوں سے بے نیاز رہے، ان کی طرف توجہ نہ دے اور ان سے کوئی اثر قبول نہ کرے؟ بلکہ کیا یہ تکلیف دہ اور المناک صورتِ حال نہیں ہے کہ انسان کی اس بے نیازی اور غفلت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا باطن تاریک ہے اور اس کے وجدان پر اندھیاریوں کا راج ہے؟

یہ غفلت اور بلادت ہی انسانیت کے امراض کی جڑ ہے، جب دل اس مرض کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ فساد زدہ ہو جاتا اور تاریک ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات مر جاتے ہیں اور اللہ کی کسی نشانی سے کوئی اثر نہیں لیتے، اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی ہیں لیکن ان سے کوئی اثر نہیں قبول کرتیں:۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ (حج : ۴۶)

(حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں)

کسی اخوانی بھائی نے اس پر سوال کیا کہ: میرا خیال ہے کہ یہ غفلت فطری ہے،

یہ دل کی کوئی بیماری ہے اور آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیاں جذبات و احساسات میں یہ ابھار پیدا نہیں کر سکتیں۔

اس کے دوسرے ساتھی نے جواب دیا کہ: نہیں، معاملہ یوں نہیں ہے جیسا تم سمجھتے ہو۔ میں یہاں ایک مثال کرتا ہوں جس سے تمہارے فاسد اور غلط خیالات محو ہو جائیں گے تو غور سے سُنو:

جو لوگ انسانیت کی مُستقبل سے شگون بد لیتے ہیں وہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ کچھ مکانات بنائے جائیں گے بلکہ زمین کے نیچے مکمل شہر بسائے جائیں گے تاکہ جنگوں کی ہولناکیوں اور آفات و مصائب سے بچا سکے۔ آپ میرے ساتھ فرض کیجئے کہ اس طرح کا کوئی شہر بسا دیا گیا ہے اور اس کے تمام باشندے مصنوعی روشنی اور مصنوعی ہوا کے عادی ہو چکے ہیں سطحِ زمین پر پائی جانے والی تمام قدرتی نعمتوں اور تحائف سے بہت دور ہیں اور یہ بھی مان لیجئے کہ اسی شہر میں ایک بچہ جنم لیتا ہے، اسی کی مٹی میں کھیلتا کودتا اور اسی کے میدانوں میں پرورش پاتا ہے، اسے روشنی کے نام پر وہ بجلیاں دکھائی دیتی ہیں جو شب و روز روشن رہتی ہیں، ان کے علاوہ روشنی کا کوئی تصور اس کے پاس نہیں ہوتا، اس کی نگاہیں اوپر اُٹھتی ہیں تو شہر کی مصنوعی چھت اسے نظر آتی ہے اس لمبے چوڑے اور وسیع قدرتی آسمان کا اس کے پاس کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ بس چند بلند و مستحکم ستونوں کے سہارے کھڑے ہوتے اس مصنوعی آسمان کو دیکھتا ہے اور یہ ساری چیزیں اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں اور وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ دنیا یہی ہے اور اس زندگی کی فطرت اور اس کا مزاج اسی طرح جاری و ساری رہے گا اور یہی تصور لئے وہ جوان ہوتا ہے۔ پھر ایک دن اسے سفر کی ضرورت پیش آجاتی ہے چنانچہ وہ سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔

یہاں میں آپ کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ سوچیں کہ اس نوجوان کی کیا حالت ہوگی جب وہ حقیقی آسمان کو دیکھے گا اور اس آسمان اور شہر کے مصنوعی آسمان کے درمیان تقابل کرے گا؟ ایک آسمان وہ تھا جو محدود تھا، ستونوں پر قائم تھا اور ایک آسمان یہ ہے جو بے انتہا بلند و بالا ہے اطراف و جوانب بے کنار ہیں، نگاہیں اس کی لمبائی و چوڑائی کا ادراک نہیں کر سکتیں، اس کے خالق نے اسے بلا ستون کھڑا کیا ہے۔ آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس نوجوان کی تصویر کشی اور اس کے خیالات کا اتھل پتھل الفاظ میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔ وہ اس عظیم اور معجز نما منظر کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے گا، اس کی زبان گنگ ہو کر رہ جائے گی، جب وہ سورج کو دیکھے گا کہ ضو فشاں ہے، ہر طرف نور بکھیر رہا ہے اور دنیا کی ہر چیز کو منور کر رہا ہے وہ اس آسمانی حیرت انگیز چراغ اور اپنے شہر کے مصنوعی چراغوں کے درمیان بڑا زبردست فرق محسوس کرے گا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ شہر کے تمام چراغ اور قمقمے ایک طاقت میں تبدیل کر دیئے جائیں اور ان کی طاقت متحد کر دی جائے تو بھی بین الاقوامی اور قدرتی چراغ کے آگے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اور جب وہ یہ دیکھتا ہے تو حیران و پریشان رہ جاتا ہے کہ یہ عظیم چراغ کسی ستون پر قائم نہیں ہے نہ کسی چیز میں لٹکا ہوا ہے جیسا کہ اس کے شہر میں تھا۔ اور اس کی حیرت مزید بڑھ جائے گی جب وہ یہ محسوس کرے گا کہ یہ چراغ اپنی لامحدود فضا میں دوڑتا رہتا ہے مشرق سے مغرب سے منتقل ہوتا رہتا ہے تو آخر یہ کیسے منتقل ہو جاتا ہے؟ کس قوت کے سہارے وہ حرکت میں آتا ہے؟ کہاں سے اس میں روشنی آتی ہے؟ اور کون ان سب چیزوں کا نظم کرتا ہے؟!

پھر اس نوجوان کی حیرت زدگی کا اندازہ کیجئے جب رات ہو جائے گی، دن کا منظر

بدل جائے گا، آسمان میں چمکتے ہوئے ستارے روشن ہوجائیں گے اور ہر جہت کو منور کردیں گے یہ ایسی چیز ہے جو عقل کو عاجز کردے گی، دل میں حیرت و استعجاب کو بھر دے گی اور دماغوں پر دہشت اور خوف طاری کردے گی۔

پھر آدھی رات کا وقت آئے گا تو رات کی یہ سیاہی چھٹتی جائے گی، صبح کی سفیدی غالب آتی جائے گی اور سناٹے اور دہشت میں ڈوبی ہوئی سرزمین پھر سورج کی شعاعوں سے منور اور ہنگامہ خیز بن جائے گی — آخر یہ کیسا نظام ہے؟ یہ کون سا جمال ہے؟ اور اس عجیب و نادر کائنات میں یہ کیسی نشانیاں ہیں؟ میرے ساتھی! اگر آپ اس نوجوان کے ساتھ ایک دن اور ایک رات رہتے اور اس کی ظاہری حرکتوں کا مشاہدہ کرتے اور اس کے باطنی احساسات اور دھڑکنوں کو دیکھ سکتے تو آپ صحیح دیکھ لیتے کہ اللہ کی ان نشانیوں پر غور و فکر کرنا ہمارے اوپر کیونکر واجب ہے اور آپ یہ قطعی فیصلہ کرتے کہ لوگوں کے اندروں بے نور ہو چکے ہیں اور ان عجیب و نادر اور عظیم مناظر کو دیکھ کر ان کے اندر کوئی عبرت و موعظت نہیں بیدار ہوتی نہ کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے۔

اس درد کا درماں؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس مرض کا علاج کیونکر ہو؟ اس کی کیا سبیل کی جائے کہ انسان کا باطن ترقی کرنے لگے اور معنوی زندگی عروج پر آجائے؟ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے جس سے اس دبیز غفلت کے پردے کو ہٹا دیا جائے تاکہ انسان کا دل اپنا کام کرنے لگے؟ وہ ہر چیز میں خالق کو دیکھنے لگے اور ایسا معلوم ہونے لگے کہ ہر چیز میں ایک روشن دان ہے، جس سے ملأ اعلیٰ کی زیارت کی جاسکتی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ سوال

یوں ہے کہ کیا کوئی راستہ ایسا ہے جس پر چل کر انسانیت اپنے دورِ طفولیت سے ترقی کر کے دورِ تجربہ و آزمائش اور دورِ عقل و فہم میں داخل ہو سکے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ایسا راستہ موجود ہے اور ہمیں اسے تلاش کرنے اور اس سلسلہ میں غور و فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے ۔ جامِ شفا ہمارے ہونٹوں پر ہے بس ضرورت اسے حلق سے نیچے اتارنے کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہر چیز کو بیک وقت دو نظروں سے دیکھیں۔ ایک تو ہماری وہ نظر ہو جو چیزوں کے ظاہری وجود اور اس کی خارجی حرکات کا مشاہدہ کرے اور دوسری نظر ہماری اندرون کی ہو جو چیزوں کو اس طرح دیکھے کہ وہ کسی فاعل کا فعل کسی مدبر کا امر و نظم اور کسی صانع کی صنعت ہیں چنانچہ اس فاعل، مدبر و منتظم اور صانع کی تلاش شروع کر دے تا آنکہ اللہ تک اُس کی رسائی ہو جائے۔

یہ دو نظریں ہیں جو بیک وقت کام کرتی ہیں ۔ اور آپ کا کام بس اتنا ہے کہ چیزوں پر نگاہ ڈالتے وقت باطنی آنکھ کو بیدار اور باہوش رکھیں اور اندرونی وجود کو ہوشیار اور چوکس رکھیں۔ اگر آپ اس باطن کو بیدار کر دیں اور باطن کو ظاہر اور ظاہر کو باطن سے ملا دیں تو آپ نے گویا مقصدِ وجود کو پا لیا اور اپنے قلب کو ملکوتِ الٰہی تک پہنچا دیا۔ یہ ہے عین زندگی اور ترقی و کامرانی کی منتہا!

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علاج آسان نہیں ہے ؟ یہ جتنا آسان ہے اتنا ہی مفید بھی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہاں کوئی شخص یہ پوچھ سکتا ہے کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت دورِ طفولیت

میں ہے اور مختلف امراض میں مبتلا ہے جبکہ یہی انسانیت روزانہ دنیا کا از سرِ نو سائنس، صناعت، اور ایجادات میں مطالعہ کرتی ہے اور ان تمام میدانوں میں اس نے پچھلی تمام صدیوں اور نسلوں کو بالکل پیچھے چھوڑ دیا ہے؟

ہم چاہتے ہیں کہ اس اعتراض کو دفع کرنے کے لئے ایک ایسے قضیہ کو حکم بنائیں جو تمام لوگوں کے نزدیک مسلم ہو۔ تمام ہی انسان یہ کہتے اور مانتے ہیں کہ: علم ایک روشنی ہے اور اس روشنی کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ انسان جن چیزوں کو دیکھ رہا ہے ان کی حقیقت کو بھی پہچانے، کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس علم کو پوشیدہ اور مخفی چیزوں کو اجاگر کرنا چاہیئے یا اسے کوئی معجزہ ظہور میں لانا چاہیئے۔

بلکہ اس کی ذمہ داری ہم یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ انسان کو روشنی دے تاکہ وہ اس آسمان کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے جو اس کے اوپر چھایا ہوا ہے، اس زمین کی اصلیت پر غور کر سکے جو اس کے نیچے ہے۔ اور ان دونوں کی حقیقت بلکہ ہر وجود کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ ایک خالق کی تخلیق اور ایک صانع کی کاریگری ہے۔ لیکن انسان ان تمام چیزوں کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس نگاہ سے یہ بے نور گونگے حیوان دیکھتے ہیں۔

علم حقیقت میں روشنی ہے، آنکھوں کے لئے بلکہ دلوں اور دماغوں کے لئے۔ جب یہ روشنی دلوں اور دماغوں میں اتر جاتی ہے تو آنکھوں ہی کی طرح دل بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ اب مجھے خدارا بتایئے کہ اگر لوگوں کا علم اس درجہ صحیح اور کامل ہے تو اس کا نتیجہ کہاں گیا؟ اور اس کی روشنی کہاں گئی جبکہ اس روشنی کے حاملین بدیہیات کو بھی نہیں دیکھ پا رہے ہیں؟ فعل کو دیکھتے لیکن فاعل پر ان کی نظر نہیں جاتی؟ اس علم کی آخری غایت یہ ہے کہ یہ سروں کا علم ہے جو اجسام کی خدمت کے لئے حیران اور سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ

اس بات کا علم ہے کہ کھانا کیسے پکایا جائے، مال کی حفاظت اور آمدنی کیسے ہو؟ تجارت کس طرح کی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع دے اور آلات اور اسلحہ جات کیسے بنائے جائیں کہ طاقتور ہر اس شخص کو دبوچ لے جو اس کی روٹی میں رکاوٹ بنے۔ ان کا علم سیاست ہے کہ کس طرح یہ زیادہ سے زیادہ طاقت اور اقتدار اکٹھا کریں، کیسے دوسروں کو زیردست بنا کر رکھیں اور کیسے اپنی بالاتری کا سکہ دوسروں پر چلائیں؟ ان کا علم فنِ تعمیر ہے جس نے پانی کا ذخیرہ کر دیا ہے، سڑکوں کو وسیع اور کشادہ اور پختہ کر دیا ہے اور بلند و بالا عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور حرکت کے قوانین کا انکشاف کیا ہے، ہتھیاروں کو استعمال کیا اور اس کے ذریعہ بمباری کی ہے۔ ان کا علم طب ہے جس کے ذریعہ انہوں نے جسموں کا علاج کیا ہے، بیماریوں کے جراثیم کا مقابلہ کیا ہے اور بدن کی حفاظت اور تندرستی کے لئے مختلف قوانین بنائے ہیں۔ انہوں نے کم وقت میں زیادہ کام کرنے کے لئے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف ایجاد کئے، جسمانی مشقتوں کو کم کرنے کے لئے گاڑیاں اور ہوائی جہاز بنائے اور ریڈیو، ٹیلی ویژن نیز دوسرے قسم کے آلاتِ نقل و حمل اور ذرائع ابلاغ ایجاد کئے۔ ان کے علم نے یہ ساری ایجادات و انکشافات کیں لیکن ان میں محض جسم کی تسکین، معدہ کی رغبت اور عیش کوشی کے سامان ہیں اور ان چیزوں کا اس نور سے کوئی تعلق نہیں جو علم کے نتیجہ میں ظہور میں آتا ہے اس لئے کہ انسان ان تمام ایجادات و اختراعات میں خالق حقیقی کا عکس تلاش نہیں کرتا۔

علمِ الٰہی ان علوم کی قدر و قیمت نہیں گھٹاتا اس لئے کہ متعین ضروریات کی تکمیل اور فرائض کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری ہیں، زمین کو سرسبز و شاداب بنانے اور اس سے غلہ اگانے کے لئے، تعمیرات کے لئے، صنعت و حرفت اور نفع بخش ہتھیاروں کو بنانے

کے لیے ان علوم کی موجودگی ضروری ہے اور ان چیزوں کی طرف کتاب وسُنّت میں بھی توجہ دلائی گئی ہے۔

اصل میں قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ اس محدود علم کو انسان کی بلند قدروں کے لئے زندگی اور روشنی کا سرچشمہ مان لیا جائے۔ یہ نہایت غلط خیال ہے جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔ وہ علم جو بدن کی ضروریات کی تکمیل کے لیے وجود میں آیا ہو بھلا وہ فرائض کیسے نبھا سکتا ہے جو اس کی حدود سے باہر ہوں؟ اور وہ نتائج کیسے ظہور میں لا سکتا ہے جو اس کے مزاج میں نہ داخل ہو؟ بھلا اس علم میں روشنی کیسے آسکتی ہے جو کسی چیز کی طرف دیکھے تو بس اس کے مادی حصے کو، اس کا تحلیل وتجزیہ کرے اور اس کی مخفی قوتوں کو اجاگر کرے تو صرف اس لیے کہ حیوانی وجود کو اس سے نفع حاصل ہو اور اس کا کوئی فائدہ انسان کے معنوی وجود تک نہ پہنچ سکے؟ جب انسانیت اس علم کے سائے میں ترقی کرے گی تو اس کی ترقی خالص ارضی اور مادی ہوگی جس میں اس عبرت وموعظت کا کوئی پہلو شامل نہ ہو گا جس سے انسان کی حقیقت زندہ وبیدار ہوتی ہے۔

فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب

مغربی تہذیب، اس علم کا فن، اس کی ایجادات واکتشافات اور اس کی ساری چیزیں انسان کے باطن کو غذا فراہم نہیں کر سکتیں، اسے وجود حقیقی سے جوڑ نہیں سکتیں، دوسرے لفظوں میں اس کے دل میں وہ روشنی پیدا نہیں کر سکتیں جس سے وہ وجود کے مغز کو پالے اور زندگی کی حقیقتوں سے روشناس ہو جائے۔ مغربی تہذیب اور ضمیروں کی بیداری اور حواس باطنہ کی تعمیر وترقی کے ہر وسیلہ اور طریقہ کار سے عملی طور سے خالی ہے، اس لئے وہ

انسان کے باطنی وجود، خیر وکرامت کی اس کی خصوصیات اور مخلوقات کو دیکھ کر ان کے خالق تک پہنچنے کی اس کی طاقتوں اور صلاحیتوں کا انکار کرتی ہے اور اسے ایک ایسا انسان سمجھتی ہے جس کا باطن مقفل ہے جیسے گونگی بہری مشین ہو۔ پھر بھلا انسانیت علم صحیح اور نورِ حقیقی سے اپنا حصہ کیسے پا سکتی ہے جبکہ وہ اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ ہدایت اور بہتری دلوں میں ہوتی ہے معدوں میں نہیں، نور دلوں اور دماغوں میں ہوتا ہے آنکھوں میں نہیں؟

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسانیت کی صحیح ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ سادہ نظری سے آگے بڑھ کر غور و تدبر اور بحث و تمحیص تک پہنچے جس سے آیاتِ الٰہی کی عظمت اور ان کے جلال و کمال کو اس کے دل کی آنکھ دیکھ سکے اور اس میں جو اسرار اور حکمت الٰہی پوشیدہ ہیں ان سے اثر لے سکے۔

یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ انسان کے اندرون میں پوشیدہ انسانی وجود کی تسکین اور اس کی غذا کی فراہمی کا سب سے آسان راستہ یہی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ یہی وہ مضبوط دھاگا ہے جو اس وجود کو اس کی آسمانی زندگی کے سرچشمہ سے جوڑ دیتا ہے۔ اور چونکہ یہ تہذیب جدید ہر ایسے علمی طریقۂ کار اور منفعت بخش توجّہ و عنایت سے خالی ہے جو انسان کو اللہ کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے پر آمادہ کرے، اس لئے یہ دھاگا بہت کمزور ہو چکا ہے اور اس بہترین وجود کو تہذیب مغرب نے زندگی سے دُور، اور نُور اور غذا سے محروم رکھ چھوڑا ہے اور ہم نہیں سمجھتے کہ یہ وجود اس نورانی ماحول سے زیادہ کہیں اور خوش بخت اور سعادتمند ہو سکتا ہے جسے رسول اکرمؐ اور آپ کے پیارے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے فراہم کیا ہے۔ انسان کو یہ فیروزمندی اور سعادت مندی میسّر رہی لیکن بعد میں ایسے لوگ آئے جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوات کے پیچھے چل پڑے جس کے نتیجے میں وہ رجعت قہقری سے

دوچار ہوئے اور پھر پہلے کی طرح بچے بن گئے۔

اس علمی تہذیب یا جیساکہ بعض لوگ انصاف سے کام نہ لے کر اسے نوری تہذیب کہہ بیٹھتے ہیں ـــــ سے یہ توقع تھی کہ وہ انسان کے اندر خیر کے سرچشمہ اور عبقریت کے ماخذ کی طرف توجہ دلائے گی اور اس سے استفادہ کو بہتر بنائے گی لیکن اس نے علم کے باوجود ٹھوکریں کھائیں اور اس حیوانی وجود کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف دھیان نہ دیا جو مٹی سے نکلتا ہے، مٹی میں مل جاتا ہے اور مٹی ہی سے نشو و نما پاتا ہے۔

کھلی کتاب

ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی علمی داعی جو اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہو، وہ لوگوں کے اردگرد بکھرے ہوئے آثار و آیات کی طرف انہیں توجہ نہیں دلائے گا، اس لئے کہ یہ آثار و آیات وہ شواہد ہیں جو اس کی دعوت کو زیادہ فصاحت و وضاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہم پیچھے ان علمی خصوصیات میں اس امر پر گفتگو کر چکے ہیں جن سے دعوت الی اللہ کی راہ میں واقعاتی عقلیت کو متصف ہونا چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی نشانیوں اور اس کی نعمتوں پر انسان کا توجہ دینا اس کی فطرت سے نہایت قریب اور خدا کو پانے کا نہایت آسان طریقہ ہے۔

یہ عالم وجود جو آپ کے سامنے ہے، یہ اللہ کی کھلی کتاب ہے اور یہ عجیب و غریب کائنات جو اس کے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے وہ زندہ سطریں ہیں جن میں انسان اس کی قدرت و رحمت، علم و حکمت، کرم و سخاوت، محبت و مودت، بر و عظمت کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی چیز پر آپ کی نگاہ پڑ گئی یا آپ کے کانوں نے انہیں سن لیا یا آپ کے

ہاتھوں نے لمس کر لیا تو حقیقت میں اللہ کی حکمتوں اور عبرتوں کا ایک وقیع خزانہ آپ کے ہاتھ آگیا۔

اور یہ اللہ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ اس نے اس کھلی کتاب کا مطالعہ عالم وجاہل، پڑھا لکھا اور ناخواندہ ہر شخص کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ آدمی پر جو فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دیکھے یا سُنے یا چھوئے پھر اس کی محسوسات کے دائرے میں جو چیز آتی ہے اس کا خالق حقیقی سے رشتہ جوڑ دے یعنی یہ سمجھ لے کہ یہ محض اللہ کی صفت اور اس کی کاریگری ہے۔ اس طرح کی سوچ اور فکر اس عالم صنعت وکمالات کے اندر سے عبرت ونصیحت کے بہت سے پہلو ڈھونڈ نکالے گی اور خدا کی بیشمار صفات کو منظر عام پر لا سکے گی جس سے دل میں لطیف جذبات کی پرورش ہوگی اور بلند احساسات جنم لیں گے اور ایسا معلوم ہوگا کہ اس عظیم کائنات کی رُوح اس کے اندر سرایت کر گئی ہے۔ جب انسان اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اس کا خدا سے تعلق جڑ جاتا ہے اور روحانی نوازشوں کا اس کے اوپر دروازہ کُھل جاتا ہے پھر دل خوشی ومسرّت سے لبریز ہو جاتا ہے، نفس خدائے ذوالجلال کے سامنے جُھک جاتا ہے، آنکھ آنسو بہانے لگتی ہے اور انسان کی طبیعت منوّر ہو جاتی ہے اور اس لمحے انسان خدائی نور کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے اس کا دل نور سے بھر جاتا ہے، اس کی عقل نور سے روشن ہو جاتی ہے، اس کے گوشت پوست میں نورانیت دوڑ جاتی ہے اس کی ہڈیاں منور ہو جاتی ہیں، اس کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں ہر طرف نور ہی نور دوڑنے لگتا ہے۔

جب انسان یہ محسوس کرے کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے، اس کے بدن پر رعشہ طاری ہو رہا ہے اور اس کے آنسو بہہ رہے ہیں تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس نے کتاب وجود کی ایک سطر سمجھ لی ہے۔ اس لئے کہ غور وتدبر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خالق حقیقی کی صفات

کے کچھ آثار تک رسائی حاصل کرلے اور ان آثار میں عبرت ہوتی ہے اور عبرت نام ہے اس لطیف کرن کا جو دل پر چھا جائے تاکہ نہایت لطافت سے خدا تعالیٰ سے اسے جوڑ دے۔ تو اگر آپ اللہ کی طرف مائل ہو گئے ہیں، آپ کے جذبات و احساسات اس کے آگے سجدہ ریز ہو گئے ہیں، اس کی محبت کے امیدوار اور اس کی غضب سے خائف ہیں تو گویا آپ نے فہم و معرفت کے وہ زینے طے کر لئے ہیں جو راسخین فی العلم کے لئے مخصوص ہیں چاہے آپ نے کوئی کتاب نہ پڑھی ہو یا کسی اسکول یا یونیورسٹی میں کسی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو۔

درد اور درماں

میرے بھائی! اس طریقۂ کار کو استعمال کیجیے اور یقین رکھیے کہ قرآن کریم ہر داعی کے لئے کافی ہے اس کی ساری ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ اس نے طریقۂ کار کی وضاحت کی ہے اور مرض کی وضاحت کے بعد علاج کے وسائل و ذرائع بھی گنائے ہیں:

۱۔ اصل مرض یہ ہے کہ انسان کا باطنی وجود بے نور ہو چکا ہے اس کے حواس فساد زدہ ہو چکے ہیں، ان میں دیکھنے کی صلاحیت ہے نہ سننے کی اور نہ سمجھنے کی۔ یہ مُردوں کے حکم میں داخل ہو چکے ہیں چاہے مردم شماری کے رجسٹر میں انہیں زندہ ہی لکھا جائے:

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝ وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ۝ (نمل: ۸۰، ۸۱)

(تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے، نہ اُن بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں)

بلکہ ساری باتوں کا انحصار اس پر ہے کہ یہ وجودِ قلب درست ہو جائے اور اس کے حواس اس کے سامنے سر فگندہ ہو جائیں، رہے بدن کے حواس تو ان کے خلاف چیخ و پکار مچانا صحیح نہیں ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (حج: ۴۶)

(آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں)

ہر شخص کے پاس دو آنکھیں ہوتی ہیں ایک ظاہری ہوتی ہے جو سر کے حصے میں ہوتی ہے اور دوسری آنکھ دل کی ہوتی ہے جو باطنی ہوتی ہے۔ ظاہری آنکھ بس چیزوں کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھتی ہے۔ جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جو رنگ، جسم شکل و صورت اور ہیئت سے متعلق ہوتی ہے۔

لیکن باطنی آنکھ چیزوں کی اصل حقیقت کو جھانک لیتی ہے اور ہر چیز کی اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ یہی وہ عبرت ہے جو کسی چیز کی تشکیل و تنظیم اور اس کی تدبیر و حفاظت میں خدا کے ہاتھوں کو کارفرما دکھاتی ہے اور اس آنکھ کے سامنے چیزوں کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس میں خدا کی قدرت اور اس کی کاریگری کو

پالیتی ہے اور جب وہ اللہ کو پالیتی ہے تو میرے بھائی! وہ ہر چیز کو پالیتی ہے، وہ زندگی پالیتی ہے، نور اور علم سے لیس ہو جاتی ہے، دولت اور غنا سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور جو آنکھ اپنے دل میں ان تمام گراں مایہ دولتوں کو پالے اسے دُنیا کے فوت ہو جانے پر کچھ رنج نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ حقیقت اس کی آنکھوں کے سامنے ظاہر نہ ہو سکے تو اس سے اسے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا کہ اس کی ظاہری آنکھیں کتنی مضبوط و منور رہیں اور اس کے کان سُننے کی کتنی زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ یہاں مسئلہ آواز سُننے یا چیزوں کو دیکھنے کا ہرگز نہیں ہے اس لئے کہ آواز تو چوپائے بھی سُنتے ہیں اور چیزوں کی ظاہری شکل و صورت بھی وہ دیکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے یوں اشارہ کیا ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۚ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (بقرہ: ۱۷۱)

(یہ لوگ جنہوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سُنتے یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابن کثیر کہتے ہیں کہ:

"کافروں کی جہالت وضلالت اور اندھے پن کی مثال چوپایوں سے دی گئی ہے جو نہیں سمجھتے کہ ان سے کیا کہا جا رہا ہے بلکہ چرواہا جب بھی انہیں آواز دیتا ہے وہ بغیر سمجھے اس کی آواز پر دوڑ پڑتے ہیں اس لئے کہ وہ تو صرف آواز سنتے ہیں"

امام زمخشریؒ کہتے ہیں کہ :

"ان کفار کو ایمان کی دعوت دی جارہی ہے لیکن یہ محض نغمہ اور دعوت کی آہنگ سُنتے ہیں اس پر کوئی دھیان نہیں دیتے ان کی مثال اس چرواہے سے دی جارہی ہے جو چوپایوں کو پکارتا ہے تو بس کچھ مخصوص آوازیں نکالتا ہے جن سے انہیں بلاتا یا ڈانٹتا ہے اور وہ چوپائے اس کے علاوہ کچھ سمجھ نہیں پاتے نہ ہی کسی چیز کا شعور رکھتے ہیں جیسا کہ عقل رکھنے والے لوگ کرتے ہیں"

یہ مرض دراصل وہ اندھاپن اور جمود و تعطل ہے جو انسان کے اندر اس پوشیدہ وجود یعنی قلب پر چھایا ہوا ہے اور وہ بہرہ پن اور گونگا پن ہے جو اسے تاریکی میں چھوڑ دیتا ہے، اس کے اندر کوئی حرکت اور کوئی بیداری نہیں لاتا، جس کی تصویر قرآن نے بڑے اچھے لفظوں میں کھینچی ہے :

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(انعام : ۳۹)

(جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے ——— سیدھے راستے پر لگادیتا ہے)

۲ — اس مرض کی ظاہری نشانی، جیسا کہ قرآن بتاتا ہے، یہ ہے کہ جو چیزیں حواس کی گرفت میں آئیں، ان پر غور و فکر کرنے سے بے نیازی برتی جائے اور سرسری

مشاہدہ اور سطحی سماعت پر اکتفا کر لیا جائے یعنی انسان سب کچھ دیکھے لیکن ایسا معلوم ہو کہ کچھ نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے اللہ کی نشانیاں اور آثار کائنات جلوہ گر ہوں لیکن اس کے اندر کوئی حرکت کوئی امنگ نہ پیدا ہو، اس لئے کہ اس نے باطنی آنکھ سے کام ہی نہیں لیا ہے اس کی حالت اس شخص کی طرح ہو جو محو خواب ہو لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہوں، سوتے ہیں چلنے پھرنے کی اس کی عادت ہو جیسا کہ کسی دانشور شاعر نے کہا ہے:

یَا نَاظِرًا یَرْنُو بِعَیْنَیْ رَاقِدٍ

وَمُشَاهِدًا لِلْاَمْرِ غَیْرَ مُشَاهِدٍ

(افسوس ہے اس شخص پر جو سونے والے کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے، وہ ایک چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے لیکن پھر بھی مشاہدہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے)

اسی حقیقت کی طرف قرآن پاک کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ (انبیاء: ۳۲)

(اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا مگر یہ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ (یوسف: ۱۰۵)

(زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے)

۳ ـــ اس اندھے پن بلکہ موت کا کامیاب علاج قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پھیلی ہوئی نشانیوں اور اپنے نفس کے اندر پائی جانے والی آیات اور ہمارے ارد گرد پائی جانے والی ظاہری و باطنی نعمتوں پر غور کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝

(ذاریات: ۲۰ تا ۲۲)

(زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے)

غور و فکر ہی وہ چیز ہے جو مطالعہ و مشاہدہ کی شکلوں کو ظاہری احساس سے باطنی احساس تک منتقل کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں تاویل و تعلیل، موازنہ و مشاہدہ اور فہم و شعور پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے یہ ہے مفہوم باطن کی زندگی اور اس کی سماعت و بصارت کا اگر تامل اور غور و فکر ہی نہ ہو تو یہ ساری چیزیں دھری رہ جائیں گی غور و فکر دراصل یہاں وہی حیثیت رکھتا ہے جو آنکھ میں روشنی کے اعصاب (EYE NERVE) کی ہوتی ہے۔ چیزیں بس اتنے سے عمل سے نظر نہیں آسکتیں کہ آنکھ کی پتلی پر ان کی شکلیں منعکس ہو جائیں بلکہ ان شکلوں کا اعصاب بصر کے ذریعہ مرکزِ ادراک و شعور تک منتقل ہونا ضروری ہے اور مرکزِ ادراک و شعور دماغ (BRAIN) کو کہتے ہیں۔ اگر یہ ریشے دماغ سے الگ ہو جائیں یا تباہ و برباد ہو جائیں تو دیکھنے کا یہ عمل درست نہیں ہو سکتا اور

نہ دماغ کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہے ۔ یہی حیثیت غور و فکر کی ہے یہ آنکھوں کے ریشے کی مانند مشاہدات کو باطنی ادراک کے مرکز یعنی دل تک منتقل کرتا ہے تب وہ مشاہدہ مکمل ہوتا ہے اور پورے بدن میں عبرت موعظت کی شراب دوڑ جاتی ہے لیکن یہ غور و فکر اگر یکسر ختم ہو جائے تو دل مقفل رہ جاتا ہے ، عالم حقائق پر انسان کی توجہ بالکل نہیں جا پاتی اور اس کی حیثیت گونگے جانوروں کی رہ جاتی ہے جو چیزوں کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھنے پر اکتفا کر لیتا ہے ۔

طریقۂ علاج

جب قرآن یہ کہتا ہے کہ آسمان اور زمین اور نفس میں ایمان رکھنے والوں کے لئے نشانیاں اور گواہیاں ہیں تو مجرد اشارہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کا تذکرہ بھی کرتا ہے کہ وہ نشانیاں کیا ہیں ؟ چنانچہ ان نشانیوں کے نام ، صفت یا ان کے وظائف کی تعیین کرتا ہے یہاں تک کہ بات کانوں اور دلوں تک پہنچ جاتی ہے اور علاج کا راستہ ہر قسم کے ابہام سے خالی رہ جاتا ہے ۔ یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ ان تمام آیات کو جمع کیا جائے جن میں ان خدائی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ، البتہ مثال کے طور پر صرف ایک آیت کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ آپ قرآن پاک میں اس طرح کی آیات کا مطالعہ کر لیں گے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ

وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (بقرہ: ۱۶۳، ۱۶۴)

(تمہارا ایک ہی خدا ہے، اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے (اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اس انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں)

اگر قرآن کریم نے صرف اسی اجمال پر اکتفا کیا ہوتا تو بھی یہ آیت کافی تھی لیکن اس نے اس میں سے ہر ایک نشانی کی تمثیل و تفصیل بیان کی اور اس کی مزید وضاحت اور تجزیہ دوسری آیات میں کیا گیا تاکہ عبرت کے ان مقامات پر دل و دماغ وا ہوں اور بصیرت و بصارت کے دروازے کھلیں:

(الف) یہاں آسمان کی تخلیق سے مراد سورج، چاند، ستارے، سیارے وغیرہ ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بیشتر آیات میں ان آسمانی خوبصورت اور باعظمت

نشانیوں اور مخلوقات کا ذکر کیا ہے جن کو قرآن پاک کا ہر قاری اخذ کر سکتا ہے اس لئے اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) عبرت کے استخراج کے لئے تنہا زمین کا تذکرہ کیا۔

(ج) ایک خاص انداز سے دن اور رات کا ذکر بھی کیا۔

(د) کشتیوں کا خصوصی ذکر کیا اور اس کے بعد بارش، کھیتی، چوپایوں، بدلیوں کا الگ الگ ذکر کیا اور اس انداز سے ان نشانیوں کا تذکرہ ہوا کہ غور و فکر کرنے والا لامحالہ اللہ کی رحمت کے آثار تک رسائی حاصل کر لے۔ اس تفصیل کی بعض مثالیں ہم سورۂ رعد کے آغاز سے نقل کرتے ہیں:

۱۔ آسمانی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ (رعد: ۲)

(وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا، اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقررہ تک کے لئے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو)

۲۔ زمین کے بارے میں وہ کہتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

(رعد : ۳)

(اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں، اُسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ اِن ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں)

۳۔ نباتات کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (رعد : ۴)

(اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ اِن سب

چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں)

اور سورۂ نحل کا آغاز آیاتِ الٰہی اور خدائی نعمتوں کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہے

ان ساری نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (نحل: ۱۸)

(اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے)

انسان کو خود اپنی تخلیق پر غور و فکر کرنے کی دعوت اس طرح دی گئی:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ (طارق: ۵ تا ۷)

(پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے)

اور دوسری چیزوں پر غور و فکر کرنے پر اس طرح اُبھارا گیا:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (عبس: ۲۴ تا ۳۲)

(پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا، پھر زمین کو

عجیب طرح پھاڑا، پھر اس کے اندر غلے اُگائے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے، تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زیست کے طور پر۔)

میں یہ کام آپ کے لئے چھوڑتا ہے کہ اپنی فکر اور اپنی بصیرت کو استعمال کیجئے اور تنِ تنہا اس پر غور کیجئے۔

کیفیّت پر غور کیجئے، نہ کہ کمیّت پر

جب ہم سے ان نشانیوں پر غور کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس طرح چاہیں غفلت اور جمود کی نظران پر ڈال لیں بلکہ قرآن کریم اس سچی نظر اور صحیح غور و فکر کا طریقہ ہمارے سامنے رکھتا ہے جو ہمارے اور ملأ اعلیٰ کے درمیان بہت کم وقت میں مضبوط تعلقات قائم کرا دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم کیفیت (QUALITIES) پر غور کریں اس کی کمیت (QUANTITIES) پر نگاہ نہ ڈالیں۔ کیفیت عبرت و دانش کا محرک ہے جبکہ کمیت بس ظاہری شکل اور جسم کا نام ہے۔ کیفیت دل کے ذریعہ سے اخذ کی جاتی ہے اور کمیت کا ادراک ظاہری حواس سے کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۝ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝ (قٓ: ۶ تا ۸)

(اچھا، تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں۔ یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اُس بندے کے لئے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔)

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَ اِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَ اِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۝

(غاشیہ: ۱۷ تا ۲۱)

(تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟ اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کئے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو)

قرآن اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ آپ کے سامنے کیفیت پر غور و فکر کی بہت سی شکلیں رکھتا ہے تاکہ ان پر قیاس کر سکیں یا ان سے استفادہ کر سکیں۔ کبھی کبھی آپ کے سامنے ایک مفروضہ رکھتا ہے اور آپ کو اپنے دل و دماغ سے سوال کرنے کا موقعہ دیتا ہے کہ آپ عبرت و موعظت کے مغز کو پا سکیں:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِضِیَآءٍ اَفَلَا

تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (قصص: ۷۱،۷۲)

اے نبیؐ! ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لئے رات طاری کردے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لادے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے پوچھو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لئے دن طاری کردے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لادے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟

اور کبھی آپ کے سامنے ایسا سوال رکھتا ہے جو سارے پردوں کو چاک کردیتا ہے اور آپ کو عرش الٰہی کے روبرو پیش کردیتا ہے:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ

جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۞ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ۞ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۞ (واقعہ: ۵۸ تا ۷۲)

(کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اُس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے، اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کردیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟ —— کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جو تم بوتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا اُن کے اُگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتیوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چٹی پڑ گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں —— کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے —— کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟)

نتیجہ علاج

اور آخری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غور و فکر کرنے والے انسانوں کو بس یہیں تک نہیں چھوڑ دیتا بلکہ انہیں آخری پھل توڑنے کے لائق بھی بناتا ہے۔ انہیں اس درجہ بلند

کردیتا ہے کہ وہ اس حکمت و مقصدیت سے روشناس ہو جاتے ہیں جو آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرنے والے اربابِ دانش پر واضح ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور اس میں موجود نشانیوں کی تخلیق بے سبب نہیں کی نہ اس نے اس عالمِ وجود کو ظہور میں لاکر کوئی کھیل تماشہ کیا ہے بلکہ ایک اہم مقصد کے تحت اس نے ان چیزوں کی تخلیق کی ہے جس میں کھیل کود اور کارِ عبث کا کوئی گزر نہیں ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(دخان: ۳۸، ۳۹)

(یہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں اِن کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝

(انبیاء: ۱۶ تا ۱۸)

(ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کرلیتے، مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے

اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لئے تباہی اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔)

یہ ہے غور و فکر کی وہ بلندی جہاں خدا پرست انسان پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ جسے انسان اس وقت حاصل کرتا ہے جب اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا اور اپنی فطرت کی پہنائیاں طے کر لیتا ہے:

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ط وَ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمْ لَکٰفِرُوْنَ ۝ (روم: ۸)

(کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدّتِ مقرّرہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔)

گرچہ یہ تعلیم کافی تھی لیکن اللہ نے پھر بھی ہمارے سامنے ان بہت سے اربابِ دانش کے اقوال نقل کر دیئے ہیں جو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کے وقت پکار اُٹھتے ہیں تاکہ ہم ان پر قیاس کر سکیں اور جب وہ صورت ہم اپنے دل میں محسوس کریں اور اپنے جذبات و احساسات میں اس کی ترجمانی دیکھیں تو اطمینان محسوس کریں:

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّہَا وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُہُوْرِہٖ ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَۃَ رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْہِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا

هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝

(زخرف : ۱۲ تا ۱۴)

(وہی ہے جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کئے اور جس نے تمہارے لئے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب اُن پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لئے اِن چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔)

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران : ۱۹۰، ۱۹۱)

(زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے، اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) "پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے، پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔)

یہ قرآن پاک کی بہترین ہدایت اور انسانی امراض کے لئے اس کا تجویز کردہ کامیاب

علاج ہے۔ خدارا مجھے بتائیے کہ کیا کوئی ہدایت اس ہدایت الہامی کو پا سکتی ہے؟ کیا کوئی انسانی طریقۂ علاج اس علاج سے زیادہ مفید اور کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ ہدایت شفائے کامل کا ذریعہ اور اس خیر و سعادت اور نعمت کا راز ہے جس کی اللہ نے اپنے اولیا کو بشارت دی ہے اور اس کی اہمیت اور بلند مرتبت سے آگاہ کرنے کے لئے اس کے حصول سے پہلے ہی اس کی حمد بیان کرنے کا حکم دیا:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (نمل: ۹۳)

(ان سے کہو، تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لوگے اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے اُن اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔)

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (حٰم السجدہ: ۵۳)

(عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔؟)

جو لوگ گم کردہ راہ ہوتے ہیں بدبخت ہوتے ہیں، وہ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں دھمکی دی ہے کہ ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے گا اور وہ اس نعمت پر غور کرنے اور دُنیا و آخرت میں حصہ پانے سے محروم رہیں گے:

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ

(اعراف: ۱۴۶)

(میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔)

یعنی اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو پھیر دے گا اور وہ خدا کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکیں گے۔

قرآن پاک سے ایک مثال

اللہ تعالیٰ اس علاج کی وضاحت کرنے اور دلوں کی شفایابی میں اس کی تاثیر بیان کرنے کے بعد ہمارے سامنے تاریخی واقعات سے ایک مثالی واقعہ بیان کرتا ہے تاکہ علمی انداز میں یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ انسان جب اپنے اردگرد کے ماحول، نشانیوں اور گواہیوں پر غور و فکر اور طلب ہدایت کی نظر ڈالتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیتا ہے، اس کا دل نرم کر دیتا ہے اور اس کی بصیرت کو وا کر دیتا ہے پھر بندہ اس خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اس نے اس مقصد کے لئے ایک حقیقی مثال بیان کی جس سے نصیحت مکمل ہوگئی اور عبرت کا بہترین خاتمہ ہوا۔ فرماتا ہے:

وَکَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ۞ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیۡہِ الَّیۡلُ رَاٰ کَوۡکَبًا ۚ قَالَ ہٰذَا رَبِّیۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ

قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(انعام : ۷۵ تا ۷۹)

(ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظامِ سلطنت دکھاتے تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا، کہا، یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا، ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اٹھا" اے برادرانِ قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنیوالوں میں سے نہیں ہوں۔)

چند نمونے

ہماری ہر داعیٔ دین کو یہ وصیت ہے کہ وہ اس طریقہ کار کو استعمال کرے اور اسے اپنا کامیاب ہتھیار سمجھے اس لئے کہ وہ یہ دیکھ چکا ہے کہ اس طریقہ کار کا دلوں پر کتنا زبردست اثر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی طریقہ کو استعمال کر کے انسانوں کو دعوت دی ہے اور قرآن نے سب سے زیادہ اسی بات پر ابھارا ہے کہ لوگ غور و فکر کو طریقہ زندگی بنائیں اس لئے داعیٔ دین پر فرض ہے کہ اس طریقہ دعوت کو اختیار کرے جسے اللہ نے متعین کر دیا ہے اور سامعین کے غور و فکر اور ان کے نظر و تدبر کو ابھارنے کی جدوجہد کرے۔

میرے بھائی! ہم یہاں آپ کے سامنے چند مثالیں نقل کر رہے ہیں جن کے ذریعہ ہدایت یافتہ اسلاف نے وعظ و نصیحت کا کام لیا ہے اور لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور اللہ کے عجائب و غرائب پر انہیں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے:

۱ — ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو وعظ کہا۔ چنانچہ آپ نے اپنی ہتھیلی پھیلائی اور اس پر تھوک دیا اور اپنی انگلی اس کے ایک کنارے رکھ کر فرمایا:

"اللہ تبارک و تعالیٰ کہتا ہے: اے آدم کے بیٹے! تم مجھے عاجز کیسے کر سکتے ہو جبکہ میں نے تم کو اس تھوک جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا ہے یہاں تک کہ جب تمہیں ٹھیک ٹھاک کر دیا اور تمہارے نوک پلک درست کر دیئے تو تم دو چادروں میں چلنے لگے اور زمین ہی میں تمہیں دفن ہونا ہے پھر تم نے مال سینت سینت کر رکھا اسے خرچ نہ کیا یہاں تک کہ جب جان ہونٹوں پہ آ لگی تو تم نے کہا۔ میں صدقہ کرتا

چاہتا ہوں، بھلا اب صدقہ کا وقت کہاں رہا؟"

اس حدیث پر آپ خود غور کریں گے تو کسی تشریح و تفصیل کی ضرورت محسوس نہ کریں گے۔

۲۔ ایک بار سخت دل افراد کے بیچ میں امام ابو حنیفہؒ نے وعظ و نصیحت کی جو سراسر علمی اور جذبات و احساسات کے لئے مہمیز تھی۔

لوگوں کو معلوم ہوا کہ امام موصوف کسی معاملے کے سلسلے میں پریشان اور غور و فکر میں مشغول ہیں۔ جب آپ سے اس بابت دریافت کیا گیا تو فرمایا: مجھے ایک واقعہ کی خبر دی گئی ہے جس کے سلسلہ میں میں سوچ رہا ہوں۔ لوگوں نے بتایا ہے سمندر کے کنارے ایک کشتی تھی جس کا کوئی نگراں تھا نہ ڈرائیور، اس کے باوجود سمندر میں آتی جاتی اور مسافروں کو سوار کر کے دوسری جانب پہنچاتی تھی بڑی بڑی موجوں کے تھپیڑے اُس پر چڑھ دوڑتے تھے اس کے باوجود وہ بچ نکلتی تھی، راستے میں چٹانیں بھی ٹکراتی تھیں لیکن وہ مطلوبہ سمت میں بچتی بچاتی نکل جاتی تھی حالانکہ اسے چلانے والا کوئی نہ تھا۔ لوگوں نے بیک وقت کہا: یہ ایسی خبر ہے جس میں آپ کا دلچسپی لینا درست نہیں ہے اسے کوئی عقلمند شخص کہہ سکتا ہے نہ اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ تب آپ نے فرمایا: اے لوگو! تم ہی لوگ اس طرح کی باتیں کہہ رہے ہو، زبانِ قال سے نہیں تو زبانِ حال سے ضرور کہہ رہے ہو۔

یہ عالم موجودات کی کشتی ہے جس میں علوی و سفلی دُنیائیں ہیں اور مُحکم و مُدلل اشیاء ہیں تو کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا کہ ان عجائبات کی تخلیق کیونکر ہوئی ہے اور ان کا منتظم و مدبر کون ہے؟ یا بغیر کسی حاکم و مدبر کے یہ کارخانۂ عالم چل رہا ہے؟ اس نصیحت سے لوگوں کے دل بھر گئے اور بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئیں، جو لوگ اب تک اسلام سے

بہرہ ور نہیں ہوسکے تھے انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

۳۔ امام شافعیؒ نے اس طرح وعظ و نصیحت کی: یہ شہتوت کا درخت ہے اور یہ اس کی پتیاں ہیں ان کا رنگ ایک ہے، مزہ ایک ہے لیکن ریشم کا کیڑا اسے کھاتا ہے تو ریشم پیدا کرتا ہے اور شہد کی مکھی اسے کھاتی ہے تو شہد تیار کرتی ہے، بھیڑ اور بکریاں کھاتی ہیں تو مینگنی نکالتی ہیں، ہرن کھاتے ہیں تو مشک پیدا کرتے ہیں حالانکہ سب کی خوراک ایک ہے۔ کتنی بابرکت ہے اللہ کی ذات جو بہترین تخلیق کرنے والا ہے۔

۴۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسی طریقہ کو یوں استعمال کیا: اپنے بغل میں ڈھکنے سے بند ایک چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ایک مضبوط قلعہ ہے نہایت ٹھوس، نہ کوئی دروازہ ہے نہ گزرگاہ، اس کا ظاہری حصہ سفید چاندی کی طرح ہے اندرونی سونے کی طرح ہے۔ اس مضبوط قلعہ کی دیوار ایک جگہ سے اچانک پھٹ جاتی ہے اور اس میں سے ایک حیوان نکلتا ہے جو سُنتا اور دیکھتا ہے۔ بہترین شکل و صورت کا مالک ہے اور پاٹ دار آواز نکالتا ہے۔ جب امام موصوف لوگوں کے شوق و رغبت کو اُبھار چکے اور ان کے اندر اس چیز کو دیکھنے کی حرص پیدا کردی تو ڈھکنا ہٹایا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک انڈا ہے جو ٹوٹ چکا ہے اور اس کے بغل میں ایک چھوٹا سا چوزہ ہے جو ابھی ابھی اس دنیا میں آیا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جو مردہ سے زندہ کو نکالتی ہے اور زندہ سے مردہ کو اور وہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتی ہے۔

میرے بھائی! یہ چند مثالیں تھیں جو موضوع سے متعلق میں نے آپ کے سامنے

پیش کی ہیں ان سے غور وفکر کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ آپ کے لئے یہ آسان ہو جائے گا کہ اس اسلوب کو اختیار کر سکیں اور ان مثالوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ہم ان مثالوں کو بس ایک اور مثال نقل کر کے ختم کر رہے ہیں جسے ہمارے ایک اخوانی دوست نے پیش کیا تھا۔ اس نے کہا: بصرہ کا ایک عالم دین اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے سوچا کہ اپنے شاگردوں اور پیروکاروں کو عمیق غور وفکر پر آمادہ کرے جس کے ذریعہ وہ سمندر میں غوطہ لگا سکیں۔ اور اس سے عبرت وموعظت کے موتی نکال سکیں۔ چنانچہ اس نے چراغ گل کرنے کا حکم دیا اور ہر طرف تاریکی مسلط ہو گئی پورے کمرے پر اندھیرے سکوت اور گہرے سناٹے کا راج ہو گیا تب اس نے کہا: میرے بیٹو! اس خاموش تاریکی میں ہم آسمان سے اپنی روحوں کو غذا اور اپنے دلوں کو زندگی فراہم کر سکتے ہیں تو دیکھو یہ موقع تمہارے ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ تم میں سے ہر شخص اپنے بارے میں غور کرے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے کیا تھا؟ اور جب اللہ نے اسے اس دُنیا میں لانے کا فیصلہ کیا تو کیا نتیجہ نکلا؟ اور کس چیز سے اللہ نے اس کی تخلیق کی؟ وہ ان تمام مراحل پر غور کرے جن سے گزر کر تم میں سے ہر شخص عقلمند، مدبر، طاقت ور اور زیرک مرد بن گیا۔ پھر موت تک اپنے سفر پر نظر ڈالے تا آنکہ وہ جنت یا جہنم میں پہنچ جائے۔

ہمارے اخوانی بھائی نے فرمایا: چنانچہ تمام مرید خاموش ہو گئے اور غور وفکر میں مشغول ہو گئے اور حکمت وموعظت کی تلاش میں ڈبکیاں لینے لگے۔ شیخ نے ان کے غور وفکر کی حالت جاننے کی خواہش کی چنانچہ یکے بعد دیگرے ان میں سے ہر ایک سے پوچھنے لگا: اے فلاں شخص! اس وقت تم کہاں تک پہنچے ہو؟ اس نے کہا: میں اس وقت

نطفہ ہوں۔ جب دوسرے سے تھوڑی دیر بعد ہی سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ :
میں اس وقت قبر میں ہوں۔ اور تیسرے سے تھوڑی دیر بعد یہی سوال پوچھا گیا تو اُس نے کہا کہ: میں اس وقت پُل صراط سے گزر رہا ہوں۔ وہ اخوانی بھائی ہر مرید کی زبان سے ان تمام کیفیات اور احوال کو بتاتا جارہا تھا جس سے وہ گزر رہے تھے۔ ہم یہاں بقیہ دو افراد کو چھوڑ کر صاحبِ نطفہ کے اقوال اور حالات کی طرف آتے ہیں۔ جب اس سے سوال کیا گیا تو اس نے کہا: جنابِ من! میں اس وقت نطفہ ہوں، بہت ہی بدنما اور بدبودار حقیر پانی کا ایک قطرہ، میں اس کی حقارت اور کمزوری پر غور کر رہا ہوں پھر میں اپنے آپ پر نگاہ ڈالتا ہوں جبکہ میں مردِ عاقل ہو چکا ہوں تو مجھے ان دونوں مراحل میں بڑا زبردست فرق نظر آتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کسی دن میں نطفہ رہا ہوں گا۔ جنابِ من! وہ بس ایک بوند ہے، اگر اسے یونہی چھوڑ دیں تو ہوا اڑا لے جائے اور وہ خراب ہو جائے اور اس میں بدبو پیدا ہو جائے لیکن پاک ہے وہ ذات جس نے میری اس وقت حفاظت کی جب میں اپنی حفاظت نہ کر سکتا تھا۔ اُس وقت وہ قطرہ سُنتا تھا نہ سمجھتا تھا، لیکن کون ہے وہ ہستی جس نے اسے عقل عطا کی تاکہ وہ غور و فکر کرنے والا انسان بن جائے، تدبیریں اور انتظامات کرنے لگے یا اپنے علم اور عقل سے لوگوں کو مبہوت کرنے لگے؟ اور کس نے اسے سماعت سے نوازا؟ اور کس نے اسے آنکھیں دیں؟ اور کیسے یہ پورا وجود مکمل ہو گیا؟ انہی سوالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ خدا تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میرے دل و دماغ کو منوّر کر گئی:

وَهُوَ الَّذِىٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (مومنون: ۷۸)

(وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو)

یہ غور و فکر مجھے اور آگے لے گیا، یہاں تک کہ میں ایک دوسرے سوال سے دوچار ہوا: اگر اللہ نے اس نطفہ کو عقل سے نہ نوازا ہوتا تو کیا خود بخود یہ دانش ور بن سکتا تھا؟ اگر اسے سماعت و بصارت نہ دی ہوتی تو کون اسے ان صلاحیتوں سے ہمکنار کر سکتا تھا؟ یہ سوالات تھے جن میں میں پریشان تھا کہ قرآن کریم کی اس آیت نے اس گرہ کو بھی کھول دیا:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ (انعام: ۴۶)

(اے نبیؐ، اِن سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہو؟ دیکھو، کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چرا جاتے ہیں۔)

میرے ذہن میں تمام انسان آنے لگے، عالم و جاہل، قوی و ضعیف سب اس نطفہ کے ارد گرد کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مدد لینے لگا شاید کہ وہ معمولی سی ہڈی بھی ترکیب دے سکیں یا کوئی باریک نس بنا سکیں یا ایک ہی بال تخلیق کر سکیں لیکن یہ سب تھک ہار کر بیٹھ گئے حالانکہ پوری کائنات اُن کا ساتھ دے رہی تھی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ (حج : ۷۳)

(لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سُنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اُسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جائے وہ بھی کمزور!۔)

غور و فکر نے مجھے تھوڑی دیر اور روکے رکھا اور مجھ سے یہ سوال کیا: جب ایک معمولی سے قطرے میں اللہ کی یہ کاریگری اور اس کی صنعت ہے تو آسمان و زمین کی پہنائیوں میں اس کے اسرار اور عجائب کا کیا عالم ہوگا؟ یہ تو بے کنار سمندر ہے جس کی حقیقتوں کا خدائے بزرگ و برتر کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر شیخ نے قطع کلام کیا اور اپنے شاگرد کو یوں نصیحت کی: بس میرے بیٹے، رہنے دو، یہ تمہارے لئے کافی ہے۔ تمہیں صحیح طریقہ کی ہدایت مل گئی اور تمام تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے ہمیں اس کی توفیق و ہدایت دی۔ اگر اس نے ہدایت نہ دی ہوتی تو ہم ہرگز راہ یاب نہ ہو سکتے تھے۔

میرے بھائی! یہاں میں نے کچھ خطوط واضح کر دیئے ہیں جو صحت مند عقلیت غور و فکر اور تعبیر و اظہار میں اختیار کرتی ہے اور اسی عقلیت کی ہر دعوتِ دین کا کام کرنے والے فرد کو ضرورت پڑتی ہے جیسا کہ ہم کئی مقامات پر لکھ چکے ہیں۔ اگر اس طرح کے غور و فکر

سے آپ مالا مال ہیں تو اس پر اللہ کا شکر ادا کیجیے، اور اس کے مزید فضل کے لئے دُعا کیجیے اور اگر صورتِ حال مختلف ہے تو ہم نے بعض محرکات و عوامل کا یہاں ذکر کر دیا ہے، انہیں اختیار کیجیے، انہیں کے انداز پر اپنی زندگی کو استوار کیجیے، ان کی مثالوں پر اپنے کو پرکھیے اور مشق و تربیت حاصل کیجیے، تا آنکہ آپ کے اندر اس کی بعض منفعت بخش خصوصیات پیدا ہو جائیں اور اللہ عمل کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

دوسری فصل

معاشرتی رُوحانیت

میرے معزز بھائی!

عنوان دیکھ کر آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو گنجلک اوہام و ظنون اور نامعلوم وادیوں کی سیر کرائی جائے گی۔ قارئین روح اور روحانیت کی بحثوں کو پڑھتے ہوئے دشواری محسوس کرتے ہیں اور جو باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں ان کو پڑھتے ہوئے اُکتاہٹ کا احساس کرتے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اس طرح کے مباحث میں خطرات اور لغزشوں کا اندیشہ ہے اس لئے کہ مضمون نگار یا مصنف خود ظنون و اوہام اور مفروضات کے میدان میں قدم رکھا ہوا ہوتا ہے جہاں ہدایت کی کوئی کرن نہیں ہوتی کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ؕ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۵)

(یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو "یہ رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔")

مادّہ اور رُوح

میں پھر کہتا ہوں، اس عنوان کے تحت آپ اس طرح کی کسی چیز کا مطالعہ نہیں کریں گے
ہم نے سوچا ہے کہ نہایت آسان، عام فہم اور مقصد و مطلب میں بالکل واضح گفتگو آپ سے
کریں۔ انسان مادّہ اور رُوح دونوں سے مرکب ہے، مادّے کا اپنا ایک نظام ہے اور اس کی
اپنی دُنیا ہے جو اس سے وابستہ ہے اس روح کی اپنی خصوصیات ہیں اور اس کی اپنی
کائنات ہے جس میں وہ رہ بس رہی ہے۔ انسان —— جس کو اللہ نے بہترین ساخت
پر پیدا کیا ہے —— سے یہ خواہش کی جاتی ہے کہ اس کی دو زندگیاں ہوں: ایک
زندگی مادی ہو جس میں وہ اپنے بدن کے تمام حقوق حکمت اور نظم کے ساتھ ادا کرے اور
دوسری زندگی رُوحانی ہو جس میں عالم مادہ سے، اوراز ندگی بسر کرے اور رُوح کے جو حقوق
ہیں انہیں ادا کرے۔ انسان جب اپنے آپ پر متوجہ ہو اور اپنے بدن اور اپنی رُوح دونوں
کے حقوق ادا کرے تو اس نے اپنی انسانیت کے ساتھ انصاف کیا، اللہ کی سُنّت کی پابندی
کی اور دُنیا و آخرت کی سلامتی میں اس نے زندگی بسر کی۔

لیکن اگر کسی ایک جانب جُھک گیا اور دوسرے پہلو سے بے نیاز ہو گیا تو اس نے اپنے
اوپر ظلم کیا اور اللہ کی سُنّت سے منہ موڑنے کی کوشش کی اور جس نے اللہ کی سُنّت سے
منہ موڑنے کی کوشش کی وہ ہلاک ہو گیا اس لئے کہ اللہ کی سُنّت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

چنانچہ جو شخص دورِ جدید کے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، مال و دولت کی طرف
بڑھتا ہے، مادہ کے حصول میں مسابقت کرتا ہے، بدن کی ضروریات کی تکمیل میں مست رہتا
ہے، کھوکھلے مناصب، فریب کُن مظاہر کے پیچھے دوڑتا ہے اپنی قلبی اور حسّی قوتوں کو چند روزہ

متاع کے حصول کے لئے مسخر رکھتا ہے تو ایسا شخص بیوقوف ہے، وہ اپنے نفس کی حقیقت سے بے خبر ہے، زندگی کی اصلیت اور اس کے لبِ لباب سے ناواقف ہے، سُنّتِ الٰہی نے اس کی انسانیت کو افقِ اعلیٰ تک پہنچانا چاہا اور وہ خود زمین سے چمٹ کر رہ گیا اور اس شرف سے نکل بھاگا۔

دوسری طرف وہ شخص ہے جو اپنی روح کی ضروریات پر توجہ دیتا ہے، دن بھر روزے رکھتا ہے، رات بھر قیام کرتا ہے، طیباتِ دُنیا سے مُنہ موڑ لیتا ہے، بس کھردرا لباس پہنتا ہے، سوکھی روٹیوں پر گزارہ کرتا ہے تاکہ اس کی حیوانی قوتیں کمزور ہو جائیں اور اسی کے حساب سے روحانی طاقتوں میں اضافہ ہو جائے، تو یہ شخص بھی زندگی کے حقائق سے ناواقف ہے اللہ کی سُنّت سے غافل ہے، اپنے بدن کے حقوق ضائع کرنے والا ہے اور یہی چیز نقصان اور حکمِ الٰہی سے انحراف کے لئے کافی ہے۔ روایت کی جاتی ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم عبداللہ بن عمرو بن عاص سے ملاقات کرنے ان کے گھر تشریف لے گئے ان کی اہلیہ رسولِ اکرمؐ سے قریب تھیں۔ چنانچہ آپ نے پوچھا: کیسی ہو اے عبداللہ کی ماں؟ انہوں نے جواب دیا: کیا بتاؤں عبداللہ بن عمرو ایسے شخص ہیں جنہوں نے دُنیا تیاگ دی ہے۔ آپ نے پوچھا: یہ کیسے؟ انہوں نے کہا: وہ نہ سوتے ہیں نہ کھاتے پیتے ہیں نہ گوشت چکھتے ہیں نہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ آپ نے پوچھا: اس وقت وہ کہاں ہیں؟ ان کی بیوی نے کہا: باہر گئے ہیں بس اب آتے ہی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا: جب وہ واپس آجائیں تو انہیں میرے لئے روک لو۔ یہ کہہ کر اللہ کے رسولؐ نکلے قریب تھا کہ آپ واپس ہو جاتے کہ اتنے میں عبداللہ بن عمرو آ گئے آپ نے پوچھا: اے عبداللہ بن عمرو! یہ میں تمہارے بارے میں کس طرح کی باتیں سُن رہا ہوں؟ تم سوتے

نہیں ہو؟ انہوں نے جواب دیا: میں اس کے ذریعہ قیادت کی تباہی سے محفوظ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے پوچھا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسلسل روزے رکھتے ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا: اس کے ذریعہ میں جنّت کی نعمتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے پھر پوچھا: اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ: میں اس کے ذریعہ ان سے بہتر عورتیں (جنّت کی حوریں) چاہتا ہوں۔ تب اللہ کے رسولؐ نے انہیں نصیحت کی: اے عبداللہ بن عمرو! تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں بہترین اسوہ ہے۔ اللہ کا رسول تہجد بھی ادا کرتا ہے اور سوتا بھی ہے، روزہ رکھتا ہے اور نہیں بھی رکھتا اور گوشت کھاتا ہے اور اپنی بیوی کے حقوق بھی ادا کرتا ہے۔ اے عبداللہ بن عمرو! تمہارے اوپر اللہ کا بھی حق ہے، تمہارے اوپر تمہارے بدن کا بھی حق ہے اور تمہارے اوپر تمہارے اہل وعیال کا بھی حق ہے۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحیح اور بہترین زندگی کا طریقہ بتا دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ افراط بہر صورت قابلِ نفرت ومذمت ہے چاہے یہ افراط انسان کی رُوحانی زندگی ہی میں ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے لئے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اس کی سُنّت پر عمل نہ کرے اور اس کے باوجود یہ گمان کرے کہ اس کی رضا پالے گا۔

ہماری حقیقی شخصیت

اس طرح ہر انسان کے دو قسم کے واجبات وفرائض ہیں، اس سے دو دُنیاؤں میں زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور اس بات کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے کہ اپنے اندر دو قسم

کی شخصیتیں پروان چڑھائیے۔ ہم ان سطروں کے ذریعہ بدن کے حقوق کی ادائیگی پر اُبھار نا نہیں چاہتے اس لیئے کہ پوری نوعِ انسانی اس میں پہلے سے لت پت ہے، ہم تو زندگی کے اور دوسرے حقوق کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہتیرے انسان پوری زندگی گزار دیتے ہیں اور مادہ کے دائرے سے عمر بھر نہیں نکل پاتے، ان کے پاس ایک منٹ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ دوسری دنیا میں بھی جھانک سکیں اور آخر میں انہیں اس حال میں موت آتی ہے کہ انسانیت کے سارے حقوق دھرے رہ جاتے ہیں، ان کی ادائیگی کی اسے عمر بھر توفیق نہیں مل پاتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر انسان کی دو ذمہ داریاں ہیں ایک ذمہ داری اس کی حیوانی شخصیت کی تربیت کی ہے اور دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ رُوحانی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدّوجہد کرے۔ اور ان دونوں ذمہ داریوں میں سب سے زیادہ بلند، اہم اور پاکیزہ ذمہ داری بلاشبہ رُوحانی ذمہ داری ہے اس لئے کہ حیوانی وجود تو انسانی اور دوسری تمام مخلوقات کے درمیان مشترک ہے پھر بھلا انسان کا امتیاز کیا رہ جاتا ہے؟

لیکن یہ بلند و بالا رُوحانی وجود ہی وہ راز ہے جس سے اللہ نے بنی آدم کو نوازا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۰)

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔)

معلوم ہوا کہ انسان کی وہ اہم ترین ذمہ داری جو اس کے شایانِ شان ہے، اس کے معنوی وجود اور رُوحانی دُنیا سے متعلق ہے۔ اور اس قضیہ کی رُو سے ہم لوگوں کی ان عمروں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو انہوں نے اس عالمِ بلند میں بتائے ہیں اور ان کی مقدس اور بلند شخصیت کی جسامت کے لحاظ سے ہی ان کی قدر و قیمت بھی متعین کر سکتے ہیں لیکن ان کی اُس شخصیت کا لحاظ نہ کیا جائے گا جو چوپایوں کی طرح پروان چڑھ رہی ہے۔

ہم اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص کو اس کی خدمات کے صلے میں اور اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں محتاط اور فرض شناس ہونے کے ناطے انعام دیا جا رہا ہے تو کیا اس نے واقعی زندگی کا حق ادا کیا ہے؟ کتنے ہی افراد خدمت سے اور روزگار سے مستعفی ہوتے ہیں لیکن چونکہ بڑے ملازمین میں ان کا شمار نہیں ہوتا اس لئے انہیں انعام سے نوازا جاتا ہے نہ اخبارات ان کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں کچھ لکھتے ہیں تو کیا ان لوگوں کی اصطلاح میں فرض شناسی اور ذمہ داری کا مفہوم یہی ہے کہ انسان بتدریج مناصب حاصل کرتا رہے یہاں تک کہ اس کی چوٹی پر پہنچ جائے اور اگر اعلیٰ ترین درجہ تک نہ پہنچ سکے تو اسے بیکار سمجھا جائے اور اس پر کوئی توجہ نہ دی جائے؟

سچی بات یہ ہے کہ یہ سب باطل اوہام اور فاسد پیمانے ہیں۔ انسان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انسانی قدروں کے تئیں اپنی ذمہ داری محسوس کرے، اگر وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرتا ہے تو وہ اُمت اور پوری انسانیت کا خادم ہے چاہے اس نے کوئی منصب نہ حاصل کیا ہو اور اگر اس ذمہ داری کو فراموش کر دے تو اس کا کوئی مقام نہیں ہے چاہے وہ صدر مملکت بن جائے۔ کتنے ہی انسانوں کی عمر ساٹھ سال کی ہو جاتی ہے لیکن ان کی حقیقی شخصیت ایک مہینے بلکہ ایک دن کی ہی ہوتی ہے۔ آپ ان کی طرف

دیکھیں گے تو آپ کی نگاہیں خوش ہو جائیں گی لیکن اگر دل کی نگاہ سے انہیں دیکھیں تو اس کے اندرونی انسان کو بہت کمزور اور دُبلا پائیں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل ہی بے وزن نکلے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس جملے کا مفہوم کیا ہے کہ انسان دو دنیاؤں میں زندگی بسر کرے؟ اور یہ کہ اپنے وجود میں دو شخصیتوں کو پروان چڑھائے؟ اس مادی دُنیا کی زندگی تو معروف ہے، حیوانی وجود کی تربیت بھی غیر معلوم نہیں ہے یہ کھانے، پانی کی فراہمی، ریاضت اور امراض سے سلامت رہنے کا نام ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے کہ ہم دوسری دُنیا میں زندگی بسر کریں اور دوسری قسم کی شخصیت —— جسے آنکھیں نہیں دیکھتیں —— پروان چڑھائیں؟ ہم آخر اس کی تربیت کیسے کریں؟ اسے غذا کیسے فراہم کریں؟ اور کہاں سے یہ غذا ملے؟

آدمی اپنے سلسلے میں غلطی کیسے کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نقطۂ آغاز پر آئیں جہاں سے لوگوں کی غلطی شروع ہوتی ہے جب وہ زندگی کی طرف دیکھتے ہیں یا اس کی راہوں میں قدم رکھتے ہیں۔ اور جب ہمیں غلطی کی شکل اور صحیح کی حقیقت معلوم ہو جائے گی تو اس سوال کا جواب خود بخود سامنے آجائے گا۔

جسم کی غذا یہ کھانا اور پانی ہے جو اس زمین سے نکلتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان اور بدن کی دوسری طاقتیں اور اعضاء و جوارح ہیں۔ اور رُوحانی وجود کی غذا یہ ہے کہ عبرت و نصیحت ہو، آسمانوں اور زمین

کے اقتدار کی معرفت حاصل ہو اور دل پر دبستانِ سماوی کی لپٹ کا نزول ہو اور اس کو ملأ اعلیٰ سے حاصل کرنے کا وسیلہ یہ ہے کہ خلق خدا کی تمام نشانیوں پر غور کیا جائے اور صانع حقیقی کی صفات کے اثرات و نتائج کی کھوج کی جائے۔

انسان اس وقت تک خیر و عافیت اور سلامتی کی زندگی گزارتا ہے جب تک اُس کی بدنی قوتیں زمین میں پیہم دوڑ دھوپ کرتی ہیں اور فکری و قلبی صلاحیتیں آیاتِ الٰہی کے نقوش اور صفاتِ الٰہی کے آثار کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ لیکن اگر وہ دل کو ایسے کام پر مجبور کرنے لگے جو اس کے لئے ناسازگار ہو یعنی ملأ اعلیٰ کے رزق سے اس کے شوق و رغبت کو موڑ کر عالمِ ارضی کے مال و منال کی طرف پھیر دے تو وہ اپنے روحانی وجود سے اس کی اصل زندگی کی غذا چھین لے گا اور اس کو ایسی چیز نگلنے پر مجبور کرے گا جو اس کے مزاج کے خلاف ہوگی اور اس کا گلا گھونٹ دے گی یعنی باطل خواہشات اور نقصان دہ حسّی شہوات، جس کے نتیجے میں قلب کمزور اور مضمحل ہو جائے گا اور وہ اسی گھٹن اور جاں کنی کے دائرے میں محبوس رہے گا اور انسان اس سے غافل ہوگا تا آنکہ اللہ اپنا طے شدہ فیصلہ نافذ فرما دے گا۔

معلوم ہوا کہ غلطی کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے کہ دل کو ایسے کام پر مجبور کیا جائے جو اس کے لئے سازگار نہ ہو یعنی ہم اسے آیاتِ الٰہی کی عبرتوں سے کاٹ دیں، خدائے تعالیٰ کی صفات کے آثار پر غور و فکر کرنے سے محروم کر دیں اور اسے دُنیا کی خواہشات اور اس کی باطل زینت و آرائش میں لگا دیں جس کے نتیجے میں خارج میں مقابلہ آرائی ہو اور انسان کا باطنی وجود اختلال کا شکار ہو کر رہ جائے۔

ہم نے کہا تھا کہ اللہ نے بدن، اس کے اعضاء و جوارح اور اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کا توشہ اسی زمین میں فراہم کیا ہے جس کے حصول کے لئے انہیں جدوجہد کرنی ہے، اگر یہ

اعضاء و جوارح اس مقصد کے لئے ناکافی تھے تو اللہ نے بدنی ضروریات کی تکمیل کے لئے کوئی اور نظم کیوں نہیں کیا؟ اور کیا کوئی ایک شخص بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہاتھ، پاؤں، اور دوسرے اعضاء و جوارح اور عقل کی قوتیں اور صلاحیتیں اس مقصد کے لئے ناکافی ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر ان قلبی قوتوں کا مصرف کیا ہے؟ اور کیسے ہم انہیں افق اعلیٰ سے نیچے اتار کر اعضاء و جوارح کے ساتھ بدن کی خدمت میں لگا دیتے ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ مان لیں کہ قلب کی صلاحیتیں بدن کی خدمت کے لئے، اعضاء و جوارح کے ساتھ کام کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں تو مجھے بتائیے کہ انسان کی باطنی روحانی زندگی کی خدمت کے لئے اللہ نے کیا نظم کیا ہے؟ وہ خادم کون ہے اور کہاں ہے؟ کیا نعوذ باللہ اس نے ایک پہلو سے محبت کر لی ہے اور دوسرے پہلو پر ظلم کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت ہے کہ حیوانی وجود اسے یاد رہا اور تمام قوتوں کو اس کی خدمت میں لگا دیا اور روحانی وجود کی خدمت کا نظم کرنا بھول گیا؟

ہم چاہتے ہیں کہ انسانیت بصیرت اور بصارت کی روشنی میں اپنا قدم بڑھائے۔ اللہ نے ہم پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا ہے، بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ انسان اس صحیح میزان کے ذریعہ اپنی قدر و قیمت متعین کرے۔ جو اللہ نے اُتاری ہے۔

کیا یہ بدن پر ظلم ہو گا کہ بقدر کفایت دنیوی مال و منال سے اسے نواز دیا جائے اور قلب کی صلاحیتوں کو دوسری دُنیا کی ضروریات اور مطلوبات کی فراہمی کے لئے جد و جہد کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے؟ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم نفی میں جواب دیں اور کھُل کر کہیں کہ یہ ظلم ہرگز نہیں ہے۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم یہ اعتراف کریں کہ بدن کی کفایت کو متعین کرنے والے پیمانے نامعلوم ہیں اور قلب و بدن کی طاقتوں کے درمیان

حدِ فاصل کا کام دینے والے خطوط ظاہر نہیں ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بدن کی کفایت کا پیمانہ کیا ہے؟ اور کیسے ہم قلب کی صلاحیتوں کو اس کی خاص ذمہ داری کی طرف موڑ دیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ آسان ہے اور اس کا حل مشکل نہیں ہے۔ جب ہم اشیاء کی طبیعت پر نگاہ ڈالتے ہیں اور فطرت الٰہی —— جس پر تمام انسان پیدا کئے گئے ہیں —— سے فتویٰ طلب کرتے ہیں تو ہمیں یہ جواب ملتا ہے کہ بدن کی کفایت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی وہ تمام ضروریات پوری ہوں جن کی بنیاد پر اس کی عمارت قائم ہے۔ پیٹ بھر کھانا اور ساتر لباس مہیا ہو۔ کیا اس کے علاوہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہے؟ کیا عقل اس کے لئے کسی اور چیز کی مانگ کرتی ہے؟ ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے پوچھا کہ دُنیا میں کون سی چیزیں میرے لئے کافی ہیں؟ آپ نے جواب دیا:

"کھانا جو تمہاری بھوک مٹا دے، کپڑا جو تمہاری ستر ڈھانک دے، تمہارے لئے کافی ہے اور اگر تمہارے پاس کوئی گھر ہو جس کے سائے میں تم رہ سکو تو یہ بھی، اور اگر سواری بھی ہو تو کیا کہنے۔"

اگر انسان کے اعضاء و جوارح زبان رکھتے تو منت وزاری کرتے کہ رہنے دو، ضروریات سے آگے بڑھ کر تعیش کے لئے معدہ کو نہ تھکاؤ، آنتوں کو زحمت نہ دو اور اعضاء کو پریشان نہ کرو۔ اس لئے کہ ضروری امور کی فراہمی میں ان کی سلامتی مضمر ہے، اگر بنیادی ضروریات سے بات آگے بڑھی تو جلد یا بدیر بیماری آ دھمکے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اسی فطری بات کو اپنے حکیمانہ اقوال میں اس طرح سموتے ہیں:

"آدمی اپنے پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی اور برتن نہیں بھرتا۔ ابن آدم کے لئے

اتنا مختصر کھانا کافی ہے جو اس کی ہڈی کو سیدھا رکھے اگر اس پر اس کے نفس کا غلبہ ہو جائے تو ایک تہائی کھانے کے لئے ، ایک تہائی پینے کے لئے اور ایک تہائی سانس لینے کے لئے خالی رکھے۔"

بدن کی بقدر کفایت ضروریات کا بیان ہو چکا اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دل کی طاقتوں اور اس کی صلاحیتوں کو ہم الگ کیسے کریں کہ اپنی خاص دنیا میں اپنی مخصوص ذمہ داری نبھا سکیں اور زندگی کے سلسلہ میں لوگوں کے نقطۂ نظر کی خرابی دُور ہو سکے ؟

اس سوال کا جواب ہم اس وقت آسانی سے دے سکیں گے جب ہمیں اس محرک کی حقیقت معلوم ہو جائے جو انسان کو زیادہ سے زیادہ کھانے پینے اور بہتر سے بہتر لباس زیب تن کرنے پر ابھارتا رہتا ہے۔ اگر انسان اپنی فطرت تک محدود رہے تو اس کے مطالبات تک اس کا دائرہ محدود رہے، لیکن کون سی چیز اسے فطری موقف کے دائرے سے نکال باہر کرتی ہے ؟ اگر انسان صرف اس لئے کھائے کہ وہ بدن کی ذمہ داری ادا کر سکے تو اس کی جسمانی، اجتماعی اور رُوحانی حالت درست رہے گی لیکن وہ لذّت وشہوت کے حصول کے لئے بھی کھاتا ہے، لباس صرف اس لئے نہیں پہنتا کہ اس کا بدن ڈھک جائے بلکہ اس لئے بھی پہنتا ہے کہ زینت وآرائش کی نمائش ہو، چنانچہ لذّت یابی کی رغبت یہ وہ دوسرا محرک ہے جو انسان کو دوڑ دھوپ کرنے پر اکساتا ہے اور رغبت دل کی زبردست قوت ہے جب یہ دوسرے محرک میں داخل ہو جاتی ہے تو پہلے محرک پر اپنی خطرناک طاقتوں کے ساتھ حملہ کر دیتی ہے اس وقت انسان اپنی طبیعت وفطرت کے قانون کے سامنے نہیں بلکہ اس شہوت کے اقتدار کے سامنے جُھک رہا ہوتا ہے جس کا کوئی عقلی ومنطقی جواز نہیں ہوتا۔ پھر وہ بدن کی ضرورت کی تکمیل پر بس نہیں کرتا بلکہ لذت وشہوت

کی پکار پر دوڑ پڑتا ہے اور پھر صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس کا مطلب یہ ہے کہ لذت یابی اور لطف اندوزی کی رغبت، یہ وہ بڑا محرک ہے جو انسان کو دنیوی مال و متاع کے لئے مہمیز لگاتا ہے اور آیات و آثار کی دنیا میں قلب و عقل کی طاقتوں کو در انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیتا۔

فطرت کی رو سے یہ دنیا دار البلاغ ہے لیکن اکثر لوگ اسے دار المتاع سمجھ لیتے ہیں حالانکہ بلاغ اور متاع میں زبردست فرق ہے جو لوگ اس دُنیا کو دار البلاغ مانتے ہیں وہ اسے ایسا وسیلہ سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے دل کی زندگی کے لئے اپنے رب سے پیغام اور ذمہ داری وصول کرتے ہیں اور جو اسے مال و منال کا گھر سمجھتے ہیں وہ اسے مقصد اور نصب العین بنا لیتے ہیں جس کے اوپر اپنے دل کی رغبتیں، اپنے نفس کے عزائم اور اپنی فطرت کی خواہشات سب کچھ قربان کر دیتے ہیں یعنی دنیا کے حصول کے لئے اپنی ساری طاقتیں جھونک دیتے ہیں اور اخروی زندگی کے لئے کسی قسم کی طاقت اور صلاحیت نہیں صرف کرنا چاہتے۔

بلاغ اور متاع کے درمیان فرق کرنے والا حدّ فاصل ہی رشد اور ضلالت کے درمیان تفریق کرے گا، اسی سے انسان کی مادّی و رُوحانی زندگی کے درمیان حدود کھڑے کئے جاسکتے ہیں تاکہ بدن اپنے دائرے میں ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ ہو کر اپنا کام انجام دے اور کفایت اور بلاغ کے نظام کو قائم رکھے اور دوسری طرف دل آیاتِ الٰہی کے باغات میں چکر لگائے، اپنے احساسات و جذبات آسمانوں اور زمین کے اقتدار پر غور و فکر

کرنے میں صرف کرے اور اپنے حقیقی وجود پر نور و معرفت کی غذا اور شرابِ طہور کا فیضان کرے۔

قلب اور خواہشِ نفس کے درمیان تفریق ضروری ہے

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قلب کی فطرت میں جمال و کمال کا ذوق موجود ہے اور یہ نہایت ضروری ہے کہ سعادت کی مسرتیں اس میں داخل ہوتی رہیں۔ دل زندہ وہ ہے جو مسرت و شادمانی کے احساس سے خوب دھڑکے اور نعمت الٰہی کی پیہم آمد کا آرزومند ہو اور اس قلب میں کوئی زندگی نہیں جو جامد ہو، بجھا ہوا ہو، اس میں کوئی حرکت ہو نہ جذبہ۔ یہ ساری چیزیں حق ہیں اور دل کے جذبات و احساسات اسی لئے ہوتے ہیں کہ اس کے اوپر جس جمال و کمال کی بارش ہو رہی ہے اس سے وہ بھی استفادہ کر سکیں اور اس کی حلاوت کا مزہ چکھ سکیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس افق سے یہ جمال قلب پر نازل ہوگا؟ کیا اس پست اور گھٹیا افق سے اس کا ظہور ہوگا جس میں جسم تمام چوپایوں کے ساتھ چرنے چگنے میں لگا ہوا ہے؟ یا اس بلند افق سے اس کا نمود ہوگا جو اپنی نعمت؛ اور اپنا جمال حسنِ معرفت الٰہی سے اکتساب کرتا ہے یعنی آیاتِ الٰہی اور اس کے محاسنِ صنعت سے عبرت و موعظت کو ڈھونڈھ نکالتا ہے۔

جسم کی دنیا الگ ہونی چاہیئے اور قلب کی دُنیا الگ، اور انسان کو اپنی بدنی کوششیں اپنی ظاہری زندگی میں صرف کرنی چاہئیں اور قلبی و فکری کاوشیں اپنی اندرونی و باطنی زندگی میں لگانی چاہئیں۔

زُہد سے تلافی ممکن ہے

اگر ہم اُس حدِ فاصل کو کوئی نام دینا چاہیں جو آدمی کو اس کی دونوں زندگیوں میں صراطِ مُستقیم پر قائم رکھتی ہے تو اس اصطلاح کو استعمال کرنا پڑے گا جسے اہلِ معرفت نے "زہد" کے نام سے یاد کیا ہے۔ جو شخص زُہد کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور سمجھتا ہے اسے اپنے اس مفہوم پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ زہد اُس روحانیت کو نہیں کہتے جو آپ کو دنیا میں دوڑ بھاگ کرنے سے روک دے اور لوگوں سے الگ تھلگ کر دے اور زندگی کی پاکیزہ اور حلال چیزوں سے بھی آپ کو محروم کر دے۔ بلکہ زہد کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے لیا ہے۔ امام زہریؒ سے پوچھا گیا: زہد کی تعریف کیا ہے؟ فرمایا: دیکھو، زُہد بالوں کے بکھیر لینے کو نہیں کہتے نہ تقشف کا نام زہد ہے بلکہ زہد کہتے ہیں شہوت سے نفس کو روک لینے کا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا: کیا کوئی شخص جس کے پاس ایک ہزار دینار ہوں، زاہد بن سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا گیا: نشانی بتائیے۔ فرمایا: نشانی یہ ہے کہ اگر اس سے زیادہ دولت اس کے پاس آجائے تو اِترائے نہیں اور اگر اس میں کمی ہو جائے تو رنجیدہ نہ ہو۔

ابن سماکؒ نے فرمایا:

"زاہد اسے کہتے ہیں جسے دنیا ہاتھ لگے تو متکبر نہ ہو اور اگر دُنیا اس سے چھوٹ جائے تو غمناک نہ ہو، مجلسوں میں ہنسے اور خلوت میں روئے۔"

یعنی لوگوں کے ساتھ مسرت و شادمانی اور بشاشت کے ساتھ رہے اور جب تنہائی

میں اللہ کو یاد کرے تو اس کی دونوں آنکھیں بہہ پڑیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زہد کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"زہد یہ نہیں ہے کہ حلال کو بھی حرام کر لیا جائے نہ زہد مال کو برباد اور ضائع کرنے کو کہتے ہیں بلکہ زہد کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ تمہاری نگاہ میں اس دولت سے زیادہ قیمتی بن جائے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے۔"

زہد کی صحیح تعریف وہ ہے جو قرآن کریم کی اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتی ہے:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (قصص: ۷۷)

(جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔)

زہد ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو آدمی کے ضمیر میں اس وقت جگہ پاتی ہے جب اللہ کی آیات میں غور و فکر کر کے معرفتِ الٰہی سے ہمکنار ہو چکا ہو، اگر اسے یہ معرفت حاصل ہو جائے تو وہ حد درجہ سعادت مند، غنی اور خوش بخت ہے۔ اس کی یہ حالت برابر قائم رہتی ہے یہاں تک کہ اس کے ذہن و شعور پر اسی کا غلبہ ہو جاتا ہے پھر وہ دنیا پر حریصانہ نگاہ نہیں ڈالتا بلکہ اس کی نظریں آخرت پر لگی رہتی ہیں۔

یہ ہے وہ حدِ فاصل، جس کے بارے میں ابھی پیچھے سوال کیا گیا تھا تاکہ دونوں زندگیوں کے نقوش واضح کر دیں، زہد کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم ہو کہ اللہ نے اس سے دو زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور مادی وجود کو مادی زندگی میں اور روحانی وجود کو ماورائے مادہ کی دُنیا میں رکھنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ مادی دُنیا میں وہ

اپنے بدن کی طاقتوں اور اس کی صلاحیتوں کو صرف کرے اور روحانی دُنیا میں اپنے قلب کی طاقتوں اور اس کی صلاحیتوں کو لگائے اور اس بات کی پوری کوشش کرے کہ اس کے جذبات واحساسات اللہ کے انعامات سے ہٹ کر متاعِ دُنیا کی طرف نہ پھر جائیں۔

انسان پاک وطیب چیزوں کو کھائے اس لئے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے اور ان کے استعمال کو ناپسندیدہ نہیں کہا ہے بلکہ اپنے پیغمبروں اور تمام مسلمانوں کو اس کے استعمال کی دعوت دی ہے:

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا۔

(مومنون: ۵۱)

اے پیغمبرو، کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح!

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

(بقرہ: ۱۷۲)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں)

لیکن ان چیزوں کا استعمال اس لئے ہو کہ وہ اس کے ذریعہ بدن کے حقوق ادا کر سکے کھانا اس لئے کھائے کہ اپنی ذمہ داری پوری کر سکے نہ کہ لذت یابی، شہوت رانی اور حیوانوں کی طرح محض لطف اندوزی کے لئے۔ اس لئے کہ:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعٰمُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (محمد: ۱۲)

(اور کفر کرنے والے بس دُنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں، اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔)

جسم کا توشہ الگ ہے اور قلب کا توشہ الگ اور حکمِ خداوندی ہے کہ:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (بقرہ: ۱۹۷)

(زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے، پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔)

ہمیں بہترین لباس زیب تن کرنا چاہیئے اور صاف ستھرا رہنا چاہیئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے اور صفائی کو محبوب رکھتا ہے اسی لئے وہ ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۳۱)

(اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔)

لیکن یہ صفائی ونظافت اور زیبائش کا اہتمام جسم کی ستر پوشی اور اس کی حفاظت کے لئے ہونی چاہیئے لوگوں کے سامنے بڑا بننے اور نمود و نمائش کے جذبے کی تسکین کے لئے نہیں۔ اوپر کی آیت میں عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ کے الفاظ قابل غور ہیں۔ مسجدوں کے لئے جو زینت ہوتی ہے وہ بزموں اور محفلوں کی زینت سے مختلف ہوتی ہے اور جو زیبائش اللہ کے لئے کی جاتی ہے وہ اس زیبائش سے بہت دور ہوتی ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے کی جاتی ہے۔ جو محرک عبادت کے وقت صفائی ستھرائی اور زینت کا اہتمام کرنے پر ابھارتا ہے وہ بڑا ہی پاکیزہ اور عظیم ہے وہ دل میں ریا و نمود اور برتری کے جذبات کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ یہ بہت ضروری ہے کہ لباس کے معاملہ میں ہمارا وہی طرزِ عمل ہو جو غسل اور طہارت کے معاملے میں ہوتا ہے۔ آدمی غسل کرتا ہے

اپنے بدن کو پاک کرتا ہے اور اس کے دل میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ اس سے لوگوں پر برتری جتائی جا سکتی ہے اور لوگوں کی نظروں کو اپنی طرف کھینچا جا سکتا ہے بلکہ آدمی غسل و نظافت کا اہتمام اس لئے کرتا ہے تاکہ اپنے جسم کا حق ادا کر سکے، ایک آدمی نے عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا: میں کون سا لباس پہنوں؟ آپ نے فرمایا: جسے کم عقل حقیر نہ سمجھیں اور جس پر دور اندیش اور صاحبِ نظر لوگ نکتہ چینی نہ کریں۔

جو لباس آپ کو میسر ہو پہنئے لیکن تکلف نہ ہونا چاہئے نہ اس کی طرف دل کی توجہ مبذول ہونی چاہیئے۔ اور ہمیشہ یاد رکھئے کہ روحانی لباس ہر لباس سے بہتر اور مناسب ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ۞ (اعراف: ۲۶)

(اے اولادِ آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں،

زندگی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ شادی کریں اور نسل کی افزائش کریں۔ اللہ نے ہمارے لئے اس کا حکم نازل کیا ہے اور اسے انبیاء کی سُنّت قرار دیا ہے:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ ذُرِّیَّۃً ؕ (رعد: ۳۸)

(تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی

بنایا تھا)

خود عقلِ آزاد کا یہ فیصلہ ہے کہ بیٹے یا بیٹی کی خواہش رکھنا، خدا کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری ہے، جس کے ذریعہ زندگی کے فرائض ادا کرنے میں آسانی ہوتی ہے، یہ محض شہوت رانی کا وسیلہ نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں شادی اسی لئے کرنی چاہیئے تاکہ اللہ کا مقصد پورا ہو اور نسل کی افزائش ہو سکے نہ کہ بچوں اور عورتوں سے ضرورت پوری کر لی جائے اور محظوظ ہو لیا جائے اور بس۔ یہ خود اللہ کا فیصلہ ہے:

فَالْئٰنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ (بقرہ: ۱۸۷)

(اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لئے جائز کر دیا ہے، اُسے حاصل کرو۔)

امام بیضاوی آیت کے آخری حصہ کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"اور اس چیز کی خواہش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے مقرر کر دی ہے اور لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے یعنی اولاد۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مباشرت زن و مرد کا مقصد اولاد ہو کہ یہی شہوت کی تخلیق کرنے اور نکاح کا قانون بنانے کا مقصد ہے نہ کہ محض حاجت کی تکمیل۔"

بیوی کے اندر بڑی کشش ہوتی ہے اور اولاد کے اندر بڑا مٹھاس ہوتا ہے، کبھی کبھی یہ چیزیں قلب تک سرایت کر جاتی ہیں اور اس میں خرابی پیدا کر دیتی ہیں اور آدمی کی خدا پرستی میں خلل ڈال دیتی ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس کے حقیقی وجود اور اس زندگی پر تیشہ چلا دیتی ہیں جس کے ذریعہ اس کی عمر اور قدر و قیمت متعین ہوتی ہے، اسی لئے خدائے عزوجل ہمیں تنبیہ کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَ أَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ (تغابن: ۱۴)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، اُن سے ہوشیار رہو۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

"تمہارا دشمن وہ نہیں ہے جسے اگر تم قتل کر دو تو تمہیں نور حاصل ہو جائے اور اگر وہ تمہیں قتل کر دے تو تم جنت میں داخل ہو جاؤ بلکہ تمہارا بدترین دشمن تمہاری اولاد ہے جو تمہارے صلب سے نکلی ہے پھر اس کے بعد سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ مال ہے جس کے تم مالک ہو۔"

زمین میں چلت پھرت کرو، اس کی پہنائیوں میں دوڑ دھوپ کرو اور اللہ کا فضل، اس کی روزی اور اس کا پھل تلاش کرو لیکن اپنے قلب کو ملکوت الٰہی میں گردش کرنے کے لئے چھوڑ دو اسے خدا کی نشانیوں اور اس کی صفات کے آثار پر غور و فکر کرتا رہنے دو۔

اپنی دُنیوی زندگی کے لئے کام کرو اور مال جمع کرو لیکن ان میں سے کوئی چیز تمہیں اُخروی زندگی سے غافل نہ کرے مال و دولت کو جمع کرنے کا مقصد یہ نہ ہو کہ تم سونا چاندی سینت سینت کر رکھو یا اس کے ذریعہ امیر ترین آدمی بن جاؤ کہ یہ کم عقل لوگوں کا شغل ہے۔ وہ فتنہ جو دلوں میں سرایت کر جاتا ہے، وہ در اصل اللہ کے ماسوا مال کی عبادت کرنا ہے:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَ أَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (تغابن: ۱۵)

(تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (منافقون : ۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں، جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔)

مال جمع کرنے کا مقصد یہ ہو کہ تم اسے اللہ کی راہ میں خرچ کروگے اور اپنے دین کی تائید و تقویت کے لئے استعمال کروگے۔

اس سے دونوں زندگیوں میں انسان کا وجود ثابت ہو جاتا ہے اور وہ دونوں میدانوں میں اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے اور اس زہد کے معنیٰ و مفہوم کو حاصل کرلیتا ہے جس تک خواہشات کے غلام رسائی حاصل نہ کرسکے تو اس پر عیب لگا دیا حالانکہ زہد پوری انسانیت کے لئے باعث زینت اور اس کا مکمل نظام ہے۔

زہد کی وادی بڑی دشوار گزار ہے

یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے کہ اس دولت گراں مایہ کا حصول آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دُنیا کی زینت و آرائش اور مال و اولاد، جاہ و منصب اور دوسری بہت سی دل فریبیوں سے گھرے ہوئے ہیں اور یہ ساری چیزیں دل پر دباؤ ڈالتی ہیں اور اسے اپنے دائرہ میں کھینچ کر لانے کی کوشش کرتی ہیں دوسری طرف انسان کی طبیعت اور اس کی فطرت ہے جو ان میں سے کسی ایک کی سحر کاری کا بھی مقابلہ نہیں

کر سکتا چہ جائیکہ ان سب کے حملوں کو برداشت کر سکے۔ انسان بچپن ہی سے لذتوں اور شہوتوں کا دلدادہ ہوتا ہے، ماں باپ کی شفقت اور رشتہ داروں کی مہربانی اسے حاصل رہتی ہے، یہ لوگ اسے بڑے نازو نعم سے پالتے ہیں، اس پر اپنی رحمتوں اور شفقتوں کے ڈونگرے برساتے ہیں چنانچہ اس کے حواس، اس کی فطرت اور اس کی خواہشات سب کچھ نرم و نازک ہو جاتی ہیں اور لذتوں کی دلدادہ، اس ماحول میں وہ پل بڑھ کر جوان ہوتا ہے اور اس کا دل دنیوی زندگی کے مظاہر کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اب ہم یہ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ دونوں زندگیاں آسانی سے وہ پالے گا جبکہ وہ اس فتنہ پرور سرسبز و شاداب اور گمراہ کن ماحول میں رہ رہا ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور ایک علمی اور باخبر شخص کی حکمت کے ساتھ اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ:

"بیشک یہ دُنیا بڑی شیریں اور بڑی شاداب ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے بعد اس کا وارث بننے والا ہے وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے رہے تھے۔"

ہم چیزوں کی حقیقت اور معاملات کی واقفیت پر اسی طرح نگاہ ڈالتے رہیں جس کی ہم کو رسول اللہ نے تعلیم دی ہے اور اس کے حل تلاش کرنے میں بھی ہمیں علمی اور حقیقت پسند انسان کا رول ادا کرنا چاہیئے

عقل و قلب کے درمیان

اس دنیا کے سلسلے میں قلب کا موقف کیا ہو جس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شیریں و شاداب ہے؟ اگر انسان کی ترکیب میکانکی انداز میں ہوتی

تو وہ اپنے بدن کے لئے ایک خاص مدار بنا سکتا تھا جو اس کے اعضاء و جوارح کو حرکت دیتا رہتا اور اپنے دل کا ایک الگ مدار بنا سکتا تھا جو اسے دوسری سمت میں گھماتا رہتا اور اس طرح انسان کو خود بھی راحت ملتی اور دوسرے کو بھی آرام مہیا کرتا۔ لیکن انسان ایک زندہ وجود ہے جو ادراک کی صلاحیت رکھتا ہے اور زندگی ایک پیہم حرکت کا نام ہے جسے مادہ کی بندشوں اور حد بندیوں سے روکا نہیں جا سکتا۔ اب پھر وہی سوال آ کھڑا ہوتا ہے کہ دُنیا کی نعمتوں اور اس کی دل فریبیوں کے مقابلے میں قلب کا موقف کیا ہو؟

کیا ہم قلب کی رغبتوں اور چاہتوں کو نظر انداز کر دیں اور تجاہلِ عارفانہ سے کام لیں یا امرِ واقع کے فیصلہ کو تسلیم کر لیں؟

ہماری خواہش ہے کہ ایک طرف ہم انصاف کا دامن پکڑے رہیں تو دوسری طرف عوام الناس بھی انصاف پسند ہوں تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی دنیا میں اپنی اندھی خواہشات کے ساتھ بلا کسی قید و شرط کے زندگی گزاریں؟ یا کچھ شرائط، کچھ پابندیاں ہونی چاہئیں اور کوئی نظم و ضبط ہونا چاہیئے؟

اگر قلب حیات اور قوتوں کا مرکز ہونے کے ساتھ منطق و عقل اور تنظیم و تحریک کا بھی مرکز ہوتا تو خود ہی نظم و ضبط پیدا کر لیتا، اپنی خطرناک طاقتوں کو اپنی منطق کے سامنے جھکا لیتا اور انہیں ان اصولوں کی راہ میں صرف کرتا جن کو وہ اچھا سمجھتا ہے پھر انسانیت کی آج جو حالت ہے اس سے بہت مختلف ہوتی۔ لیکن مشیتِ الٰہی کا فیصلہ یہ ہوا کہ تنظیم کا مرکز دل سے دُور ہو اور اس کی قیادت کا قلعہ کھوپڑی کے سب سے اوپری حصہ میں تعمیر ہو۔ دل انسانی اِنجن کی وہ ہانڈی ہے جس میں بھاپ اُٹھتی ہے اور منطقی عقل اس کا ڈرائیور ہے۔ جن اصولوں پر منطق و عقل کا ایمان ہے، اگر انہی کی خوشبو دل میں بھی

بسی ہو تو سمجھ لیجئے کہ ڈرائیور نے انجن کی نکیل تھام رکھی ہے اور اس کی قوتوں کو جس رخ پر چاہے پھیرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اگر عقل کا ایمان کچھ دوسرے اصولوں پر ہو اور دل میں کسی اور نظریہ کی یاد بسی ہو تو سمجھ لیجئے کہ ڈرائیور کی گرفت قیادت پر سے کمزور ہے اور انجن بلا کسی نگرانی کے چل رہا ہے اور انسان بغیر کسی قید و شرط کے اپنی خواہشاتِ نفس کا ساتھ دے رہا ہے۔ یہی آج کل اکثر لوگوں کی حالت ہے۔

حیرت ہے کہ لوگ دنیوی معاملات میں تو عقل و منطق کا سہارا لیتے ہیں، اگر عقل یہ فتویٰ دے دے کہ فلاں پھل بڑا شیریں اور لذیذ ہے لیکن صحت کے لئے حد درجہ نقصان دہ ہے اور یہ لکڑی صحت کے لئے بہت مفید ہے اس سے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں ہے تو عقل کے فیصلہ کو تسلیم کر لیں گے اور لکڑی کو پھل پر ترجیح دیں گے، اس کے مزے اور حلاوت کی کوئی فکر نہ کریں گے بلکہ اس کے نقصان سے بچنے کے لئے اس کے قریب بھی نہ جائیں گے —— لیکن دل کے معاملہ میں عقل و منطق سے کام نہیں لیتے اس لئے کہ یہاں تو دل عقل سے آزاد ہوتا ہے، اگر ان سے کہا جائے کہ اخلاق کا یہ اصول بہت عمدہ اور مفید ہے تو کھانے پینے کے معاملے کی طرح فوراً اسے تسلیم نہیں کریں گے اے کاش کہ انسان کا معدہ مبادی اور اقدار کو بھی ہضم کرے جس طرح کھانے کو ہضم کرتا ہے پھر تو دو بھلائیوں سے وہ ہمکنار ہو جائے اور بدن اور رُوح کی دونوں غذائیں اس کے اندر پہنچ جائیں۔ لیکن اصول و اقدار کا معدہ تو دوسرا ہوتا ہے جسے ہم دل کے نام سے جانتے ہیں —— سچائی اخلاق ہے اور جھوٹ بولنا بد اخلاقی ہے، مجھے بتایئے کہ کون اس حقیقت سے انکار کرے گا؟ کون عقل مند اس بہترین اصول کو تسلیم نہیں کرے گا؟ لیکن جب اپنا مفاد خطرے میں پڑتا نظر آتا ہے تو مجھے بتایئے کہ کون ایسا شخص ہے جو

سچائی کو گرانبار نہیں سمجھتا؟ اور اس وقت کون ایسا فرد ہے جو جھوٹ کو شیریں نہیں بناتا اور اس پر سچائی کا روغن چڑھا کر خواہش نفس کی پیروی نہیں کرتا ہے؟ وہ ڈرائیور کی پسند اور مرض کے علی الرغم انجن کو ہر کسی رخ میں چلانے کی کوشش نہیں کرتا؟ خیر کی راہ میں خرچ کرنا محبوب ہے اور کنجوسی معیوب ہے، اس حقیقت میں کوئی شک نہیں، لیکن دماغ کا انجن اس پٹڑی کو چھوڑ کر کسی اور پٹڑی پر چلا جاتا ہے، کیوں؟ کیا اس وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں انہیں اصولوں کے مطابق کام کرتا ہے جن پر اس کی عقل مطمئن ہوتی ہے؟ یا اس وجہ سے یہ حادثہ رونما ہوتا ہے کہ عقل اور اصول ایک راہ پر گامزن ہوتے ہیں اور دل اور اس کی خواہشات دوسری راہ پر؟ -

ہم چاہتے ہیں کہ تمام انسان انصاف پسند اور منصف بنیں تو کیا وہ یہ پسند کریں گے کہ انسان اس زندگی کو اختیار کرے؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کہیں کہ انسان پر جب سچائی گراں گزرنے لگے اور جھوٹ شیریں اور لذیذ ہو جائے تو جب تک ذاتی مفاد وابستہ ہو اسے جھوٹ بولنے میں کوئی عار نہ ہو اس لئے کہ دنیا شیریں اور شاداب ہے؟

کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم سچائی کی مذمت کریں اور بخل کی تعریف کریں، اس لئے کہ مال و متاع دنیوی زندگی کی آرائش کا ذریعہ ہے اور انسان آغاز عمر سے اس کا پرستار اور دلدادہ رہا ہے؟

چنانچہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس شیریں و شاداب دنیا کے سلسلے میں قلب کا کا موقف کیا ہو؟ تو ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ اس کے سامنے اس زبردست تضاد کو

نمایاں کردیا جائے گا جو آدمی کی عقل اور اس کے اصولوں اور قلب اور اس کی خواہشات کے درمیان پایا جاتا ہے۔

شاید اس زبردست تضاد سے اس کی آنکھ کھل جائے اور سرسبز و شاداب دنیا کو اپنانے سے پہلے ان متضاد پہلوؤں کے درمیان موزونیت اور مناسبت تلاش کرلے ——،

امر واقعہ یہ ہے کہ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ قلب کے نظام اور اس کے موقف کی تعیین کرسکیں اِلّا یہ کہ اس صورتِ حال کا علاج کریں۔

یہ پہلی شرط اور پہلا مرحلہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیسے ہو؟ اور اس زبردست خلیج کو کیسے کم کیا جائے؟ کیا اس کا طریقہ یہ ہے کہ عقل کو قلب کی وادی میں لے آیا جائے اور اس کی خواہشات کا اسے پابند بنادیا جائے؟ یا یہ کہ دل کو ایک دوسری وادی میں منتقل کردیا جائے اور عقل اور راست اصولوں کا اسے پابند کردیا جائے؟

پیچھے جتنے سوالات گزر چکے ہیں، وہ سب عقل و قلب کے مفہوم سے ناواقفیت کی وجہ سے خلط مبحث کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ہمیں مختصر طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دل اپنے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے شوق و رغبت اور جذبات و احساسات کا مرکز ہے چنانچہ جب دل میں جتنی چیزیں ہی بسی رہتی ہیں اور مال و منال، جاہ و منصب لذت و تعیش کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے اس میں گنجائش نہیں ہوتی تو قلب کے احساسات اور اس کی رغبتیں انہی چیزوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں اور دل کے ارادہ اور اس کی مرضی پر انہیں تھوپ دیتی ہیں اور زندگی کے ظاہری معاملات میں، سلوک و

برتاؤ میں، سیرت و کردار میں انہی مرغوبات کی جھلک دکھائی دیتی ہے، انسان دنیا کمانے اور اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ اللہ کا فضل اور اس کا کرم ہے کہ اس نے عقل کو باطنی حس دے رکھی ہے جس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور اس کی صفات پر کائنات کی دلالت کا ادراک کرے یعنی مخلوقات عالم میں خدا کی صفات کے آثار تلاش کرے، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی حکمت، اس کی رحمت و مودت، اس کی سخاوت و دریا دلی، اس کا احسان و عدل، غرضیکہ اس کی ساری صفات کے مظاہر ڈھونڈھے۔ اور جب انسان پر ان قدسی صفات کے آثار و مظاہر رونما ہوتے ہیں تو ان کی شکلیں فوراً دل تک منتقل ہو جاتی ہیں اور یہی خدا کی معرفت حاصل ہونے کا نتیجہ اور ماحصل ہے اس لئے کہ اللہ کی معرفت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کی صفات کی معرفت حاصل کی جائے اور یہی معرفت اس کا عقیدہ اور ایمان بھی ہے۔

یہاں جس چیز کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ خدائی صفات کے یہ آثار جب قلب تک منتقل ہوتے ہیں اور ضمیر ان کا احاطہ کرتا ہے تو جتنی چیزوں کے اثرات بالکل مٹ جاتے ہیں اور قلب کے احساسات اور اس کی رغبتیں انہی آثار سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور انسان کا ضمیر یعنی اس کا دل پاکیزہ وجدانات سے معمور ہو جاتا ہے جو بر و احسان کرم و سخاوت، مودت و رحمت، حکمت و علم اور عدل و انصاف وغیرہ خدائی صفات کی شکل میں ظا[ہر] ہوتے [ہیں] اور اس کا دل، بغض و عداوت، اور خراب عادات و رسوم سے پاک ہو جاتا ہے، خدائی وجدانات کا دل کے ارادہ پر غلبہ ہو جاتا ہے اور انسان کی ظاہری زندگی میں انہی کی نمود بر و رحمت، مودت و محبت اور اچھے سلوک اور عمدہ اخلاق

کی شکل میں ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ ساری باتوں کا انحصار اس چیز کی طبیعت اور مزاج پر ہے جو دل کے خلا کو پُر کرتی ہے، اگر وہ چیز معرفت الٰہی کی نمائندگی کرنے والی عبرتیں اور نصیحتیں ہوں تو دل کے جذبات واحساسات معرفت الٰہی کے مفہوم سے معمور ہوجاتے ہیں اور انسان کا دل بلند اقدار اور پاکیزہ اصولوں سے بھر جاتا ہے لیکن اگر انسان پر غفلت طاری ہو جائے یا وہ ایسے کاموں پر توجہ دینے لگے جو اسے آیات الٰہی پر غور وفکر کرنے سے روک دیں اور چیزوں کے اندرون میں جھانکنے والی اس کی حس آثار کائنات میں خدائی صفات کے مظاہر تلاش کرنے سے بے نیاز ہو جائے تو بلند قدروں کا نزول رک جائے گا اور قلب کسی بھی صالح تحریک اور مناسب انگیخت سے محروم ہو جائے گا اور حسی چیزیں دل کے اوپر چھا جائیں گی اور انہی سے قلب کے احساسات وجذبات وابستہ ہو جائیں گے اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

یہاں پہنچ کر پھر وہی پرانا سوال آگیا کہ اس شیریں وشاداب دنیا کے سلسلہ میں قلب کا موقف کیا ہونا چاہیے؟ میں سمجھتا ہوں کہ سائل کے سامنے دو بنیادی چیزیں رکھ دی جائیں گی:

۱۔ اس زبردست تضاد کو سامنے لایا جائے جو انسانی زندگی کی بنیاد حرکت اور صحت پر رکھتا ہے۔

۲۔ اس تضاد کا علاج کیسے کیا جائے؟ اس کی شکل یہ ہے کہ انسان کی خواہشات اور بلند اصولوں کے درمیان الفت اور محبت کے رشتے استوار کیے جائیں یعنی اس کی خواہشات کو ان بلند اصولوں کی جنس میں شامل کر دیا جائے۔

یکسوئی ضروری ہے

جب ہم نے ان دونوں چیزوں میں ایک ایسی قید لگادی جو اس دنیوی زندگی کے سلسلے میں ہمارے دل کے معاملہ کو منظم کرے گی تو اب ہمارے سامنے صرف ایک طریقہ رہ جاتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریقے میں انسان کے لئے کوئی بھلائی بھی نہیں ہے وہ یہ کہ دل کو ہم ہر ایسے خیال سے پاک کرلیں جو بلند اقدار سے ٹکراتا ہو۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ وہ خیالات ہیں کون سے؟ اور کیسے ہم ان سے دل کو پاک کرکے یکسو کرلیں؟ یہ دونوں سوالات ہمارے قلب اور ہماری عقل کے لئے اس وقت بہت اہم ہوجاتے ہیں جب ہم اس اہم کام کی تکمیل کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ اب اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر جان چھڑالیں کہ تم اپنے قلب کو ہر اس خواہش اور خیال سے پاک کرلو جو بلند اصولوں سے ٹکراتا ہو۔ ہم اپنے دل کو اس چیز سے کبھی خالی نہیں کرسکتے جس سے ہم واقف نہ ہوں۔ نہ کسی ایسے فریضے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں جس کے نقوشِ راہ واضح نہ ہوں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خواہشات اور خیالات ہیں کون سے، جو بلند اقدار کی راہ میں حائل ہیں؟

یہ خواہشات ان خیالات اور شہوات کا مجموعہ ہیں جو دل پر کسی ربانی تحریک یا کسی آسمانی روشنی کی کوئی کرن نہیں پڑنے دیتیں اس لئے کہ یہ چیز اس کے مزاج میں شامل ہی نہیں ہے۔ یہ خواہشات تو انسان کے حیوانی اعضاء سے متعلق ہیں جو ارضی ہیں سماوی نہیں ہیں۔ زمین سے ان کی تخلیق ہوئی ہے، یہیں سے ان کو غذا ملتی ہے

اوران کی نشوو ارتقاء یہیں پر ہوتی ہے اس لئے لازمی طور پر یہ اس سرزمین کی لذت وفرحت کے مشتاق ہوں گے یہ آسمانی رزق اور خدائی نعمتوں کا ادراک اتنا ہی کر سکتے ہیں جتنا کسی بھی حیوان کے اعضاء وجوارح کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ اور حیوانات کے اعضاء وجوارح دونوں یکساں ہیں، ان دونوں کی چراگاہ ایک ہے، دونوں کا دسترخوان یہ زمین ہے۔۔۔ اور اگر فطرت کی صحیح منطق استعمال کریں تو ان دونوں کا توشہ گاہ ایک ہے۔۔۔۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ قرآن، زمین اور اس کی نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے:

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ۝ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ۝ وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا ۝ (نازعات: ۳۰ تا ۳۲)

(اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا، اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔)

پھر کہتا ہے:

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ (نازعات، ۳۳)

(سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے)

سورہ عبس میں کہتا ہے:

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝

(عبس: ۲۶ تا ۳۱)

(پھر زمین کو عجب طرح پھاڑا، پھر اس کے اندر غلے اُگائے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل

اور چارے)

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

(تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زیست کے طور پر)

سورہ طٰہٰ میں فرماتا ہے:

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿٥٣﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿٥٤﴾ (طٰہٰ: ۵۳، ۵۴)

(اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی، کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لئے۔)

معلوم ہوا کہ یہ سرزمین انسان اور حیوان دونوں کے اعضاء و جوارح کے لئے واحد دسترخوان —— یا توشہ گاہ جو چاہیں آپ کہہ لیں بشرطیکہ حقیقت ان اصطلاحوں میں گم نہ ہوکر رہ جائے —— ہے، جس شخص کو یہ حقیقت ناگوار لگے اسے ہمارے اوپر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسے بتائیں کہ آسمان کا رزق اس ارضی رزق کے علاوہ اور اس سے مختلف ہے اسے اللہ دلوں پر نازل کرتا ہے معدوں اور جیبوں پر نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام اپنے ممتاز مومن بندوں کے لئے کیا ہے ان لوگوں کے لئے نہیں جو چوپایوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں۔ ہر انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ارضی توشہ گاہ سے بلند ہوکر آسمانی توشہ گاہ پر بھی نظر ڈالے اگر وہ بھیڑوں اور بکریوں کی سطح سے اوپر اٹھنا چاہتا ہے۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا

(بقرہ : ۱۶۸)

(لوگو ، زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ -)

اور اس سے تھوڑی دُوری پر یہ آیت ملتی ہے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ

(بقرہ : ۱۷۲)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں۔)

ان دونوں آیتوں میں دیکھئے کتنا زبردست فرق ہے ! پہلی آیت میں ایک عام بات کہی جا رہی ہے جبکہ دوسری آیت میں مسلمانوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے اور اس رزق کا انتساب خدا اپنی ذات کی طرف کر رہا ہے۔ دیکھئے کتنا زبردست تناسب ہے ان میں ایک طرف عام انسانوں کو زمین کی پاکیزہ چیزوں سے استفادہ کرنے کا حکم دیا جا رہا اور دوسری طرف مسلمانوں کو ان طیبات کے استعمال کا حکم دیا جا رہا ہے جو اللہ نے اپنے فضل خاص سے انہیں دے رکھی ہیں۔

وہ تمام خواہشات اور خیالات جو صرف انسان کے حیوانی پہلو کی خدمت کرتے ہیں، انہی سے دل کو پاک و صاف رکھنا اور ان کی تاریکیوں سے اسے نکالنا ضروری ہے تاکہ دل روشن ہو جائے اس میں جلا آ جائے۔

ان خواہشات اور خیالات کی تفصیل تین شقوں میں بیان کی جا سکتی ہے :

(۱) خواہشات ، جو بدن کی ضروریات اور اعضاء و جوارح کی مطلوبات کو دل میں

اس طرح پیوست کر دیتی ہیں کہ آدمی کھانا، پانی، لباس، بیوی اور دوسری عیش کوشیوں اور ظاہری محسوسات کے اسباب و وسائل کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔

(۲) دوسرے نمبر پر وہ خواہشات آتی ہیں جو قلب کو جاہ و منصب کی رغبتوں اور ریاء و شہرت کی مطلوبات پر ایسا فریفتہ بنا دیتی ہیں کہ ان کے نتیجے میں آدمی جاہ و اقتدار یا دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا غلام بن جاتا ہے۔

(۳) ایسی خواہشات جو قلب کو مال و دولت کا گرویدہ بنا دیتی ہیں اور اسے دُنیوی زندگی کی زینت کے لئے استعمال کرنے پر مہمیز لگاتی ہیں۔ کبھی کبھی مال کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ اوپر مذکور دونوں مقاصد میں سے کسی کی تکمیل ہو سکے یا دونوں کو مکمل کرنا مقصود ہوتا ہے تو مال بدنی رغبتوں کی تسکین کے لئے وسیلہ بن جاتا ہے یا جاہ و اقتدار کی خواہشات کو تقویت دینے والا ایک عنصر۔ اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواہشات کی اس تیسری شق کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن بیشتر اوقات بذاتِ خود مال محبوب ہو جاتا ہے جس طرح گھوڑے اور چوپائے، کھیتیاں اور باغات محبوب ہو جاتے ہیں اور آدمی بدن کی لذتوں یا جاہ و منصب کی شہوتوں پر توجہ بھی نہیں دے پاتا، اس وجہ سے خواہشات کی اس تیسری قسم کو الگ سے بیان کرنا پڑا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝

(ہمزہ: ۲، ۳)

(جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔)

یہ ہیں اس باطل کی تفصیلات جس کے اوہام سے ہم اپنے دلوں اور دماغوں کو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور جس کی آلائشوں اور نجاستوں سے انہیں پاک وصاف کرنا مقصود ہے۔

اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو حقائق اپنے اصل جوہر اور سچی روح کے ساتھ ہمارے اوپر منکشف ہوں گے اور ہماری آزادی و حریت محفوظ رہے گی لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ہم اپنے قلوب کو آزادی دلائیں اور ان کی موجودہ خباثتوں سے انہیں کیسے باہر نکالیں؟

باطل خواہشات کھل کر ہمارے سامنے آگئیں، آخر دل پر ان کے تسلط کو کیسے ختم کریں؟ کیا ہم اس کے لئے دستے تشکیل دیں؟ فوج ترتیب دیں؟ لاؤ لشکر اکٹھا کریں پھر اس دشمن پر جان توڑ حملے کریں؟ جی ہاں، حملہ کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ باطل خواہشات کتنی مشابہت رکھتی ہیں اس دشمن سے جو دوسروں کے علاقوں میں مداخلت کرے، دیارِ غیر پر قبضہ جمالے اور وہاں اپنے اوامر و نواہی نافذ کرے، اس کے باشندوں پر ایسی ذلت و مسکنت تھوپ دے جو وہاں کے حریت پسند کبھی پسند نہ کریں گے! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی غاصب و قابض کسی کالونی کو بغیر کسی جنگ اور جھڑپ کے خالی کر سکتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ فاسد و مفسد خواہشات دل کی کالونی کو بغیر کسی جنگ کے خالی کر دیں اور اگر آپ کو اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہو تا کہ کوئی غلام قوم مجرد خواہشات اور خوابوں کے ذریعہ آزادی و سیادت کو دوبارہ حاصل کر لے گی تو اس مفروضہ پر بھی یقین کر لیجیے کہ منفی حوصلے اور خالی خولی خواب دل کو اس کے دشمن سے آزادی دلانے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہے

آپ کو یقین ہے کہ کوشش لامحالہ درکار ہے، ایک خوں ریز معرکہ ناگزیر ہے جو غلام اُمت کو لڑنی پڑے گی اور اس کے لئے ہر طرح کے ارادے اور قوتیں صرف کرنی پڑیں گی تو حق یہی ہے اور تنہا یہی طریقہ انخلاء، آزادی اور حریت کے حصول کا ہے اگر قریب و بعید کی تاریخ سے آپ کو اس حقیقت پر یقین ہو جائے تو جان لیجئے کہ دل کی کالونی کو آزاد کرانے کے لئے اسی طرح کی معرکہ آرائی ناگزیر ہے۔ لیکن پھر سوال اٹھتا ہے کہ یہ معرکہ ہم کیسے لڑیں؟ اس کے لئے اسباب ووسائل کیسے فراہم کریں؟ اس کی وہ فوج کون سی ہوگی جس کو اکٹھا کرنا ہوگا؟ اور وہ ہتھیار کیا ہوں گے جن کی فراہمی ضروری ہے؟ یہ معاملہ اہم ہونے کے ساتھ حد درجہ وسیع بھی ہے اور محنت کرنا آسان بھی ہے۔ اس معرکہ کی فوج آدمی کے اندر ہوتی ہے اور وہ اس دل کے سپوت اور اس قلبی کالونی کے فرزند ہیں اور کیا دل کے جذبات وخواہشات کے سوا اس کے فرزند اور بھی ہیں؟

جب وطن پر دشمن کا قبضہ ہو جاتا ہے تو اس کی آزادی کی صرف ایک شکل باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ وطن کے فرزند اٹھ کھڑے ہوں اور پوری قوم ان کا ساتھ دے۔ لیکن جب ہر ایک اپنے انفرادی وذاتی کام میں لگ جاتا ہے تو ان کی طاقت منتشر ہو جاتی ہے، ان کا دبدبہ بجھ جاتا ہے اور ان کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور اس صورت میں دشمن کا انخلا نہیں ہو پاتا اِلّا آں کہ آسمان سے بے سان وگمان مدد مل جائے۔

یہی حال دل کا بھی ہے، جب دشمن اس پر قابض ہو جائے تو اس سے آزادی حاصل کرنے کی صرف ایک شکل رہ جاتی ہے وہ یہ کہ دل کے فرزند یعنی اس کی خواہشات وجذبات اٹھ کھڑے ہوں اور اس مقصد کے لئے فرزندوں کی پوری قوم متحد ہو جائے۔ لیکن اگر

ہر جذبہ اپنے ہی کام میں مست رہے اور ہر خیال اپنی ہی دُنیا میں مگن رہے تو شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور قلب کے ارادے تحلیل ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں آدمی باطل کی ضلالتوں اور اس کے اوہام و خرافات سے کبھی گلو خلاصی نہیں پا سکتا۔ یہ امر ضروری ہے کہ قلب کی فوج اکٹھا ہو اور اس کے مختلف ارادے ہوشیار ہو جائیں اور جذبات و احساسات کے ارادے متحد ہو جائیں۔ جس جذبے میں کوئی ارادہ اور کوئی اُمنگ نہ ہو وہ منتشر اور پراگندہ جذبہ ہے ہر رنگ میں رنگ جانے والا اور ہر بہاؤ میں بہہ جانے والا خیال ہے جو انسان کو منفی اور خمیدہ زندگی کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا۔ ارادی جذبات ہی متحرک جذبات ہوتے ہیں جو آدمی کے ظاہر و باطن میں ایجابی زندگی کا خون دوڑا دیتے ہیں، پیداوار کے میدان میں آدمی کی اہمیت اس کے ارادی اور متحرک جذبات کی وجہ سے ہی ہوتی ہے، اگر یہ متحرک جذبہ انسان کے اندر نہ پایا جائے تو وہ خالی خولی سایہ ہے پھر تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جذبات سے خالی انہی انسانوں کو ہم ندا دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کی طرف پلٹیں، اپنے دل کے خیالات کو کنٹرول کریں اور اپنے پراگندہ ارادے کو جمع کریں، جب ان میں سے کسی کا وجود اس کے ارادے میں جمع ہو جائے گا تو اسے یہ کہنے کا حق حاصل ہو جائے گا کہ فوجی معرکہ کے لئے تیار ہو چکا ہے اب بس ہتھیار کی کمی ہے۔

میرے بھائی! معرکے کا پہلا سامان یہ ہے کہ تم صاحب ارادہ بن جاؤ اور بلا ارادہ زندگی بسر کرنے سے دُور رہو اور یہ تمہارے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ اگر تم شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہو گے تو کیا سمجھتے ہو کہ اس کے لئے مال جمع کرنا پڑے گا؟ محنت و مشقت اُٹھانی پڑے گی؟ تمہیں صرف یہ کرنا ہو گا کہ اپنے جذبات کو مستحکم اور ٹھوس بنا دو، اپنے خیالات

کو مضبوط اور اٹل کر لو ایسا نہ ہو کہ وہ ہر بہاؤ کے ساتھ بہہ جائیں۔ تم اپنی مردانگی وجواں مردی یا اس مردانگی کی ذمہ داریوں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔

میرے بھائی! صاحب ارادہ بن جاؤ!

یہ ارادے جو قلب میں جمع ہیں اور معرکہ آرائی کے لئے تیار ہیں، ان کا ہتھیار کیا ہو سکتا ہے؟ کیا ان کا ہتھیار تلوار ہوگا؟ بندوقیں اور توپیں استعمال کی جائیں گی؟ جی ہاں، تلوار ان کا ہتھیار ہے لیکن وہ کون سی تلوار ہوگی؟ کیا تلوار لوہے کی ہوگی؟ نہیں یہ حق کی تلوار ہوگی۔ بندوقیں آگ نہیں برسائیں گی۔ بلکہ خدائی تعلیمات کی بوچھار کریں گی۔ توپیں بموں اور گولیوں سے نہیں حق کے دلائل سے باطل کے اوپر چلائی جائیں گی۔ حق وہ ہتھیار ہے جس سے ان فوجیوں کو مسلح ہونا ضروری ہے۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور ہتھیار سے یہ لیس ہوگئے تو حملے کی زد خود دل پر پڑے گی، غاصب وظالم کے ساتھ وطن عزیز بھی اس کی زد میں آئے گا جیسے غدار مجرموں کا کوئی ٹولہ ہو جو بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ مل کر اپنے ہی وطن کے باشندوں پر ظلم ڈھائے۔ اگر یہ ارادہ یا مختلف ارادے حق سے متصف نہ ہوں گے تو باطل انہیں اچک لے جائے گا اور جس مقصد کے لئے چاہے گا استعمال کرے گا۔ اس لئے ان فوجیوں کو حق کا توشہ جمع کرنا چاہیئے۔ حق ہی اُن کی ڈھال ہے اور بیک وقت ہتھیار بھی ہے۔ ان ارادوں کو اس سے مسلح ہونا چاہیئے۔ جو بیک وقت شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ہم اس توشہ کو جمع کریں؟ حق کا کلمہ ایک مبہم لفظ ہے جو واضح نہیں ہے پھر بھلا اس ہتھیار کو ان فوجیوں کے ہاتھوں میں ہم کیسے تھما سکتے ہیں؟

یکسوئی، فطرت کی طرف پلٹنے کا نام ہے

میرے بھائی! حق تو تمہارے پوشیدہ شعور کی تہوں میں موجود ہے۔ ہم تمہیں سائنس دانوں کی سائنس، فلاسفہ کے فلسفوں اور ان چیزوں کی طرف نہیں لوٹانا چاہتے جو تمہارے ذہنوں کو تھکا دیں بلکہ ہم تمہیں تمہاری اپنی فطرت کی طرف پلٹانا چاہتے ہیں۔ جو تمہارے وجود میں قرار پذیر ہے۔ فطرت ہی حق کی رصدگاہ اور اس کے تیروں کا ترکش ہے یہی تمہاری روشنی کا گھر بھی ہے اور آتش کدہ بھی، اس لئے ہر فوجی کو اس ترکش کو ضرور لینا چاہیئے اور ہر ارادہ کو ان تیروں سے مسلح رہنا چاہیئے۔ ارادہ کیا ہے؟ ایک مضبوط تانت، اگر اس سے حق کا تیر چلایا جائے تو فیصلہ کن لڑائی لڑی جا سکتی ہے۔

ان استعاروں اور کنایوں کے ذریعہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صاحبِ ارادہ انسان اپنی فطرت کی طرف رجوع کرے تاکہ زندگی کے حقائق کو وہ فطرت کی روشنی میں دیکھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہر چیز کا اسی فطرت کے ذریعہ مشاہدہ کرے۔ ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں لیکن ان کے تمام حقائق کا ادراک نہیں کر پاتے بلکہ کبھی کبھی تو حقائق کے علاوہ کچھ دیگر چیزیں دیکھ لیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم بس ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان پر بصیرت کی نگاہ نہیں ڈالتے، اگر ہر چیز کو ہم اسی بصیرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں تو تمام حقائق پر روشنی پڑے گی اور دل پر اوہام و باطل خرافات کی جو بدلیاں چھائی رہتی ہیں جو سب چھٹ جائیں گی۔

فطرت ہی وہ عینک یا اُس کا شیشہ ہے جس کے پیچھے سے اشیاء کی حقیقتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں جن میں کوئی التباس رہتا ہے نہ وہ مخفی رہ سکتی ہیں اور فطری نظر ہی

حق کا وہ تیر ہے جو چیزوں کے اندر نفوذ کر جاتا ہے، اور اپنی تیز دھار سے باطل کے ان تمام خوشنما غلافوں کو پھاڑ دیتا ہے جو چیزوں کے ظاہر یا دلوں کے ظاہر پر چڑھے ہوتے ہیں پھر یہ قلوب حقائق کو روشن کر دیتے ہیں اور روح وجوہر کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

میرے بھائی! صاحبِ ارادہ بنو، ارادوں کو مجتمع کرو، زندگی کے حقائق کو فطری نظر سے دیکھو اور جب کسی حقیقت کو پالو تو اس سے چمٹ جاؤ، اس کی ظاہری شکل وصورت سے شکست نہ کھاؤ۔ اسے اس امر کا موقع نہ دو کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ کھینچ لے یا اپنے سامنے تمہیں دوڑ دھوپ کرنے پر مجبور کر دے بلکہ اس حقیقت کے سامنے اپنے ارادہ کو مجتمع کر لو، اسے مضبوط ومستحکم بنا لو اور اس کے لئے اپنی فطرت کو حاضر رکھو یا یوں کہئے کہ اپنے حقیقی عینک کو آنکھوں سے لگائے رکھو اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس عینک کے ذریعہ چیزوں کا مطالعہ کرو پھر تو جھوٹے مناظر اپنے اوہام اور باطل خیالات کے ساتھ چھٹ جائیں گے اور اس شئی کی حقیقتیں تمہارے عقل وقلب کے سامنے ضوفشاں ہو جائیں گی۔

کتنے ہی مروجہ عیوب ہیں جن کی خرابی ظاہر نہیں ہوتی، کتنے ہی فاسد خیالات اور افکار ہیں جن کا فساد لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے، زندگی کے مظاہر ہیں کتنی بار دھوکہ دیتے ہیں اور ہم ان کے دھوکے میں آجاتے ہیں، کتنے ہی لوگ ہیں جو غلط پیمانوں اور اوزان سے چیزوں کو ناپتے ہیں اور ہم بھی ان کی تقلید کرتے ہیں، اسی طرح کی کتنی ہی چیزیں ہیں جن میں ہم غلطی کر جاتے ہیں، حالانکہ اگر ہم بصیرت کی نگاہ سے چیزوں کی طرف دیکھیں تو حق ہمارے سامنے نمایاں ہو جائے اور باطل کی دسیسہ کاریاں اور وسوسہ اندازیاں ناکام ہو جائیں۔

زندگی ایسے جھوٹے افسانوں اور باطل خرافات سے بھری ہوئی ہے جن کے سامنے

سارے انسان گھٹنے ٹیکے ہوئے ہیں، آپ خود ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، ان کی مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہاں میں ایک بدترین جھوٹ بلکہ سب سے بڑے باطل خیال کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے دلوں اور عقلوں پر زنگ لگانے والے بہت سے خیالات اور باطل اور خوشنما افکار جنم لیتے ہیں یہ بدترین جھوٹ اور سب سے بڑا باطل پوری انسانیت کے ذہنوں اور دماغوں پر چھایا ہوا ہے، سب اس کی ظاہری چمک دمک سے مسحور ہیں، اور ان کے خوشنما مظاہر سے ان کی آنکھیں خیرہ ہیں البتہ جنہیں اللہ نے توفیق دی ہے وہ اس سحر سے محفوظ ہے اور ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

عوام الناس کی اکثریت اس باطل وہم میں گرفتار ہے کہ زندگی نام ہے کھانے پینے کا اور عیش و تنعم میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کا۔ انسان کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ محنت کرے، دوڑ دھوپ کرے، مقابلہ آرائی کرے، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے، مال جمع کرے، زینت و آرائش کے اسباب سینت سینت کر رکھے، مفلسی سے بھاگنے اور دولت سے قریب ہونے کے لئے پوری محنت کرے اور جہاں تک ہو سکے "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"، پر عمل کرنے کی کوشش کرے اور اپنے آپ سے تمام غیر محبوب و غیر مرغوب چیزوں کو ہٹانے کی جدوجہد کرے۔

اس کی ذمہ داری بس اتنی ٹھہرتی ہے کہ وہ اس سرزمین پر اس لئے بھیجا گیا ہے کہ کھائے پیے، نسل کی افزائش کرے اور پھر مر جائے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کا شکار ہو جائے۔ یہ ہے وہ باطل وہم جس نے پوری سرزمین پر اپنی طنابیں گاڑ دی ہیں، لوگ اس کی ظاہری چمک دمک سے فریب خوردہ ہیں اور غفلت و سرمستی میں سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں پیچھے والا آگے کی پیروی کر رہا ہے اور خلف سلف کی تقلید کر رہے ہیں جیسے

چوپایوں کا کوئی ریوڑ ہو جو بغیر کسی مقصد و منزل کے جنگل میں بھٹک رہا ہو۔ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ زندگی جو ہمیں ملی ہوئی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور ہم یہاں کس لئے آئے ہیں؟ اور ہمارا انجام کیا ہوگا؟ بلکہ رحم مادر سے نکلتے ہیں اور قبروں میں جا سوتے ہیں اور پوری عمر شکم سیر ہونے میں کھپا دیتے ہیں اس کے علاوہ ان کی زندگی کی کوئی حکمت ہے نہ غایت۔ یہ ہے ان کا فلسفۂ زیست، تو کیا یہ درست ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ اللہ نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم کھائیں، پئیں، نسل کی افزائش کریں اور مر جائیں؟ کیا آپ کی فطرت یا عقل یہ ماننے کے لئے تیار ہے کہ اس سطحی اور عبث مقصد کو اللہ نے اپنے سامنے رکھا ہے اور اس کی خاطر اس نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے؟ اسی کے اہتمام میں اس نے یہ عظیم الشان کائنات، یہ محکم نظام اور یہ معجز نما آیات و مشاہدات تخلیق کی ہیں؟ کیا کھانے پینے کی ذمہ داری کو نبھانے کے لئے یہ کافی نہ تھا کہ اس باشعور، صاحب فکر، عبادت گزار اور فرماں بردار مخلوق کو "احسن تقویم" کے سوا کسی اور ساخت پر پیدا کرتا؟ کیا اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ کافی نہ تھا کہ وہ اس شاندار اور معجز نما کائنات کے بجائے ایک ایسا عالم پیدا کرتا جو پژمردہ اور کمزور ہوتا اور اس مقصد کی پژمردگی اور سطحیت کے موافق ہوتا؟ کیا یہ نعوذ باللہ اللہ کی طرف سے بھول تھی؟ یا کیا بات تھی؟ یہ لوگ کیا جواب رکھتے ہیں؟ پھر انسان کی تخلیق کیا صرف اس لئے ہوئی ہے کہ وہ کھائے اور پیئے؟ کیا زمین کی پاکیزہ چیزیں اس پر گراں گزر رہی تھیں کہ اس نے اس مخلوق کو پیدا کر دیا تاکہ ان سے بھرپور استفادہ کرے؟ یا نعوذ باللہ اسے ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کا خبط تھا کہ اس نے پوری کائنات لہو و لعب کے لئے پیدا کر دی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھاتے ہیں اور ان غلط کار لوگوں کی خرافات کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اللہ کی ذات ان

اوہام سے بہت پرے ہے اس کی حکمت وعظمت سے یہ بہت بعید ہے کہ ایک مکھی کو بھی اس سطحی مقصد کے لئے پیدا کرے چہ جائیکہ یہ عظیم کائنات!

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝

(انبیاء: ۱۶ تا ۱۸)

(ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے، مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لئے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔)

اگر آپ فطری مشاہدہ اور عقلی تدبیر کی مثال چاہتے ہیں تو اس قسم کے رنگ برنگ سوال اُبھر سکتے ہیں۔ اور آپ نے دیکھ لیا کہ اس حقیقت کا ادراک کتنا آسان ہے اس میں کوئی زحمت یا پریشانی نہیں ہے اس لئے کہ یہ آپ کے قلب اور عقل سے تعلق رکھتا اور اس کا فیضان وہیں سے ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ آپ کی فطرت کی منطق سے اُبل رہا ہے جو خطا نہیں کرتی۔ اور اگر آپ حق کے کسی معنی کی مثال چاہتے ہیں تو یقین رکھئے کہ حق نہایت سہل ہے اس کے ادراک کے لئے ذہنوں کو حیران ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضبوط و مستحکم شعور جو آپ کے دل میں پیدا ہوا اور جس نے دنیائے دوں

کی بے وقعتی کو آپ کے سامنے رکھا، یہی عین حق ہے، اس کے علاوہ حق کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے۔ حق ایسے نظریات سے متعلق نہیں ہے جو کتابوں میں پڑھے جائیں، مدارس اور کالجز میں اساتذہ ان کی تعلیم دیں اور ان کے ذریعہ کوئی قوم دوسری قوموں سے ممتاز ہو جائے بلکہ یہ وہی شعور ہے جو قلب میں اس وقت اُجاگر ہوتا ہے جب آدمی چیزوں کی طرف اپنے معدہ اور شہوت کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے فطرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

میرے بھائی! یہ چند ثابت شدہ حقائق ہیں جن کے اندر باطل کسی طرح نفوذ نہیں کر سکتا، نہ آگے سے ان میں دراندازی کر سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ ہمیں ان کی ہدایت صرف اس لئے مل سکی ہے کہ ہمارے دل باطل اوہام وخرافات سے پاک ہیں اور ان میں حق کی روشنی جگمگا رہی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ فطرت سلیم کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے ہمیں یہ حقائق ہاتھ لگے ہیں۔ اگر آدمی یہ قلبی طہارت حاصل کرلے اور حق کی تاباں روشنی میں زندگی گزارے تو اسے ہر چیز میں حق کا جلوہ نظر آئے گا اور اس کو ایسا احساس ہوگا کہ اس کے اوپر ہر وجود کے درمیان سے رُوح کا نزول ہو رہا ہے پھر اس کو ایک نئی زندگی نصیب ہوگی، ایک نئی بیداری اس کی فکر وعمل کو متحرک کردے گی اور علوم ومعارف کا ایک نیا خزانہ اس کے ہاتھ آئے گا۔

اربابِ اقتدار کی طہارتِ نفس کی چند مثالیں

میرے بھائی! یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ قلب کی طہارت اور پاکیزگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی جائز وسائل وذرائع سے بھی جاہ ومنصب اور مال ودولت کے

حصول سے باز آجائے، بلکہ یہاں وہ مفہوم مراد ہے جو ہم نے زہد کے بارے میں لکھا ہے۔

اللہ کے برگزیدہ پیغمبر سلیمان علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے رب سے ایسی حکومت مانگی جو ان کے بعد کسی کو عطا نہ ہو، اور اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور انہیں وہ اقتدار عطا کی جس کے بعض پہلوؤں پر ہم پیچھے گفتگو کر آئے ہیں۔ تو کیا آپ کی حکومت واقتدار کی دعا شہوت کی بنیاد پر تھی؟ کیا آپ نے جاہ ومنصب کی اس خواہش کا اظہار اس لئے کیا تھا کہ انہیں اس سے ذاتی طور پر کوئی لگاؤ تھا؟ کیا آپ نے اقتدار ملنے کے بعد اس میں غلط کار حکمرانوں کی طرح کوئی تصرف کیا؟ نہیں، انہوں نے اپنی ضرورت یا خواہش کے لئے اللہ سے دعا نہیں مانگی تھی۔ انہوں نے حکومت کو اس لئے طلب کیا تھا تاکہ اسے اللہ کی مرضی کے مطابق چلا سکیں اور اس میں اللہ کے مطلوبہ احکام نافذ کرسکیں۔ جنات خداوند تعالیٰ کی توفیق سے آپ کے لئے کام کرتے تھے ہوائے نفس یا ذاتی انانیت کے محرک کا وہاں کوئی دخل نہ تھا۔

لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے چڑیاں آپ کی خدمت پر مامور تھیں، لیکن یہ چڑیاں خیر وہدایت کا ذریعہ تھیں، کسی کے خلاف جاسوسی کے لئے نہیں بلکہ کفر وضلالت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کی گئی تھیں۔ آپ بادشاہوں سے جو مراسلت کرتے تھے، اپنے ذاتی مفاد کے لئے یا نجی مرغوبات کے لئے نہیں بلکہ حق کی دعوت وتبلیغ کے لئے کرتے تھے جس کی شہادت خود قرآن میں موجود ہے:

إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝
أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ۝ (نمل: ۳۰، ۳۱)

(وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا

ہے۔ مضمون یہ ہے کہ " میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔)

آپ کے پاس وہ فوج تھی جس کا کوئی فوج اس روئے زمین پر مقابلہ نہ کر سکتی تھی لیکن کیا اس قوت و طاقت نے آپ کو غرور میں مبتلا کر دیا اور آپ نے اسے لوگوں کو ذلیل کرنے میں لگا دیا یا حق کی تائید و تقویت اور ایمان و اسلام کی تبلیغ میں صرف کیا؟ اور کیا ملکۂ سبا پر فوجوں سے چڑھائی کرنے کی دھمکی دینے کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ تھی کہ اس کا موقف دھوکہ دینے والوں اور بھاؤ تاؤ کرنے والوں سے مختلف نہ تھا؟

یہی وجہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اقتدار طلب کیا لیکن آپ کی رغبت آپ کا قلبی شوق اور اس سلسلے میں آپ کے جذبات و احساسات سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ماتحت تھے اور نیک بندوں کے مقامِ بلند کے مشتاق تھے۔ اس کی دلیل آپ اس دُعا اور گریہ وزاری میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں جو انہوں نے اپنے رب سے کی:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ۝ (نمل : ۱۹)

(اے میرے رب، مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اُس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔)

یہ ایک مثال ہے جو عالم واقعہ میں رونما ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ نے اس مثال کو

اس لئے بیان کیا ہے تاکہ زہد کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آجائے اور لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ ایک نیک انسان کس طرح کا بادشاہ ہوتا ہے، وہ جاہ و منصب اور مال و دولت کے فتنوں سے گھرا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اعلیٰ وارفع مقصد کی طرف اس کی نگاہیں اُٹھی ہوئی ہیں وہ مال وجاہ اور اقتدار و قوت کی جملہ ملکیتوں کو حق کی تائید اور خدا کی رضا کے حصول کے لئے صرف کرتا ہے۔

میرے بھائی! ہم آپ کو خرافات کی طرف دعوت نہیں دیتے اور دین زندگی کے حقائق سے پیچھے رہنے کا نام نہیں ہے۔ ہلاکت ہے اس شخص کے لئے، جو خواہش نفس کی اتباع میں بھٹک جائے اور شہوات کا غلام ہوجائے۔

ہم مال و دولت چاہتے ہیں، ہم اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں لیکن ہماری چاہت اور دوسروں کی چاہت میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے لوگ فخر جتانے، دولت و ثروت جمع کرنے اور برتری قائم کرنے کے لئے ان چیزوں کو حاصل کرتے ہیں اور ہم اس سرزمین کو منکرات سے پاک کرنے اور حق کے نقوش قائم کرنے کے لئے حکومت پر قابض ہونا اور دولت وثروت کو اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔

یوسفؑ کی مثال

اور یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ اللہ سے نہیں، جیساکہ سلیمانؑ نے کہا تھا، بلکہ بادشاہِ مصر سے منصب رفیع طلب کرتے ہیں اور اس میں کوئی نقص بھی نہیں ہے جو یوسفؑ کی ذات پر چسپاں ہوتا ہو اس لئے کہ ہر موقع و محل کے لئے الگ الگ گفتگو ہوتی ہے اور ہر ماحول اور حالات کے الگ

احکام اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہاں حالات اور ماحول کا تقاضا یہی تھا کہ آپ بادشاہِ مصر سے اقتدار طلب کرتے تاکہ اللہ کی مرضی کے مطابق اسے اہلِ مصر کے لئے خوشحالی اور فارغ البالی مہیا کرنے کے لئے استعمال کرتے ـــــ یوسفؑ اللہ سے گڑگڑاتے ہوئے کہتے ہیں:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ (یوسف: ۱۰۱)

(اے میرے رب، تونے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچانا سکھایا۔)

یہ ایک جھلک ہے یوسفؑ کی دُعا کی، جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام بلند حقائق کا ادراک کس درجہ حُسن وخوبی کے ساتھ کرتے تھے اور یہ کہ ان حالات میں کسی بشر سے اقتدار طلب کرنا، اللہ سے حکومت طلب کرنے سے کم رتبہ کا حامل نہ تھا۔ پیچھے ہم بتا چکے ہیں کہ تمام جائز ذرائع و وسائل کے ذریعہ مال وجاہ کی طلب کرنا واجب ہے بشرطیکہ یہ طلب اور چاہت صرف اللہ کے لئے ہو، کسی اور مفاد کے لئے نہ ہو، جس کی مثال ہم ان دونوں نبیوں کی زندگی میں دیکھتے ہیں یوسف علیہ السلام بادشاہِ مصر سے یوں مطالبہ کرتے ہیں:

اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝

(یوسف: ۵۵)

(ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔)

کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اقتدار کی اس طلب میں آپؑ نے اس گندے طریقۂ کار کا استعمال کیا ہے جو ہر کمزور و مظلوم اور غلام قوم برتری اور غرور کی شہوت کے لئے استعمال کرتی ہے؟ یہاں آپ دیکھیں گے کہ طلب میں کامل درجہ کی خود اعتمادی، غیرت و خودداری اور عزّت و طاقت کارفرما ہے، یہاں اپنے لئے نہیں بلکہ غیروں کے مفاد کے لئے حکومت طلب کی جارہی ہے اور اس شخص کی غیرت و طاقت بول رہی ہے جو فرض کی ادائیگی کے لئے آگے بڑھ رہا ہے اور نازل ہونے والے ایک خطرے سے پورے ملک کو بچانا چاہتا ہے۔ یہاں اس عزّت و غیرت کی رُوح امر کے صیغہ سے بھی جھلک رہی ہے جو آپؑ نے ایسے موقعہ پر استعمال کیا ہے یعنی ”ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے“، جبکہ سلیمانؑ اقتدار کی طلب میں اللہ کے سامنے غایت درجے کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں:

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي

(صٓ: ۳۵)

(اے میرے رب، مجھے معاف کردے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو۔)

ہمارے لئے یوسفؑ کے اس قصّے میں اس بات کا درس بھی ملتا ہے کہ کس طرح ہم مناصب اور وظائف کا مطالبہ کریں۔ عزّت و غیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناصب کو طلب کریں، ذلّت کے ساتھ نہیں، فرض کی ادائیگی اور خلا کو پُر کرنے کے لئے ہماری طلب ہو، عوامی ملکیت میں فضول خرچی کرنے اور محض جاہ و منصب پر قبضہ کرنے کے لئے نہ ہو، اور ہماری یہ طلب صلاحیت اور صالحیت کی بنیاد پر ہو، رشوت اور سفارشات کی بنیاد پر نہ ہو۔

دیکھتے نہیں یوسف علیہ السلام اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو سامنے رکھتے ہیں :

اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝

(یوسف : ۵۵)

(ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں ۔)

تو کیا ہمارے نوجوان اور ہمارے حکام اس قصہ سے درس عبرت لیں گے ؟

اور یوسفؑ نے اقتدار حاصل کرلیا اور اللہ نے آپ کے ذریعہ لوگوں کی سختی و پریشانی دُور کردی اور غم و تکلیف کے بادل چھانٹ دیئے ۔ چنانچہ مصر قحط کے سخت ایام میں بھوک و پیاس کے مارے عوام کی پناہ گاہ تھا لیکن جاہ و منصب کے فتنہ نے آپ کو اپنے رب سے غافل نہ کیا اور خوش حالی و فارغ البالی نے آپ کے قلب میں بسیرا نہ کیا چنانچہ آپ کی بصیرت خدائے ذوالجلال کے مقام بلند پر لگی رہی اور سلیمانؑ کی طرح یہ بھی اپنے رب سے برابر مناجات کرتے رہے :

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝

(یوسف : ۱۰۱)

(اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا ۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دُنیا اور آخرت میں میرا سرپرست

ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجامِ کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔)

رسول اکرمؐ کی مثال

رسول اکرمؐ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ جزیرہ عرب کی دولت آپ کے قدموں میں آکر ڈھیر ہو جاتی ہے، مالِ غنیمت کا سلسلہ جاری رہتا ہے فدک اور دوسرے علاقے آپ کے لئے خاص کر دیے جاتے ہیں لیکن آپ کی حالت کیا ہوتی ہے؟ آپ فوراً نیکی و تقویٰ اور مفاداتِ عامہ کے راستے میں اسے لٹا دیتے ہیں بلکہ بسا اوقات بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھنے پڑتے ہیں، لیکن آپ کی یہ بھوک افلاس اور فقر کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ بے نیازی اور زہد کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن مسلسل شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا اگر ہم چاہتے تو شکم سیر ہو جاتے لیکن آپ نے ایثارِ نفس سے کام لیا۔"

حضور اکرمؐ نے ایک بار جبل اُحد کو دیکھا تو اپنے اس طریقہ کار کی وضاحت اس طرح کی:

"کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ احد پہاڑ کے برابر میرے پاس سونا ہو اور اس پر تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس اس میں سے ایک دینار بچ جائے ہاں قرض چکانے کے لئے البتہ کچھ بچ جاتا، میں اسے اللہ کے بندوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیتا۔"

پھر آپؐ آگے بڑھے اور فرمایا:

"آج جن لوگوں کے پاس مال و دولت کی کثرت ہے، وہ قیامت کے روز قلت

کار دنا رو دیں گے مگر جس نے اپنی دولت ادھر اُدھر تقسیم کر دی ۔

یہ تاریخ کے واقعات ہیں جو عالم ظہور میں آچکے ہیں اور ہمارے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ قلب کے متاعِ دنیا سے خالی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے حصول سے باز رہا جائے اور جائز وسائل کے ذریعہ بھی اس کے لئے جدّوجہد نہ کی جائے ۔ قلب کی طہارت اور نفس کا زہد آدمی کے اندر اللہ کے لئے ضروریات وخواہشات پیدا کرتا ہے اور انہی ضروریات وخواہشات کی تکمیل کے لئے وہ جدّوجہد کرتا اور دوڑ دھوپ میں لگتا ہے اور ان جذبات وعزائم کا اظہار کرتا ہے جو اہلِ ہوس اور شہوت پرست کے عزائم سے کم نہیں ہوتے ۔

یہ واقعات اور مثالیں ہمارے سامنے مال ودولت اور جاہ ومنصب کی اہمیت بھی واضح کرتی ہیں ۔ انسان ان چیزوں کو اپنے بدن کی ضروریات کے لئے استعمال کرتا ہے اور مندرجہ ذیل مقاصد میں سے کسی ایک مقصد یا دونوں ہی مقاصد کی راہ میں انہیں لگا دیتا ہے :

۱ — لوگوں کی مصیبتوں اور ان کی پریشانیوں کو دُور کرتا ہے اور ان کے مسائل حل کرتا اور ان کے مفادات کے حصول کے لئے جدّوجہد کرتا ہے ۔

۲ — حق کے پاس مادی قوت بھی ہونی چاہیئے جس سے اس کی حفاظت ونگہداشت بھی ہو سکے اور مادی قوت میں مال ودولت ، ہتھیار اور تربیت یافتہ فوجیں سبھی شامل ہیں ۔ آدمی کو زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنا چاہیئے تاکہ حق کے لئے اسے استعمال کر سکے اور اس مال کی بڑھوتری کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ جدّوجہد کرنی چاہیئے اور شر کی طاقتوں اور برائی کی علمبردار فوجوں سے اُسے

چھین لینے کی کوشش ہونی چاہیئے اور اس کے لئے علم، تدبیر اور وسائل و ذرائع سب کچھ کام میں لانے چاہئیں اس لئے کہ نیک آدمی کے ہاتھوں میں پاک مال کی جو افادیت ہے جو اظہر من الشمس ہے۔ اگر جمع شدہ مال پر خوشی منانے کا جواز ہو تو اسے خوش بھی ہونا چاہیئے، لیکن یہ خوشی اپنے لئے نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس وجہ سے ہونی چاہیئے کہ اس نے حق کی نصرت اور مدد کے وسائل جمع کئے ہیں اور یہ انبیاء کا طریقہ کار رہا ہے اور انہوں نے زندگی کے حقائق اور اشیاء کی طبیعت کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔

معاشرتی روحانیت کی صفات

ہم نے اس قدر تفصیل محض توضیح و تشریح کے لئے کی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہر باطل خیال سے آپ کا الگ رہنا، حق کی طرف آپ کی رہنمائی کرے گا۔ آپ جب باطل اوہام و خرافات سے پاک ہوں گے تو حق کی کرن اپنے قلب میں ضوفشاں محسوس کریں گے اور دن بدن آپ کا شعور مضبوط و مستحکم ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ حق کے سوا کسی اور چیز کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ ایسا معلوم ہونے لگے گا کہ آپ گوشت پوست کے نہیں بلکہ شعور مستحکم کی وحدت ہیں جس میں صرف حق جلوہ گر ہے۔

جب انسان کے اندر یہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو اس کے اندر وہ معاشرتی روحانیت جاگزیں ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ دونوں زندگی بسر کرتا ہے اور دونوں ہی دنیاؤں میں اس کی پرواز رہتی ہے۔ جسم اس کا زمین پر ہوتا ہے لیکن حقیقت آسمان پر رہتی ہے۔ اعضاء و جوارح اہل دنیا کی طرح کام کرتے ہیں لیکن روحانی صلاحیتیں عارفین حق کی طرح

کسی اور ہی مقصد کے لئے وقف ہوتی ہیں۔ لوگوں کے درمیان رہتا بستا ہے لیکن ملأ اعلیٰ کی سیر بھی کر آتا ہے، کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسری تجارت میں مشغول رہتا ہے، کھیت میں، کارخانے میں، سڑک پر یا مسجد میں دیگر افراد کی طرح حرکت کرتا ہے لیکن اس کے اور دوسرے افراد کے درمیان بڑا فرق رہتا ہے، ایک شخص اس سرزمین پر جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اسی زمین کی طرف پلٹ آتا ہے، لیکن دوسرا عمل جس میں رضائے الٰہی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ بلند کرتا اور مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند کرتا ہے:

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ۝ (فاطر: ۱۰)

(اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور عمل صالح اُس کو اوپر چڑھاتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو بے ہودہ چالبازیاں کرتے ہیں، ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے

روحانیت اور ذکرِ الٰہی

میرے بھائی! آغاز سے لے کر اختتام تک ان تمام چیزوں کا انحصار ہمہ وقت ذکرِ الٰہی پر ہے۔ ذکر کی حیثیت دل کے لئے ایسی ہی ہے جیسے آکسیجن بدن کے لئے۔ اگر یہ ماننے کے لئے آپ تیار ہیں کہ بغیر آکسیجن کے انسان زندہ رہ سکتا ہے تو آپ یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ قلوب ذکرِ الٰہی کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ :

"ذکرِ الٰہی انسان کی زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا پانی مچھلی کے لئے۔ ذرا سوچئے تو سہی مچھلی پانی سے دُور رہ کر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔"

یہ اہلِ حقیقت کا قول ہے مجازی یا خیالی دُنیا میں رہنے والے کسی فرد کا نہیں۔

زندگی ایک راز ہے اور جسم میں اس کا مظہر حرکت ہے لیکن رُوح میں اس کا مظہر معرفت الٰہی کی مسلسل آمد اور ہمہ وقت بیداری ہے۔ جسم اس وقت تک حرکت سے باز نہیں آسکتا جب تک اس میں زندگی موجود ہے، یہاں تک کہ انسان سو جاتا ہے لیکن اس کے پھیپھڑے دھڑکتے رہتے ہیں اور اس کے بعض اعضاء حرکت و عمل سے غافل نہیں ہوتے۔ اگر حرکت رُک جائے تو یہ اس کی موت کی نشانی ہے۔

یہی معاملہ دل کا بھی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ رُوحانی بیداری سے غافل نہ ہو یہاں تک کہ جب انسان نیند کی حالت میں ہو تو بھی رُوح کو بیدار اور ہوشیار رہنا چاہیئے۔ یہی مفہوم ہے رسولِ اکرمؐ کی اس صفت کا کہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن آپ کا قلب بیدار رہتا تھا۔ اور اس حقیقت کی تفسیر بھی یہی ہے کہ نیک دل خواب صبح کی سپیدی کی طرح روشن ہوتے ہیں جو نبوت کا چوالیسواں حصہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغامات بھیجتا ہے اور دل بیدار اس کا احساس کر کے اسے اخذ کر لیتا ہے جیسے وائرلیس سیٹ ایتھر کے سگنل کو اخذ کر لیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قلب کی بیداری رُوحانی زندگی کی حرکت و عمل کا مظہر ہے چنانچہ اگر دل بیداری سے باز آجائے، اس کی روشنی ماند پڑ جائے اور اس کے اندر تاریکی پھیل جائے تو یہ اس کی موت کی نشانی ہوگی جیسا کہ جسم کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے ذکرِ الٰہی ہر وقت اور ہر حال میں ہمارے لئے ضروری ہے تاکہ ہمارے قلوب پر زندگی کی تقویت و

تائید کا سلسلہ جاری رہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ذکرِ الٰہی سے زیادہ آسان اور شیریں ہمارے لئے کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اگرچہ نماز بعض لوگوں پر گراں گزرتی ہے اور وضو کی ٹھنڈک لوگوں کے لئے باعث حرج بن جاتی ہے، صدقہ نکالنا بعض انسانوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اور زہد انسان پر بار بن جاتا ہے اور جنت کا راستہ بڑا دشوار گزار ہے لیکن یاد رکھئے کہ ہمہ وقت اور ہر حال میں ذکرِ الٰہی انسان پر ایسے اسرار و رموز کے دروازے کھولتی اور ایسے انوار کی بارش کرتی ہے کہ اس سے تمام مشقتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے رسولؐ کا فرمان ہے:

"جس شخص پر راتوں کا قیام گراں گزرے، مال میں خرچ کرنا جس کے لئے مشکل معلوم ہو، میدان جہاد میں دشمن سے مقابلہ کرنے میں بزدلی دکھاتا ہے تو اسے چاہیئے کہ اللہ عزّ و جلّ کا ذکر کرے۔"

بلکہ جب یہ سارے اعمال تمہارے لئے آسان ہو جائیں گے تو بہت جلد وہ آپ کی ضروریات میں شامل ہو جائیں گے جن کی تکمیل کی آپ کو خواہش ہوگی اور جن پر آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ رسول اکرم جب نماز کا انتظار کرتے تو آپ کا شوق و ذوق بڑھ جاتا اور حضرت بلالؓ سے کہتے: "اے بلال، نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ۔" اس کے بالکل برعکس پیٹ کے بندوں کا طریقہ کار ہوتا ہے جب انہیں بھوک ستاتی ہے اور لذت و شہوت کی پیاس بڑھ جاتی ہے تو اپنے نوکروں اور اہل کاروں کو چیخ کر حکم دیتے ہیں کہ "ہمیں کھانے کے ذریعہ راحت پہنچاؤ۔" کتنی بلند مثال ہے اللہ اور اس کے رسول کے لئے!

راہِ حق کی اس سہولت کو سامنے رکھتے ہوئے رسول اکرم ص نے فرمایا ہے کہ:

"جنت تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

لیکن دوسری طرف ذکر الٰہی میں کوتاہی کرنے والوں کے لئے کہتے ہیں کہ:

"جنت کا راستہ بڑی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔"

ان دونوں حدیثوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ پہلی حدیث ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان کی لذت پا چکے ہیں اور ذکر الٰہی کی حلاوت کا مزہ چکھ چکے ہیں لیکن دوسری حدیث ان لوگوں کے لئے ہے جو ذکرِ الٰہی میں کوتاہی کرتے ہیں اور ایمان و اسلام کے راستے سے منہ موڑتے رہتے ہیں۔

ہر حال میں ذکرِ الٰہی کا مفہوم

ذکر و فکر کرنے والوں کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اسوۂ حسنہ ہے اس لئے آپؐ کی سیرت کو اُسوۂ بنایئے اور ہر حال میں ذکر کا مفہوم سمجھنے کے لئے آپؐ ہی کو بلند اور اعلیٰ مثال تصور کیجیے۔ حضورِ اکرمؐ ذکر کرتے تھے جب آپ کھانا کھانے بیٹھتے تھے اور جب آپ کھانے سے فارغ ہوتے تو بھی ذکر کرتے، پانی پینا شروع کرتے تو ذکر کرتے اور ختم کر چکتے تو ذکر پر ختم کرتے۔ جب کپڑے پہنتے یا اتارتے، گھر میں داخل ہوتے یا گھر سے نکلتے تو ذکر کرتے سونے کے لئے جاتے یا سو کر بیدار ہوتے تو آپ کی زبان ذکر الٰہی سے تر ہوتی بلکہ آپ رات میں کروٹ لیتے تو آپ کی زبانِ مبارک پر خدا ہی کا نام ہوتا، سفر کے لئے نکلتے یا سفر سے واپس ہوتے، یا سواری پر سوار ہوتے یا کسی بستی میں داخل ہوتے تو ہر حال میں ذکر کرتے، نیا کپڑا پہنتے یا بازار میں داخل، ہر وقت اللہ کا نام آپ کی زبان پر ہوتا، نیند سے

چونک پڑتے یا بے خوابی کی حالت میں ہوتے، رزق کی جدّ و جہد میں ہوتے یا کسی خوش کُن نعمت کو یاد کرتے، کسی مصیبت، تنگی یا قرض کو ادا کرنا چاہتے، قبروں کی زیارت کرتے یا پانی کے لئے دُعا کرتے، طوفانی ہوا چلتی، کڑکا ہوتا، یا بارش ہوتی اور سیلاب آجاتا یا نیا چاند دیکھتے ان تمام حالات میں آپ کا قلب بیدار رہتا اور ذکر کے صیغے آپ کی زبان پر جاری رہتے۔

رسول اکرمؐ کے نفس میں ذکر کا حلول

ہم یہاں رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تمام احوال کا احاطہ نہیں کرسکتے کہ ان کا استقصار محال ہے، راویوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ روایت کی ہے وہ تمام احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہے اور ہر حال میں آپ نے ذکرِ الٰہی کے جو صیغے استعمال کئے ہیں وہ سب احادیث میں وارد ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آپ کو رسولِ اکرمؐ کے ذکر اور عمل کی تمام صورتیں نظر آجائیں گی۔

اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم عبودیت کے مفہوم کا شدید احساس رکھتے تھے ایک لمحہ کے لئے یہ حقیقت آپ کے قلب و ذہن سے غائب نہ ہوتی تھی کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہیں، اپنے آقا کی ملکیت میں اسی کی سرزمین کے اوپر اور اسی کے آسمان کے نیچے کام کر رہے ہیں اور اسی کے بلند و برتر نام پر کر رہے ہیں کسی اور کے نام سے آپ کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ حقیقت آپ کے عقل و قلب سے ایک سکنڈ کے لئے محو نہ ہوتی تھی۔ وہ ایک خدا ترس بندے تھے اپنا اعزاز عبودیت ہی کو سمجھتے تھے اور آپ کی زندگی آپ کے مولیٰ کی یاد میں بسر ہوتی تھی، اس کے اقتدار میں ذرہ برابر کوئی

شریک نہیں، ان تمام حقوق کو آپ اچھی طرح نبھاتے تھے ان سے ذرہ برابر انحراف یا ان کی ادائیگی میں ادنیٰ کوتاہی کو ہلاکت خیز تصور کرتے تھے۔ آپ اپنی ذمہ داری کا احساس کرکے رو پڑتے اور کہتے: "مجھے جو پیغام لے کر بھیجا گیا ہے وہ تلوار کی دھار کی طرح تیز ہے اگر میں نے اس سے کبھی اختیار کی تو ہلاک ہو جاؤں گا" اللہ تعالیٰ سے آپ یوں دُعا کرتے: "اے اللہ تو مجھے پل بھر کے لئے بلکہ اس سے بھی کم مدت کے لئے میرے نفس کے حوالہ نہ کر۔"

رسول کے طریقہ کی پیروی

کِس کے بس میں ہے کہ وہ ذکر و فکر میں رسول اکرمؐ کی برابری کر سکے؟ البتہ ہر شخص آپ کی زندگی کو اپنا اُسوہ بنا سکتا ہے، آپ کے نقشِ قدم پر چل سکتا ہے اور آپ کی پیروی کر سکتا ہے اور اس کے لئے اسے بہت زیادہ محنت و مشقت اور جدّ و جہد کرنے کی ضرورت نہیں نہ اسے نفسیاتی سعی و جہد میں لگنے کی حاجت ہے۔ بس اسے صرف یہ کرنا ہے کہ اسے اللہ کی معیت میں رہنے کی خواہش اور دلچسپی ہو اور اپنے قلب کو اس کے سامنے حاضر رکھے اور عبودیت و عبدیت میں بہترین نمائندگی کرے یہاں تک کہ پوری کائنات اسے زندہ و مستحکم اور خدا کے جمال و جلال کا پرتو نظر آنے لگے اور اپنے آپ کو خدا پرست بندہ سمجھنے لگے جسے حکم وامر میں کوئی اختیار نہ ہو۔ پانی کا ایک قطرہ، جسے وہ حلق سے نیچے اتارے، اسے خدا کی نعمت و فضل کی یاد دلائے، کھانے کا ایک لقمہ، جس سے وہ اپنی بھوک مٹائے، اسے مخاطب کر کے کہے کہ جو کچھ تم کھا رہے ہو اس میں تمہاری طاقت اور قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہوا، جسے وہ دیکھتا ہے، اسے چیخ چیخ کر یہ

پیغام دے کہ خدائے ذوالجلال کا زبردست ہاتھ مجھے چلا رہا ہے۔ اس کا وجدان ہر چیز سے اسی طرح متاثر ہو اور ہر چیز اس کے وجدان پر اسی طرح اثر ڈالے، ہر حال میں اسے کوئی خاص پیغام ملے اور خدا پرستی کا متعین مفہوم اسے اپنی طرف کھینچے۔ یا یوں کہئے کہ ہر حال میں ذکر کا خاص صیغہ اس کے قلب و ذہن پر طاری رہے جو اللہ کی ہمہ وقت موجودگی کے تصور سے وجود میں آئے۔ اور ذکر کے بہترین صیغے اور الفاظ وہ ہیں جو رسولِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے منقول ہیں۔ اس لئے کہ آپ کا قلب مُبارک ذکر کرنے والے تمام قلوب میں بہتر تھا اور اللہ کی نشانیاں اور اس کی نعمتیں اس میں سب سے زیادہ اپنے نقوش ثبت کرتی تھیں اور حمد و ثنا کے بہترین صیغے آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوتے تھے۔ اور ان صیغوں کی سچائی اور بہتری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حالات اور مواقع سے سب سے زیادہ مطابق ہوتے تھے۔

جب آدمی کوئی نیا کپڑا پہنے — اور نئے کپڑے میں لذّت اور فتنہ و غرور کا عنصر کافی ہوتا ہے تو ایسے موقعہ پر خدا ترس بندے کا موقف یہ ہے کہ وہ کہے "شکر ہے اللہ کا جس نے میری طاقت و قوت کے بغیر مجھے کپڑا پہنایا۔" اور جب آپ کسی مسافر کو الوداع کہیں — اور مسافر دو قسم کے زادِ راہ اکٹھا کر لیتا ہے، ایک تو کھانے یا رقوم کا توشہ، دوسرے مقصد کی کامیابی کی توقع اور امید کا توشہ — تو ایسے موقع پر آپ کا قلب یوں ذکر کرے: "اللہ تجھے تقویٰ کا توشہ دے اور تو جہاں کہیں ہو تجھے خیر سے ہمکنار کرے۔" اور جب آپ ایسے لوگوں سے ملیں جنہیں آپ محض خدا کے لئے ناپسند کرتے ہیں یا کسی خطرناک بادشاہ کے دربار میں داخل ہوں تو اللہ کے علاوہ آپ کا سہارا اور کون ہو سکتا ہے؟ ایسے موقعہ پر آپ یہ دُعا کریں: "اے اللہ ہم تجھی کو ان کے مقابلہ میں اپنا سہارا بناتے ہیں اور ان کے شر سے تیرے ہی واسطہ سے پناہ مانگتے ہیں۔" اور جب آپ بازار میں داخل ہوں،

جوایک چھوٹی موٹی دُنیا ہوتی ہے جہاں دُنیا کے لہو ولعب، اس کی زینت و آرائش کے سارے
سامان موجود ہوتے ہیں اور انسان یہاں پہنچ کر جس قدر اپنے آپ کو اور خدا کو بھول جاتا ہے
اس قدر کہیں اور نہیں بھولتا، لیکن اگر آپ کا اللہ سے تعلق ہے تو آپ بازار میں ذکر الٰہی
کرتے ہوئے داخل ہوں گے۔ جو آپ کی غفلت و سرمستی کا پردہ چاک کر دے گا اور دُنیائے
فانی کی طرف مائل ہونے سے آپ کو بچالے گا۔ آپ بازار دیکھتے ہی یہ دُعا پڑھیں گے:

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اقتدار
اسی کے لئے ہے، تمام تعریفیں اسی کے لئے ہیں وہ زندہ کرتا اور موت دیتا ہے،
وہ زندۂ جاوید ہے اسے کبھی موت نہیں آتی، اسی کے ہاتھ میں خیر ہے اور وہ
ہر چیز پر قادر ہے"

خدا پرستی کی طرف

ہمارے پیشِ نظر رسولِ اکرمؐ سے منقول تمام دُعاؤں کا استقصاء ہرگز نہیں ہے
جو لوگ اپنے لئے بھلائی اور خیر کے طالب ہیں وہ انہیں احادیث کی کتابوں میں تلاش کر سکتے
ہیں لیکن جو شخص انہیں یاد نہ رکھ سکے یا جس کے لئے احادیث کی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں
تو اسے اپنے تمام معاملات اور احوال اسی رقیق قلب کے ذریعہ حل کرنا چاہئیں کیونکہ
قلب رقیق کا حامل اپنے نفس کو دیکھتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کے
چہرے پر خدائی کلام پڑھ رہا ہے یعنی مقام و محل کے مناسب ذکر کے صیغے تراش لیتا ہے اسی
قلب میں زندگی، سینے میں حرکت اور صلاحیتوں میں بیداری ابھرتی ہے اور انسان ظاہر و باطن
دونوں میں زندہ و بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی خارجی زندگی اس کی رُوحانی زندگی سے مل جاتی

ہے اور اس کی روحانی زندگی خارجی زندگی سے میل کھا جاتی ہے اور دونوں کے ایک دوسرے پر اثرات پڑتے اور ہر ایک کی دوسرے کی دُنیا میں صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے چنانچہ آدمی کی دُنیاوی زندگی سخاوت وکشادہ دلی، خوش روئی ونرمی کی چادر اوڑھ لیتی ہے اور خشکی و ترش روئی اور تنگ دل وبخیل کی ساری الجھنیں کافور ہو جاتی ہیں یا ایک اخوانی بھائی کے الفاظ میں " اس کا جزیرہ فسادِ اجتماعی کے جراثیم سے پاک ہو جاتا ہے۔ گویا سچی خدا پرستی ہی ان تمام جراثیم کو ختم کر دینے والی طہارت ہے اور گویا اس کا قلب وہ خدائی پچکاری ہے جو اس طہارت کو سوسائٹی میں پھینکتی ہے تو وہ اسے پاکیزہ اور صاف ستھرا بنا دیتی ہے۔" اور اجتماعی خدا پرستی کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

یہ داعیان دین کی ذمّہ داری ہے

اگر عوام النّاس اس بہترین طریقہ کو اختیار نہیں کر سکتے تو اے داعیانِ کرام! آپ کو ناگزیر طور پر اس طریقہ کار کو اختیار کرنا ہے اور ان کلمات کا مقصود سب سے پہلے آپ ہی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ متاعِ دُنیا سے آپ کا تعلق یکسر ختم ہو جائے اور مال وجاہ سے بالکل الگ تھلگ ہو جائیں بلکہ آپ کو مسلسل اور پیہم سخت مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہے جس سے آپ اس لائق ہو سکیں کہ ان اصولوں کی رُوح سے آپ جڑ جائیں جن کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مدعو حضرات سے آپ ممتاز ومنفرد ہو سکیں عقل میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ داعئ دین کو مدعو ہی کی طرح اس نیکی وتقویٰ کی ضرورت رہے جس کی طرف وہ بلا رہا ہے یا اس سے زیادہ اسے نیکی کی ضرورت ہو۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہی رُوحانیت وہ سرچشمہ ہے جہاں سے آپ کو دعوت کا فہم حاصل ہو سکے گا

داعیانِ دین کی زندگی میں مؤثر اور فعال محرک یہی ہے۔ یہی وہ برق آفریں مشین (DYNAMO) ہے جو جذباتی طاقت اور باطنی قوت کی بجلی پیدا کرتی ہے اور اس کی فکری و نظری اور تقریری و تحریری صلاحیتیں اور علمی اقدامات یہ سب محض آلات ہیں جو اس لئے حرکت کرتے ہیں تاکہ ان جاری و ساری طاقتوں کو فکر و نظر اور تحریر و تقریر اور عمل و کردار کے ذریعہ سے واضح کر سکیں۔ اب اگر داعی اس رُوحانیت سے خالی ہو تو اس کی زندگی اس ڈائنمو (DYNAMO) ہی سے خالی ہو جائے گی اور اس کا اندرون خالی خولی اور تباہ و ویران ہو جائے گا جس میں حرکت یا اشارہ کرنے کی کوئی طاقت نہ رہے گی اور اس محرومی و بے مائیگی کے باوجود اگر وہ داعیانِ دین کی صف میں شامل ہے تو وہ انانیت پسند ہے، زبردستی دعوت کا کام کر رہا ہے، درحقیقت اسے دعوت الی اللہ کے کاز سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے، وہ تو اپنے نفس کی طرف دعوت دے رہا ہے، میرے بھائی! اس مقامِ بد سے بچیے۔ اور اس منزلت کے قریب نہ پھٹکیے۔

اس روحانیت یا DYNAMO کا راستہ بہت آسان ہے، اگر اس کے لئے آپ کمر بستہ ہو جائیں اور وہ تقویٰ و خدا ترسی کا وہ مفہوم ہے جو ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں یا اس سے بہتر طریقے سے خدا ترسی پیدا کرنا ہے اگر انسان کی استطاعت میں ہو۔ اور بخدا اس مبارک اور مقدس راہ میں اٹھا ہوا کوئی قدم ناکام نہیں ہو گا اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ کہتا ہے اور وہ تمام کہنے والوں سے زیادہ سچا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ (انفال: ۲۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لئے کسوٹی بہم پہنچا دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دُور کرے گا اور تمہارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا افضل فرمانے والا ہے۔

یہ فرقان وہی الہام کی ہوئی رُوح ہے جس کی تشبیہ ہم نے مشینوں اور حرکتوں کی دُنیا سے DYNAMO دی ہے۔

بعض نقوشِ راہ

یہاں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم انسان کے سامنے اس رُوحانی زندگی کے بعض نقوش اجاگر کر دیں جس سے مزید وضاحت ہو جائے، اس راہ سے ہر رہرو کو انسیت ہو جائے اور مشکلات و مصائب میں اس کو تعاون بھی حاصل ہو سکے:

ا— کلامِ پاک کا کثرت سے مطالعہ کیجئے کہ اس سے پژمردہ نگاہوں میں روشنی آئے گی اور سینوں کو شفا حاصل ہو گا۔ اگر تلاوت کلام پاک کا تدبر و ترتیل کے ساتھ التزام کیا جائے تو دلوں کے بند دروازے وا ہوں گے، قرآن کی روشنی پھیلے گی اور نفس کے آفاق پر چھا جائے گی، اسی لئے قرآن تدبر و فکر کی دعوت دیتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا ﴿۲۴﴾

(محمد : ۲۴)

(کیا وہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ہیں، یا دلوں پر اُن کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہایت پابندی کے ساتھ تلاوتِ کلامِ الٰہی کا اہتمام کرتے تھے اور اللہ سے یہ دُعا مانگتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِکُلِّ	اے اللہ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے
اِسْمٍ ھُوَ لَكَ سَمَّیْتَ بِہٖ	واسطے سے جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے
نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِكَ	کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں
اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ	اُتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں
اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ	سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست
الْغَیْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ	کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل
الْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ رَبِیْعَ	کی بہار، میرے سینے کا نور،
قَلْبِیْ وَنُوْرَ بَصَرِیْ وَجَلَاءَ	میرے غم کا مداوا اور میرے
حُزْنِیْ وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَغَمِّیْ	فکر و پریشانی کا علاج
(حدیث)	بنا دے۔

اللہ کے پیارے رسولؐ اپنے پیارے صحابہ کو اسی شیریں چشمہ کی طرف بلاتے اور اور ان کے انوار و اسرار ان کی نگاہوں کے سامنے کھولتے تھے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"اپنی آنکھوں کو عبادت گزاری کا مزہ چکھاؤ۔" لوگوں نے پوچھا: اللہ کے رسولؐ! آنکھوں کی عبادت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "قرآن میں دیکھنا اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائب و معجزات سے درس عبرت حاصل کرنا۔"

ایک دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ:

"دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے"۔ لوگوں نے پوچھا: اس زنگ کو دُور کیسے کیا جائے؟ آپ نے فرمایا: "قرآن کی تلاوت اور موت کی یاد سے"۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

وَّعَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَاۨ ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ فِىۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكۡرِىۡ وَكَانُوۡا لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَمۡعًا ﴿۱۰۱﴾

(کہف: ۱۰۰، ۱۰۱)

(اور وہ دن ہوگا جب ہم جہنّم کو کافروں کے سامنے لائیں گے، اُن کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سُننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔)

اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کافروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن اور اس کے معانی پر غور و فکر کرنے اور اس کی آیات پر تدبّر کرنے سے اعراض کرتے تھے۔

میرے بھائی! یہ آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں ہے بشرطیکہ آپ اسباب و علل کے قانون پر عمل کریں، گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوں اور اس قیمت کو چکانے کے لئے تیار ہوں جو آپ کو دل والے داعیانِ دین کی صف میں کھڑی کر سکے۔

لیکن اگر آپ اسباب و وسائل کا سہارا لینے کے بجائے غصب کرنے پر تُل جائیں تو جان لیجئے کہ کوئی شخص اللہ سے صلاحیت یا خصوصیت چھین نہیں سکتا اور غصب کرنا تو چوروں اور ڈکیتوں کا کام ہے داعیان کرام کا نہیں۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریئے، آپ کی مبارک زندگی سے ایسا وجدانی وجذباتی لگاؤ رکھیئے کہ جب رسول اکرمؐ مجلسوں میں تشریف رکھتے ہوں تو آپ وہاں موجود ہوں، جب وہ سوار ہو رہے ہوں تو آپ ان کی سواری پر بیٹھے ہوں، جب وہ چل رہے ہوں تو آپ ان کی معیت میں ہوں اور جب وہ رات کی تاریکیوں میں یا دن کی تنہائیوں میں اپنے رب سے دُعا و مناجات میں مصروف ہوں تو آپ ان کی وعظ و نصیحت سُن رہے ہوں اور ان کی مناجات کی رقت اور گداز اپنے قلب میں محسوس کر رہے ہوں۔ آپ اپنے جذبات کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات واحساسات سے جوڑ دیجیے یہاں تک جب آپؐ خفا ہوں تو آپ کے قلب مبارک کی دھڑکن قاری اپنے سینے میں محسوس کر سکے اور جب کسی چیز سے خوش ہوں تو آپؐ کی بشاشت اور کشادہ رُوئی وہ اپنے چہرے پر محسوس کر سکے۔ وہ مومنین صحابہ کرامؓ کی معیت میں ہو، انہیں تکلیف دی جا رہی ہو تو اسے اس کا درد ہو، وہ مصیبت سے دوچار ہو رہے ہوں تو یہ بھی کرب و الم محسوس کرے، انہوں نے جس طرح ہجرت کی یہ بھی ان کے ساتھ ہجرت کر جائے اور یہ ہجرت اس کے وجدان و خیال اور جذبات کی دنیا میں اسے حبشہ اور دوسرے ممالک لے جائے۔

اور جب مدینہ میں جہاد شروع ہو تو آپ حضور اکرمؐ کے کامیاب پرچم تلے موجود ہوں، آپ کے ہم رکاب ہو کر میدان جہاد میں تگ و تاز میں مصروف ہوں، حضورِ اکرمؐ نے زرہ بھی زیب تن کی ہے، تلوار بھی حمائل کی ہے، نیزے بھی چلائے ہیں آپ بہترین شہسوار اور فوجوں کے کمانڈر بھی رہے ہیں۔ خود کے نیچے سے آپ کی دونوں معزز اور بلند آنکھیں

چمکتی تھیں۔ اس لئے آپ جس فراز پر چڑھیں، جس وادی میں بھی اتریں اور دشمنوں کی طرف سے جو زخم بھی اٹھائیں، مطالعہ کرتے وقت آپ ہمہ وقت رسولؐ کے ساتھ موجود رہیں آپ کی ذات پر آنچ آئے تو قاری خود کو پٹتا ہوا محسوس کرے، آپ حکم دیں تو فوراً آگے بڑھے اور جان و مال کی ساری صلاحیتیں آپ کے قدموں میں ڈھیر کردے اور دل و دماغ کے سارے جذبات اور محبت و مودت کے سارے احساسات آپ کے اوپر نچھاور کردے۔

حضور اکرمؐ کے ساتھ جب یہ بہترین صحبت اور معیت آپ اختیار کریں گے تو آپ نبوی دائرے میں داخل ہوجائیں گے، آپ کا قلب رسول اکرمؐ کی رُوح کی لہروں سے نرم پڑ جائے گا، آپ کی طبیعت میں نکھار آجائے گا، آپ کی عادات اور خصلتیں مہذب اور شستہ ہوجائیں گی اور زندگی کا بلند نصب العین اور صالح طریقہ کار آپ کے سامنے آجائے گا اور یہ سب اسی اجتماعی رُوحانیت سے متعلق ہے جس کے حقوق کی نگہداشت کی ہم آپ کو دعوت دے رہے ہیں۔

۳۔ صالحین، خداترس اور عارف باللہ بندوں کی صحبت اختیار کیجئے۔ اگر آپ ان کی صحبت اختیار کریں گے جن کا طرۂ امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب سے پہلے اپنے عیوب پر نظر ڈالتے ہیں، صدق دل سے شریعت کے اوامر و نواہی کی پابندی اور اطاعت کرتے ہیں، پوری ایمانی قوت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اور اگر آپ یہ دیکھیں گے کہ ان بزرگان دین کے چہرے پر تازگی دنیا دی رزق سے نہیں بلکہ آسمانی رزق سے آتی ہے، یہ بندوں کے احسانات پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل پہ بھروسہ کرتے ہیں اور اللہ کے اس حکم کے

پوری طرح پابند ہیں :

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ (طٰہٰ : ۱۳۱)

(اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اس شان وشوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے اُنہیں آزمائش میں ڈالنے کے لئے دے رکھی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔)

تو آپ کے دل نرم ہوں گے، گناہوں اور لغزشوں سے پاک ہوں گے۔ اور یہ ایک ایسا پاکیزہ ماحول ہوتا ہے جس میں قلب پاکیزہ زندگی گزارتا ہے۔

۴۔ نگاہوں کو پاکیزہ بنائے رکھئے اور فواحش و منکرات کی مجلسوں سے الگ تھلگ رہیئے۔ ہم ایک ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جب کہ مادہ پرستی کا دور دورہ ہے، اباحیت اور وسیع المشربی انسان کو ہر قید اور بندھن سے آزاد کر رہی ہے، عورت تمام بندھوں کو توڑ کر سڑکوں پر نکل چکی ہے اور اپنی زینت و آرائش کو نمایاں کر کے دعوتِ نظارہ دے رہی ہے اور منکرات کے علمبردار علی الاعلان برائیوں کو پھیلا رہے ہیں اور لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ بسا اوقات انہیں قبول عام حاصل ہو جاتا ہے اور هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ کا نعرہ لگتا ہے۔

میرے بھائی! نگاہ وہ ڈاکیہ ہے جو قلب تک شیطان کا پیغام لے جاتا ہے

اور منکرات کی مجلسوں میں جب نفس کو سکون ملنے لگتا ہے تو ان کے خلاف سارے جذبات ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں اور ان کی کراہت رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگتی ہے۔

نگاہوں کی پاکیزگی اور ان محفلوں کا بائیکاٹ آپ کے سامنے مضبوط و مستحکم فصیل کھڑا کر دیں گے جو آپ کے قلب کو اباحیت کی برائیوں اور اس کی زہرناکیوں سے محفوظ رکھے گی اور مادیت کی مسلسل یورش کا توڑ کرے گی۔

یہاں پر کسی اخوانی دوست نے پوچھا:

اس مادی سیلاب کا مقابلہ کس طرح کیا جائے جس نے ہمارے دل و دماغ کو بُری طرح متاثر کیا ہے اور ان میں فساد کی تخم ریزی کر دی ہے؟

اس کے ساتھی نے کہا:

فوراً اپنے ارد گرد ایک فصیل کھڑی کر دو جو تمہیں اس مادیت کی تباہ کاریوں سے بچا سکے۔ پھر اس فصیل کے اندر مادیت کے جو اثرات و نشانات ہیں انہیں کھرچ کر پھینک دو تاکہ تمہاری یہ فصیل ان گندگیوں اور آلائشوں سے پاک ہو جائے اور تمہارا دل و دماغ اس کے اثرات سے محفوظ ہو سکے اور صاف ستھری فضا میں سانس لے سکے۔ یہ فصیل وہی نگاہوں کی پاکیزگی اور منکرات و فواحش کی بزموں سے کنارہ کشی ہے اور فصیل کو اندرونی اثرات و نشانات سے محفوظ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کے اندر جو فاسد اخلاق اور غیر اسلامی عادات و رسوم راسخ ہو گئے ہیں انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکو —

میرے بھائی! یہ ایسی محنت ہے کہ اگر آپ قلب سلیم کا حامل ہو کر دعوت الی اللہ کا کام کرنا چاہتے ہیں تو اس میں زیادہ پریشانی آپ محسوس نہیں کریں گے۔

۵ — قرآن و حدیث میں، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال میں، انبیاء کے معجزات

اور اولیاء صادقین کی کرامات میں رُوح اور ماوراء مادہ کے متعلق جو احوال و تفصیلات ملتی ہیں ان کا مطالعہ کیجئے۔ ان سب میں یا تو فکری اوصاف کا بیان ہوگا یا عملی حقائق کا تذکرہ ہوگا جن سے انسان کے سامنے عظیم اسرار و رموز کے بہت سے پردے ہٹیں گے۔

• معراج کا واقعہ اور وہاں کے نوادرات و عجائبات، ابراہیمؑ کے لئے آگ کا ٹھنڈی اور باعثِ برکت ہو جانا یہ اور اس طرح کے دوسرے معجزات جن کا آپ مطالعہ کریں گے تو خدائی انوار و اسرار سے آپ کی آنکھیں کھلیں گی، یہ سب ان بلند دُنیاؤں کے عجائبات کے علمی بیانات ہیں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ ان حقائق کو تسلیم کریں اور کبھی بھی ان چیزوں کی علمی و طبعی تعلیل یا روزمرہ کے حالات و قوانین کے تقاضوں کے مطابق ان کی تفسیر کرنے کی کوشش نہ کریں اس لئے کہ یہ سارے واقعات خدا کے حکم سے وجود میں آئے اور خدا کا حکم قوانین طبیعت سے بہت بلند اور بالا ہے۔ اور مروّجہ معاملات کی منطق سے پرے ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝ (بنی اسرائیل: ۸۵)

(مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔)

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ جدید مصنّفین نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے ان کا مطالعہ کر لیا جائے، لیکن ان کی تحریروں سے کسی فتنہ میں پڑنے سے دُور رہئے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے قرآن و سنّت کے سامنے پیش کیجئے، ان میں سے جو چیز قرآن و سُنّت سے مطابق ہوں وہی حق ہیں اور جو تحریریں ان ماخذ سے ٹکراتی ہوں وہ باطل ہیں اور جن کے بارے میں قرآن و سُنّت خاموش ہیں انہیں تجربہ و امتحان کے

مراحل سے گزاریئے۔

قرآن و سُنت میں ماورائے مادہ وطبیعت کے متعلق جو کچھ موجود ہے اُس کا مطالعہ کرنے سے انسان رُوح پر ایمان کو مستحکم بناتا ہے اور غیب کی ان تمام باتوں پر آمنا وصدقنا کہتا ہے جن کو سمجھنے کی اس کے علاوہ اور کوئی سبیل نہیں کہ قلب سے کام لیا جائے، اس سے اس کے نفس کے آفاق وسیع ہوں گے اور اس کے اندرونی وجود میں روحانی زندگی بیدار ہوگی۔

۶ — فکر و ذکر کے متعلق ہم کہہ چکے، اب ہم نماز روزہ اور دوسری عبادات و نوافل کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

میرے بھائی! اس زندگی میں اللہ عزّ وجلّ کے سامنے کھڑے ہونے کی سب سے بہترین اور عمدہ شکل نماز ہے، دن میں پانچ بار اس طرح کھڑا ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اللہ سے آپ کا تعلق مضبوط ہوگا اور بہت سے معاملات میں اس کا رشتہ قائم ہوگا۔ اور یہ آپ کے لئے مشکل نہیں ہے کہ نماز کو آپ خدا سے قربت کا ذریعہ بنالیں اگر آپ نماز کے ذریعہ خدا سے ملاقات کرلیں اور آپ پر یہ احساس غالب رہے کہ وہ آپ کو دیکھ رہا ہے، آپ کے تمام حالات سے واقف ہے اور آپ کی سجدہ گاہ میں موجود ہے تو آپ اس کے سامنے خشوع وخضوع اور ادب واحترام کے ساتھ کھڑے ہوں گے جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور خدا کی ہیبت اور اس کی عظمت کے احساس سے آپ کا دل کانپ رہا ہوگا۔ اگر دن میں پانچ بار اس طرح کی ملاقات آپ خدا سے کرتے ہیں تو آپ دلِ زندہ کے مالک ہوں گے جس سے خدا پرستی پھوٹی پڑ رہی ہوگی اور خدا کی طرف بُلانے اور اس پر گفتگو کرنے کے اہل قرار پائیں گے جیسے

کوئی عارف باللہ اپنے دل و دماغ میں گفت گو کے مواد اور مضامین بھرا پُر محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر اپنی نمازوں کے ذریعہ آپ خدا سے اس طرح کی ملاقات نہیں کر پاتے تو یا تو آپ نماز ہی نہیں پڑھتے ہیں یا پڑھتے بھی ہیں تو جی چُراتے ہوئے۔ اس لئے داعیوں کے زمرے میں شامل ہونے سے پہلے کسی ایسے فرد کو ڈھونڈھئے جو آپ کو اللہ کی طرف دعوت دے۔

میرے بھائی! نوافل کا اہتمام کرنا آپ کے لئے ناگزیر ہے تاکہ آپ خدا کا قرب حاصل کر سکیں۔ حدیث قدسی ہے:

"میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب وہ میری نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے تو اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے ...... الخ"

نماز، روزہ، دُعا و مناجات اور رات کی تاریکی میں غور و فکر وغیرہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قربتِ خداوندی حاصل کیجئے اس لئے کہ آپ داعیٔ دین ہیں اور داعیانِ کرام عوامی سطح سے بہت بلند ہوتے ہیں اور نوافل ان کے حق میں واجبات کا درجہ رکھتی ہیں۔ علماء نے بہترین فصلیں اس باب پر قائم کی ہیں کہ نوافل حضورِ اکرمؐ کے لئے فرائض کا درجہ رکھتی تھیں:

وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ (بنی اسرائیل: ۷۹)

(اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لئے نفل ہے۔)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم راتوں کو کثرت سے قیام کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ کے ہاتھ پاؤں پھٹنے لگتے تھے۔

تقویٰ و خدا ترسی اور شب بیداری و قیامِ لیل کا یہ توشہ داعئ دین کے اس مشکل اور پرپیچ راستہ کا ہتھیار ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آدمی زادِ راہ اور ہتھیار کے بغیر منزل مقصود تک پہنچ جائے گا؟

بعض لوگ کہتے ہیں: یہ تو بڑا مشکل ہے۔ ہم ان کے جواب میں کہیں گے کہ آپ جانیں اور آپ کا کام۔ آپ کی خواہش تھی کہ دعوت دین کا کام کریں تو ہم نے اس راہ کو طے کرنے کے طریقے بتائے اور مشکلات و مصائب سے آپ کو آگاہ کیا۔ اگر یہ آپ کی طاقت سے زیادہ معلوم ہو رہا ہے تو جس قدر آپ کے بس میں ہو، کیجئے ورنہ آپ جیسے لوگ اپنے آپ کو معذور سمجھیں اور کمزوروں اور پیچھے رہنے والوں کی صف میں جا کھڑے ہوں اور خدا کا خوف کریں۔

میرے بھائی! رات صالحین کے لئے خدا کی طرف کوچ کرنے کی سواری ہے اور دن خدا کے دیدار کا شوق رکھنے والوں کے لئے باز کی حیثیت رکھتا ہے جس کے سہارے وہ اپنے محبوب کی طرف پرواز کرتے ہیں:

"بندہ اپنے رب سے اس وقت سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب وہ سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔" (حدیث)

"خدا اپنے بندوں سے رات کی تاریکی میں سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔" (حدیث)

وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝

(دھر: ۲۶)

(رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔)

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (طور : ۴۹)

(رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اُس وقت بھی۔)

معاشرتی روحانیت اور رہبانیت

ہم یہاں آپ کو ایک نہایت نازک مسئلہ سے واقف کرانا چاہتے ہیں جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، وہ یہ کہ معاشرتی روحانیت معاشرہ کے عام افراد سے متعلق ہے اور معاشرہ میں رہتے ہوئے یہ صفت افراد کے اندر پرورش پاتی ہے لیکن اس کے برعکس رہبانیت والی روحانیت انسان کو معاشرہ سے الگ تھلگ کر دیتی ہے نہ وہ عام افراد سے ملتا ہے اور نہ عام انسان اس سے ملاقات کر پاتے اور اس کے ساتھ اُٹھ بیٹھ پاتے ہیں نہ وہ نہ دوسروں کو تعلیم دیتا ہے نہ دوسرے اس سے کچھ سیکھ پاتے ہیں یہ روحانیت کمزوروں اور خود غرض لوگوں کی روحانیت ہے۔ ایسے کمزوروں کی روحانیت ہے جو شر و فساد کے سامنے کھڑے نہیں ہو پاتے ہیں چنانچہ انہیں عزلت و تنہائی میں ہی سکون ملتا ہے دوسری طرف یہ ان خود غرض لوگوں کی روحانیت ہوتی ہے جو صرف اپنی کامیابی اور سعادت چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مقصد کی بلندی اور وسیلہ کی عمدگی کے باوجود یہ ایک قسم کی بیماری ہے۔

آپ کسی مضبوط و توانا نوجوان کو خوبصورت اور آراستہ محل میں رکھ دیجئے، اسے روزانہ نوع بہ نوع کے کھانے مہیا کیجئے، ہر طرح کی خوش حالی اور عیش کوشی فراہم کر دیجئے لیکن اسے اس بات کی اجازت نہ دیجئے کہ وہ حرکت و عمل، صحت و تندرستی اور ریاضت و محنت کے لئے محل سے باہر نکل سکے۔

نوجوان محل کی نعمتوں میں رہے گا، کھائے پئے گا اور بلاشبہ اس کا جسم موٹا تازہ

ہو جائے گا، لیکن اس حقیقت میں آپ کو کوئی شبہ نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کا گوشت ڈھیلا ڈھالا رہے گا گٹھا ہوا نہیں رہے گا اور یہ ایک قسم کی بیماری ہے صحت و تندرستی کی علامت نہیں ہے۔

لیکن اگر نوجوان کھانا کھائے اور حرکت و عمل اور ریاضت و محنت کے لئے محل سے باہر نکلے اور اپنی زندگی محل کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر بسر کرے تو اس کا جسم صحیح طریقے پر نشو و نما پائے گا اور قانونِ صحت کے مطابق اس کی پرورش و پرداخت ہوگی۔

معلوم ہوا کہ حرکت و عمل کے بغیر کھانا کھانا بیماریوں کا پیش خیمہ ہے اسی طرح بِلا کھائے پیئے حرکت کرنا بھی مرض کو دعوت دینا ہے۔ یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو عبادت و خدا ترسی کے لئے لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر ایک کونے میں بیٹھ رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس مبارک توشہ کے ذریعہ وہ اپنی روح کی تربیت کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے نفس کے آفاق وا ہوں گے اس کی رُوح پروان چڑھے گی اور اس میں فراخی آئے گی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ترقی اور نشو و نما ڈھیلی ڈھالی اور بہت سی بیماریوں کی علامت ہوگی نہ کہ صحت و قوت کی ترقی ہوگی۔

روح بھی ویسے ہی غذا حاصل کرتی اور خوش حالی چاہتی ہے جیسے جسم غذا کا طلبگار اور خوش حالی کا خواستگار ہوتا ہے، جسم ارضی کھانوں سے غذا حاصل کرتا ہے جبکہ رُوح آسمانی توشہ سے شکم سیر ہوتی ہے، جسم عمدہ کھانا اور نرم و گداز بستر پر سونے کی خواہش رکھتا ہے اور رُوح زیادہ سے زیادہ عبادات اور تنہائیوں کا دلدادہ ہوتی ہے اس لئے جس طرح جسم کی عیش کوشی اس کے لئے مرض پیدا کرتی ہے اسی طرح روح کی عیش کوشی بھی امراض کا سبب بن جاتی ہے۔

طبعی زندگی کا قانون یہ ہے کہ وہ آپ کو کھانا دیتی ہے تاکہ آپ اسے حرکت و عمل سے نوازیں اور اس کے مختلف عناصر کے درمیان نفع بخش اور نتیجہ خیز عنصر کی تشکیل کریں، اسی میں اس کی ترقی اور آبادکاری ہے اور آپ کی صحت اور سعادت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اب اگر وہ تو آپ کو کھانا دے لیکن آپ اسے سُستی و جمود عطا کریں تو آپ قانون کی مخالفت کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی قاہرانہ قوتوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور جو شخص اپنے آپ کو سُنّتِ الٰہی کی زد میں لے آئے وہ یقیناً تباہ و برباد ہو گیا۔

روحانی تجریدات (SPRITUAL EXPEDITIONARY FORCE) میں مُستغرق ہونے کا ایک قانون یہ ہے کہ وہ آپ کی رُوح کو زادِ راہ دیتا ہے تاکہ آپ اسے حرکت و عمل دیں۔ اور حرکت و عمل سے مراد امر بالمعروف، نہی عن المنکر، باطل کو زائل کرنا، ظالم طاغوت کے خلاف بغاوت کرنا یا ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا ہے جس میں نیکیوں اور اچھائیوں کو فروغ ہو مساوات اور مواساۃ کا وجود ہو لیکن اگر یہ قانون تو آپ کو زادِ راہ دے لیکن آپ اسے تنہائی و عزلت اور گوشہ گیری سے نوازیں تو سُنّتِ الٰہی سے اعراض کر کے اپنے نفس کو خراب کریں گے اور اسے ایسے حالات کے سامنے پیش کر دیں گے جہاں سے کمزوری اور بیماری کے سوا کچھ اور جنم نہیں لے سکتی۔

اس لئے صحت و سلامتی موجودات کے قوانین کا ساتھ دینے میں ہے اور کمزوری و بیماری بلکہ اضطراب و انتشار اس سے ٹکرانے یا پیچھے رہ جانے میں ہے۔

داعیانِ دین کی ذمہ داری ہے کہ جب وہ اپنے نفس کے اندر عزلت و تنہائی کے جراثیم محسوس کریں تو فوراً ان کا مقابلہ کریں اور اپنی رُوح کے بہاؤ کو عوام کی طرف پھیر دیں انہیں تعلیم دیں، خود ان سے سیکھیں اور ان کے لئے راستہ روشن کریں، ان کے

ذہن و قلب کو زندگی کے حقائق سے روشناس کرائیں اور اپنی سچی عبادات، مواعظِ حسنہ، بہترین معاملات اور نفع بخش رہنمائی کے نمونے ان کے سامنے پیش کریں اور زندگی کے وہ تمام گوشے اجاگر کریں جن سے اثر پذیری مکمل طور سے ہو اور اسوۂ کامل سامنے آئے۔

آپ داعئ دین ہیں اور داعئ دین اپنی رعیت کے سلسلے میں جوابدہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ان کے درمیان سے اوجھل ہو جائے تو گویا اس نے اپنی ذمہ داری سے ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی قوم کو شیطانوں کی گمراہی اور غلط کاروں کے لہو و لعب کے حوالے کر دیا۔ اسے اس صورتِ حال سے کسی صورت میں بھی یہ کہہ کر بری قرار نہیں دیا جا سکتا کہ خلوت کو اختیار کرنے میں اس کی نیت درست ہے۔ ہم قرآن پاک میں پڑھتے ہیں کہ اس طرح کی حرکت موسیٰؑ سے سرزد ہو گئی تھی جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان سے باز پرس کی کیونکہ ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے قوم میں گمراہی پھیل گئی تھی:

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ (طٰہٰ: ۸۳ تا ۸۶)

(اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ؟ اُس نے عرض کیا" وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں، اے میرے رب، تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے"۔ فرمایا: "اچھا تو سُنو، ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا"

چنانچہ موسیٰ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔)

اور ہم دیکھتے ہیں کہ داعیانِ دین کے سردار حضورِ اکرمؐ کو جب سے دعوت و تبلیغ کا حکم دیا گیا، آپؐ نے ایک دفعہ بھی عزلت و تنہائی کا سہارا نہ لیا، آپ اپنے صحابہ اور پیرو کاروں کے ساتھ رہے، ان سے کبھی جدا نہ ہوئے۔ مسجد میں، بازار میں، کھیت اور باغات میں اور تمام مجلسوں میں ان کے ساتھ رہے، موسمِ حج میں بھی اور لڑائیوں اور جنگوں میں بھی ہر جگہ آپ نے ساتھ دیا، اپنے ساتھیوں سے ان کے گھروں پر جا کر آپ ملاقات کرتے، مریضوں کی عیادت کرنے جاتے، جنازوں میں ساتھ ساتھ رہتے، انہیں تسلی دیتے اور ان کے اوپر جو دکھ سکھ نازل ہوتا اس میں ان کا حصہ بٹاتے۔ آپ ہر معاملہ میں ان کے لئے رشد و ہدایت کے منبع تھے، ان کے دلوں اور دماغوں کے لئے توشہ تھے اور ان کے لئے ایک نور تھے جس کی روشنی میں وہ اللہ کی طرف کوچ کرتے جا رہے تھے۔ آپ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف بھی کرتے تھے لیکن کہاں؟ مسجدِ نبوی میں، جو مدینہ کے وسط میں تھی جس طرح وہ صحابہ کے لئے عبادت گاہ تھی اسی طرح ان کے لئے مشورہ گاہ اور اسمبلی ہاؤس بھی تھی اور لوگ شب و روز آپ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ آپ کا یہ اعتکاف دراصل مصاحبت تھا اور مصاحبت، عزلت کے مانند تھی، لیکن یہ اعتکاف ایسا نہ تھا جو آپ کو لوگوں سے الگ تھلگ کر دے یا لوگوں کو آپ کے پاس پھٹکنے نہ دے اور پوری رعیت کو بغیر کسی نگرانی کے سامری کے حوالے کر دے۔

ایک اخوانی دوست نے شکایت کی اور کہا:

جماعت اخوان المسلمون میں شامل ہونے سے پہلے میں فلاں فلاں عبادات کا اہتمام کرتا تھا اور شب بیداری کے لئے طرح طرح کے انتظامات کرتا تھا، مجھے ایسی خلوتیں

اور تنہائیاں میسر تھیں جن کی حلاوت اور لذت مجھے اب تک محسوس ہوتی ہے مجھے وہ ایام بھولے نہیں ہیں، میری خواہش ہے کہ میں پھر وہیں لوٹ جاؤں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ دعوت دین کی مشغولیتوں نے ہمیں ان سے بے نیاز کر دیا ہے اور عبادت اور توجہ الی اللہ کے سلسلے میں ہمارے عزائم کو سرد کر دیا ہے؟

اس کے ساتھی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

نہیں، میرے بھائی! تمہارے یہ ایام ماضی سے بہت بہتر ہیں، پہلے تم محدود دائروں میں مقید تھے آج تم آزاد ہو، تمہاری روح عمل سے بے نیاز تھی آج تم عمل سے روشناس ہو چکے ہو اور عمل ہی صحت و سلامتی کا قانون اور تندرستی کا غماز ہے۔ تمہاری روح ماضی میں اپنے محدود دائرے میں غذا لیتی تھی اور سستی و بیکاری میں مست تھی آج وہ اپنے وسیع میدان میں غذا حاصل کر رہی ہے اور زندگی کو اس کھانے پینے کی بہترین قیمت بھی چکا رہی ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ماضی میں روح کے توشہ کی کثرت تھی آج بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ وہ قلیل توشہ جو مبارک عمل پر منتج ہو اس کثیر توشہ سے بہتر ہے جو بانجھ ہو۔ اور بغیر کام کئے کھانا کھانا ہلاکت کو اسی طرح دعوت دینا ہے جس طرح بلا کھائے کام کرنا ہے۔ اس لئے میرے بھائی! ماضی کے ایام کی تمنا نہ کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہارے سامنے اس معزز اور متبرک دعوت کے میدان کھول دیئے اور جس چیز کی مجھے تم سے توقع ہے اور جس کی میں تم کو نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ عمل کی رفتار تیز تر کر دو تاکہ تمہاری روح کی غذائی ضرورت سخت تر ہو جائے اور تمہارے جسم کو عبادت و انابت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرنی پڑے۔

یہ ہے معاشرتی روحانیت کے سلسلہ میں ہمارا تصور اور رہبانیت پر اعتراض،

لیکن میرے بھائی! رہبانیت پرست حضرات اور ان کی کرامتوں او معجزات پر آپ تنقید و تنقیص نہ کیجیے، ان کے گنہگار ہونے کے لیئے یہ کافی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے لاپرواہ ہیں، ان کی گرفت کے لیئے یہ امر کافی ہے کہ انہوں نے فریضۂ جہاد کو ایسے وقت میں چھوڑ رکھا ہے جب کہ جہاد کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض عین ہو گیا ہے۔

عبداللہ بن مبارکؒ مسلمانوں کے کسی سرحدی علاقے میں جہاد میں مصروف تھے اور ان کے ساتھی فضیلؒ بن عیاض مسجد حرام میں مشغول تھے، عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنے ساتھی کو چند اشعار لکھ کر روانہ کیئے جو یہ تھے:

يَا عَابِدَ الْحَرَمَيْنِ لَوْ أَبْصَرْتَنَا لَعَلِمْتَ أَنَّكَ بِالْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

مَنْ كَانَ يَخْضِبُ خَدَّهُ بِدُمُوعِهِ فَنُحُورُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

أَوْ كَانَ يُتْعِبُ خَيْلَهُ فِي بَاطِلٍ فَخُيُولُنَا يَوْمَ الصَّبِيحَةِ تَتْعَبُ

رِيحُ الْعَبِيرِ لَكُمْ وَنَحْنُ عَبِيرُنَا رَهَجُ السَّنَابِكِ وَالْغُبَارُ الْأَطْيَبُ

(اے حرمین شریفین کے عبادت کرنے والے! اگر تو ہماری حالت پر نظر ڈالے تو تجھے معلوم ہو گا کہ تو عبادت سے کھیل رہا ہے۔

اگر کسی کے رخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہو رہے ہیں تو ہمارے سینے ہمارے خون سے لالہ زار ہیں!

اگر اس کا گھوڑا غلط راہ میں تھک رہا ہے تو ہمارے گھوڑوں کو میدان جنگ میں دوڑ بھاگ کرنے کی وجہ سے تھکن لاحق ہوتی ہے!

تمہارے لیئے خوشبو کی ہوائیں ہیں اور ہماری خوشبو ہمارے گھوڑوں کی ٹاپ کے گرد و غبار اور پاکیزہ دھول ہے۔)

عبداللہؒ بن مبارک نے اپنے ساتھی کے پاس یہ اشعار اس وقت بھیجے تھے جبکہ جہاد کرنا فرض عین نہ تھا اس کے باوجود انہوں نے اپنے دوست کی عبادت کو کھیل قرار دیا اور وہ عبادت بھی اس سرزمین کے سب سے مقدس اور پاکیزہ علاقے میں انجام دی جارہی تھی۔ ذرا سوچئے عبداللہؒ بن مبارک اپنے ساتھی سے کیا کہتے اگر اس وقت جہاد فرضِ عین ہوتا؟ اور اس عبادت کے بارے میں ان کا خیال کیا ہوتا جو سرزمین حرام کے علاوہ کہیں اور انجام دی گئی ہوتی؟

کسی بھی داعیٔ دین کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ عزلت و تنہائی کی راہ ڈھونڈھے چاہے اس کے مقاصد کتنے ہی اعلیٰ اور وسائل کتنے ہی پاکیزہ ہوں۔ داعی کی خانقاہ اس کا میدانِ دعوت ہے اور اس کی وہ محراب جس میں اللہ کی جانب سے ہدایت اور مدد نازل ہوتی ہے لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا ہے ——— اور اللہ تعالیٰ محرابوں میں عبادت کرنے والوں پر اپنی تجلیاں جس طرح نازل کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ افضل طریقے سے اپنے میدانوں میں کام کرنے والوں پر وہ اپنے انوار کی بارش کرتا ہے۔ میرے بھائی! ایک فرد وہ ہے جو قیامت کے دن اُٹھے گا تو اس کی قوم اس کے ساتھ ہوگی لیکن دوسرا فرد وہ بھی ہوگا جو تن تنہا اُٹھے گا، ان دونوں میں کتنا زبردست تفاوت ہے!

داعیان دین پر اس روحانیت کے اثرات

اب آخر میں ہم چاہتے ہیں کہ داعیانِ دین کی زندگی پر اس روحانیت کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا بھی مجمل انداز میں ذکر کر دیا جائے:

۱ــــ داعیٔ دین ــــ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ــــ ایک ایسا ڈاکٹر ہے جو انسانیت کی اس سے بڑی بیماری کا علاج کرتا ہے جس سے دوسری بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ یہ بات

اچھی طرح معلوم ہے کہ اس بیماری کا علاج نہ تو کھیتوں میں اُگنے والی جڑی بوٹی اور گھاس پھوس سے کیا جاسکتا ہے نہ کان سے نکلنے والی دھات سے اور نہ ہی دواخانوں (PHARMACIES) کی دوائیوں سے، بلکہ یہ علاج وہ خدائی رُوح ہے جو بندہ مومن کے ضمیر میں ہوتی ہے جس سے خداپرستی پھوٹتی ہے۔ چونکہ روح لوگوں کے لئے شفا و رحمت، اور نور و قوت اور خوشی و مسرت کا محرک ہے اور اسی سے حرکت و عمل اور استقامت کی کرنیں پھوٹتی ہیں اس لئے یہی دل زندہ ہی خدائی دواخانہ (DEVINE PHARMACIES) ہے اور اس سے صادر ہونے والا ہر کلمہ دواؤں کا ڈبہ (MEDICINE BOX) ہے جس میں لوگوں کا علاج موجود ہے۔ اگر داعی کا قول و فعل اور گفتار و کردار اس کے روحانی دائرے سے متعلق نہ ہوگا اور ماورائے مادہ میں رہنے والی زندگی سے اس کا لگاؤ نہ ہوگا تو اس کی ساری گفت گو روشنی سے خالی ہوگی اور دلوں کا علاج کچھ بھی ممکن نہ ہوگا ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص فصیح و بلیغ تقریر کر ڈالتا ہے، اپنی جذباتی تقریر سے لوگوں کے احساسات کو اُبھار دیتا ہے اور داد و تحسین کا خراج وصول کر لیتا ہے لیکن عوام کا سارا خراج تحسین اس کے تصنع و تکلف اور جذبات انگیختی کا دین ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، اگر مریض کو خالی ڈبہ مہیا کر دیا جائے جس میں کوئی دوائی نہ ہو تو کیا اس کو شفا مل جائے گی؟ اور کیا یہ بات اس کے علاج کے سلسلہ میں کچھ بھی مفید ثابت ہوگی کہ وہ ڈبہ سونے، ہاتھی دانت اور موتیوں سے جڑا ہوا ہے؟

یہی خداپرستی ہی دوا ہے، اگر اس چیز سے داعی کے اقوال و افعال خالی ہوں تو

ان میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔

۲ — داعی اس روحانیت کو تجربات کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے، وہ اس کے ذریعہ مایوسی و محرومی کی تلخی برداشت کرے گا، مجاہدہ و ریاضت کی مشقت اٹھائے گا، اوامر و نواہی کے نفاذ میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے گا، خدائی ہدایات کو اپنے اوپر اور اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے اوپر پہلے نافذ کرے گا، اور یہ ساری چیزیں اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر جائیں گی، ان سے ان کا رشتہ جڑ جائے گا تو جب وہ کسی خوبی یا اچھائی کی دعوت دے گا یا کسی منکر اور برائی سے روکے گا یا نفس کی اعلیٰ لذتوں کا بیان کرے گا تو اس وقت چونکہ معرفت و یقین کے جذبے سے سرشار ہو کر بولے گا، تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر گفت گو کرے گا اس لئے حق مجرب کے سوا اس کی زبان سے کوئی بات نہ نکلے گی اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ گفت گو کا موضوع اور مضمون اس کے ذہن و قلب پر چھایا ہوگا سے کسی کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اس لئے کہ وہ خود اس حق کی کتاب اور اپنے عملی تجربات کا صحیفہ ہوگا۔ مزید برآں یہ کہ تجربے اور تنفیذ کی تلخی سے گزرے ہوئے نفس کی بات ہی اور ہوتی ہے پھر تو اس کی آنکھیں بھی حق کی گواہی دیتی ہیں، اس کے چہرے کے ریشے اور خطوط بھی حق کا اعلان کرتے ہیں، اس کے ہاتھ کے اشارات اور اس کی جبیں کی کرن سب کچھ حق کی دعوت دیتی نظر آتی ہے۔ یہ سارے حصے لوگوں سے عبارتوں سے کہیں زیادہ وضاحت سے حقیقتِ حال بیان کر دیتے ہیں بلکہ آواز کی عمدگی اور گفت گو کا لہجہ وہ کام کر جاتا ہے جو خود وہ گفت گو بھی نہیں کر پاتی۔ خدا کی قسم، آپ نے کبھی حسن البناؒ کے چہرے کو دیکھا ہے جبکہ وہ بات

کر رہے ہوں یا خطبہ دے رہے ہوں ؟ ان کی آنکھوں پر نظر ڈالی ہے ؟ ان کے چہرے کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے اور دورانِ تقریر ان کی آواز کی عمدگی، لہجہ کی پستی اور ہاتھ کے اشارات پر غور کیا ہے ؟

ہمارا یہ مرشد جب بات کرتا تھا تو ایک نئے انداز اور نئے جذبہ کے ساتھ بات کرتا تھا اس لئے کہ گفت گو تو اللہ کے قدیم کلام ہی کے ذریعہ ہوتی تھی لیکن چہرہ نیا تھا، آواز نئی تھی، آنکھیں نئی تھیں اور اسلوب اور لہجہ نیا تھا اور یہ سارے حصے سچی زبان تھے جوان کے ساتھ ساتھ بات کرتے تھے اور کلامِ قدیم کو نیا رُخ دے دیتے تھے۔ اس لئے کہ یہ حصے تجربات کی قوت، تنفیذ کی آزمائش، مجاہدہ و محرومی کی شدت کے ساتھ بولتے تھے اور یہ وہ اسرار ہیں جن کی گواہی اس رجلِ عظیم کے گھر کی دیواریں دے رہی ہیں، حسن البناؒ اپنی نجی زندگی میں تجربات کرتے تھے، اور انہیں اپنے لوگوں پر پہلے نافذ کرتے تھے ——— مجھے کیا پڑی ہے کہ دلیل کے لئے حسن البناؒ کا نام پیش کروں کہ حاسدین کی تعداد بہت ہے، باتیں بنانے والے کثیر تعداد میں ہیں اور ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا موقع دیں کہ یہ لوگ شخصیتوں کی پرستش کرتے ہیں یا ان کی تعریف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے مقصد کے لئے حضور اکرمؐ کو بطور دلیل پیش کروں۔ آپؐ کچھ ایسے لوگوں سے بات کر رہے تھے جو آپؐ کو پہچانتے نہ تھے، آخر میں وہ سب پکار اُٹھے: "بخدا یہ جھوٹا چہرہ نہیں ہو سکتا نہ جھوٹی آواز ہو سکتی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ الفاظ اور عبارتوں سے زیادہ آپؐ کے چہرے اور آواز سے متاثر ہوئے تھے۔ اور یہ چیز ہماری مندرجہ بالا باتوں کی تفسیر کرتی ہے۔

میرے مخلص بھائی! کیا آپ کے پاس مقررین کا وہ گروہ ــــــ جس کا اوپر تذکرہ ہوا ہے یعنی آنکھ، چہرے کے خطوط، ہاتھ کا اشارہ، آواز کی عمدگی، لہجہ کی پستی وغیرہ ــــــ ہے جو آپ کی ہاں میں ہاں ملائے؟ آپ کے پاس وہ سچی زبانیں ہیں جو آپ جیسی گفتگو کریں، آپ کی تائید و تصدیق کریں؟ ان زبانوں میں گویائی اسی وقت آسکتی ہے اور ان مقررین میں جوش اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب نفس کی وہ قوت موجود ہو جس نے صبر و ثبات اختیار کیا ہے، مجاہدہ کیا ہے اور شیریں و تلخ کا مزہ چکھا اور سرد و گرم کا تجربہ کیا ہے۔

لوگوں نے کہا: بڑا بھاری کام ہے! مشقت طلب طریقہ کار ہے!! اور نہایت گراں قیمت ہے!

ان کے ایک ساتھی نے جواب دیا: اس طریقہ کار کو اپنانا ناگزیر ہے اس لئے کہ ہمارا فریضہ اس سے کہیں زیادہ گراں بار ہے، ہماری ذمہ داری بہت زیادہ اہم ہے، سامان بہت ہی قیمتی ہے، منزلت کہیں بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا تو سب سے بلند اور برتر ہے۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ: تم داعیانِ دین ہو اور داعیانِ دین کا کام انبیاء کا کام ہے؟ تو تم ان منازل کو کیسے پہنچو گے جب اس کی خاطر چڑھنے کی مشقت بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو گے؟

۴ــ داعئ دین ایک قائد ہے اور جس قائد کے پاس روح کی قوت اور نفس کی بلندی نہ ہو وہ دوسروں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا نہ لوگوں کے دلوں کو خارجی قانون یا بادشاہ کا کوئی حکم جمع کر سکتا ہے، ان کے دل اسی وقت جڑیں گے اور آپ کی طرف وہ شوق و رغبت کے ساتھ اسی وقت لپکیں گے جب آپ کے پاس

وہ معنوی وجود اور باطنی انسان ہو جو اس روحانیت کے چمنستان میں پرورش پاتا ہے۔

۴۔ یہ روحانیت داعی کو فطری علم اور نورِ معرفت کا توشہ دیتی ہے جس سے زندگی کے حقائق اس پر واضح ہو جاتے ہیں اور زندگی کو سمجھنے اور اس کی طرف دیکھنے میں جن غلطیوں کا اندیشہ رہتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی روشنی میں انسان پیچیدہ مسائل میں حق و صواب کی راہ دیکھ لیتا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

(نور: ۴۰)

(اور جسے اللہ نور نہ بخشے، اُس کے لئے پھر کوئی نور نہیں!)

نفس کے اطراف و جوانب بہت وسیع ہیں، اس کی دنیائیں متعدد ہیں، لیکن بہت سے لوگ اس کے ایک ہی جانب میں زندگی بسر کرتے ہیں جو نہایت تنگ ہوتا ہے اور انسان کو مادہ کے اوہام اور دُنیوی زندگی کے مظاہر میں گھیر دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ باطل کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے، چند روزہ زینت سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور انہی اوہام سے متاثر ہو کر زندگی کو سمجھنے اور حقائق و معارف کا ادراک کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اس کے پیمانے اور معیارات غلط ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر خدا پرستی کا نور جلوہ گر ہو، دل میں اس کی روشنی جل رہی ہو تو اس کا نفس منوّر رہتا ہے اور یہ واضح روشنی نفس کے سارے اطراف و جوانب میں پھیل جاتی ہے پھر تو یہ افق متعدد آفاق بیں اور اس کا تنگ پہلو وسیع و کشادہ زمانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، علوم و معارف میں تازگی آتی ہے، جذبات و احساسات نئے

ہوجاتے ہیں اور نئے حقائق ہاتھ لگتے ہیں اور یہ ساری چیزیں ہمارے سامنے سربستہ رازوں کو بے نقاب کرتی ہیں پھر ہم چیزوں کو ایک نئے فہم کے ساتھ دیکھتے ہیں اور انہیں ایک نئے پیمانے سے ناپتے ہیں۔

کسی اخوانی دوست نے کہا: آپ کا فلاں پرانا شاگرد کہہ رہا تھا کہ مارکونی (GUGLIELMO MARCONI) غزالیؒ سے بہتر ہے۔ مارکونی نے وائرلیس کو ایجاد کیا اور انسانیت کو فائدہ پہنچایا لیکن غزالیؒ سے لوگوں کو کیا ملا؟

اس کے ساتھی نے جواب دیا: یہ قدیم شاگرد اپنے نفس کی حقیقت سے ناواقف ہے اسے اپنے اردگرد صرف مادہ کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ لوگ صرف لہو ولعب اور اس مادی زندگی میں مست رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اگر اسے اپنے نفس کی کرامت اور پاکیزگی کا خیال ہوتا تو اس مفہوم سے وہ بغاوت کرجاتا اور ایک دوسری زندگی میں ایک دوسرا ڈھانچہ تلاش کرتا جو اس کی بلند ہمتی کے مناسب ہوتا جس کا اسے احساس ہوا ہے اور جن انسانی اقدار پر اس کا نفس مشتمل ہے انہیں پسند کرتا اور اس کا یہ مبارک اور معزز احساس اس کی روشنی والہام کا سرچشمہ ہوتا جس سے اس کے نفس کی حقیقت واضح ہوتی اور اس زندگی میں اس کی حیثیت متعین ہوجاتی۔

یہ قدیم شاگرد مادہ پرستی کی تہذیب اور اس کی زینت و آرائش کی فریب کاریوں میں کھو گیا جیسا کہ اکثر لوگ کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہر اس ایجاد اور کارنامہ پر خوش ہوتے ہیں جو انہیں لہو ولعب کے وسائل، خوش حالی وعیش کوشی کے اسباب اور رنگ برنگے کھانے اور مشروبات مہیا کرے اور جتنا زیادہ ہوسکے ان حسی شہوات سے ان کے اعضاء وجوارح کو شکم سیر کردے۔ حالانکہ انسانیت کی ترقی ان میں سے کسی چیز میں بھی نہیں ہے جیسا کہ

وہ تمام انسانوں کی فطرت میں ودیعت ہے۔ انسانیت کی ترقی اس بات میں ہے کہ ان کے جذبات بلند ہوں، ان کی طبیعتوں میں سدھار آئے، ان کے معنوی حقائق کمال کو پہنچیں اور ان کی قلبی صفات (CHARACTERISTICS OF HEART) خدا اور اس کی ابدی نعمتوں میں لگی رہیں....... انسان کو حیوان کہہ کر پکارا جائے تو اسے غصہ آجائے گا اور وہ بھڑک اُٹھے گا لیکن اسے خود اپنے اوپر کبھی غصہ نہیں آتا کہ وہ حیوانوں کی زندگی بسر کر رہا ہے؟

انسان اپنے آپ کو حیوان سے ممتاز اس لئے نہیں سمجھتا ہے کہ وہ پکی پکائی روٹیاں کھاتا ہے جبکہ حیوان کچا گیہوں ہی چبا ڈالتا ہے، وہ سبزیوں کو آگ پر ابال کر کھاتا ہے لیکن ایک جانور انہیں ویسے ہی کھا جاتا ہے، وہ کپڑوں سے بدن ڈھانکتا ہے اور آرام دہ بستروں پر سوتا ہے لیکن جانور اسی حالت میں رہتا ہے جس میں اللہ نے اس کی تخلیق کی تھی، انسان کا اپنے کو حیوانوں سے ممتاز سمجھنے کی ان میں سے کوئی وجہ نہیں ہے پھر آخر انسان اس درجہ غلط فہمی کا شکار کیوں ہے؟ کیوں وہ بدن کی خدمت میں کسی پیش رفت کو ترقی سمجھ بیٹھتا ہے؟ کیوں وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے ترقی کر لی ہے کیونکہ آج وہ کیک کھاتا ہے جبکہ پہلے وہ صرف چپاتیاں کھاتا تھا؟ آج وہ گوشت کے نوع بنوع سالن کا مزہ چکھتا ہے جبکہ پہلے وہ صرف اُبلا ہوا یا بھنا ہوا گوشت کھاتا تھا؟ آج وہ کانٹے سے کھانے لگا ہے جبکہ پہلے وہ اپنی انگلیوں سے کھاتا تھا؟ پہلے وہ اونٹ پر سواری کرتا تھا آج وہ راکٹ سے اُڑ رہا ہے؟ پہلے قاصدوں کے ذریعہ ڈاک بھیجتا تھا آج وہ بجلی سے یہی کام لے رہا ہے؟ پہلے وہ قریب ہی کی آواز سُن سکتا تھا آج لاکھوں میل کی مسافت سے ریڈیو اور ٹیلیفون سے سُنتا ہے؟ کیا انہی چیزوں کا نام ترقی ہے؟! اگر اسے حیوان کہہ دیا جائے تو اسے غصہ آجاتا ہے اور کھانوں میں

ترقی کرنے کو حیوانوں کے مقابلے میں اپنا امتیاز نہیں سمجھتا، پھر آخر جسم کی خدمت اور اس کے اعضاء و جوارح کی خوش حالی میں اضافہ کو وہ ترقی کیسے سمجھ لیتا ہے؟

اس مبارک غصہ کو اپنا کام کرنا چاہیئے اور حیوانی مطالبات میں انسان کی ہمتوں اور ارادوں کو سکڑنے اور خشک ہونے سے بچانا چاہیئے اسے تو ایک الگ معیار اور جُداگانہ انداز قائم کرنا چاہیئے۔ اور انسان کی حیوانی اور انسانی زندگی میں جو زبردست تضاد ہے اسے نمایاں کرنا چاہیئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان حیوانات کے مقابلہ میں اپنی ترقی کا معیار یہ بنائے کہ اس کے جذبات و احساسات معنوی اقدار کی طرف کس حد تک آگے بڑھے ہیں اسے ترقی کا معیار یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ بدن کے اعضاء و جوارح کے لئے اس نے کس قدر اسباب و وسائل فراہم اور ایجاد کئے ہیں۔

ہر وہ کوشش جو کوئی انسان یا دوسرے لوگ ظاہری ترقی کے محدود دائرے میں کریں اور اُخروی و روحانی دائرے میں کسی قسم کی سرگرمی انجام نہ دیں ان کی کوشش اور جدّ و جہد انسانوں کی متاعِ دنیا میں اضافہ کرتی ہے اور انہیں ان کے حیوانی دائرے ہی میں محدود رکھتی ہے بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی بُری حالت تک پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ کوشش جو دلوں کو زندہ کرنے کے لئے اور صلاحیتوں کو آسمانی پیغامات کے ذریعہ سعادت مند بنانے کے لئے کی جائے، بڑی ہی مبارک اور پاکیزہ ہے۔ یہ انسان کو اعضاء و جوارح کی عیش کوشیوں سے نکالتی اور حیوانوں کی زندگی اور ان کی غفلت و سرمستی سے بلند کر دیتی ہے اور روحانی سعادت کے اس افق تک پہنچا دیتی ہے جہاں انسان کی انسانیت میں ارتقاء آتا ہے اور وہ متعین کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ کوشش لوگوں کے لئے سراپا شفا و رحمت اور ہدایت ہے اور جو شخص بھی اس مقصد میں حصہ لے وہ انسانیت کا سچا دوست ہے میرے بھائی!

اب مجھے بتایئے کہ انسانیت کی خدمت میں مارکونی کا کیا حصہ ہے اور غزالیؒ کا کیا کارنامہ ہے ؟

یہ دونوں عالم ہیں لیکن دونوں میں سے کس نے اپنے علم وعمل سے انسانیت کو زیادہ فائدہ پہنچایا ؟

غزالی شب وروز اس حال میں گزارتے تھے کہ وہ اپنے قلب کی وحی سے سیراب ہوتے تھے، تنہائیوں میں ہوتے تو ذکر و فکر اور نماز و عبادت میں مشغول ہوتے اور جب لوگوں کے سامنے جاتے تو وعظ و نصیحت اور تذکیر کے ذریعہ انہیں یاد دہانی کراتے، دلوں کو خطاب کرتے، نفوس میں گداز پیدا کرتے اور سامعین کے اندر بلند اور پاکیزہ جذبات ابھارتے اور یہ سارے کام محض اللہ کی رضا کے لئے انجام دیتے، جب وعظ و تدریس ختم کر چکتے تو پھر اپنے کام میں لگ جاتے، کتابیں لکھتے، دل کے امراض کا تجزیہ کرتے، قلب کے حالات کا ذکر کرتے، دوا دارو کی وضاحت کرتے، ایمان کے حقائق واضح کرتے اور لوگوں کے سامنے اللہ تک پہنچنے کا راستہ روشن کرتے۔ ان کی کتابیں آج تک زندگی کا سرچشمہ اور طبیعتوں اور عادات کے لئے تہذیب و اخلاق کا منبع ہیں، لیکن مارکونی نے اس انسانی افق میں کیا کام انجام دیا ؟ اس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اس نے طبیعت کے چند قوانین (NATURAL LAWS) دریافت کئے۔ قوانین موجود تھے، بس انہیں کھوج کر نمایاں کر دیا، یہ ہے اس کا کل کارنامہ۔ آج ہم مارکونی کی ایجادات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن ایجادات نے ہماری طبیعتوں میں کتنا سدھار پیدا کیا ہے ؟ اور اللہ سے کتنا قریب کیا ؟ -

اسی بھائی نے پوچھا : اور غزالیؒ کی تحریروں اور کارناموں نے ہمیں اللہ سے کتنا قریب کیا ؟ -

اس کے ساتھی نے جواب دیا: غزالیؒ کی تحریروں نے ہمیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا، لیکن جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے ہمیں ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا کہ ہمیں نے انہیں کبھی استعمال ہی نہ کیا۔ مارکونی کی ایجادات سے تو ہم خوب مستفید ہوئے لیکن غزالیؒ کی تخلیقات پر ہم نے کبھی عمل نہ کیا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر مارکونی کے کارناموں پر جس طرح ہم نے توجہ دی ہے اسی طرح غزالی کی تحریروں اور تخلیقات پر بھی توجہ دی ہوتی تو کس قدر پاکیزگی اور عظمت انسانیت کے حصہ میں آتی اور اس کے جذبات و احساسات اور ارواح نیکی و بھلائی اور فضیلت کی طرف کتنی تیزی سے بڑھی ہوتیں!

اسی بھائی نے دوبارہ سوال کیا: تو کیا آپ لوگوں کو موجد ہونے سے روک دیں گے؟

اس کے ساتھی نے جواب دیا: میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ایجادات و اختراعات ناپسندیدہ ہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کی قدر و قیمت ان کے ایمان و اسلام سے کی جائے اور ان کے اعمال کا وزن اس حیثیت سے کیا جائے کہ انہوں نے ظاہری چھلکوں سے قطع نظر معانی کے مغز اور ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے انسانیت کو کیا دیا، اور غزالیؒ کی ایک رات میزانِ حق میں مارکونی کی پوری عمر سے بھاری ہے اور امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم کا صرف ایک صفحہ مارکونی کی تمام ایجادات سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں اس لئے کہ اگر آپ انسانیت کے ترقی یافتہ ضمیر کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ مارکونی کی تمام ایجادات کو دریا برد کر دے یا ان بلند اقدار، اخلاق فاضلہ اور خدا پرستی کی روح کو مٹا دے جو احیاء العلوم کے ایک صفحہ میں موجود ہیں، یہ تمام چیزیں مٹا دی جائیں اور ان کا کوئی وجود باقی نہ رہے، اگر انسانیت کے ضمیر کو ان

دونوں میں سے کسی ایک کو ختم کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو عظیم نقصان کا تصور کر کے وہ کانپ اُٹھے گا اور وہ اپنے آپ سے اس تجارت کی دھوکہ دہی اور عیاری کو دُور کر دیگا۔

ہمارے اندر یہ سمجھ کب آئے گی؟

کتنے ہی غلط افکار ہیں، فاسدانہ نظریات ہیں جنہیں سچی خدا پرستی ہی ٹھیک کرتی اور ان میں سے حق کی شکلیں ہمارے سامنے رکھتی ہے!!

۵ــ ذکر الٰہی سے اور معاشرتی روحانیت سے داعیٔ دین کا قلب سوز و گداز سے بھر جاتا ہے، وہ زندہ و بیدار اور ذکی الحس ہو جاتا ہے، روح قرآنی کے بہاؤ سے مستفیض ہوتا ہے، اس کے باریک اشارات نکال لاتا ہے، اس کی مخفی عبارتوں کو ڈھونڈھ لیتا ہے جس کی طرف لوگوں کی نگاہیں نہیں جاتیں۔ اور یہ اس داعیٔ دین کے لئے بہت ضروری ہے جو قرآن کریم کو اپنا سب سے بڑا سرچشمہ اور منبع تصور کرتا ہے۔

عقل عام قرآن کریم کے فہم کا حامل نہیں ہو سکتی اس لئے کہ قرآن اللہ کی رُوح ہے، محض معانی والفاظ نہیں ہے، اگر عقل کے لئے یہ ممکن ہو سکے ـــــ جو ناممکن ہے ـــــ کہ وہ الفاظ کو سمجھ لیں اور ان سے تمام معانی کا استخراج کر لیں تو یہ چیز تو ان کے مزاج ہی میں نہیں ہے کہ اس میں پوشیدہ الٰہی رُوح کا احساس بھی کر سکیں اس لئے کہ یہ عقلوں کا نہیں بلکہ دلوں کا کام ہے۔ اور یہ احساس، جو عبادت سے ماورا حقائق کو اجاگر کرتا اور الفاظ کے گریبان کو پھاڑ کر اسرار و اشارات نکالتا ہے، اس کے قابل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس سے نوازے گئے ہیں۔

عمر بن خطابؓ عبداللہ عباسؓ کی کمسنی کے باوجود ان کی بے حد قدر کرتے تھے اور

اور قرآن پاک کے فہم وتدبر کا جو حصہ وافر آپ کو ملا تھا، اس سے آپ اچھی طرح آگاہ تھے، آپ انہیں بدری شیوخ کے ساتھ اپنے مکان پر آنے کی اجازت دے چکے تھے اور یہ وہ لوگ ہیں جو فضل و مرتبہ میں سب سے بڑے تھے، ایک دن عمرؓ کو یہ احساس ہوا کہ اس سے بعض صحابہ اپنے دل میں ناراضگی محسوس کرتے ہیں چنانچہ کسی نے ٹوک دیا کہ یہ بچہ ہمارے ساتھ آپ کے پاس نہ آئے اس لئے کہ اس جیسے ہمارے پاس اور بھی بچے ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے مجھے بلایا اور ان شیوخ کے ساتھ مجھے بھی داخل ہونے کی اجازت دی، میرا خیال ہے کہ اس وقت مجھے بُلانے کا مقصد صحابہ کو محض دکھانا تھا۔ آپؓ نے سارے لوگوں سے پوچھا: تم لوگ اس سورہ کی تفسیر کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝ (نصر)

(جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دُعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔)

کچھ لوگ خاموش رہے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، کسی نے کہا: اس سورہ میں اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب ہمیں اللہ کی مدد مل جائے اور ہم فتح یاب ہوجائیں تو اس کی حمد کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں۔

میرے بھائی! آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تفسیر بالکل سیدھی سادی اور آیات کے

ظاہری مفہوم کے مطابق ہے لیکن عمرؓ، جن کے قلب وزبان پر اللہ نے حق نازل کر رکھا تھا، وہ ان سطروں کے درمیان مبہم اور غیر ظاہر اشاروں کو بھی دیکھ رہے تھے، چنانچہ آپ عبداللہؓ ابن عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے پوچھا: کیا تم بھی ابن عباس، یہی کہتے ہو؟ یہ کہتے ہیں کہ میں نے نفی میں جواب دیا تو آپؓ نے پوچھا: پھر تمہاری رائے کیا ہے؟ میں نے کہا: اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کی مقررہ مدتِ حیات ختم ہونے کی اطلاع دی ہے اور فرمایا ہے: ”جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے“ یہ اس کی بات کی علامت ہے کہ آپ کی موت قریب آگئی ہے، تو ” اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دُعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے“ حضرت عمرؓ نے کہا: میں بھی اس سورہ کے بارے میں یہی کچھ جانتا ہوں۔

آپ کے رب کی قسم، مجھے بتائیے کہ کون سی عقل سطروں کے درمیان اس باریک اشارہ کی طرف متوجہ ہو سکے گی؟ یہ اس دل زندہ کا راز ہے جو اللہ کے ذریعہ بہتر طور پر فہم حاصل کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ یہ پوچھیں کہ کہاں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہ تاویل صحیح ہے؟ اور کس بنیاد پر آپ نے صحابہ کے اقوال پر اس قول کو ترجیح دی ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ دلیل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی موت سے پہلے اکثر یہ حمد پڑھتے تھے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(اے اللہ تیری ذات پاک ہے، اور تیرے حمد کے ساتھ میں تجھ سے مغفرت کی دُعا کرتا ہوں اور تیری طرف پلٹتا ہوں۔)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! یہ کیسے کلمات ہیں جن کو

میرے خیال میں آپ نے کچھ ہی دنوں پہلے سے پڑھنا شروع کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

"میرے لئے میری اُمت ایک نشانی بنا دی گئی ہے جب میں مندرجہ ذیل آیت کو دیکھتا ہوں تو وہی دُعا پڑھتا ہوں: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ . . . . الخ۔"

بعض آیات کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے لیکن عقلیں اس تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ایک فقیہ اس کا ادراک کر لیتا ہے اور اس کی ایسی بہترین توجیہ و تاویل کرتا ہے کہ اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس کا حُسن وجمال نکھر جاتا ہے۔ کسی نے عاصم بن زیاد کی حضرت علیؓ سے شکایت کی کہ وہ کھردرا لباس پہنتے ہیں اور خوشبو نہیں لگاتے اور اپنے والدین کو اور اپنے بچوں کو پریشان کئے رہتے ہیں۔ آپؓ نے انہیں بُلوایا۔ جب وہ آئے اور حضرت علیؓ نے ان کے خشک اور ترش چہرے کو دیکھا تو فرمایا: عاصم، تمہارا بُرا ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ نے تمہارے لئے ان نعمتوں کو مباح تو کر دیا ہے لیکن ان کے استعمال کو وہ ناپسند کرتا ہے؟ تم اللہ کی نگاہ میں بہت حقیر ہو۔ کیا تم نے قرآن کی یہ آیات نہیں پڑھیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝

(رحمٰن: ۱۹، ۲۰)

(دو سمندروں کو اس نے جوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی اُن کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔)

پھر آگے اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ (رحمٰن: ۲۲)

(ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔)

بخدا لوگوں کے سامنے اللہ کی نعمت کا اظہار کثرتِ استعمال کے ذریعہ کرنا اس سے زیادہ مجبوب ہے کہ زبانوں سے اس کے تذکرے ہوں۔ تم نے قرآن کو یہ کہتے ہوتے نہیں سُنا:

وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾ (ضحیٰ : ۱۱)

(اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔)

یہ کتنا بہترین التفات (ATTENTION) ہے لیکن اس کی طرف وہی لوگ متوجہ ہوتے ہیں جو دل زندہ کے مالک ہیں، ہم کتنی بار قرآن کریم کی آیات پڑھتے ہیں لیکن حضرت علیؓ کی طرح کبھی ان کی تاویل و توجیہ نہیں کرتے اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے ان نعمتوں کو مباح کر دیا ہے لیکن کیا ان کا استعمال ان کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے؟

دیکھئے یہاں حضرت علیؓ کی تیز نگاہ نے اور ان کی ذکاوتِ حس نے ذہن کو یک بیک سورۂ رحمٰن سے سورۃ الضحیٰ کی طرف موڑ دیا اور بڑی تیزی سے اوپر کی دونوں آیتوں میں ربط پیدا کر کے ایسا معنیٰ نکال دیا جس کی طرف عام قاری کا ذہن کبھی نہیں جا سکتا یعنی یہ کہ اللہ کی نعمتوں کا استعمال کر کے اس کے فضل کا اظہار کرنا محض زبانی اظہار سے بہت بہتر ہے لوگوں کو حضرت علیؓ کی تبحرِ علمی پر حد درجہ حیرت تھی۔ انہوں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بیت کو کچھ خصوصی علم سے نوازا ہو۔ چنانچہ کسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا: ابوالحسن، اللہ تم پر رحم کرے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو کوئی ایسا علم بھی دیا تھا جو ہم لوگوں کو نہیں ملا؟ آپؓ نے فرمایا:

"نہیں، قسم ہے اس ذات کی جو دانہ کو پھاڑ کر پودا نکالتا ہے اور رُوح میں زندگی

دوڑاتا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے البتہ کتابِ الٰہی کی سمجھ وہ اپنے بندوں میں سے کسی کو دے دیتا ہے۔"

بسا اوقات معنیٰ بالکل واضح ہوتا ہے لیکن ارادوں کی پستی، متاعِ دُنیا کی دلچسپی، شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے قربت آدمی کی نظر کو ایسا بنا دیتی ہے کہ وہ چیزوں کو دیکھتا ہے لیکن اپنی خواہشات کے موافق خیالات ہی اخذ کرپاتا ہے اور یہ لوگوں کے درمیان بہت ہوتا ہے۔ ہم یہاں چند مثالیں دیں گے :

پہلی مثال

اللہ تعالیٰ کہتا ہے :

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ‌ ۚ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ ؕ (مائدہ : ۱۰۵)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔)

اس آیت کا مفہوم بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو بس اپنی فکر کرنی چاہیئے اسے دوسروں کی ضلالت اور گمراہی پر کڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ یہ ضلالت خود اس کی ذات تک محدود رہے گی اور اس کا نقصان صرف اسی کو پہنچے گا۔

قرآن پاک کی اس آیت کی یہ تفسیر محض شیطان کی در اندازی اور ارادوں کی پستی ہے اس لئے کہ یہ تفسیر قرآن کریم کی ان تمام آیات کی مخالف ہے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا واضح طور سے حکم دیا گیا ہے اور قرآن کی آیات ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہوسکتیں :

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (نساء: ۸۲)

(اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔)

یہ بات کہ ضلالت خود گمراہ انسان تک محدود رہے گی اور اس کا نقصان دوسروں کو نہیں ہوگا۔ قرآن کریم کی اس صریح آیت سے ٹکراتی ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ (انفال: ۲۵)

(اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔)

ہم یہاں ان احادیث کو پیش کر سکتے ہیں جو اس تفسیر کو مکمل طور سے منہدم کردیں لیکن ہم محض اس تضاد اور مناقضہ کو پیش کرنے اور اس آیت کی ایسی تفسیر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو اس کے الفاظ سے معنیٰ کو بغیر کسی تکلف کے نکال رہی ہے۔ نحوی قواعد کی رو، سے آیت امر اور جواب امر پر مشتمل ہے۔ امر ہے عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ اور اس کا جواب ہے لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ۔

ہم یہاں ایک مقدمہ اور ایک نتیجہ کی طرف آتے ہیں۔ مقدمہ یہ ہے کہ ہمیں ہر ممکن اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے اور جتنا ہمارے بس میں ہو پوری طاقت اس پر لگا دینی چاہیئے اور نتیجہ یہ ہے کہ یہ اصلاح ہمیں دشمنوں کی چالوں اور ان کی سازشوں سے محفوظ رکھے گی۔ یہ گمراہ لوگ ہمیں کچھ بھی زک نہ پہنچا سکیں گے۔ لیکن یہ مفہوم جو بہت سے

لوگ نکالتے ہیں، آخر کہاں سے پیدا ہوگیا؟ آپ اس آیت کو دوبارہ پڑھ لیجئے، اس کے علاوہ کسی اور مفہوم کی گنجائش ہی آپ کو نظر نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی طرف توجہ دیں اور اپنی تربیت و اصلاح سے غافل نہ ہوں اور اس کے لئے تمام وسائل و ذرائع استعمال کریں، اس میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہ لیں، اگر یہ لوگ خدا کے حکم پر لبیک کہیں گے تو دشمنوں کی ہمتیں پست ہو جائیں گی اور وہ مسلمانوں کو کوئی زخم نہ لگا سکیں گے۔

یہ آیت مسلمانوں کی جماعت کو خطاب کرتی ہے یا مسلمانوں کو بحیثیت ایک اُمت اور جماعت کے مخاطب کرتی ہے، انہیں انفرادی طور سے مخاطب نہیں کرتی، عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ کے الفاظ استعمال کرتی ہے عَلَيْكَ أَنْفُسَكَ کے الفاظ نہیں، ان دونوں خطابوں میں ٹھیک وہی فرق ہے جو اِن دونوں جملوں میں ہے کہ: اُمت کے اوپر واجب ہے کہ یہ کام کرے، اور فرد کے اوپر واجب ہے کہ یہ کام کرے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی اُمت کے لئے نجات کے اسباب اکٹھا کریں اور اس کے لئے امن و امان کا قلعہ قائم کریں، اور مسلمانوں کی اصلاح و حفاظت کے لئے دَورِ جدید کی روح اور ماحول کے مطابق جن اسباب و وسائل کی ضرورت ہے، اس کا تذکرہ نہیں کرتی لیکن یہ وسائل ہر زمانے میں مندرجہ ذیل بنیادوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے:

نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا اور اسلام کے پانچوں ستون کی پابندی کرنا، اس لئے کہ سب سے پہلے روح کی قوت کی ضرورت ہے اس کے بعد علم اور ہتھیار کی طاقت کی ضرورت ہے تاکہ اللہ کے اس قول کی منشا پوری ہو سکے:

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (انفال: ۶۰)

(اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو۔)

مکمل تیاری کے لئے ضروری ہے کہ تیر اندازی اور جنگ کے دوسرے تمام فنون میں ٹریننگ دی جائے۔ اگر مسلمانوں کی جماعت اپنے آپ پر اس طرف توجہ دے دے اور اپنی اصلاح و تربیت اس ڈھنگ سے کرے تو ان کے بدترین دشمن بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بھلا اِس مفہوم کا اُس تفسیر سے کیا تعلق، جو اُمت کے افراد کو تن تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے، جس کے مطابق ہر ایک کو دوسرے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتنے بڑے ہیں یہ پست ہمت والے لوگ؟!

دوسری مثال

ایک اخوانی کی اپنے ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو اس کے ساتھ دفتری کام کرتے تھے، تو اس نے اپنے دوست سے کہا:

میں تم سے ناراض ہوں، تم ہمارے ساتھ دعوت الی اللہ کا کام نہیں کرتے حالانکہ تم کو اللہ نے علم عطا کیا ہے، جوانی دی ہے، صحت اور تندرستی سے نواز رکھا ہے اور صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں ــــ تو اس کے دوست نے کہا:

ہمارا یہ دفتری کام بھی درحقیقت دعوتِ دین کا کام ہے، اگر اسے ہم بحسن وخوبی انجام دیں اور اس میں اللہ ہماری مدد کرے تو یہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اخوانی نے کہا:

یہ دفتری کام تو ہم دفتری بندشوں کے اندر رہتے ہوئے انجام دیتے ہیں، گھروں اور محلوں میں بیٹھ کر کرتے ہیں اور لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جبکہ ہم ایسی بلند

اور آزاد آواز چاہتے ہیں جو در و دیوار میں نہیں بلکہ عوام میں گونجے اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری سمجھ کر محض اس کی رضا کے لئے انجام دی جائے۔

اس کے ساتھی نے اپنی محنت اور جدّ و جہد کو کافی سمجھتے ہوئے قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن: ۱۶)

(لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو)

اخوانی نے کہا:

میرے دوست! یہ آیت تو تمہارے خلاف دلیل ہے نہ کہ تمہارے حق میں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصیبت کے وقت میں خدا سے ڈرو۔ نہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ جیسے چاہو اور جس قدر چاہو تقویٰ اختیار کرو بلکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تقویٰ اور خدا ترسی میں اپنی تمام صلاحیت صرف کردو، کوشش، علم، مال سب کچھ اس کی راہ میں قربان کردو اور ان میں سے کوئی چیز بچا نہ رکھو۔ اگر ہماری کوئی صلاحیت خدا ترسی کی راہ میں خرچ ہونے سے رہ گئی تو یہ اللہ کے حکم سے روگردانی ہوئی اور تقویٰ میں ہماری جانب سے کمی ہو گئی میرے بھائی! یہ آیت تو آپ کو یاد آ گئی لیکن یہ آیت کیوں بھول گئے کہ:

اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

(آل عمران: ۱۰۲)

(اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔)

اس پر اس کے دوست کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ آگے بڑھ گیا

آیتِ مذکور کی اس غلط تفسیر میں بہتیرے لوگ مبتلا ہیں۔ اور اسی طرح سے وہ اپنی تائید میں قرآن کی اس آیت کو بھی پیش کرتے ہیں:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (بقرہ: ۲۸۶)

(اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔)

شیطان کی وسوسہ اندازی اور انسان کی پست ہمتی، ان دونوں چیزوں نے مل کر غلط قسم کے لوگوں کو غذا فراہم کیا اور وہ دونوں آیات سے اس امر پر استشہاد کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کی وکالت کر رہا ہے اور کاہلوں اور سُست رفتار لوگوں کی جدوجہد کو قبول کرتا ہے۔

تیسری مثال

ہم اکثر مال و اولاد کے فتنوں سے لوگوں کو ہوشیار کرتے رہتے ہیں تاکہ قلب صحیح و سالم رہے اور اللہ کی طرف یکسو رہے۔ لیکن ایک شخص اُٹھتا ہے اور ہمارے خلاف اللہ کے اسی قول سے استدلال کرتا ہے:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (کہف: ۴۶)

(یہ مال اور یہ اولاد محض دُنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آزمائش ہے۔)

وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس آیت کی عبارت ہمیں خاموش کر دے گی اور ہماری بات کو غلط ثابت کر دے گی، حالانکہ یہ آیت اس کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف جاتی ہے۔ اگر واقعی وہ اللہ کے حکم پر عمل کرنا چاہتا ہے تو اسی آیت کے پہلو بہ پہلو یہ آیت بھی موجود ہے:

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ

فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ (تغابن : ۱۴)

(تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دُشمن ہیں، اُن سے ہوشیار رہو۔)

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ (تغابن : ۱۵)

(تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں۔)

لیکن چونکہ اس کا دین سے رشتہ کمزور ہے اس لئے وہ مندرجہ بالا آیت پر رک جاتا ہے اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ خوش حالی اور عیش کوشی کو قرآن میں زینت کہا گیا ہے جو مطلوب ہے۔ حالانکہ خود وہ آیت مال و اولاد کی تعریف میں نہیں نازل ہوئی ہے نہ اس میں کوئی ایسی عبارت ہے جس سے ان دونوں چیزوں کے حصول کی خواہش کا پتہ چلتا ہو بلکہ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے جو زہد اور قناعت سے ملتی جُلتی ہے گرچہ مکمّل زہد نہیں ہے۔ مال اور اولاد کو دُنیوی زندگی کی زینت کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اُخروی زندگی کی زینت نہیں ہیں، اور ان دونوں زینتوں میں کس قدر فرق ہے!!

اس آیت کے درمیان ایک مبارک مضبوط رُوح آپ کو ان لوگوں کے عیوب بتا رہی ہے جو اس بات پر راضی اور مطمئن ہیں کہ ان کے دل اخلاق فاضلہ کی زینت سے خالی ہوں اور اعلیٰ جمال تک ان کی ہمتیں اور ارادے بلند نہ ہو سکیں، جو اس سطحی خالی خولی زینت پر قانع ہو چکے ہیں جن کے مالکین بس بچوں کے بازار میں سامنے آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کھوکھلی گڑیوں میں یہ احمق دل چسپی لے رہے ہیں۔

اگر ہم پوری آیت کو پڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ خود اس کا آخری حصّہ پہلے حصّہ کے خلاف فیصلہ دے رہا ہے۔ ہمارا ایک اخوانی ساتھی ایک بار اسی طرح کے بھنور

میں پھنس گیا اور کسی نے اس پر اعتراض کر دیا چنانچہ اس نے فوراً جواب دیا کہ :

میرے بھائی اس آیت کو آخر تک پڑھ لیجیے خود ہی فیصلہ ہو جائے گا :

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۔۔

(کہف : ۴۶)

(اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے

بہتر ہیں اور اُنہی سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔)

اسی طرح کچھ لوگ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں مندرجہ ذیل آیت کو بھی پیش

کرتے ہیں :

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (قصص : ۷۷)

(اور دُنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔)

آپ فوراً اس آیت کا پہلا حصہ پڑھ دیجیے، اس کی زبان بند ہو جائے گی :

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ (قصص : ۷۷)

(جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر۔)

اس کے بعد آپ اس کی حق وصواب کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں۔ آپ پوری آیت کو

شروع سے آخر تک پڑھ دیجیے اور دونوں جملوں میں جو فرق ہے اسے واضح کر دیجیے۔

اسے بتائیے کہ یہاں ایک چیز کی طرف آگے بڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف

دوسری چیزوں کو نظر انداز کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ یہ آیت جن لوگوں کو مخاطب کر رہی

ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو بلند اقدار کی طرف مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور اللہ کی طرف

ان کی توجہ اور انابت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے لیکن دنیوی یافت کو وہ نظر انداز کرتے

جا رہے ہیں اس لئے انہیں ان یافتوں (FORTUNES) کی طرف توجہ دلائی گئی اور فرمایا گیا کہ
"دنیا سے اپنے حصے کو بھول نہ جاؤ"

اگر ہم کلامِ الٰہی کی کمزور اور بے بنیاد تاویلوں کا استقصاء کریں تو یہ میدان بہت وسیع ہے۔ ان اوہام اور غلط تاویلات کا پردہ چاک کرنے کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ دل بیدار ہو اور اس میں خدا پرستی کی روشنی موجود ہو اور یہ داعی کے لئے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، ناگزیر ہتھیار ہے۔

۶ — وہ داعیِ دین جو کارِ تجدید کے لئے اُٹھا ہے، ایک نئی مملکت تشکیل دینا چاہتا ہے اور کمال کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معاشرتی روحانیت کے الہام کی دُعا کرے اس لئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

یہاں کارِ تجدید سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اُمت کی اجتماعی، اقتصادی اور بین الاقوامی ان تمام حیثیتوں کو بحال کرنا چاہے جو ختم ہو چکی ہیں یا ان میں اضمحلال آچکا ہے۔

ایک نئی مملکت تشکیل دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی مملکت کی تشکیل کے لئے جدوجہد کر رہا ہو، جس کی مثال کہیں اور نہ ملتی ہو اور جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی مملکت کے مانند ہو۔

کمال کی طرف بڑھنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی اُمت کے سامنے تو پاتا ہے جو تمام قوموں اور ملتوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے لیکن کمال کی طرف اس کی پیش رفت اس کی ہمتوں اور حوصلوں کو بلند تر مقصد اور پاکیزہ تر نصب العین کی طرف آگے بڑھاتی ہے۔

ایسے داعیٔ دین کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اس معاشرتی روحانیت کے الہام کی دُعا کرے۔ اس کے بغیر وہ مجد و شرف میں اُلجھ جائے گا اور وہ تمام غلطیاں اور لغزشیں کر گزرے گا جن میں مجنوں اور پاگل لوگ ملوّث رہتے ہیں۔

مسلمان اس سرزمین میں اللہ کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے، وہ خدا کا سپاہی ہے جس کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے تاکہ وہ اس سرزمین کو تمام بُرائیوں سے پاک کر دے۔ اس ذمّہ داری کا تقاضا ہے کہ وہ تمام بُرائیوں کا مقابلہ کرے، ان کے پھندوں کو سمجھے، اور ان کے تمام المیوں (TRAGEDIES) کا احاطہ کرے۔ چنانچہ جب تک وہ صاف ستھرے وجدان اور زندہ قلب کا مالک نہیں ہوگا، اس وقت تک نیکی اور بدی کی اچھائی اور برائی کو نہیں پرکھ سکے گا نہ اسے یہ معلوم ہو سکے گا کہ کمزوری کہاں پیدا ہوئی ہے اور اس کا علاج کیسے کیا جائے۔ اسی لئے مسئلہ یہاں شعور و وجدان، آگاہی اور جذباتی ادراک (SENTIMENTAL OBTAINING) کا ہے۔ اس عقل کا مسئلہ بعد میں آتا ہے جو تنفیذ کے اقدامات کے خطوط کھینچتی ہے۔ اور شعور کے اندر چاہے کتنا ہی طبعی نکھار موجود ہو، اس کا اللہ سے تعلق ہر حال میں ضروری ہے اس سے کسی حال میں بھی بے نیازی نہیں برتی جا سکتی ورنہ جہالت، فتنہ اور انارکیت کا دور دورہ ہوگا۔

اس سپاہی پر واجب ہے کہ وہ ہمیشہ کمانڈر ان چیف — اور اللہ ہی کے لئے بلند صفات ہیں — سے ربط رکھے، اپنے دل کو اللہ کے لئے کھلا رکھے اور اس کے ذریعہ دوسری دُنیا کے اشارات و خطرات کی طرف کان لگائے رہے اس لئے کہ دل پر جب اللہ کی طرف سے کوئی چیز نازل ہوتی ہے تو وہ گداز ہو جاتا ہے اور اس کے اندر دھڑکن

اور رعشہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہاں یہ سپاہی اپنے دائرے میں چلتا ہے تو اس کے پاس احساس کا آلہ ہوتا ہے جو فساد اور شر کے اثرات و آثار دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے اور خیر و ہدایت اور نظام کے مظاہر کو دیکھ کر نارمل رہتا ہے اور اس کا کوئی اثر آپ کے نفس پر اس وقت پڑ سکتا ہے جب آپ کے اندر اس بات کی شدید خواہش ہو کہ آپ فساد کو دُور کرنے کے لئے اور معاشرے کو خیر کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے کام کریں گے اور صبح و شام گویا آپ کے دل میں ہر جگہ ٹیلیفون کی طرح سے آوازیں آ رہی ہوں گی کہ کام کیا جائے اور مطلوبہ چیزوں کو بروئے کار لایا جائے۔

ہم نے مقدمہ میں لکھا تھا کہ داعی اپنے ماحول کا ماہر سیاست (DIPLOMATE) ہوتا ہے، اپنے دائرے کا لیڈر ہوتا ہے اور اپنی فکر اور اپنے پیرو کاروں کی فکر کا رہنما ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کا افق کبھی بہت وسیع ہوتا ہے اور وہ پوری اُمت کا قائد اور اس کی فکر کا رہنما ہوتا ہے اور کبھی اس کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ کسی صوبے یا بستی کا لیڈر ہوتا ہے، اپنے محدود دائرے میں کام کرتا ہے، اپنی فکر کی روشنی عام کرتا ہے اور اس عظیم لیڈر سے اپنا تعلق جوڑنے کی تلقین کرتا ہے۔ ہم یہ اس لئے کہہ رہے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ سوچے کہ اصلاح و تربیت کا کام بڑے لیڈران تک محدود ہے اور جن کی دنیا بہت وسیع اور اثرات کافی ہوتے ہیں بس وہی یہ کام کر سکتے ہیں۔

اس عظیم کام کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ داعی اللہ کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرے اور جتنا ممکن ہو اپنی رُوحانی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدّوجہد جاری رکھے۔

۷۔ یہ معاشرتی روحانیت اس کی نفسی خوبیوں کو پروان چڑھاتی اور اندرونی طاقتوں (SENTIMENTAL FORCES) کو فضل واحسان کی عظیم چوٹی تک پہنچاتی ہے جہاں سے انسان لوگوں کی طرف نظر ڈالتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی پہاڑ کی بلند وبالا چوٹی سے نیچے انسانوں کے جمِ غفیر کو دیکھ رہا ہو، چنانچہ اس کی نگاہ میں سارے بھاری بھرکم جسم زائل ہوجاتے ہیں اور سب بونے معلوم ہونے لگتے ہیں ان کی ظاہری چمک دمک اور حُسن وجمال ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ سارے لوگ اس کی نگاہ میں بالکل بے وقعت اور یکسر کمتر ہوجاتے ہیں اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ سارے انسان اس داعیٔ دین کے سامنے کمزور ڈھانچے بن جاتے ہیں جو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں نہ خود کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں، اسی لئے وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا، کسی سے امیدیں وابستہ نہیں کرتا، کسی کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوتا چاہے طاقت ور افراد اپنی ساری طاقت اور پورا اقتدار استعمال کرلیں لیکن اس کے عزائم پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ جو شخص بلند افق پر کھڑا ہو وہ بھلا ان کمزور اور بے بنیاد اوہام سے کیسے دھوکہ کھا سکتا ہے۔ وہ تو شجاعت وجرأت کا پیکر ہوتا ہے، قوتِ خداوندی کا مظہر ہوتا ہے، دل میں جو رزقِ الٰہی بہم پہنچتا ہے اس کی بدولت وہ حد درجہ بے نیاز اور تونگر ہوتا ہے، خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے اور یہ سب داعیانِ دین کی ناگزیر صفات ہیں۔

۲۔ وہ اپنی بلند چوٹی اور وسیع وکشادہ جذباتی افق (SENTIMENTAL HORIZAN) سے عوام پر نگاہ ڈالتا ہے اور ان کی کمزوریوں اور برائیوں پر رحم کھاتا ہے جیسے کوئی

شفیق آدمی بچوں کی غلطیوں پر شفقت کھاتا ہے، اور نرمی و چشم پوشی، حکمت و موعظت حسنہ کی رُوح کے ساتھ ان کا علاج کرتا ہے، ان پر خفا نہیں ہوتا، انہیں ڈانٹ نہیں پلاتا، نہ ان کی جہالت سے وہ ان کی دُشمنی کرتا ہے بلکہ وہ صبر و حکمت، نرمی و دلجوئی، چشم پوشی اور عفو سے کام لیتا ہے، ان کی غلطیوں کا عذر خود ہی ڈھونڈھ لیتا ہے اور ان کی ہدایت کی ہمیشہ امید رکھتا ہے، اگر ان میں سے کوئی راہِ راست پر نہیں آتا یا وہ اپنی بیماری ہی پر اڑا رہتا ہے تو اس کی حالتِ زار پر رحم کھاتا ہے اور اسی طرح درد و کرب محسوس کرتا ہے جیسے کوئی رحمدل آدمی اپنے مریض کی عدمِ صحت پر تکلیف محسوس کرتا ہے۔ آخر کیا بات تھی کہ رسول اکرمؐ اپنی قوم کی حالت پر رنجیدہ تھے۔ ان کی ہدایت کے اتنے متمنی اور فکر مند تھے کہ قرآن میں آپ کو کہا گیا کہ:

"ان کے پیچھے حسرت و افسوس میں گویا تم اپنی جان ہی ہلاک کر دو گے۔"

یہ بلند اور پاکیزہ صفت ہی داعی کو دعوت الی اللہ کے کام کے لائق بناتی ہے، اس کے جذبات عالمگیر ہوتے ہیں، اس کا نفس خدا ترس ہوتا ہے، اپنے پیرو کاروں اور دشمنوں سب کے لئے اس کی نظر وسیع ہوتی ہے اور وہ سب کی بھلائی کا خواہاں ہوتا اور سب سے محبت کرتا ہے البتہ اپنے پیرو کاروں سے اس کی محبت اخوت اور بشاشت کی علامت ہوتی ہے جبکہ مخالفین سے اس کی محبت، ہمدردی اور شفقت کی غماز ہوتی ہے اور ان کی فلاح کی حریص اور مختلف وسائل سے ان کے علاج کی فکر مند ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے جذبات و احساسات انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوقات کے لئے بھی وسیع ہوتے ہیں یہاں تک کہ حیوانات و جمادات بھی اسی فہرست میں آتے ہیں۔ اوّل الذکر پر رحم کھاتا اور ان سے بہتر سلوک کی تلقین کرتا ہے اور آخر الذکر سے وفائے عہد کرتا ہے اور اس سے کئے گئے وعدوں

اور یادداشتوں کی وجہ سے اس پر شفقت کھاتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے۔

میرے مخلص بھائی!

یہ ہے معاشرتی روحانیت کی ایک جھلک، اسے اختیار کیجئے اور اس کے میزان پر اپنی حالت کو تولیے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس رُوحانیت سے آپ کو کتنا حصہ ملا ہے اور وہ آپ کے اندر کتنا نفوذ کر پائی ہے۔ میں خدا سے اپنے اور آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری کمزوریوں پر رحم کھائے۔ ہماری غلطیوں کی تلافی کر دے اور ہمیں فضل و حکمت کا اہل بنا دے۔ وہی توفیق دینے والا ہے اور بڑا زبردست احسان کرنے والا ہے۔

تیسری فصل

عملی مزاج EXECUTIVE NATURE

رُوحانیت آدمی کا خدا سے تعلق قائم کرتی ہے، اس کے اندر فریضۂ رسالت کی رُوح پھونکتی ہے اور اس کے مقصد و نصب العین سے آگاہی دلاتی اور اس کے لئے تحریک کرتی ہے۔

اور عملی مزاج (EXECUTIVE NATURE) انسان کو زندگی سے جوڑتا ہے تاکہ رسالت کی تعلیمات کو مفید اور نفع بخش اعمال اور صالح عمرانیاتی ڈھانچوں (GOOD CULTURAL PRACTICES) میں ڈھال سکے۔

یہی دونوں ایمان کے دو پہلو ہیں جن کا ایک مسلمان کے دل میں جمع ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص روحانیت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کی زندگی عمل سے محروم ہے تو اس کا ایمان ناقص ہے بلکہ کھوٹا اور مشکوک ایمان ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عملی زندگی میں پیش پیش ہو لیکن اس کی زندگی روحانی نہ ہو، خدا سے اس کا تعلق مضبوط نہ ہو تو وہ ایسا شخص ہے، جس نے صحیح نصب العین کھو دیا ہے اور ضمیر کی ہدایت سے محروم ہو چکا ہے۔

رسول اکرمؐ نے ایمان کی تشریح یہی کی ہے کہ: "ایمان محض تمناؤں کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان وہ ہے جو قلب میں اُتر جائے اور عمل سے اس کی تصدیق ہو۔"

ایمان کی بعض خصوصیات

مکمل اور صحت مند ایمان وہ ہے جو دل میں اتر جائے اور انسان کو عمل پر آمادہ کرے، اس کی کچھ متعین خصوصیات اور علامتیں ہیں جن میں سے چند اہم یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ رسالت کا فہم

۲۔ اس کی تعلیمات سے محبت اور اس کے جمال سے قلب کا لگاؤ

۳۔ محرمات کے خلاف غیرت کا جذبہ

فہم COMPREHENSION

فہم سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ داعیٔ دین بس رسالت کے تمام عناصر، اس کی ہدایات، اس کے اوامر و نواہی، اس کے حلال و حرام وغیرہ کا مکمل طور سے احاطہ کرلے کہ یہ تو عام طور سے لوگوں کو سمجھنا پڑتا ہے اور یہ تلقین کا معاملہ ہے یقین کا نہیں، فہم سے ہماری مراد یہ ہے کہ جذباتی فہم (SENTIMENTAL COMPREHENSION) ہو اور قلبی تصدیق (FAITH OF HEART) ہو اور یہ تصدیق دراصل وہ شعور ہے جو آدمی کے وجود میں اتر جاتا ہے وہ احساس ہے جو اس کے وجدان پر چھا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ رسالت کے ان تمام حقائق کا ادراک کرلیتا ہے جن تک عام عقلیں رسائی نہیں حاصل کرپاتیں اور اس فہم یا شعور کا سب سے نمایاں مظہر یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرلے کہ یہی پیغام اور رسالت حق ہے اور اس کے ماسوا باطل ہیں، اور حق و باطل کے درمیان اسی طرح تمیز کرنے لگے جس طرح ہم خواب میں دیکھی ہوئی صورتوں اور عالم بیداری و مشاہدہ کی صورتوں کے درمیان تمیز اور فرق کرلیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص

حق و باطل کو اس طرح سمجھ لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اسی طرح نمایاں طور پر تمیز کر لیتا ہے تو اسے قلبی ہدایت مل گئی، جذباتی فہم سے وہ ہمکنار ہو گیا اور مسلمانوں کی معیت میں رہنے کا اسے جواز مل گیا، لیکن اگر کسی کو یہ فہم نہ ملا ہو تو اسے جان لینا چاہیئے کہ وہ ابھی تک رشد کو نہیں پا سکا ہے چاہے ساٹھ ستر سال کی عمر کو وہ پہنچ جائے اور علوم و فنون کی اونچی اونچی ڈگریاں لے لے۔

وہ ظاہری علامت جو انسان کے فہم و شعور کا پتہ دے سکے، یہ ہے کہ وہ متاعِ دنیا کو باطل سمجھ کر اس کی آلائشوں سے دور رہے اور قیامت کو حق سمجھ کر عالمِ آخرت سے دل لگائے رہے اور موت سے پہلے اس کی تیاری کر لے۔ اور اس کے برعکس انسان کے فہم و شعور سے کورے ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ آخرت کی حقیقتوں سے آنکھیں میچ لے اور دُنیا کے اوہام و خرافات کو کچھ سمجھ کر ان کے جال میں پھنس جائے اور اس کی مثال اس بیوقوف کی ہو جائے جس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی آدمی سے سودے بازی کر رہا ہے۔ وہ دوسرا آدمی بیوقوف کو ننانوے ۹۹ قرش دینے کے لئے تیار ہے لیکن یہ سَو قرش سے کم لینے پر راضی نہیں ہے اور دونوں اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں، اسی حالت میں بیوقوف کی آنکھ کھل جاتی ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے وہ فوراً اپنی آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا ہے اور اپنے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میں ننانوے قرش پر تیار ہوں، لاؤ معاملہ مکمل کر لو۔

اگر پردے چاک کر دیئے جائیں اور ہم ایمان و فہم کی دولت سے مالا مال ہو جائیں اور لوگوں کے وجود اور اس کے حقائق پر نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس دھوکہ باز

دُنیا کی طرف مائل ہونے میں اکثر انسانوں کا رویہ اس بیوقوف سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے
تو دوبارہ آنکھیں بند کرکے قرش حاصل کر لینا چاہتا تھا۔
اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی اتباع کی توفیق دے اور باطل کا پردہ
چاک کردے اور اس سے دُور رہنے کی توفیق عطا فرما:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا
مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (آل عمران: ۸)

(پروردگار! جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں
کو کجی میں بتلا نہ کر دیجیو، ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی
فیاضِ حقیقی ہے۔)

تعلیمات سے محبّت

فہم ہمیں اس لائق بناتا ہے کہ ہم حق کی قدر کر سکیں اور اس کی قیمت جان سکیں،
لیکن وہ ایجابی قوت جو کارِ رسالت سے شغف پیدا کرتی ہے، اس میں نمایاں نہیں ہے،
چنانچہ اللہ نے دلوں میں محبّت ڈال دی اور اسے ایمان کی ایک خصوصیت قرار دیا۔
رسالت میں دل نوازی اور دل ربائی ہوتی ہے جس کا ادراک محبّت ہی سے کیا جا سکتا ہے
جس طرح محبّت کی نفاست کو فہم ہی سے پہچانا اور اخذ کیا جا سکتا ہے۔
اس محبّت کا تقاضا ہے کہ انسان طاغوت سے نفرت کرے، باطل سے بغض رکھے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم محبّت کی خصوصیت اس طرح بیان کرتے ہیں:
"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات میری
میری لائی ہوئی تعلیمات کے مطابق نہ ہو جائیں۔)

اور طاغوت سے نفرت کی خصوصیت اس طرح نمایاں کرتے ہیں:

"تین خصوصیات جس آدمی کے اندر ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔"

اور آخری خصوصیت آپؐ یہ بتاتے ہیں کہ:

"وہ کفر کی طرف پلٹنے کو اسی طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو وہ ناپسند کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ ان دونوں خصوصیات کو اس طرح جمع کرتا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۚ (حجرات: ۷، ۸)

(مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لئے دل پسند بنا دیا؟ اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں۔)

اور اس محبت کی نمایاں ترین دلیل یہ ہے کہ انسان دعوت الی اللہ کے لئے اُٹھ کھڑا ہو، پوری محنت اور لگن سے کارِ رسالت کی طرف لوگوں کو بلائے، اپنے اوپر اور خاندان کے اوپر اس کی تعلیمات کو نافذ کرے اور اس میں کسی ریا یا مفاد کا سوال نہ ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ کیسی محبت ہوگی کہ وہ اپنے مقصد کی تنفیذ اور اقدامات میں سستی دکھائے اور اس کی خاطر مشقتیں جھیلنے سے کترائے؟!

غیرتِ حق

غیرت محبت کے لوازم میں سے ہے، کوئی چیز جس قدر انسان کو محبوب ہوگی اور اس کے قلب سے جتنا زیادہ اسے لگاؤ ہوگا، اس کی حرمت اس کے نزدیک اتنی ہی زیادہ ہوگی اور یہ غیرت اس کی حدود کی حفاظت اور اس کے ممنوعہ علاقوں کی نگہداشت کے لئے اسے کھڑا کر دے گی۔

غیرتِ حق خود اللہ کی صفت ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں:

"اللہ کو بھی غیرت آتی ہے اور اس کو غیرت اس بات پر آتی ہے کہ کوئی مسلمان وہ کام کرے جو اللہ نے اس پر حرام کر دیا ہے۔"

مومن کی غیرت حق کی علامت یہ ہے کہ جب اللہ کے محارم (FORBIDDEN AREAS) کی پامالی ہو رہی ہو تو وہ غصہ سے بھڑک اُٹھے اور منکرات کے استیصال کے لئے وہ سراپا انقلاب بن جائے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

"رسول اکرمؐ ایک سفر سے واپس آئے۔ میں نے سُرخ رنگ کا ایک باریک پردہ لٹکا رکھا تھا جس پر مجسمے بنے ہوئے تھے، جب آپؐ نے اسے دیکھا تو تار تار کر دیا اور آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: عائشہ! قیامت کے دن سب سے سخت عذاب سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو اللہ کی مخلوق سے مشابہت کرتے ہیں۔"

اسی طرح غیرت کی علامت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پیغام کو بیکار اور معطل نہ دیکھ سکے یا کسی دوسرے نظریہ کے اقتدار کے سامنے جھکتا ہوا نہ دیکھ پائے۔ یہاں ایک سچے داعی اور فطری مومن کو ہم پائیں گے کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کرے گا کہ اپنے پیغام اور

مشن کے لئے روحانی و مادّی ہر اقتدار فراہم کرے جو اس کی حفاظت کی مکمل ضمانت لے سکے۔

عملی مزاج کا مفہوم

ہم اوپر کی سطروں سے یہ نتیجہ نکالنا پسند کریں گے کہ ایمان محض سلبی روحانیت کا نام نہیں ہے کہ بس اللہ سے تعلق جڑ جائے بلکہ یہ اس سے آگے بڑھ کر ایک ایسی ایجابی قوت ہے جو تنفید (IMPLITATION) پر ابھارتی ہے اور عمل کے لئے آمادہ کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ وہ خدائی سِرّ (DEVINE SACRAMENT) ہے جو داعیٔ دین کے قلب وذہن میں روشن ہے جس کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اس کے رسالت اور مشن کو عملی زندگی میں کھینچ لائے چنانچہ اس کے قلب وذہن میں اس وقت تک چین وسکون اور اطمینان نہیں پیدا ہوسکتا جب تک زندگی کی ہر چیز دعوت کے طریقہ کار اور اس کی تعلیمات کے مطابق نہ ڈھل جائے۔ ورنہ اس کو عمل صادق اور جہادِ قوی میں لگے رہنا ہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ اسی دُنیا میں اس کی آنکھیں ٹھنڈی کرے یا کسی اور چیز کا فیصلہ کردے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس روشن سرِّ الٰہی کی دو واضح خصوصیات ہیں:

۱۔ یہ وہ بھڑکتا ہوا انگارہ ہے جس سے داعی قوت عمل اور غیرت حق اخذ کرتا ہے۔

۲۔ یہ ایک قوت محرکہ (AWAKING FORCE) ہے جس کی وجہ سے داعی یہ احساس رکھتا ہے کہ تنفید اور عمل کی طرف بڑھنا ناگزیر ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ روحانی دھکا (SPRITUAL THRUST) ہے جو انسان کے اعضاء کو عمل کی طرف دھکیلتا ہے۔ اگر انسان اس دھکے کا احساس کرے اور اس پر لبیک کہہ بیٹھے تو اسے بڑا آرام اور عمیق لذت

محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس کی طرف توجہ نہ دے، اور ردِّعمل و تنفیذ کا کام نہ کرے تو وہ مسلسل گھٹن کے ماحول میں رہتا ہے اور اسی کو ہم عملی مزاج (EXECUTIVE NATURE) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگر یہ سرِّ الٰہی نہ ہو تو داعی کی حیثیت ان لوگوں سے چنداں مختلف نہ ہوگی جن کے ذہن و دماغ میں اصلاح کے نام پر مختلف اوہام و خرافات بسیرا کئے رہتی ہیں اور جو اُمّت کو تمام تر فائدہ صرف اتنا پہنچاتے ہیں کہ کوئی مقالہ لکھ دیتے ہیں یا کوئی لیکچر دے دیتے ہیں اور اس کے بعد اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ قارئین یا سامعین ان کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی تقریر و تحریر پر مبارک باد پیش کریں اور ان کے دل و دماغ میں خوشی کی لہر دوڑ جائے اور وہ خود مصنوعی تواضع اور خاکساری کے لبادے میں لپٹے رہیں۔ میں اس مبارکبادی اور واہ واہ کو ایک ٹریجڈی سمجھتا ہوں جس سے غم اور افسوس ہونا چاہیئے نہ کہ خوشی۔ اس لئے کہ اگر فطری داعی کی تمام تر یافت صرف اتنی ہو کہ لوگ اس کی تقریر و تحریر پر تعریفوں کے پل باندھ دیں تو حسرت و غصہ سے اس کا جگر پاش پاش ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی نہیں چاہتا، وہ اپنی تعریف و تحسین نہیں چاہتا نہ ان بیوقوفوں کی یہ حالت دیکھنے کی طاقت رکھتا ہے کہ بے پرواہی سے یہ اس کی تقریر و تحریر سے الگ تھلگ ہو جائیں اور اپنی جمود و اضمحلال کی زندگی میں جمائی لیتے رہیں۔

یہ سرِّ الٰہی نہ ہو تو داعیٔ دین بھی ان لوگوں کی طرح ہو جائے گا جو ریا کے لئے تقریر کرتے ہیں اور شہرت و ناموری اور روزی روٹی کماتے ہیں —— گرچہ مندرجہ بالا صفات داعیٔ دین کا فطری امتیاز ہیں لیکن ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ داعیٔ دین پر واجب ہے کہ ایسا ہو ورنہ اپنے آپ کو آرام پہنچائے اور اس پر وہ ذمہ داری نہ ڈالے جو اس کے مزاج میں شامل

نہیں ہے۔ نہیں، بلکہ ہماری تمام تر ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اُن عظیم داعیان کرام کی طرف دیکھیں جن کو اللہ نے تعمیر و تشکیل کے لئے مبعوث فرمایا تھا اور ہم اس تاک میں رہیں کہ جتنا ممکن ہو سکے ان کی صفات اور ان کا امتیاز اختیار کریں پھر ہم اسے اپنا آئیڈیل بنالیں جسے اصلاح و تربیت سے دل چسپی رکھنے والے داعیانِ دین اپنے سامنے رکھیں۔

ان عظیم داعیان کرام سے ہماری مراد صرف انبیاء کرام علیہم السلام بلکہ صرف رسول اکرمؐ ہیں اس لئے کہ آپؐ کے اندر سارے انبیاء کی صفات جمع تھیں اور ان کے نفسی و علمی تجربات کے نتائج سے آپ نوازے گئے تھے، اگر ہم آپ پر نگاہ ڈالیں اور دعوتِ دین کی راہ میں آپؐ کو اپنا اسوہ بنالیں تو وہ بہت سی فطری صفات جن سے ہم محروم ہیں، تجربہ اور مشق سے ان کا ایک حصہ ہم حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ عملی مزاج کیسے پیدا ہو؟

خیر کی رغبت رکھنے اور اس کی دعوت دینے والے پر صرف یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بالاستیعاب مطالعہ کرے، دعوتِ دین کی راہ میں آپ کی کوششوں اور محنتوں کا جائزہ لے اور قرآن میں آپ کی رسالت کی جو روح بیان کی گئی ہے، اسے اخذ کرے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے اس مشن کو ہمہ گیر اور واضح قواعد کی شکل میں جمع کر دیا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قواعد کو اوامر و نواہی کی شکل میں جاری و ساری کر دیا ہے جو قاری کو تنفیذ کے دروازے پر کھڑا کر دیتے ہیں اور عمل کے راستے کے سرے پر پہنچا دیتے ہیں بس اس کا کام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اپنا سفر شروع کر دے اور ان تمام اوامر و نواہی کو نافذ کرے جنہیں اللہ نافذ کرنا چاہتا ہے، فقط ایک

پیروکار کی رُوح کے ساتھ نہیں بلکہ ایک داعی کے جذبے کے ساتھ یہ فریضہ انجام دے جس پر دعوت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ پھر وہ جلد یا بدیر یہ محسوس کرے گا کہ اس عملی مزاج کی شعاع اور اس مقدس شعلہ کی چنگاری اللہ کی توفیق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں ضوفشاں ہو چکی ہے۔

ہم یہاں ایک حقیقت کی طرف اور اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس ضوفشاں تنقیدی و عملی مزاج کو داعی کی رُوحانیت سے پوری طرح متصل ہونا چاہیئے، اسی کے اشارے پر کام کرنا چاہیئے اور اسی کے چشمہ سے قوت حاصل کرنی چاہیئے۔ ہم اور ہمارے ساتھ ساتھ پوری پاکیزہ عالمی انسانیت ——— نہ کہ وہ مادہ پرست انسان جو وطن و قوم کی حد بندیوں میں محصور ہیں ——— ہر ایسے شخص سے بری اور الگ تھلگ ہیں جو منفعل المزاج ہو، بغیر ہدایتِ الٰہی کے کوئی اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتا ہو یا کوئی عملی اقتدار قائم کرنا چاہتا ہو جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو ان اصولوں کی دعوت دے رہا ہو جنہیں اس کا بگڑا ہوا مزاج درست اور صحیح سمجھتا ہو۔ ہم معاشرتی روحانیت کے باب میں اس امر پر گفتگو کر چکے ہیں کہ تجدید اور تشکیل مملکت کا کام کرنے والے داعیانِ دین کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اس حق کے الہام کی دُعا کریں جو کبھی بھٹک نہیں سکتا۔ اس کے بغیر داعیانِ دین ان لوگوں کی طرح ہو جائیں گے جو موہوم مجد و شرف سے لگے رہتے ہیں اور وہ ساری غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جو مجنوں اور پاگل کرتے ہیں۔

اس مخبوط الحواس اور مجنوں گروہ سے ہم بری ہیں اور نوجوانوں اور دوسرے تمام لوگوں کو خبردار کرتے ہیں کہ اس صنف کے قریب نہ آئیں کہ یہ اللہ سے دُور ہیں، حق سے ہٹے ہوئے ہیں، خود اپنے لئے اور پوری انسانیت کے لئے بلائے بے درماں ہیں اور ہم

اپنے نوجوانوں اور داعیوں کو ہوشیار کرتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے اللہ سے تعلق کو مضبوط تر کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہماری جوانی کی طاقتیں اور مجد و شرف کے لئے بھڑکتی ہوئی ہماری چنگاریاں مقصد کے حصول کے لئے کافی ہیں، نہیں میرے جوان دوستو اور داعی بھائیو، وہ نور ناگزیر ہے جس کی روشنی میں تم چل سکو اور جس کے اشارے پر کام کر سکو ورنہ کتنے ہی بگٹٹ گھوڑے ہیں جو بغیر کسی رہنمائی کے سرپٹ دوڑ رہے ہیں اور آخر کار ٹکرا کر ہلاک ہو جائیں گے۔

مقصود کا علم ہو

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ داعیانِ دین سے کیا مطلوب ہے اور کس چیز پر عمل کرنا اس کے لئے ناگزیر ہے؟

ان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اپنے مشن کے اصولوں اور اس کی تعلیمات کو اپنے سینے اور اپنی فکر میں مقید کر کے نہ رکھیں بلکہ انہیں اجتماعی ڈھانچوں میں ڈھالیں اور زندہ عملی شکل اور عمرانیاتی نظام میں تبدیل کریں تاکہ اس کے ذریعہ عوام اپنی معاش اور معاد کو سدھار سکیں۔

یہ نہایت مختصر گفتگو ہوئی، اس سے قارئین کو تشفی نہیں ہو سکتی۔ یہاں پھر سوال پیدا ہو گا کہ وہ اپنے مشن کو ان ڈھانچوں میں کیسے ڈھالیں؟ اور کس بنیاد پر یہ کام کریں؟ جو شخص فطری طور پر داعی ہے، اس کے لئے تو اس سوال کا جواب تلاش کرنا بے معنیٰ ہے کہ اس کے پاس اس کے قلب کا شعور اور اس کے رب کی وحی ہے جو اس کے لئے راستہ روشن کرے گی لیکن یہاں جن داعیانِ دین کا ذکر ہو رہا ہے،

ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ اس حق کی روشنی کی جستجو میں لگ جائیں جس سے ان کا نفس قرار پاسکے۔

مقصود اللہ ہے

تنفیذ وعمل کے میدان میں داعیانِ دین کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنا مقصود پہچانیں اور اسے اچھی طرح سمجھ لیں، اگر یہ کام ہو جائے تو وہ اپنی فطرت کی بنیاد پر اس لائق ہو سکیں گے کہ ان وسائل کا ادراک کر سکیں جو اس مقصد کے حصول کے لئے ناگزیر ہیں۔ داعیِ دین کا مقصود وہی ہے جو اس دُنیوی زندگی کے ہر انسان کا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرق میں رہتا ہو یا مغرب میں، سب کا مقصود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے ہر داعی اور ہر انسان کے لئے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ازاول تا آخر اللہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور کسی بھی لحاظ سے غیر اللہ کے لئے اس کی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔

مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ میری اس گفتگو میں جادو ہے نہ عوام کے لئے کوئی کشش، اس لئے کہ نوجوان اور بوڑھے سب مادی تہذیب کی آرائش اور عصرِ جدید کے واقعات سے بری طرح متاثر ہیں، مال و دولت، صنعت وحرفت اور جنگ و سیاست کی دُنیا میں شخصی مفاد اور ذاتی وقار انہیں آزمائش میں ڈالے ہوئے ہے تو اقتدار کی بہتات اور نو آبادیات کی کثرت انہیں مملکت کے مجد و شرف کے سحر میں مبتلا کئے ہوئے ہیں، یعنی ذاتی مفاد یا مملکت کے مفاد اور وقار یہی دو عوام کی نظروں کا مرکز اور ان کے عزائم کا قبلہ وکعبہ ہیں اور ہر وہ گفتگو جو انہیں ان دونوں مقاصد کی طرف موڑے، ان کی نگاہ میں برق آفریں ساحرانہ اور متاثر کن گفتگو ہے جس سے ان کے فریب خوردہ

دل بہت خوش ہوتے ہیں۔

اے لوگو! ہم اللہ کے لئے پیدا کیے گئے ہیں، ان اوہام و خرافات کے لئے نہیں، اور ہر طرح کا مجد صرف یہ ہے کہ انسان اس بلند نصب العین کی راہ میں کامیاب ہو جائے۔ اگر اس گفتگو میں گرج اور چمک نہیں ہے تو فطرت کی منطق ضرور موجود ہے جس کے سامنے دل جھکتے ہیں اور جس کی طاقت کا طبیعتیں لوہا مانتی ہیں۔ ہم اللہ ہی کے لئے پیدا کیے گئے ہیں، چاہے ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں، اس کی طرف ہمیں لامحالہ پلٹنا ہے، چاہے ہم اس کی بات مانیں یا ٹھکرا دیں، انسان کے لئے بہتر یہ ہے کہ جن امور کو اپنانا ناگزیر ہے انہیں عزت و کرامت کے ساتھ اپنائے، بجائے اس کے کہ ذلت و رسوائی کے ساتھ انہیں اختیار کرنے پر اسے مجبور کیا جائے، آسمان و زمین نے اللہ کی قوت اور اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا جب اللہ نے ان دونوں سے کہا کہ اطاعت کے لئے آجاؤ تو دونوں برضا و رغبت آ گئے:

ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ۖ قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۝

(حم السجدہ: ۱۱)

"تم دونوں وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔ دونوں نے کہا "ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔"

اب جس شخص کے اوپر فریب و غرور کا شیطان ہے تو اسے بھی خدا کی طرف پلٹنا ہے وہیں وہ حقیقت اس پر کھلے گی جس سے وہ تجاہلِ عارفانہ برت رہا تھا اور پھر حسرت و ندامت اسے آئے گی لیکن اس وقت ندامت کچھ کام نہ آئے گی اور اس کی ذلت و رسوائی اور اپنے خلاف غصہ فزوں تر ہو جائے گا کہ اس نے وہ چیز بھی نہ دیکھی جسے اندھا دیکھتا تھا اور وہ حقیقت بھی نہ سمجھ سکا جسے جمادات سمجھتے تھے، یہ حقیقت اور خدا کا واعظ بھی اسے حسرت و افسوس کے موقف

میں کھڑا کردے گا:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ (ق: ۲۲)

(اس چیز کی طرف سے تو، غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ (انعام: ۳۱)

(نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا، جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس! ہم سے اس معاملہ میں کیسی تقصیر ہوئی" اور ان کا حال یہ ہوگا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے، دیکھو! کیسا بُرا بوجھ ہے جو یہ اُٹھا رہے ہیں۔)

اگر داعی دین اپنی غایت پہچان لے تو اپنی ذمہ داری پہچان لے گا اور اس حقیقت کا ادراک کرلے گا کہ اس نصب العین تک پہنچنے اور اس راہ کے تمام مراحل طے کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کمربستہ ہوجائے اور اپنی تمام فکری جدوجہد اور جذباتی و بدنی صلاحیتیں صرف کردے۔

یہی وہ محور ہے جس کے گرد اللہ کے پیغامات اور انبیاء، رسولوں اور اولیاء پر نازل ہونے والی وحی اور علم گھوم رہا ہے۔ جو شخص ان تمام پیغامات کو ایک کلمہ یا ایک نصیحت کے

اندر دیکھنا چاہے تو اسے اس حقیقت پر نظر ڈالنی چاہیئے کیونکہ وہ یہ محسوس کرے گا کہ ساری چیزیں اسی حقیقت کا رُخ کر رہی ہیں اور اسی کے پاس جمع ہو رہی ہیں، اور میں یہ بات کہہ کر اللہ کے خلاف اور اس کی رسالت کے خلاف بہتان تراشی نہیں کر رہا ہوں کیونکہ یہ خود خدا کا حکم ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۔ (سبا: ۴۶)

(اے نبیؐ! اِن سے کہو کہ " میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، خدا کے لئے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مِل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو۔

ہمارا مقصود اللہ تعالیٰ ہے، ہم اپنے ہر قول و فعل سے اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا کی طرف جانے والا ہمارا راستہ آسان پُر سکون اور مامون ہو جائے، اور یہ اپنے تئیں اور عوام کے تئیں داعیٔ دین کی ذمہ داری ہے اور اسی کی تنفیذ ہم علمی مزاج کے حوالے کرتے ہیں۔

دل کو زندہ کرنا

سوال یہ ہے کہ خدائی سفر کو آسان، پرسکون اور مامون بنانے کا مطلب کیا ہے؟ ہم خدائی راستہ پر مارچ کرنے جا رہے ہیں، ہم اگر اس راہ کے تمام مراحل اس کی مرضی کے مطابق طے کر لیں تو ہم اس کی نگاہ میں قابلِ تعریف ٹھہریں گے اور اپنا پڑاؤ اس کے فضل و کرم کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ڈالیں گے:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا

يَعْلَمُوْنَ ۝ (عنکبوت : ۶۴)

(اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔)

سفر کا آغاز موٹر گاڑی یا ٹرین سے نہیں ہوگا بلکہ دل کے ذریعہ یہ مسافت طے کی جائے گی اور اس سفر میں قلب ہی سب کچھ ہے، اسی سے انسان اپنی منزل مقصود دیکھتا ہے یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بقول وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور ہمارا مقصود نگاہوں سے نہیں بلکہ ان دلوں سے دیکھا جا سکتا ہے جو سینے میں ہیں اور جب تک انسان اپنا مقصود نہ دیکھ لے، اس کی طرف جانے والا راستہ نہیں پا سکتا نہ اس کے جمال و کمال سے واقف ہو سکتا ہے۔

اسی دل کے ذریعہ مقصود تک پہنچنے کا راستہ واضح ہوتا ہے، چنانچہ دل زندہ پر اس راہ کے نقوش خلط ملط نہیں ہوتے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ

(انعام: ۱۲۲)

(کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اُسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور وہ کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو۔؟)

اور یہاں نقوش سے مراد نیکی و بدی، اچھائی و برائی، مضر و مفید اور حلال و حرام ہیں۔

یہی دل ہے جو مقصود کی طرف انسان کے شوق و رغبت کو دو چند کرتا ہے اور اس کے

ارادوں اور اس کی ہمتوں کو بلند کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس راہ کے تمام مراحل اور گھاٹیاں اس پر آسان ہوجاتی ہیں اور جب بھی اس پر اضمحلال یا اکتاہٹ طاری ہوتی ہے تو امن و سلامتی کے گھر کی ایک کرن اس کے اندر عزم اور حوصلہ جگادیتی ہے اور اس کی امیدیں شاعر کے قول کے مطابق زندہ و بیدار ہوجاتی ہیں :

لَهَا اَحَادِيثُ مِنْ ذِكْرَاهَا تَشْغُلُهَا

عَنِ الطَّعَامِ وَتُلْهِيهَا عَنِ الزَّادِ

اِذَا اشْتَكَتْ مِنْ كَلَالِ السَّيْرِ اَوْعَدَهَا

رُوحُ الْقُدُومِ فَتَحْيَا عِنْدَ مِيعَادِ

میرے پیارے بھائی!

اس ازلی سفر میں قلب ہی پر ساری چیزوں کا دارومدار ہے، آپ کی زندگی میں اصل اہمیت اسی چیز کی ہے، جسم تو بس اس کی سواری ہے یا حفاظت کرنے والا برتن ہے، مختلف مقامات پر یہ بات گزر چکی ہے کہ انسان کی حیثیت بس اس کے قلب کی وجہ سے ہے، داعیانِ دین کے ماٰخذ کے باب میں یہ بات آئے گی کہ یہ امر ناگزیر ہے کہ قرآن کریم پڑھنے کی اول و آخر غایت دلوں کو زندہ کرنا اور ذکر الٰہی کے ذریعہ ان کی سلامتی و اطمینان کی نگہداشت کرنا ہے اور حضرت رسول اکرم کی پوری سیرت قریب یا بعید سے، براہِ راست یا بالواسطہ اسی مفہوم کو اجاگر کرتی ہے، ہم نے ابھی پیچھے کہا ہے کہ اس طرح کی گفتگو میں کوئی کشش یا جادو نہیں ہوتا، تو کیا یہ فریب خوردہ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم جسم کی خدمت کی تنظیم کے لئے نازل ہوا ہے یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت ہمیں اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ اس سواری کے لئے توشہ کیسے جمع کیا جائے؟ اگر انسان اس بات کا نام نہیں ہے کہ شرافت و پاکیزگی کے مفاہیم، مواسات و ایثار کے جذبات اور ذکر و تقویٰ کی طمانیت پر مشتمل ہو تو کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان، اس کے کھانے اور پہننے والے جسم اور بھوکی اور حریصانہ شہوات کا نام ہے؟

میرے بھائی!

مقصود کو جاننے کے بعد داعئ دین کی ذمّہ داری صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ دلوں کو زندہ کرنے کی کوشش کرے، خدائی سفر کو آسان پرسکون اور مامون بنانے کی جدّوجہد کرے، اس راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آنے دے جو قلب کو مضمحل کردے یا اس کی

چنگاری کو بجھا دے اور یہ مقصد میری نگاہ میں دو وسائل اپنا کر حاصل ہو سکتا ہے :

پہلا وسیلہ ــــــ مقصود کی یاددہانی

سب سے پہلے ہمیں یہ کام کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان کو مقصود کی برابر یاددہانی کراتے رہیں، اسے اس راہ میں لگادیں، وہ اسی کے لیے غور وفکر کرے، اسی کی طرف ہمہ آن متوجہ ہو۔ اور دل کو زندہ رکھنے کا توشہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس مقصود کی معرفت حاصل ہو، اس سے لگاؤ اور عشق ہو اور اس کے بارے میں انسان مسلسل غور وفکر کرتا رہے، اوپر کی آیت میں ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ داعیانِ دین کی مسلسل تذکیر کیسے ہو؟ تو اللہ نے ہمارے اوپر نماز فرض کی ہے۔ اور اس سے دُعا و مناجات اور اس کی حمد و توصیف کے لئے اسے عملی اسباق کی حیثیت دی گئی ہے اور روزِ جزا کے بارے میں غور وفکر اور صراطِ مستقیم کی تلاش و جستجو کے لئے نماز کو عملی مظہر بنایا گیا ہے۔ اور داعیانِ دین کے لئے اس کام کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ مسجد بنائیں تاکہ یہ ربانی مدرسہ کا کام دے سکیں جہاں طالبانِ ربانیت ارشاد و ہدایت کے اسباق لے سکیں "روزانہ پانچ پیریڈ"۔

یہ ایک الٰہی رہنمائی (DEVINE GUIDENCE) اور عملی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے داعیانِ دین کے لئے متعین کیا ہے تاکہ مقصود کی تعیین اور اس کی تذکیر میں اس کی ہدایت اور مرضی کے مطابق وہ کام کر سکیں، اس لئے ہمارے داعیانِ کرام پر فرض ہے کہ وہ لوگوں کو نماز کی اقامت پر اُبھاریں اور مسجد سے انسیت اور رُوحانی لگاؤ پیدا کریں،

اور لڑکوں اور لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجز کے نصابِ تعلیم اس طرح بنائے جائیں کہ بنیادی مقصود کی یاددہانی ہوتی رہے، اس کی طرف توجہ دلائی جاتی رہے اور چھوٹوں بڑوں کے دلوں میں اس کی تخم ریزی ہوتی رہے، اس کے علاوہ فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات و رسائل اور وہ تمام اسبابِ ابلاغ ایجاد ہو رہے ہیں، ان سب کو استعمال کیا جائے اور کسی حالت میں بھی اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ یہ تمام مؤثر وسائل کھوٹی باتوں کو ثابت کرنے، فاسد اصولوں کو عام کرنے اور لہو ولعب اور باطل کی زندگی کی طرف عوام کی رہنمائی کرنے میں صرف کئے جائیں اور داعیانِ حق اس تمام صورت حال کا خاموشی سے مشاہدہ کریں جیسے وہ دیکھ رہے ہوں نہ سُن رہے ہوں اور نہ اس دور کی زندگی کے ساتھ جی رہے ہوں۔

دوسرا وسیلہ مختلف اثرات سے قلب کی حفاظت

جب یہ ثابت ہو گیا کہ خدائی سفر کی تمام محرکات میں سب سے اہم دل ہے یا یہ وہ اہم ترین چیز ہے جو مقصود کو سامنے لاتی، راستہ روشن کرتی، عزائم کو زندہ کرتی اور حوصلوں کو ابھارتی ہے، تو ضروری ہے کہ ہم اسے وہ سکون اور فارغ البالی عطا کریں جو اسے مسلسل ذکر وفکر میں لگائے رکھے اور پوری طمانیت وسکینت کے ساتھ اخبات وانابت الی اللہ پر جمائے رہے۔

میری رائے میں جب قلب اس فارغ البالی اور سکون سے ہمکنار ہو جاتا ہے جس سے وہ ہنگامی اثرات سے محفوظ رہ سکے تو ہدایت اور صراطِ مُستقیم پر رہتے ہوئے وہ اپنے مقصود کی طرف بڑھتا جاتا ہے، ان اثرات کو مختصر طور پر مندرجہ ذیل شقوں میں بیان

کیا جاسکتا ہے:

(۱) معاشی اثرات

زندگی کی ضروریات اور اقتصادی زندگی سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں انسان کے قلب پر زبردست اثر ڈالتی ہیں جیسے فقر و مفلسی، بیکاری، بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے بے روزگاری، قرضوں کا بوجھ، آفات و مصائب کا نزول، یتیمی، مفلسانہ بیوگی اور اس کی دوسری چیزیں انسان کے قلب وذہن کو پریشان کردیتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان فکر و غم کے ہجوم اور ذلت وحیرانی کے حملوں میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ تو کیا انسان کا قلب پُرسکون اور مطمئن رہ سکتا ہے جبکہ یہ فکر و غم اسے مختلف خانوں میں بانٹ دیتے ہیں؟

داعیٔ دین کی ذمہ داری ہے کہ اس حقیقت کا ادراک کرے اور اس سے قلب کو بچانے اور اسے امن وسلامتی اور ذکر و فکر کی نعمت میں باقی رکھنے کے لئے انتھک کوشش کرے۔ ہم دوبارہ یہاں ذکر کرنا پسند کریں گے کہ قلب کی حفاظت ان تکمیلی امور میں سے نہیں ہے جن کا خیال کرنے میں انسان بسا اوقات سُستی برت جاتا ہے اور نہ یہ نعمت عیش کوشی اور خوش حالی میں اضافہ کی صنف سے ہے، یہ تو اولین ضرورت ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جس کے بغیر جینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہ سراپا نجات ہے اس کے علاوہ محض ہلاکت اور تباہی ہے، اور اس کا وہی ادراک کرسکتا ہے جو یہ سمجھتا ہو اور یقین رکھتا ہو کہ وہ دُنیا کے لئے نہیں بلکہ آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ہم جب انسان کی معیشت سے متعلق ان اثرات کا تذکرہ کریں تو ہلاکت کے تمام اسباب وذرائع کا ذکر بھی ضرور کریں اس لئے کہ انسان کی ہلاکت کے بعد اس کی اصلاح کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہتا پھر یا تو ہمیشہ کے لئے جنّت ہوگی یا ہمیشہ کے لئے جہنّم۔ جب

حکومتیں انسانوں کی صحت وحفاظت کے لئے مختلف دباؤ سے جنگ کرنے میں پہل کرتی ہیں تو اس سے کہیں تیزی اور مسابقت اس بات میں ہونی چاہیئے کہ قلب کو اس پر نازل ہونے والی آفات، افکار اور بحرانوں سے چھٹکارا دلایا جائے۔ آخر کوئی بات تو تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعا مانگی تھی:

"اے اللہ میں تیرے واسطے سے غم اور رنج سے پناہ مانگتا ہوں اور تیرے واسطے سے میں دین کی مغلوبیت اور ظالموں کے قہر و جبر سے پناہ مانگتا ہوں"

اور آپ کہا کرتے تھے:

"اے اللہ! میں تیرے واسطے سے کفر اور فقر سے پناہ مانگتا ہوں"

پوری انسانیت میں کوئی فرد ایسا نہ ملے گا جو رسول اکرمؐ سے زیادہ بلند ہمت ہو لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے بھی رنج وغم اور دین کی مغلوبیت اور فقر سے پناہ مانگی ہے اس لئے کہ یہ ساری چیزیں بھی گناہوں اور شہوتوں کی طرح دل کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں سے آپ اس لئے بھاگتے تھے کہ آپ کو کھانے سے روک رہی تھیں اور کسبِ حلال کے لئے ہمتوں اور ارادوں کو دبا رہی تھیں؟ کوئی ماہرِ نفسیات و سماجیات (SOCIO-PSYCHOLOGIST) اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ رنج وغم کا اثر انسان کے ارادے اور اس کی عزیمتوں پر پڑتا ہے اور مادی زندگی میں اس کے عمرانیاتی و اقتصادی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ صحیح ہے۔ لیکن ہمیں رسول اکرمؐ کی بلند ہمتی اور اعلیٰ حقائق کو ادراک کرنے کی صفت کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے اس سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ ہر چیز سے پہلے اس قلب کی حفاظت پر زور دیتے تھے جو دُنیا و آخرت میں زندگی کا مخزن ہے۔

اس وقت جبکہ ہم ان اقتصادی عوامل اور انسان کی نفسی حالت پران کے اثرات کا جائزہ لے رہے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ بس اسی لقمہ تک آپ محدود ہو جائیں جو آپ کی بھوک مٹا سکے اور انہیں کپڑوں میں اُلجھ کے رہ جائیں جو آپ کی ستر پوشی کر سکیں جیسا کہ فقر اور بھوک مری کا علاج کرنے والے بہت سے لوگ یہ موقف اپناتے ہیں بلکہ ہماری نظر ان حدود سے بہت آگے ہے، ہم اس سے آگے بڑھ کر قلب کی عظمت کو چھانٹنا چاہتے ہیں، اس کے اردگرد کے ماحول کو پاکیزہ بنانا چاہتے ہیں اور اسے سکون و طمانیت سے اس لئے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں تاکہ منزل مقصود کی طرف وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے اگر یہ ممکن ہو کہ بھوک اور افلاس کے اسباب کے باوجود اس منزل تک پہنچا جا سکتا ہے تو یہ وہ رُتبہ ہے جہاں تجربہ کار اور صاحبِ بصیرت لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ رسول اکرم کو بھوک ستاتی تھی لیکن کسی تذلیل آمیز کام پر آمادہ نہ کر سکتی تھی، آپ کا گھر دو وقت کی روٹی سے خالی رہتا تھا لیکن آپ کسی کے سامنے اس لئے فروتنی نہیں اختیار کرتے تھے کہ وہ اپنی روزی میں سے کچھ آپ کو دے دے، نہ یہ فقر آپ کو پریشان کرتا تھا۔ بلکہ آپ اپنے پیٹ پر پتھر باندھا کرتے تھے اور اپنے موجود ساتھیوں سے کہتے تھے:

"آگاہ رہو، بہت سے لوگ جو آج اس دُنیا میں کھا پی رہے ہیں پہن رہے ہیں، قیامت کے دن بھوکے اور ننگے ہوں گے۔ بہت سے لوگ بظاہر اپنے نفس کی عزّت کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں اُس کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ اپنے نفس کو بظاہر ذلیل کرتے ہیں حالانکہ وہ اس کی عزّت افزائی کرتے ہیں۔"

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس بلند و بالا شخصیت اور آپ کی ناقابلِ تسخیر

عظمت کا کیا مقابلہ ؟ یہاں تو عوام مختلف پابندیوں اور ضرورتوں کی وجہ سے ذلت اور سطحیت پر اُتر آتے ہیں۔

ہم نے ان باتوں کا تذکرہ اس لئے کیا ہے تاکہ ہم یہ واضح کردیں کہ مالی اور مادّی خوش حالی سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جو محدود عقل وذہنیت کے لوگ سمجھتے ہیں، اسی لئے ہم ہمیشہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مادی خوش حالی کو اُسی رُوحانی خوش حالی سے اختلاط ہونا چاہیئے جو قلب پر طاری ہوتی ہے اور اس کی تمام ضروریات کو نہایت نرمی وشفقت سے پورا کردیتی ہے اور اسے اس دُنیوی حصہ پر قانع اور مطمئن کردیتی ہے جو اللہ نے اس کے لئے الگ کردیا ہے۔

میرے بھائیٓ! یہ وہ زبردست فرق ہے جو ہمارے طریقہ کار میں اور دَورِ جدید کے بڑے بڑے مصلحین معیشت کے طریقہ کار میں پایا جاتا ہے۔

انگریزوں نے اپنے ایک نئے منصوبے کا اعلان کیا جبکہ چھ سالوں کی جنگ جاری تھی، اور اسے انہوں نے اور مشرق ومغرب کے تمام انسانوں نے انسانیت کی ترقی کا منشور سمجھا، تو کیا ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم تکبر اور غرور سے بچ کر اپنے طریقہ کار پر فخر کریں اور پوری انسانیت کو اس کی بشارت سُنا دیں ؟ بلکہ اس سے پہلے کیا ہماری ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں اور اپنے ایمان ویقین پر فخر کریں ؟

ہم پھر پیچھے کی طرف پلٹتے ہیں، ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ معیشت سے متعلق اقتصادی عوامل کا انسان کی زندگی پر اثر پڑتا ہے اور اس کی قلبی ونفسی حالت میں اضطراب رونما ہوتا ہے تاکہ داعیٔ دین یہ سمجھ لے کہ ان عوارض کے علاج میں کسی قسم کی تاخیر یا تسویف

مناسب نہیں ہے اس لئے کہ لوگوں کی ہلاکت پر بس وہی خاموش رہ سکتا ہے جو سخت دل ہو، جذبات سے محروم ہو اور ان صفات کا داعیٔ دین سے کوئی تعلق نہیں ہے ......

اور تاکہ داعیٔ دین یہ جان جائے کہ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی جماعت میں باہم تعاون و تکافل کا پایا جانا ناگزیر ہے اور اس تعاون و تکافل کو ایک نظام کی شکل دے دی جائے جس کی اطاعت سب پر فرض ہو ..... اسلام نے زکوٰۃ فرض کی ہے، اسے کوئی نفلی عبادت نہیں قرار دیا کہ انسان کی رغبت اور اس کی مرضی پر اسے چھوڑ دیا جائے اور اس ایجابی عملی فریضہ کے ذریعہ اس نے داعیٔ دین کے سامنے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور اسے ظن و تخمین پر نہیں چھوڑا اور اسے حکم دیا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی قدرت رکھنے والے تمام لوگوں سے زکوٰۃ لی جائے، اور اگر وہ لوگ اس سے منہ پھیریں یا کنجوسی کا مظاہرہ کریں تو تلوار کے ذریعہ اس نظام کو ان پر مسلط کیا جائے۔ اس کے بعد داعیٔ دین کا کام بس تنفیذ اور ایسے نظام اور ان قوانین کی اقامت کا رہ جاتا ہے جو جماعت کے درمیان اس تکافل کو پیدا کر سکیں اور اسے واقعی عملی حقیقت کا روپ دے سکیں۔

ہم یہاں پھر آخر میں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ داعی کا کام بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ اس اجتماعی نظام[1] کو قائم کر دے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ

---

[1] اسلام میں باہمی تعاون کا یہ نظام ایک فطری اور دُنیوی نظام ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ مال اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کی جانب سے یہ جماعت کو عطا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ہمدردی و غم خواری کرتے ہیں۔ اس (باقی صفحہ ۴۲۳ پر)

مال لینے اور دینے والے دونوں گروہوں اور طبقوں کے دلوں ہیں یہ نظام قابلِ قبول بھی بن جائے۔ دونوں اسے پسند کرنے لگیں اور اس سے مسرور و مطمئن ہوں اور دونوں یکساں طور پر اسے مفاد میں سمجھیں۔ بسا اوقات یہ ذہن میں آتا ہے کہ یہ صرف ان لوگوں کے مفاد میں ہے جن کی ضروریات رُکی ہوئی ہیں، یہ عظیم غلط فہمی ہے۔ اس لیے کہ قلب پر فقر و افلاس کا طاری ہونا نتیجہ کے اعتبار سے حرص اور مال سے محبت کرنے کے برابر ہے، یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے جو اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہوں کہ اللہ سے لو لگانے ہی میں قلب کی زندگی ہے اور اس سے بے نیازی برتنے اور اس کو چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانے میں اس کی موت اور تباہی ہے۔ اور یہ بے نیازی اور لاپرواہی جس طرح مال و دولت میں اُلجھنے سے وجود میں آتی ہے اسی طرح فقر و افلاس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے، یہاں گفتگو مقدمات پر نہیں بلکہ نتائج پر ہو رہی ہے۔ اگر داعی صرف تکافل و تعاون کا نظام قائم کر دے، اس کے راستے آسان کر دے اور اس کے نمایاں وسائل و ذرائع فراہم کر دے تو اس نے ایک محض مشینی نظام قائم کیا ہے جو فقراء کے دلوں میں قابلِ احترام ہو سکتا ہے لیکن مال داروں کو اس سے کیا دلچسپی ہوگی؟ اور اگر خدا سے بے نیاز مصلحین کے دلوں میں یہ بات بیٹھ بھی جائے تو اسلام پسند مصلحین کے حلق سے تو یہ بات نیچے نہیں اتر سکتی۔ وہ تو اللہ کی روشنی کا دامن تھامے ہوئے ہے قرآن کو اس نے اپنا دستورِ حیات

(بقیہ صفحہ ۴۲۲) سلسلے میں ہم نے اپنی کتاب "دولت ——— اسلام کے سائے میں" تفصیل سے بحث کی ہے۔ (مؤلف)

بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ خود کہتا ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ (توبہ: ۱۰۳)

(اے نبیؐ، تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دُعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دُعا ان کے لیے وجہِ تسکین ہوگی۔)

قوت اور تلوار کے ذریعہ فرض کی ادائیگی اس وقت ہوتی ہے جب نافرمانی، بغاوت اور سرکشی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دعوت کا آپ کے اوپر بہ حق ہے اور عوام کا بھی، کہ آپ اوپر کی آیت پر خوب غور و فکر کریں۔ اس لیے اس باب میں جو کچھ کہا جا سکتا یا کیا جا سکتا ہے، ان سب کا وہ جامع قول ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے:

۱۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یعنی "ان کے اموال میں سے صدقہ لو" اور یہ فقیروں اور محتاجوں کا حق ہے، یہاں ایک قانون کے نفاذ کا حکم ہے اور اسے (ضرورت کے وقت) تلوار سے بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ یہ صدقہ انہیں پاک کرے گا اور انہیں آگے بڑھائے گا۔ تطہیر پہلی منزل ہے اس سے آگے کی منزل تزکیہ[1] ہے اور یہ دونوں الفاظ شرح و وضاحت سے

---

[1] تطہیر کے معنیٰ ہیں گندگیوں سے اور مفسدانہ اور مضر نفسی عوامل اور صفات سے پاک کرنا اور تزکیہ کے معنیٰ ہیں، نفس کو پاک کرنے کے بعد اسے نیکی کی راہ میں معرفتِ الٰہی کے ذریعہ آگے بڑھانا۔

بے نیاز ہیں۔ دل کا بھی ایک حق ہے جو محض صدقہ لے لینے سے اس تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ اُس اسلوب کے ذریعہ یہ حق اسے ملتا ہے جس سے صدقہ وصول کیا جائے اور اسے ان مصارف میں صرف کرنے سے ملتا ہے جو متعین ہیں۔ اور وہ نرم وگداز وعظ ونصیحت کا اسلوب جو صدقہ کو عبادت، اور تقرب الٰہی اور دارِ آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اسی نظام کا اسلوب ہے جو آدمی کو یہ احساس دلاتا ہے کہ حکومت خوش حالی و بدحالی میں اس کی نگراں ہے اور اگر وہ اپنے بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اس دُنیا سے چلا جائے تو وہ حکومت وقت کی کفالت میں ہوں گے اور یہ کفالت رحمت و شفقت پر مبنی ہے اس میں جبر و دباؤ کا دخل نہیں ہے، باعزت کفالت ہے، ذلت سے بہت دور ہے، یہ ایسی کفالت ہے جو اللہ کو تمام لوگوں کا محافظ ونگراں بناتی ہے اور اپنے لئے کوئی مادی منفعت یا جاہ و منصب نہیں چاہتی، یہ حقوق انسانی میں مساوات اور عدالت کا اسلوب ہے جہاں ظلم کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ دولت و حکومت کی ملکیت تمام لوگوں کے لئے ہے کسی خاص طبقہ یا گروہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ یہ خرید و فروخت میں، لین دین میں اور مفادات کو آسان بنانے میں دریا دلی اور کشادہ ظرفی کا اسلوب ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جسے حکومت اس لئے اپناتی ہے تاکہ اس کی بنیاد پر عوام سے معاملہ کرے اور عوام حکومت سے معاملہ کریں اس میں کوئی طمع اور لالچ نہ ہو، استحصال اور دباؤ نہ ہو، سود اور دھوکہ نہ ہو نہ کوئی ایسا نظام ہو جس کے ذریعہ باطل طریقہ سے عوام کا مال ہڑپ کر لیا جائے، یہ ایک عوامی کشادگی اور

فراخی کا دور ہوتا ہے جہاں انسان جسم و بدن کی تنگنائیوں سے اور مفادات و تحریصات کے شعلوں سے بھڑکتی ہوئی دُنیا کے حدود سے نکل کر اپنے قلب کی وسعتوں اور دار آخرت کی نعمتوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس اسلوب سے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے، اس کے بند دروازے کھلتے ہیں اور صدقہ اپنے اجتماعی و رُوحانی اثرات سامنے لاتا ہے۔

۳۔ "اور ان کے لئے دُعا کرو تمہاری دُعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی" یعنی ان کے لئے خیر کی دُعا کرو اور اپنے قلب کی روشنی اور اپنے دل کی شفقت ان پر نچھاور کر دو، اس سے یہ لوگ فتنوں اور کینوں سے اور نظام کے خلاف بغاوت سے محفوظ رہیں گے۔

آیت کے ظاہر سے یہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ ضمیر ہی مال و دولت کے مالکین کی طرف لوٹ رہی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بہترین صدقے کا فائدہ خود صدقہ دینے والوں کو ہوتا ہے اور اس کا نفع انہی کی طرف پلٹتا ہے، اس کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۚ (بقرہ: ۲۷۲)

(اور راہِ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لئے بھلا ہے۔)

یہاں وہی لوگ مخاطب ہیں جو تطہیر و تزکیہ کے مرحلے سے گزر چکے ہیں اور ان کے صدقات اللہ نے اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کئے ہیں اور انہیں خوب پروان چڑھایا یہاں تک کہ حدیث شریف کے مطابق ان کا ہر صدقہ پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ لیکن فقراء اور محتاجین کو اس سے کیا ملا؟ روٹی، کپڑا یا درہم، کیا ان چیزوں سے محتاجوں کی تطہیر ہو سکتی ہے؟ اور یہ فقیر بیچارہ کب گناہوں سے آلودہ ہوا تھا کہ صدقہ اس کی تطہیر کرے گا؟ جس شخص کو گندگیوں

سے سامنا کرنا پڑا ہے، وہ دراصل وہی ہے جس کے دل میں مال کی محبت داخل ہوگئی اور اس کی طمانیت اور اس کے تقویٰ کے نظام کو پارہ پارہ کردیا۔ رہا محتاج اور مسکین، تو اس کی تمام تر پوزیشن صرف اتنی ہے کہ اس کے راستے میں ایک گھاٹی آ گئی تھی جسے پار کرنے میں ہم نے مدد کردی اور اس کے راستے کی مشکل دور کردی۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ روٹی کھانا یا کپڑا پہننا یا درہم لینا انسان کے لئے باعث طہارت ہے تو اسے یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ مالدار لوگ تو اس سے کہیں زیادہ پاک ہوتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ کھاتے، سب سے اچھا پہنتے اور خرچ کرتے ہیں؟!

امر واقعہ یہ ہے کہ صدقہ لینے والا تو اللہ کی ذات ہے، اس نے خود فرمایا ہے:

أَلَمْ يَعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ ٱلتَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِۦ وَيَأْخُذُ ٱلصَّدَقَٰتِ وَأَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ۝

(توبہ: ۱۰۴)

(کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے)

اس آیت سے اوپر والی آیت کا ظاہری مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے جس میں کسی التباس کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی، اور جو فقراء اور مساکین کے اوپر سے احسان کی چادر اتار پھینکتا ہے اور کسی صدقہ دینے والے کا فضل اس پر باقی نہیں رہنے دیتا اس لئے کہ اس مفہوم کی رو سے ان کے صدقات ان کے اور ان کے رب کے درمیان گردش کرتے ہیں، وہ ان صدقات کے ذریعہ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں گناہوں سے پاک و صاف

کرتا ہے اور ان کے اجر کو بڑھاتا ہے اور یہ مفہوم کتاب اللہ کے بلند حقائق میں سے ہے۔

بعض لوگ زیرِ بحث آیت کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا میں تمام ضمیریں اغنیاء اور فقراء دونوں کی طرف لوٹتی ہیں اور اس رائے کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ مال و دولت دراصل اللہ کی ملکیت ہے جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے اور سارے انسان اسی کی مخلوق ہیں چنانچہ سب اس کی دولت میں شریک ہیں اور ہر ایک کا اس میں متعین حصہ ہے، اس تاویل کی روشنی میں صدقہ مال داروں کو تنگ دلی اور مال کی محبت سے پاک کرتا ہے اور دوسرے اخلاقی و اجتماعی رذائل سے انہیں صاف ستھرا کرتا ہے اور فقراء و محتاجین کو فقر سے نہیں بلکہ ذلت و رسوائی سے اور مال داروں کی عبادت و پرستش اور ان کی اطاعت سے پاک کرتا ہے۔

ان دونوں ہی مفہوموں کا ماخذ کلامِ الٰہی ہے اور ہر ایک میں خیر و برکت کا پہلو موجود ہے، قابلِ لحاظ چیز عمل ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے۔

یہ وہ خیالات تھے جن کا پیش کرنا ضروری تھا۔ ہم ان اثرات و عوامل پر گفتگو کر رہے تھے جو لوگوں کی معیشت سے متعلق ہیں، جو ان کے افکار و نظریات کو زیر و زبر کر دیتے ہیں اور خدائی مقصود کی راہ میں زبردست رکاوٹ ڈال دیتے ہیں۔ داعیِ دین نے دیکھ لیا کہ اسلام نے تمام ضروری اور بنیادی چیزوں کی وضاحت کر دی ہے، اب اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ تنفیذ کے لئے سراپا جدّ و جہد اور اضطراب بن جائے۔ اور تمام ضروری طاقتوں سے مسلح ہو کر اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اس کے لئے اقدامات کرے۔

(۲) نفسیاتی اثرات

یہ وہ عوامل ہیں جن کا تعلق حیوانی فطرتوں سے ہے اور ان میں اہم ترین فطرت جنس اور مال سے محبت کی ہے۔ ان دونوں فطری عوامل میں سے کوئی بھی جب انسان کو بھڑکاتا ہے تو اس کی عقل کو زائل کر دیتا ہے اور اس کے دل کے ارادے کو ماؤف کر دیتا ہے تاکہ تنکے کی طرح ہوا میں اڑائے پھرے۔ دل کے رُوحانی سفر کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان فطری داعیات کا علاج کیا جائے، ان کی سرکشی و طغیانی کا توڑ کیا جائے اور ان کی قوت اور تیزی کو نرم کر دیا جائے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فطری داعیات سے جنگ کی جائے اور ان کے استیصال کی کوشش کی جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کی شدّت کو کم کیا جائے دل میں ان کی شیطنت کو ناکام بنا دیا جائے تاکہ یہ داعیات مہذب ہو جائیں اور اخلاق کے دائرے میں آ جائیں۔ اور ہر علاج سے پہلے اس کا طبیعی علاج ہونا چاہیئے ——— ایسا علاج جو بدن کے مزاج سے متعلق ہو اور اس کے حیوانی مزاج پر اثر انداز ہو، یہ ان حکمتوں کا ایک جزو ہے جس کے پیشِ نظر اللہ نے روزے کو فرض کیا ہے۔ روزہ انسان کی فطری خواہشات کو دباتا اور اس کی سرکش طاقتوں کو کچلتا ہے، اسی لئے رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"اے گروہِ جوانان! تم میں سے جو شخص شدید ضرورت محسوس کرے وہ شادی کرلے اس لئے شادی نگاہوں کو جھکا دیتی اور شرمگاہ کی حفاظت کرتی ہے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ روزہ رکھے اس لئے کہ روزہ اسے دباتا ہے۔"

داعیانِ دین لوگوں کی پرائیویٹ زندگی سے واقف نہیں ہو سکتے کہ جان سکیں کہ کون

روزہ رکھتا ہے اور کون نہیں رکھتا، اس لئے کہ روزہ بندہ اور اس کے رب کے درمیان ایک راز ہے جس سے واقف ہونے کی اس کے علاوہ اور کوئی سبیل نہیں ہے کہ روزہ دار علی الاعلان افطار کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس معزز فریضہ کی پامالی بھی کرتے جاتے ہوں گے اور ان کی طبیعت میں قوت اور تیزی باقی رہ جاتی ہوگی جو لوگوں کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالنے اور ان کی عصمت تار تار کر دینے پر مجبور کرتی ہوگی، اسی احتمال کی وجہ سے اسلام نے وہ حدود اور سزائیں مقرر کی ہیں جو فوری طور پر فتنہ پردازوں کا قلع قمع کر دیتی ہیں اور ان کی شرانگیزیوں اور تباہ کاریوں سے قلب کو بچالیتی ہیں۔ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور زانی کو کوڑے لگائے جاتے ہیں یا رجم کر کے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

ان فطری داعیات کے علاج کے لئے اس عملی نظام کے سلسلہ میں داعیٔ دین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسے سختی سے نافذ کرے اور دین الٰہی کے نفاذ میں کسی مجرم مرد یا عورت پر اسے ذرا بھی رحم نہ آئے تاکہ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہ سکے اور یہ شیطانی داعیات اندر ہی گھٹ کر فنا ہو جائیں اور قلب کے اردگرد کا ماحول پاکیزہ ہو جائے اور وہ اپنی سلامتی کے گھر اور زندگی کے چشمہ کی طرف رجوع کر سکے۔

(۳) معاشرتی اثرات

یہ ایسے عوامل ہیں جن کا تعلق عفت و عصمت اور عزت و ناموس کی قیمت متعین کرنے کے سلسلہ میں مروجات اور رسمیات سے ہے اور ان میں سب سے نمایاں عورتوں کی بے پردگی اور لوگوں کا علی الاعلان منکرات کا ارتکاب کرنا ہے۔ ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ سڑکوں کی رنگینیاں، رقص و سرود کی محفلیں، شراب و کباب کی مجلسیں، جن کا اخبارات و

وسائل جو بے پردگی پھیلاتے ہیں وہ ترقی کی نشانی اور تہذیب و تمدن کے مظاہر ہیں بلکہ وہ تو
یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں دل کا راستہ ہموار کرتی ہیں اور اس کے لئے یہ وہ فضا
کو قائم کرتی ہیں۔

نگاہ زہر میں بجھا ہوا تیر ہے، یہ شیطان کا پیغام قلب تک لے جاتی ہے
اور عورت جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور رسول اکرم ﷺ
نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورت سے زیادہ زبردست فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑا آپ
نے اسے مردوں کے لئے زہر آلود آتش بتایا۔ اس سے کوئی بھی بشر ہوشیار رہتا ہے اس
لئے کہ یہ آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے۔

داعی دین سے اولین مطالبہ یہ ہے کہ وہ ماحول کو حل کے لئے ہر اس عوامل
سے پاک کرنے کے لئے تمام ممکنہ وسائل اختیار کرے اور اسلام نے اس کو وہ اقدام کھول دیا
ہے اس نے بے پردہ نکلنے سے منع کیا ہے اور شراب پینے والے کی سزا مقرر کی ہے اس
کے بعد اعیان دین کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ماحول کو پاک کرنے کے لئے وہ سارے
افکار اور وسائل جدیدہ کے تمام ذرائع استعمال کریں۔

بے پردگی کے علاوہ عریاں صحافت، سینما ہاؤس اور تفریح گاہیں ہیں جو سطحی
جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں، فحش تصویریں ہیں جو سڑکوں کی دیواروں پر عورت نظارہ
دے رہی ہیں اور فتنہ و فساد کو ہوا دے رہی ہیں۔ داعی دین کو معلوم ہونا چاہئے کہ
یہ ساری چیزیں اس کی بدترین دشمن ہیں اور ان کے استیصال کے لئے کام کرنا اس کی
اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مغرب کا یہ بے ہودہ نظریہ ہمارے یہاں در آیا کہ عورت اپنی نجی زندگی میں

آزاد ہے، جو چاہے کر سکتی ہے لوگوں کو بس اتنا حق ہے کہ وہ عوام سے متعلق اس کی غلطیوں پر تنقید کریں اور ان کی عمومی خدمات سے بحث کریں۔ حرص و آز کے مارے اور فتنہ و شہوت کے شکار افراد نے بڑھ کر اسے قبول کر لیا اور بہتیرے لوگوں نے ان کی تقلید کی۔ اگر آج آپ کسی پر یہ تنقید کریں کہ وہ شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے یا عورتوں کے ساتھ رقص کرتا ہے تو آپ سے فوراً کہا جائے گا کہ یہ نجی معاملات ہیں ان میں گفتگو کرنا آپ کے لئے صحیح نہیں ہے، اگر آپ کو تنقید ہی کرنا ہے تو اس کے منصوبوں اور عوامی تصرفات پر کیجئے اور سیاست، ادب، معیشت یا دوسرے شعبوں کے بارے میں اس کے خیالات و افکار سے بحث کیجئے۔

داعیٔ دین کو اس بیہودہ نظریہ پر کڑی نظر رکھنی ہوگی اس لئے کہ آدمی ایک وجود ہے جو اس کی نجی اور عوامی دونوں زندگیوں سے مربوط ہے۔ ان میں سے کسی ایک میں خرابی آجائے تو دوسرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور اخلاق و شرافت کو حقیر سمجھنا اور اس بیہودہ نظریہ کو قبول کر کے اسے نظر انداز کر دینا، اس کے انکار کے مترادف ہے۔ ہم اس بات کے مکلف نہیں ہیں کہ اس بیہودہ نظریہ سے مباحثہ کریں اور اس کے ماننے والوں کو دلائل سے مطمئن کر ہی دیں اس لئے کہ اللہ کے اوامر و نواہی کے ہوتے ہوئے تردّد اور مجادلہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بس اس نے جس چیز کا حکم دیا ہے، اس پر عمل کرنے کے لئے وہی حکم کافی ہے۔ بس یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ انکار اور تردد کرنے والوں کو ایسی سخت سزا دی جائے جس سے بے باک اور جری مجرمین کی سرکوبی ہو سکے غفلت و سرمستی میں پڑے ہوئے بیدار ہو سکیں اور تمام لوگ اللہ کی شریعت پر اعتدال و توازن کے ساتھ قائم ہو جائیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟ یہ ثابت ہوگیا کہ داعیٔ دین کی ذمہ داری نصب العین کی پہچان کے بعد یہ ہے کہ وہ قلب کو زندہ کرنے کی کوشش کرے اور اس کے خدائی سفر کو آسان پرسکون اور مامون بنائے، اس کے راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ باقی نہ رہے جو اس کے عشق و محبت کی انگیٹھی کو بجھا دے۔ اور ہم نے پیچھے اس کا بھی تذکرہ کردیا کہ یہ مقصد دو وسائل کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے:

۱۔ مقصد کی برابر تذکیر ہوتی رہے۔

۲۔ آدمی اپنے ماحول کو ایسا اعلیٰ و اشرف اور بہترین قدروں کا حامل بنائے کہ اقتصادی بحران اسے زچ نہ کرسکے، اس کی حیوانی فطرت شائستہ اور مہذب ہو سکے اور عرفِ عام برائی کو برائی سمجھنے لگے اور نیکی و تقویٰ کے حقوق کی حفاظت کرنے لگے۔

خراب ماحول میں تذکیر ممکن نہیں ہے بلکہ صحیح ترین لفظوں میں بے فائدہ ہے جب سوسائٹی ہی خراب ہو چکی ہو اس میں افکار و نظریات زیر و زبر ہو چکے ہوں، ہر ایک اپنی رائے پر نازاں، اپنی خواہشات کا حریص اور آخری حد تک شخصی آزادی کو استعمال کرنے والا ہو تو اس ماحول میں تذکیر اور یاددہانی بھلا کیونکر نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے؟ فاسد ماحول اباحیت اور وسیع المشربی کی دعوت دے گا، جب تک آپ کے ہاتھ میں اقتدار نہ ہو جس سے آپ سرکش گردنوں کو مروڑ سکیں اس وقت تک اس کے تمام احکام و اوامر محض کارِ عبث ہوں گے۔ اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ نیک نظام کے حامل صالح ماحول کو وجود میں لانے کے لئے کام کیا جائے۔

ہم یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ اسلام اس ماحول کے چند قواعد و احکام لے کر آیا ہے،

داعی کا کام بس یہ ہے کہ جن اصولوں کو وہ پسند کرتا ہے ان کے نفاذ کا کام شروع کر دے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ:

۱۔ جن اخلاقی اصولوں اور عملی ڈھانچوں کو وہ چاہتا ہے انہیں اپنے ماحول میں داخل کرے۔

۲۔ جن چیزوں کو وہ ناپسند کرتا ہے انہیں دُرست کرنے کی جدوجہد کرے۔

۳۔ ہر اس فکر یا نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے جو حق کے خلاف اور اس سے متصادم ہو، یہی طبعی تربیت ہے ورنہ محض وعظ ونصیحت اور تقریریں جب تک لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالیں گی، لوگ اپنی عبادت گاہوں سے باہر نکل چکے ہوں گے اس لیے کہ عقلوں اور دلوں پر اس سیلاب کا قبضہ ہو چکا ہو گا جو شیطان اور اس کی فوج لا رہی ہے۔

اک آگ کا دریا ہے

ایک اخوانی نے سوال کیا:

یہ پوری گفتگو سمجھ میں آتی ہے لیکن اس کا حصول قدرے مشکل ہے۔ ایک داعیِ دین کو یہ آسانی کہاں ہے کہ وہ اپنے ماحول کے ڈھانچوں میں اس طرح کا تصرّف کر سکے؟ اس کے سامنے بے شمار گھاٹیاں ہیں، عرف عام اسے برداشت نہیں کرے گا، فریب خوردہ تہذیب اس کی دعوت کو تسلیم نہیں کرے گی، اس کے قوانین کو جب وہ چیلنج کرے گا تو ان سے بھی مقابلہ آرائی ہو گی۔ جن لوگوں کے نجی مفادات اس فاسدانہ تہذیب اور بگڑے ہوئے ڈھانچوں سے وابستہ ہیں وہ آڑے آئیں گے۔ وہ کبھی اسے

اس بات کا موقع نہ دیں گے کہ وہ ان کو ان کے حصوں سے محروم کر دے، پھر بھلا اس نصب العین کا حصول کیونکر ہو گا؟

اس کے دوسرے ساتھی نے جواب دیا کہ:

ہاں راستہ واضح اور نمایاں ہے گرچہ طویل مسافت کا اور پُر مشقت ہے۔ راستہ یہ ہے کہ لوگوں کو دعوت دیں، انہیں ان کے موجودہ حالات سے ہوشیار کریں اور جن غلطیوں میں وہ مبتلا ہیں، انہیں واضح کریں، پھر اس کے بعد گھاٹیوں کی طرف دیکھیں۔ آپ کا دل جو فتویٰ دے گا اور آپ کے پاس اللہ کا جو حکم موجود ہو گا اس کی روشنی میں آپ گھاٹی عبور کر جائیں گے۔

میرے بھائی!

آپ اس انتظار میں نہ رہیں کہ میں آپ کے لئے کوئی طریقہ کار متعین کر دوں گا، کوئی پالیسی بناؤں گا، داعی کوئی مشین نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو نافذ کر دے جنہیں مشین چلانے والا چاہتا ہے، وہ تو دلِ زندہ اور فکر بیدار کا کام ہے، رسول اکرمؐ نے اسے مکمل طریقہ عطا کیا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ عمل و تنفیذ کی تفصیلات وہ اپنی فطرت سے پوچھے اور جو زحمتیں اسے پیش آ رہی ہوں، ان کے سلسلے میں لوگوں کا فتویٰ کچھ بھی ہو، وہ اپنے قلب سے خود فتویٰ پوچھے۔ یقین رکھئے آپ اللہ کی توفیق سے منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہیں گے بشرطیکہ سنجیدگی و نرم خوئی اور حلم و بردباری سے دست کش نہ ہوں۔

نرم اُسلوب کی کامیابی کی مثال

طاقتور اور فولاد صفت داعئ دین کی مثال اس تیز و تند سیلاب کی ہے جو پہاڑ کی چوٹیوں سے آرہا ہو اس میں بہا لیجانے کی طاقت ہوتی ہے تو عوام کو فائدہ پہنچانے اور انہیں مُستفید کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے لیکن سیلاب گھاٹیوں اور پہاڑیوں کو پہلے ہی ریلے میں نہیں بہاتا بلکہ ان کے اردگرد اپنا گھیرا تنگ کرتا ہے اور پیچھے سے انہیں گھیر لیتا ہے یہاں تک کہ پانی کی سطح بلند ہو کر ان کے اطراف و جوانب پر چڑھ جاتی ہے اور ان کی چوٹیوں تک کو اپنے احاطہ میں کر لیتی ہے اور اپنی قوت کے سامنے اس کی بلند و بالا چوٹیوں کو جھکا لیتی ہے ..... اگر اس مثال کو آپ نے نہ سمجھا ہو تو کھلے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ آپ کا پیغام پہاڑ سے نازل ہونے کے بجائے آسمان سے نازل ہوتا ہے اور اس کے بہنے اور فائدہ پہنچانے کا راز آپ کے اپنے قلب میں موجود ہے کسی دوسرے محاذ میں نہیں، آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر جگہ اپنی دعوت کی تبلیغ خوانی کرتے رہیں۔ اگر آپ کے راستے میں سرکش قانون یا خدا بیزار شخصیت کی کوئی گھاٹی آتی ہے تو اس کے سلسلہ میں وہی موقف اختیار کیجئے جو سیلاب نے اختیار کیا تھا، اسے حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ دعوت دیجئے اور اس سے اُلجھنے کی غلطی نہ کیجئے کہ یہ حماقت اور جہالت ہے بلکہ سیلاب کی طرح اس کے اردگرد اپنا حلقہ تنگ کیجئے، اس کے پیچھے سے اپنا کام کیجئے اور لوگوں کو اپنی طرف بلائیے یہاں تک کہ وہ گھاٹی دوسری تمام طاقتوں سے الگ تھلگ ہو کر رہ جائے اور حکم الٰہی کی طاقت سے اسے اطمینان ہو جائے یا اللہ تعالیٰ اس کی مہلتِ عمل چھین لے۔

اس سے قطع نظر، اس امر کا راز علمی مزاج میں ہے اور ہم اس راز کا تجزیہ نہیں کر سکتے البتہ دعوت کے خارجی دائرے میں اس کی کامیابی کے مظاہر کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں اور بعض ان نفسی خصوصیات کا ذکر کر سکتے ہیں جو اس کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خارجی دائرے میں کامیابی کے ستون

۱ — حرکت

ہم کہہ چکے ہیں کہ علمی مزاج ایک بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جس کی خطرناک طاقتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اس کا تقاضا ہے کہ داعئ دین سراپا حکمت وعمل بن جائے، کبھی دعوت سے باز نہ آئے اور عمل کی چنگاری کبھی سرد نہ ہو، لوگوں سے ملاقات کرے، ان سے گفتگوئیں کرے مجلسوں اور پارٹیوں میں شریک ہو، دعوتیں اور ضیافتیں دے اور ہر ایک سے مقصد اور نصب العین کی بات کرے، تہواروں اور میلوں میں جبکہ عوام کا ہجوم ہوتا ہے، لوگ گروہ در گروہ آتے ہیں، تو یہ ملاقات کرنے اور بات چیت کرنے کا بہترین موقع ہوتا ہے داعئ دین کہیں چین سے نہیں بیٹھتا، شہروں اور بستیوں کے چکر لگاتا ہے، دیہاتیوں اور شہریوں کے درمیان گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہے، اسے آرام راس نہیں آتا، عیش و سکون اسے اچھا نہیں لگتا بلکہ اس کا آرام اس کی تھکاوٹ میں اور اس کی سعادت اس کی دعوت میں پوشیدہ ہوتی ہے ؏

چین سے بیٹھتا ہے عاشق ناشاد کہیں دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ حرکت وعمل اور اضطراب وقلق اُس طاقتور جذبہ یا رُوحانی شعلہ کے بغیر وجود میں آجائے گا ؟

کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں اس جذبہ سے محروم ہوں، اس لئے کہ خیر سے رغبت رکھنے والا ہر شخص بیدار ہو سکتا ہے اور حرکت وعمل کے میدان میں آگے بڑھ سکتا ہے وہ آمد ورفت کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے تاکہ روحانی شعلہ بھڑک اُٹھے اور اس کا اندرون جوش کھانے لگے اور حرکت سے حرکت جنم لیتی ہے اور ارادے ارادوں کو مہمیز کرتے ہیں۔ جو لوگ بجھی بجھی مجلسوں کی دعوت دیتے ہیں، جامد اقتدار کی طرف بلاتے ہیں اور اس طرح کی باتیں کہتے ہیں جو محض زبان کی گردش کی پیداوار ہوتی ہیں تو ہم ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ سے دُعا گو ہیں کہ وہ انہیں ان غلطیوں اور گناہوں سے نکال دے ۔۔۔،

۲ ۔۔۔ لوگوں کی زندگی میں دعوت کو اتار دینا

اور اس کامیابی کی پہلی شرط یہ بھی ہے کہ داعی اپنی دعوت کو لوگوں کی زندگی کی گہرائیوں میں اُتار دے۔ اس لئے کہ ہر گفتگو کرنے والا داعی نہیں بن سکتا نہ صبح وشام کرنے اور اِدھر اُدھر پھرنے والا اپنی دعوت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ تمام تر کامیابی یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کو لوگوں کی زندگیوں میں اُتار دیں، ان کے دلوں میں اور اعصاب کے اندر اسے انڈیل دیں اگر آپ کنارے ہی کنارے قدم رنجہ ہیں تو اس سے کامیابی حاصل ہونے والی نہیں۔ میرے بھائی ! آپ کی جیت اور کامیابی یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کو زندہ اور پُرجوش مسئلہ بنا دیں جس پر لوگ اپنی مجلسوں اور گھروں میں گفتگو کرنے لگیں، اپنے دوستوں اور اہلِ خانہ کے ساتھ جس کے متعلق بحث ومباحثہ میں لگ جائیں۔ آپ اس

پر اچھی طرح غور کرلیں۔ کامیابی یہ نہیں ہے کہ آپ جلسے کرلیں یا تقریریں کردیں یا بستیوں اور شہروں کے دورے کرلیں۔ کامیابی یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی میں دعوت فوری مسئلہ بن جائے۔ آدمی اپنے بھائی سے ملے تو اس پر گفت گو کرے، دوست اپنے دوست سے ملاقات کرے تو اسی کے متعلق بحث ومباحثہ کرے اور ان دونوں کی پوری گفت گو میں سب سے اُبھرا ہوا مسئلہ یہی ہو۔ اسی کے متعلق وہ داستانیں اور قصے بیان کرے اور داستان گو حضرات اسی مسئلہ کے گرد چکر لگائیں اور اپنی بیٹھکوں اور چوپالوں میں اسی کو موضوع بحث بنائیں۔

یہ ہے دل ودماغ کے دعوت میں لگ جانے کا مفہوم۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سارے افراد اس کی حمایت وتائید کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور دل وجان سے عزیز رکھنے لگیں، بس اتنا کافی ہے کہ وہ توجہ اور اہتمام سے اس پر گفت گو کرنے لگیں۔ اگر آپ یہ دیکھ لیں کہ ان میں سے کچھ آپ کے مخالف ہوگئے ہیں اور اپنی مخالفت میں آگے بڑھ گئے ہیں اور دوسری طرف ایک گروہ ایسا ہے جو آپ کی تائید وحمایت کر رہا ہے اور اس میں جرأت وشجاعت کا ثبوت دے رہا ہے تو یہ زبردست کامیابی ہے۔ اہل مکہ کی ایک قلیل تعداد رسولِ اکرمؐ پر ایمان لائی تھی اور عظیم اکثریت نے انکار کیا تھا لیکن دعوت مکی سوسائٹی کا فوری مسئلہ بن چکی تھی، مسلمان اور کافر سب کے دل ودماغ اسی میں اُلجھے ہوئے تھے اور داعیٔ اعظمؐ ایک پل کے لئے بھی دعوت سے باز نہ آئے اور گفت گو کرنے والوں کی زبانیں بھی بند نہ ہوئیں چاہے وہ موافق ہوں یا مخالف، مسلمانوں پر مصائب کے بادل برابر برستے رہے، گالیوں سے نوازا گیا، پٹائی کی گئی، آگ پر لٹائے گئے، کوڑے برسائے گئے، جنگیں لڑی گئیں، دین سے پھیرنے کے لئے مال ودولت کی

لالچ دی گئی، جاہ ومنصب کا وعدہ کیا گیا، خوبصورت دوشیزاؤں سے شادی کرنے کی پیش کش کی گئی۔ والدین نے اپنے بچوں پر شفقت ومحبت کا مظاہرہ کیا اور انہیں نئے دین سے پھیرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا اور یہ جھگڑا، مخالفت اور لڑائی گھروں میں داخل ہوگئی اور اس کی بنیاد پر دل پھٹ گئے اور محبتیں جدا ہوگئیں۔ یہ سب کچھ ہوا اور یہی عین کامیابی ہے۔ رسول اکرمؐ نے جانفشانی کی، محنت کی تھکن اور مشقت سے دوچار ہوئے اور بالآخر اپنی دعوت زندگی کی گہرائی میں داخل کردی، اسے کنارے پر چھوڑکر الگ نہیں ہوگئے دعوتِ حق کی کامیابی کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ عوام کی زندگی کے مغز میں نفوذ کرجائے اور ان کی عقلی وجذباتی زندگی میں اس طرح حلول کرجائے کہ وہ دوست یا دشمن بن جائیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ لوگوں سے آغاز ہی میں اس طرح موقف اپنائیں کہ وہ آپ کے دُشمن بن جائیں اور آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہوجائیں اور اسے آپ اپنی کامیابی کی نشانی سمجھنے لگیں، نہیں، یہ مفہوم نہیں ہے، حکمت اور موعظت حسنہ ہرحال میں ضروری ہے۔ آپ کسی سے اس طرح کا معاملہ نہ کیجئے کہ آپ کے نجی اسلوب یا طریقۂ برتاؤ میں کسی عیب کی وجہ سے وہ آپ کا مخالف ہوجائے بلکہ وہ اگر مخالفت کرے تو اس کی بنیاد خود دعوت ہو اس وقت ان کی دشمنی صرف حق سے ہوگی اور حق اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے دلوں میں داخل ہوجائے۔ یہ دشمن حق کی مخالفت اسے جاننے اور پہچاننے کے بعد ہی کرتے ہیں اور ان کے انکار کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے ان کے کسی منصب یا مفاد پر ضرب پڑتی ہے یا دوسرے وقتی اور ہنگامی فائدے خطرے میں پڑتے نظر آتے ہیں، چنانچہ جب حالات بدل جاتے ہیں اور یہ وقتی محرکات ختم ہوجاتی ہیں تو دل میں ایک چیز باقی رہ جاتی ہے

اور وہ وہی حق ہے جس سے انہوں نے دشمنی کی تھی اس وقت بغیر کسی زحمت کے یہ دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے۔

جو کوشش دعوت کو زندگی کے کنارے چھوڑ دیتی ہے وہ کمزوروں، مردہ دلوں اور ریاکاروں کی کوشش ہے جن کو اپنے اوپر ـــ اور اپنی دعوت کے اوپر اعتماد نہیں ہوتا۔ اور یہ بات انتہائی نامعقول ہے کہ ایسے لوگ دعوت میں منہمک ہوں جنہیں خود دعوت مصروف نہ کر سکے۔

میرے بھائی! قابلِ تقلید نمونہ دعوت میں رسول اکرمؐ کو بنایئے۔ اپنی دعوت سے دلچسپی پیدا کیجئے، اپنے ماحول میں اس کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا کر دیجئے، اپنی بستی، اپنے شہر اور اپنے لوگوں میں اسے فوری مسئلہ بنا دیجئے اور اسے لے کر ہر مجلس میں ہر محفل میں گھس جایئے اور ہر بہترین موقع اس کے لئے فارغ کیجئے اور ایسی باتوں کا انتخاب کیجئے اور انہیں اپنی زبان پر لایئے جو عوام کو طاغوت اور اس کی آلائشوں سے نفرت کرنے پر اُبھاریں اور اپنی گفتگو جنت و جہنم، حشر و نشر اور قلب و بدن تک محدود نہ رکھئے بلکہ اسے پورے معاشرے کے حالات، جاہ و منصب کے فتنوں، اخلاق میں بگاڑ اور کفر و طاغوت کی گندگیوں تک پھیلا دیجئے اور تحریر و تقریر، گفتگو اور چلت پھرت سے باز نہ آیئے تاکہ آپ کی دعوت مخالفین و موافقین سب کے دلوں میں زندہ ہو جائے اور آپ کی موجودگی اور غیر حاضری میں لوگ آپ سے دلچسپی لینے لگیں۔

یہ ہے وہ عملی مزاج (EXECUTIVE NATURE) جس کے طفیل داعی محنت و جدوجہد کرتا ہے کھیل نہیں کرتا، بہادر ہوتا ہے خوف زدہ نہیں ہوتا، باعمل

ہوتا ہے خیالی چیزوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، لوگوں کے آلام و مصائب میں برابر شریک ہوتا ہے، ان کی امیدوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتا ہے اور خوشی و غمی، پسند و ناپسند، قیام و قعود اور حرکت و جمود کے نغمے بکھیرتا رہتا ہے ورنہ اس مشن کو وہ زندگی میں کیا نافذ کر پائے گا اگر لوگوں کے دلوں تک اس کی رسائی نہیں ہوگی اور ان کے معاملات سے اسے گہری دلچسپی نہ ہوگی۔

۳ — اجتماعیت کی لڑی میں پرو دینا

یہ وہ تیسرا نکتہ ہے جس کی طرف علمی مزاج متوجہ کرنا چاہتا ہے یعنی جو لوگ دعوت کی تائید و حمایت کرتے اور اس کا دم بھرتے ہیں انہیں اجتماعیت کی لڑی میں پرو دینا۔ اور یہ جذبہ عقلی و نظری اجتہاد کے نتیجے میں وجود میں نہیں آسکتا بلکہ اس کے لئے وہ قلق اور اضطراب درکار ہے جو ان حامیان دعوت کو اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ہم یہاں اسی جذبہ کے عناصر کی نظری تحلیل و تجزیہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی اس امر پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ جب افراد کے عقائد میں ہم آہنگی ہو اور کسی متعین اصول کی خدمت پر ان کے اندر اتفاق پیدا ہو جائے تو اس وقت ان کے اندر اجتماعیت کو ابھار دینے سے کیا خوبیاں پروان چڑھ سکتی ہیں، نہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کو اجتماعیت کی لڑی میں پرونے کے لئے اسلام نے مختلف قسم کی عبادات فرض کی ہیں، بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ کوشش اور دعوت و تبلیغ کی جدّ و جہد، جس کے پیچھے اجتماعیت کو پیدا کرنے کا جذبہ نہ ہو یا جس کے نتیجے میں اجتماعیت وجود میں نہ آسکے، وہ بھی نظریاتی کوشش ہے جس کا اثر جلد یا بدیر زائل ہو کے رہتا ہے۔

یہ مفہوم ہمیں اس حدیث سے بھی ملتا ہے جس کی روایت امام مسلم نے کی ہے۔

اللہ کے رسولؐ جب کسی کو کسی فوج یا سریہ کا امیر بناتے تو اسے وصیت کرتے . . . یہاں تک کہ آخر میں کہتے :

"جب تمہاری کسی مشرک دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو اسے تین باتوں کی دعوت دو، ان میں جس کو بھی وہ تسلیم کرلے تو اس کی بات مان لو اور اسے طرح دے دو تم اسے اسلام کی طرف بلاؤ، اگر تمہاری بات مان لے تو اس کو تسلیم کرلو اور اسے طرح دے دو پھر اسے اپنا گھر بار چھوڑ کر مہاجرین کے ساتھ آ بسنے کی دعوت دو اور اسے بتادو کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو انہیں وہی حقوق ملیں گے جو مہاجرین کو ملے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر ہیں...... الخ "

آپ دیکھ رہے ہیں، رسول اکرمؐ اسلام لانے والوں کو مدینہ منورہ منتقل کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں، آخر ایسا کیوں ہے ؟

آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس مسئلہ پر سوچیں اور اس اجتماعیت کی عملی خصوصیات کا استخراج کریں جو مسلمانوں کو اکٹھا کرنا چاہتی تھی اور انہیں دعوت کے عظیم محور حضور اکرمؐ کے گرد جمع کرنا چاہتی تھی۔

ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ داعی اپنی دعوت کے اعوان و انصار کو ان کی بستیوں اور علاقوں سے نکال کر اپنے گرد جمع کرنے لگے بلکہ ہمارے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ اس اجتماعیت کے مقاصد پر ہم اپنی توجہات مرکوز کریں جو حضور اکرمؐ کے پیشِ نظر تھی، اگر داعی اور اس کے ساتھی اس اجتماعیت کے حصول کی رغبت اپنے اندر محسوس کریں تو انہیں ایک جگہ مجتمع ہونا چاہیئے اس لئے کہ یہ نبیؐ کا طریقہ ہے۔ ورنہ ڈاک، تار اور بحری و

بڑی سہولیات کی وجہ سے ان اجتماعیت کے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، داعیٔ دین اپنے اعوان وانصار سے برابر ملاقاتیں کرسکتا ہے، اپنی آراء وافکار انہیں ارسال کرسکتا ہے اور اپنی ہدایات انہیں پہنچا سکتا ہے بشرطیکہ کوئی ایسی جماعت موجود رہے جو اس کی نمائندگی کرتی رہے اور اس کے احکام پر سختی سے عمل کرتی رہے۔

جو لوگ ہجرت کی استطاعت نہ رکھتے تھے اور آپؐ کے گرد اکٹھا نہ ہوسکتے تھے، ان کی معذوریوں کو آپ تسلیم کرتے تھے چنانچہ آپ ان کی خدمت میں ایسے افراد روانہ کرتے تھے جو آپ کی جگہ ان کے درمیان دعوت کا کام انجام دیتے اور انہیں احکامِ الٰہی پر مجتمع کرتے تھے۔

ماضی قریب میں ایک دینی اصلاحی دعوت کی صدا بلند ہوئی، جن لوگوں نے یہ آواز لگائی تھی اور دعوت کا علم بلند کیا تھا وہ کافی طاقتور اور مستحکم لوگ تھے لیکن آج اس کا وجود کہاں ہے اور اس کے کیا اثرات باقی رہ گئے ہیں؟

یہ ابھی قریب ہی کی بات ہے، نئی نسل اس تحریک کی تعریف وتوصیف کرتی رہتی ہے اور اس کے علمبرداروں کو امامت وپیشوائی کا منصب دیتی ہے لیکن اس تحریک نے کیا ثمرات دکھائے؟ اس تحریک کے علمبرداروں میں علم کی کمی تھی نہ جاہ ومنصب کی، انہیں ان چیزوں کا حصہ وافر ملا تھا لیکن اصل کمی یہ تھی کہ انہوں نے اجتماعیت کا راز نہیں سمجھا، انہوں نے اس بات کی فکر نہ کی کہ ایسی جماعتیں[1] قائم کریں جو ان کی نمائندگی

---

[1] مشہور یہ ہے کہ انہوں نے اجتماعیت اور شیرازہ بندی کی کوشش کی تھی لیکن مختلف عوامل ومحرکات اور مصائب وآلام کی وجہ سے وہ اس پر قادر نہ ہوسکے۔

کر سکیں اور شہروں اور دیہاتوں میں ان کی دعوت کی حفاظت کر سکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں کے ارد گرد وکیلوں، بیرسٹروں اور اہم مناصب کے مالک افراد جمع تھے، مصنفین، سربرآوردہ افراد اور مالداروں کی ایک کھیپ ان کے پاس تھی اور حکومت کے بعض افراد بھی ان کے حامی تھے لیکن یہ لوگ بس یونہی اکٹھا ہو گئے تھے ان میں اجتماعیت نام کی کوئی چیز نہ تھی، اس کے علاوہ یہ ایسے تلامذہ تھے جو اپنے اساتذہ کی عبقریت سے متاثر ہو کر جمع ہو گئے تھے یہ وہ فوج نہیں تھی جو اپنے کمانڈر ان چیف کی اطاعت کے جذبہ سے سرشار ہو، یہ سارے لوگ یا تو استاذ کے فہم و فراست سے مسحور تھے یا اس کی مضبوط و توانا شخصیت سے متاثر تھے یا جاہ و منصب کے ان ثمرات سے مستفید ہونا چاہتے تھے جن سے اُن کا لیڈر ہمکنار تھا، ان میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو اصلاح و دعوت سے واقعی دلچسپی رکھتے ہوں۔

ان داعیانِ کرام نے اصلاح کی دلچسپیوں کے اعلان پر اکتفا کیا اور ملک کے اطراف و جوانب میں اس کے اثرات و نتائج کی تنظیم کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔

اگر آپ اس بات کا جائزہ لیں کہ اس تحریک کے جو نتائج ظاہر ہوئے، اس سے زیادہ اس کے اثرات کیوں نہیں پھیلے اور اس سے ہمہ گیر اور دوررس نتائج کیوں نہیں رونما ہوئے؟ تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اللہ سے مضبوط تعلق اور غایت درجہ تقویٰ کے باوجود ان کی دعوت کی رسائی محض عقل و فکر تک تھی، شعور و وجدان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، انہیں دلوں کے بجائے عقلوں کی پیداوار پر زیادہ اعتماد تھا اور ایمان کی خصوصیات اُبھارنے کے بجائے علمی اسباق اور جدید مقالات کے ذریعہ ذہنوں کو بیدار کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ وہ جدید بیداری کے بارے میں حُسنِ ظن میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے روحانی حقائق کو بیدار کرنے سے انہوں نے صرف نظر کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ پورا ملک جمود و تعطل میں مبتلا تھا اور

ان کے ہاتھوں اس کے سر میں زندگی رینگ گئی اور ذہن بیدار ہو گیا اور زبان سے آوازیں نکلنے لگیں، لیکن دل میں کوئی بیداری نہ آئی، بدن ویسے ہی جامد پڑا رہا، اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ملک کے ہر حصے میں نہیں گئے اور لوگوں کی زندگی میں اس طرز پر اپنی دعوت کو داخل نہ کیا جس کے سلسلے میں ہم پیچھے گفتگو کر چکے ہیں۔ سمندر کی تہ میں قومی و وطنی قوتوں کے بیٹھ جانے کی وجہ سے انہوں نے گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کی بلکہ سطحِ سمندر کے اوپر ہی طیب و خبیث کے سمیٹنے میں لگے رہے۔

اگر ہم چاہیں تو اس کے علاوہ اور گفتگو بھی ہو سکتی ہے لیکن اس سے اعراض کرتے ہوتے ہوئے ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اجتماعیت اور شیرازہ بندی ناگزیر ہے یہ وہ عملی اقدام ہے جو آپ کی دعوتی جدوجہد کے نتائج کی خوشہ چینی کرتا ہے اگر آپ اس اس سے غفلت برتیں گے تو آپ کا حال اس شکاری سے مختلف نہ ہوگا جو پانی میں جال پھینکنے کے بعد اس کی رسیاں ڈھیلی چھوڑ دے اور مچھلیوں کو اِدھر اُدھر بکھر جانے دے۔ ہم نے اس کے اثبات میں احادیث سے بھی استدلال کیا ہے اور اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ ان قابلِ تعظیم رہبران نے اس اجتماعیت کے اُصول سے صرفِ نظر کیا جس کی وجہ سے شکار ان کے ہاتھ سے نکل گیا، وہ بلا فوج رہنما بنے رہے اور قوم کسی قیادت کے بغیر اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی۔

اجتماعیّت کے اصول

گفتگو اجتماعیت پر ہو رہی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ دعوت کی کامیابی ان دلوں سے متعلق ہے جو اس پر ایمان لائیں ان کے جاہ و منصب اور مال و منال

سے اس کامیابی کا کوئی تعلق نہیں ۔ اگر کوئی انسان آپ کی دعوت پر ایمان لائے تو آپ کو اس سے کوئی بحث نہ ہونی چاہیئے کہ وہ مالدار ہے یا فقیر، سردارِ قوم ہے یا کوئی عامی شخص بس آپ کے لئے یہ کافی ہے کہ آپ نے اس کا دل جیت لیا ہے ۔ یہ دعوت وہ مبارک بیج ہے جو مومن قلوب کی مٹی ہی میں پروان چڑھتا ہے خبردار ، ظاہری ہیئت یا علمی القاب سے کبھی دھوکہ نہ کھایئے گا اور آگاہ باش ، کہیں کسی شخص کی اہمیت آپ کم نہ سمجھ لیں چاہے وہ بظاہر کتنا ہی کم عقل اور کمتر ہو اس لئے کہ ہر شخص کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی موجود ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی شخص کو پیدا کر دے اور اس کے اندر کوئی صلاحیت ودیعت نہ کرے ۔ قابلِ لحاظ چیز یہ ہے کہ ان خوبیوں کو پرکھا جائے ، ان کا استخراج کیا جائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے اندر وہ صلاحیت ہو جو دوسروں میں نہ ہو ، اس لئے اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کو کام میں لگایئے اور ان کی دلچسپیوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں ذمہ داری سونپیئے تاکہ ہر ایک کو یہ احساس ہو کہ یہ اس کی اپنی دعوت ہے اور اس کا دعوت سے اور دعوت کا اس سے گہرا تعلق ہے ۔ اور ہر طاقت اور صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجیے ۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو بظاہر آپ کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہے اور اس راہ میں استقامت و پامردی کا مظاہرہ کر رہا ہے اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیجیے ۔ کسی حالت میں بھی اسے نہ ٹھکرایئے اور یہ نہ سوچیئے کہ یہ شخص تو گنا ہوں پر اڑا ہوا ہے ۔ اس لئے کہ آپ نے اس کے دل کو نہیں ٹٹولا ہے ۔ نہ اس کے ماضی کو دیکھ کر اس کے خلاف طومار باندھئے ہوسکتا ہے

کہ کسی وقت اس نے اللہ سے توبہ کرلی ہو۔ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ یہ کہ ایسے لوگوں کو آخر تک وعظ ونصیحت کرتے رہیئے، تحریک کی تعلیمات ومقاصد سے انہیں روشناس کرایئے اور بلا جھجک ان پر انہیں نافذ کیجیے۔

تاہم ان صلاحیتوں کی شیرازہ بندی کرنے اور ان طاقتوں کو اجتماعیت کی لڑی میں پرونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ دو بنیادی چیزیں ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہیں:

ا — تنظیم

امیر تنظیم اور قانون کی طرف رجوع کرنا ہر ایک کے لئے لازم ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے، اس کی نگاہ میں جس چیز کی اہمیت ہو اسے بڑھ کر انجام دے اور بے فائدہ کاموں میں بھی لگ جائے، اور جو کام اس سے متعلق نہ ہو اس میں بھی اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے تو اس سے ہر طرف انتشار اور لاقانونیت ہی کا راج ہوگا، ہر ایک اپنی ڈفلی لے کر راگ الاپ رہا ہوگا اور ساری اجتماعیت پراگندگی اور اختلافات میں تحلیل ہو جائے گی اور تنظیم کا سب سے بہترین مظہر اطاعت کیشی ہے جس میں کوئی تردد ہو نہ تنگی۔ ہم یہاں اطاعت کی خصوصیات اور ہر نظام میں پائی جانے والی اس کی خوبیوں پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے نہ اس سلسلے میں کتاب وسُنّت میں جو کچھ وارد ہوا ہے، اسے دوہرانا چاہتے ہیں البتہ اس حقیقت کو اجاگر کرنا پسند کریں گے کہ اطاعت امیر سے عزت نفس مجروح نہیں ہوتی نہ کسی صورت میں انسان کی خودی اور اس کی شرافت پر آنچ آتی ہے۔ اس تصور سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، سب کو یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ اجتماعیت کو منہدم کرنے اور ہر شیرازہ بندی کو منتشر کرنے کے لئے

شیطان اس طرح کی دراندازیاں کرتا ہے۔ ہم سب محض اللہ کے لئے کام کرتے ہیں اور اللہ مناصب و مراتب کے لحاظ سے اعمال کی قدر و قیمت نہیں متعین کرتا بلکہ وہ تو رضائے الٰہی کے حصول کی سچی نیت دیکھتا ہے۔ بسا اوقات اللہ تعالیٰ آخری صف کے کسی معمولی کارکن کو وہ پذیرائی بخشتا ہے جو صدارت و امارت کے منصب پر رہنے والے کو بھی نہیں ملتی۔ اللہ نے اطاعت کا نظام اس لئے بنایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اجتماعیت وجود میں آسکے اور اعمال میں نکھار آسکے۔ یہ وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لئے جماعت کو جدوجہد کرنا لازم ہے۔ یہ بات ہم اس لئے نہیں کہہ رہے ہیں کہ اسے ہم بس نظری و عقلی لحاظ سے صحیح سمجھتے ہوں، بلکہ سب سے پہلے ہم جذباتی طور سے بھی اسے درست خیال کرتے ہیں اور اور ہمارے اعمال اور ہماری جملہ سرگرمیاں اس کی تصدیق کرتی اور اس کے مبارک ثمرات کی خوشہ چینی میں لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ منظم افراد، چاہے تعداد میں تھوڑے ہوں، اس انبوہ کثیر سے بہتر ہیں جو بکھرا ہوا ہو اور کسی خیر یا حق پر اتحاد کو قائم رکھنا اس اجتماعیت سے بہتر ہے جس کے ارکان متفرق ہوں اور ان میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہو کہ بس وہی حق پر ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اطاعت کو بجالائیں پھر اس کے بعد امارت کی طرف دیکھیں اگر ہماری ناراضگی کی وجہ یہ ہو کہ امیر حسب و نسب اور جاہ و منصب سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے تو ہم اللہ سے پناہ مانگیں اور ان غلط خیالات سے دامن جھاڑ لیں اور اگر ہم دیکھیں امیر جماعت حالات سے باخبر نہیں رہتا، معاملات میں غلط تصرف کرتا ہے اور علمی انتشار کا شکار ہے اور ذاتی خواہشات کا ساتھ دیتا ہے تو حکمت سے معاملہ کو نپٹانے کی کوشش کریں اور حکمت کا مطلب یہاں یہ ہے کہ اجتماعیت کی حفاظت اور سلامتی بہر قیمت عزیز ہو، اور اگر اس

سے انتشار اور افتراق نمودار ہونے کا اندیشہ ہو تو اس طرح کا اقدام جرم شمار ہو گا۔

۲ — اخوت

اس طرح کی جماعتوں پر ان اقدار کا غلبہ ہونا چاہیئے جو ہم آہنگ اور ہم فکر بھائیوں پر حاوی ہوتے ہیں۔ اخوت کے اہم عناصر۔ محبت، مساوات اور خوش حالی و بدحالی میں خیر کے معاملہ میں تعاون کرنا ہیں۔

اگر آپ دیکھیں کہ کچھ بھائی آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تو سمجھ لیجیے کہ ان کے درمیان کوئی ایسی بات ضرور ہو گئی ہے جس نے ان کے تعلقات خراب کر دیئے ہیں۔ اور جب آپ یہ دیکھیں کہ وہ اپنے منصب کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر جتا رہے ہیں، مال و دولت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے جاہ و حشم کی برتری جتا رہے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کا بھائی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر آپ یہ محسوس کریں کہ وہ ایک دوسرے کی امداد و تعاون سے ہاتھ کھینچ رہے ہیں تو یقین کر لیجیے کہ دلوں کے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔

ہم یہاں دو عمدہ خصائل کی وصیت کرتے ہیں:

۱ — انکسار اور تواضع

اس سے میری مراد یہ ہے کہ خدا پرستی کی اس دعوت میں ہر شخص اپنے بھائی کے سامنے فروتنی اور انکسار کا رویہ اپنائے اور اس مبارک قول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے "جب تمہارا بھائی سخت ہو تو تم نرم پڑ جاؤ"۔ ہم اس کی وصیت کرتے وقت اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ہر جماعت اس اصول کو نظری نہیں بلکہ عملی طور پر اختیار کرے گی اس لئے کہ سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ نفس اس طرح کے بلند اقدار سے

بے نیازی برتتا ہے اگر ہم اسے ان کا عادی بنا سکیں تو ہم ایک بڑی جنگ جیت سکتے ہیں اور شیطان مردود کو، جو خودی اور عزّتِ نفس کے نام پر ان بلند قدروں سے انسان کو پھیرنے کی کوشش کرتا ہے، شکست دے سکتے ہیں۔ آخر کوئی حکمت تو تھی کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

"غصّہ کے گھونٹ سے زیادہ محبوب اللہ کو اور کوئی گھونٹ نہیں ہے جسے ایک بندہ پی جائے۔ جو بندہ محض اللہ کی رضا کے لئے غصّہ پی جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا پیٹ ایسے ایمان سے بھر دیتا ہے جس کی حلاوت وہ اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے۔"

اگر ہم اپنے بھائیوں کے سامنے ذلّت وانکساری کے اس اصول کو اختیار کر لیں، چاہے غصّہ کی حالت میں ہوں تو امید ہے کہ ہم انتشار اور افتراق کے اسباب کا خاتمہ کر سکیں گے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ جس انکسار اور فروتنی کی ہم وصیت کر رہے ہیں وہ ایک کمزور کا طاقتور کے سامنے ذلیل اور پست ہونے کے مترادف ہرگز نہیں ہے نہ ایک فقیر ومحتاج کا مالدار کے سامنے، پسماندہ طبقات کا اعلیٰ نسب کے سامنے اور ایک شخص کا اپنے طاقتور دشمن کے سامنے جھکنے کے برابر ہے۔ یہاں تو گفتگو صالح قیادت اور باعمل امارت کی ہو رہی ہے چاہے کوئی نکتہ چینی ہی اس کا ذمّہ دار بنا دیا جائے۔

اوپر کی ذلّت وخواری تو ایک قسم کی گندگی ہے جس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں یہاں جس پستی وانکساری کی بات ہو رہی ہے وہ ایک مومن کا دوسرے مومن کے سامنے اور ایک بھائی کا اپنے بھائی کے سامنے تواضع اختیار کرنا ہے اور جو لوگ اس روحانی والہامی دعوت سے وابستہ ہو گئے ہیں ان کے سامنے پستی اختیار کرنا ہے،

اور انہیں مساوات کی لڑی میں پرونا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر آپس میں یہ ذلت وانکسار واجب ہے، اگر یہ لوگ آپس میں اس فروتنی وخاکساری کا مظاہرہ نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور شیطان کے ہاتھوں اپنے دین کو منہدم کر کے رہیں گے چاہے شیطان نے ان کے سامنے اس عمل کو خوب مزین کر کے پیش کیا ہو اور یہ سجھا دیا ہو کہ وہ صحیح اور سچے راستے پر ہیں۔ اس لئے کہ تعلقات کا بگاڑ وہ چیز ہے جو دین کو مونڈ دیتی ہے اور اس کے سارے نقوش مٹا دیتی ہے۔ اگر کوئی اپنی عزتِ نفس کا جائزہ لینا چاہتا ہے تو اسے کفر والحاد اور طاغوت کے نمائندوں کے بارے میں اپنے موقف پر غور کرنا چاہیئے، اگر وہ اپنے دل میں ان کے خلاف ایسی نفرت محسوس کرتا ہے جو اسے ان کے خلاف اٹھا کھڑا کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عزتِ نفس درست ہے اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ذلیل ہے چاہے اس کے سامنے کتنی ہی گردنیں جھکتی ہوں۔ اللہ کا یہ قول اس مفہوم کی کتنی صحیح ترجمانی کرتا ہے:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ؗ

(مائدہ : ۵۴)

(جو مومنین پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے۔)

یہاں جس پستی کی بات ہو رہی ہے وہ رحمت ومحبت اور اخوت کو باقی رکھنے کی رغبت سے متعلق ہے اور یہ پستی ایسی ہے جو بلندی وبرتری کے مفہوم کی حامل ہے اس لئے اللہ نے مومنین کی صفت یہ بتائی کہ یہ مسلمانوں پر شفیق ورحیم ہیں اور کافروں پر سخت ہیں لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے اور کافروں کے لئے نرمی اور اپنوں کے لئے گرمی پیدا ہو جائے تو یہ ایسی صورت حال ہو گی جس کی موجودگی میں کسی بہتری کی توقع بیکار ہے۔

كِبْرًا عَلَيْنَا وَجُبْنًا عَنْ عَدُوِّكُمْ

لبئست الخلتان الكبر والجبن

(ہم پر اکڑفوں دکھاتے ہیں اور دشمنوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں کتنا بُرا ہے یہ تکبر اور بزدلی۔)

کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ اگر اپنے بھائی کے ساتھ فروتنی اور عاجزی کا معاملہ روا رکھا جائے گا تو اس سے ظالم و باجبروت شخص کو اور شہ ملے گی اور اس کا ظلم و عدوان مزید بڑھ جائے گا، اس لیے کہ یہ عام قانون نہیں ہے۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ سے ایک بار غلطی ہوگئی اور انہوں نے حضرت بلالؓ کو حبشی النسل ہونے کا طعنہ دیا، جس پر بلالؓ خاموش رہے اور ابوذرؓ کو اتنی ندامت ہوئی کہ انہوں نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور قسم کھائی کہ جب تک بلالؓ اپنے قدم سے ان کے رخسار نہ روندیں گے وہ اپنا سر اٹھا نہیں سکتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے اس وقت تک زمین سے سر نہ اٹھایا جب تک بلالؓ نے ان کے قسم کی تکمیل نہ کر دی۔

بھائیو! یہ بات جان لیجیے کہ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے "مومن سدھائے ہوئے اونٹ کی طرح ہے"، جو شخص عزت و رفعت کا اور محبوبیت کا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ مطیع و منقاد اونٹ بننا سیکھے اور ابوذر اور بلال رضی اللہ عنہما کی مثال اپنے سامنے رکھے۔ سختی و سخت گیری، شدت و حدت، بہت جلد غصہ ہو جانا اور تلخ و ترش گفتگو کرنا تو ان احمق اور بیکار لوگوں کا کام ہے جن کو اس نصب العین سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی نہ ان سے کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ ان کے سر اختیار و تمیز اور معاملات کے انجام پر غور و فکر کرنے سے خالی ہوتے ہیں۔

۲ —— بحث و مناظرہ سے پرہیز

یہاں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان مراحل کا ذکر کروں جن سے بحث و مباحثہ گزر کر باہمی کینہ پروری اور حسد و نفرت کی تخم ریزی تک جا پہنچتا ہے اور پھر تعلقات پراگندہ ہو جاتے ہیں اور دل ایک دوسرے سے پھٹ جاتے ہیں۔ ہم تو یہاں اپنے بھائی کو ایک نہایت قیمتی اور قابلِ قدر تجارت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"میں اس شخص کے لئے جنت کے وسط میں ایک گھر کی ضمانت لیتا ہوں جو حق پر ہوتے ہوئے بحث و مباحثہ کو چھوڑ دے۔ اور اس شخص کے لئے جنت کے گرد و نواح میں ایک گھر کی ضمانت لیتا ہوں جو غلط بنیادوں پر ہونے کی وجہ سے کج بحثی کو چھوڑ دے"

اگر آپ یہ محسوس کریں کہ حق آپ کے ساتھ ہے یا آپ حق پر ہیں تو جان رکھئے کہ رسولِ اکرمؐ اس ضمانت کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے آپ سے کہتے ہیں کہ جنت کا یہ گھر آپ کی کج بحثی جاری رکھنے سے زیادہ بہتر ہے۔ تو ہر آدمی کو سوچنا چاہیئے کہ کیا وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ جھٹر رہا ہے اور آپ کی ضمانت کو ٹھکرا رہا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو وہ اس رسول کے پرچم تلے چلنے والوں کے ساتھ کیوں ہے؟ اور اگر جواب نفی میں ہے تو اس مباحثہ اور اسباب و ذرائع کو شیطان کے منہ پر پھینک دینا چاہیئے اور اس ضمانت کو بڑھ کر قبول کرنا چاہیئے جو اللہ کے رسول اپنے دستِ مبارک سے پیش کر رہے ہیں۔

مناظرہ بازی بڑی گندی اور خبیث عادت ہے، محبتوں پر قینچی چلانے اور اور اجتماعیت کو پارہ پارہ کر دینے میں اس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور اجتماعیت دین کا

مغز ہے جبکہ انتشار شرک کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے اور اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں:

"وہ اولین چیز جس سے بتوں کی پرستش کے بعد میرے رب نے مجھے روکا ہے، مناظرہ بازی ہے۔"

آدمی کے لئے یہ چنداں مشکل نہیں ہے کہ وہ احقاق حق کا فریضہ انجام دیتے ہوئے بھی کج بحثی سے پرہیز کرے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ اس کی رائے ہی صحیح ہے اور اس کا اس وقت تک دفاع کرنا واجب ہے جب تک وہ غالب نہ ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر ایک اپنی رائے رکھے اور اگر وہ اسے حق سمجھتا ہے تو اپنے نفس کے لئے خاص طور سے اس پر عمل کرے۔

میرے بھائی! آپ کی رائے اجتماعیت سے زیادہ بہتر ہے نہ قیمتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (انفال: ۶۳)

(تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے۔)

ذرا دیکھئے تو سہی کہ آپ کی رائے ماننے کے بعد جماعت کو کسی عظیم خسارہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے، میں دوبارہ یہ کہنا پسند کروں گا کہ وہ حق جس میں اختلاف ہوتا ہے، اس میں حق کی روشنی کم ہو جاتی ہے اور باطل کی ملاوٹ کی وجہ سے اس کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس پر بحث ہو اور اس سے صرفِ نظر کرکے اس حق پر اکتفا کر لیا جائے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

جو حق عوام کے سامنے ظاہر ہو جائے، اس میں ان کا لگ جانا ان کی سعادت کے لئے اور ان کے رب کے راستے کی طرف رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

یہاں تک خارجی زندگی میں انسان کی کامیابی کے ستون اور اس کی دعوت کی فلاح کے مظاہر پر گفتگو ہوئی ہے، اب ان نفسی خصوصیات کو بیان کیا جائے گا جن کے بارے میں ہم لکھ چکے ہیں کہ وہ علمی مزاج کی روح سے کبھی جُدا نہیں ہوتیں، ہمیشہ اس کے ساتھ موجود رہتی ہیں اور وہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

صبر

اللہ کے تمام رسول اور پیغمبر مشکلات و مصائب سے دوچار ہوئے، اُنہیں جلاوطن کرنے اور قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں اور دوسری بہت سی پریشانیوں سے انہیں گزرنا پڑا لیکن وہ زبردست ہتھیار جس سے انہوں نے ان تمام حملوں کا مقابلہ کیا، صبر تھا۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾ (انعام: ۳۴)

(تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جُھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں، انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی، اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔)

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو جن چیزوں کی وصیت کی ہے ان میں سب سے زیادہ زور صبر پر دیا گیا ہے۔ یہاں صبر سے مراد ذلت و رسوائی اور سپر ڈال دینا نہیں ہے نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ دعوتِ دین سے باز آجائیں اور جو لوگ نیک و پاکدامن لوگوں پر الزامات لگاتے ہیں اور انہیں مسلسل پریشان کرتے ہیں، ان کی تدبیر کرنے کی فکر نہ کریں۔ یہاں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ :

۱۔ دعوتِ دین کی راہ میں جو نفرت و عداوت، مصائب و مشکلات اور اعراض و بے نیازی آئے ان سے صرفِ نظر کرلیں اور اس بات کا احساس نہ کریں کہ یہ مصائب گلے کا کانٹا بن گئے ہیں، اس لئے کہ اس احساس سے دلوں میں تنگی آئے گی اور اس کی تدبیر کرنے میں ہم جلدی کر بیٹھیں گے، بلکہ ہماری ذمہ داری ہے کہ نفس اور معدہ کو ان تمام چیزوں کو ہضم کرلینے پر آمادہ کریں۔ ہر مصیبت پر گھبرا اٹھنا اور آہ و واویلا مچانا داعیانِ دین کا کام نہیں ہے نہ اس سے دعوت کا کام ہو سکتا ہے۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم ان چیزوں کو برداشت کریں اور تسلیم و رضا کے جذبے کے ساتھ ان کا استقبال کریں اور ہر حال میں اللہ کا شکر کریں اور جو لوگ دعوت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں ان کے لئے اللہ سے مغفرت کریں۔

۲۔ ہر داعیٔ دین ان تمام حالات و نتائج کا منتظر رہے جو گردش زمانہ سے پیش آنے والے ہوں۔ اس لئے کہ زمانہ بغیر کسی انتظار کا موقع دیئے اپنے مواقع و حالات اور تصرفات کے ساتھ آدھمکتا ہے اور اس کے پہلو میں اللہ ایسے واقعات اور ایسی تبدیلیاں رکھ دیتا ہے جو ان مصیبتوں کو گھٹا دیتی یا انہیں ختم کر دیتی ہیں۔ داعیٔ دین

کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ طولِ زمانہ کی وجہ سے اس کی جرأت اور اس کا حوصلہ سرد نہ ہو بلکہ آلام و مصائب کو ہضم کرنے کے بعد اس کی اندرونی طاقتوں اور خفیہ صلاحیتوں کو اور جلا ملے اور گردش زمانہ کے ساتھ اس کا معاملہ کچھ اس طرح ہو جائے کہ ؎

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

۳۔ وہ ان مشکلات و مصائب سے براہِ راست ٹکرانے کے بجائے کسی اور راستہ سے اپنا کام کرے۔ سیلاب کی طرح اس کے چاروں طرف چکر لگائے اور پیچھے سے اپنا راستہ بنالے۔ وہ اپنی دعوت میں لگا رہے۔ لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلاتا رہے، اپنے گرد دین کے مددگاروں کو جمع کرتا رہے اور مختلف خدمات رفاہی کاموں اور امداد و تعاون کے اداروں کے قیام کے ذریعہ عوام کے دل جوڑتا رہے۔ اس کے سامنے ایسی خرابیاں ہیں جن کی حمایت نہ قانون کر سکتا ہے نہ اس کی بقا سے کسی کا مفاد وابستہ ہے اس لئے ان خرابیوں کا علاج کرنا اور عوام کو ان سے دُور کرنے کی فکر کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

ایسے کتنے ہی اصول ہیں جنہیں اگر داعیٔ دین اور اس کے پیرو کار ساتھی اپنی نجی زندگی میں نافذ کریں اور اپنے اخلاق و کردار کو سنوار کر ان کی عملی مثال بن جائیں تو انہیں کوئی تنگی اور پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ آپ لوگوں کے سامنے ان اصولوں کی خوبیاں بیان کیجیے اور انہیں ان صفات سے متصف ہونے کی دعوت دیجیے۔ اس کے ذریعہ آپ اپنی دعوت کے لئے ایک ماحول پیدا کر سکیں گے اور اپنے مشن کی بعض تعلیمات کے لئے تجرباتی میدان فراہم کر سکیں گے اور یہ کوئی مخفی چیز نہیں کہ اس تجربہ میں کتنی

زبردست قوت وتاثیر ہے اور اس سے جو غلطیاں سامنے آئیں گی، ان سے کس طرح آپ مُستفید ہو سکیں گے۔

داعیِ دین اس طرح کے اور بہت سے تجربے کر سکتا ہے۔ ہر کوشش جو دعوتِ حق کی راہ میں ہو گی، وہ ایک کمک ہو گی جس سے اس نصرت کے محفوظ سرمایہ میں اضافہ ہو گا، جس کا وہ منتظر ہے۔ اگر وہ دعوتِ دین کا کام کرنے سے اس وجہ سے بیٹھ رہتا ہے کہ کوئی اس کی آواز سننے والا نہیں ہے یا حالات غیر مساعد ہیں تو وہ نصرت کو واجب کرنے والی کمک سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور یہ بات میں محض نظریاتی جذباتیت کی رو میں بہہ کر نہیں کہہ رہا ہوں، نہ استعارہ ومجاز کا استعمال کرکے اپنی بات کو خوبصورت بنانے کی کوشش کر رہا ہوں، بلکہ یہ وہ حق ہے جس میں کسی شک وشُبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ

(آل عمران: ۱۹۵)

(میں تم سے کسی عمل کا ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت۔)

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

(البقرہ: ۱۴۳)

(اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا، یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق ورحیم ہے۔)

ہم جلد ہی اس مفہوم کی مزید وضاحت کریں گے۔ یہاں تو ہم جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں وہ بس اتنی ہے کہ ان میدانوں میں کام کرنے سے ہرگز باز نہ آیا جائے جن میں

کام کرنے سے کسی تنگی یا پریشانی کا سامنا نہیں ہوگا۔

میرے بھائی، اس طرح اپنے ہاتھوں سے آپ اپنی نصرت کی فوجیں تیار کریں گے۔ مشکلات و مصائب کے باب میں داعیٔ دین کے صبر اختیار کرنے کے موضوع پر یہ تھوڑی سی گفت گو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آخری نبیؐ کو ایسی بہت سی مثالیں سُنائی ہیں جن میں اس سلسلے میں بہترین رہنمائی موجود ہے۔ موسیٰؑ جب سن رشد کو پہنچے اور جوان ہوئے تو ظلم کے ان تمام مظاہر کو دیکھا جن سے پوری اسرائیلی قوم دوچار تھی۔ موسیٰؑ ایک تندرست نوجوان تھے جنہیں اللہ نے رسالت کے لئے تیار کیا تھا۔ آپ حساس نفس لے کر آئے تھے۔ ظلم سے نفرت کرتے تھے اور اس کے مظاہر کے خلاف سراپا بغاوت تھے۔ ایک بار جب کہ شہر کے لوگ غفلت میں پڑے تھے، یہ داخل ہوئے تو:

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ ﴿١٥﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِلْمُجْرِمِينَ ﴿١٧﴾ فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهُ ۚ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُبِينٌ ﴿١٨﴾ فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَهُمَا قَالَ يَا مُوسَىٰ أَتُرِيدُ أَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ

نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

(قصص : ۱۵ تا ۱۹)

(وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اُسے مدد کے لئے پکارا۔ موسیٰؑ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰؑ نے کہا: "یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے۔" پھر وہ کہنے لگا "اے میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے۔" چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی وہ غفور رحیم ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ: "اے میرے رب، یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے، اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔"

دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہے کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لئے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا "تو تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے۔" پھر جب موسیٰؑ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اُٹھا "اے موسیٰؑ، کیا آج تو مجھے اُسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔")

بلاشبہ ظلم ایک بڑا گناہ ہے جس کا استیصال واجب ہے۔ اور موسیٰؑ کی یہ ذمہ داری

تھی کہ بنی اسرائیل کو ان مظالم سے نجات دلائیں جن میں وہ پس رہے تھے، تو کیا موسیٰ علیہ السلام نے اس عمل کے ذریعہ اس فساد کو دُور کرنے کی صیحح تدبیر کی تھی؟

اس ظالم مصری کو قتل کرنے کا وبال بنی اسرائیل پر کیا آیا؟ کیا ظلم کا استیصال ہوگیا اور مصائب کی بدلیاں چھٹ گئیں؟۔

بنی اسرائیل کے ایک فرد کو مصری کے مار دینے کی کوئی توجیہ، ہوسکتا ہے کہ نکل آئے اس لئے کہ اسرائیلیوں پر مظالم ایک عام بات تھی اور اس سُنّت کے مطابق تھی جس کی حفاظت مصر کا فرعون کرتا تھا۔ اگر ہم اس کا صیحح علاج کرنا چاہیں تو یہ انفرادی حادثات کے ذریعہ نہیں ہوسکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ اس رائج سُنّت کو تبدیل کیا جائے اور اس قانون کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جس کی حفاظت فرعون کرتا تھا۔ ایک فرد یا چند افراد کا قتل کر دینا، جیساکہ موسیٰ علیہ السلام نے کیا، ایک ایسا عمل ہے جو اصلاح سے ایک قدم بھی قریب نہیں ہے اور خود موسیٰ علیہ السلام نے اسے شیطان کا عمل قرار دیا تھا۔

پھر ایک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ انفرادی حادثات کے ذریعہ اس فساد کا علاج بسا اوقات قانون کی زد میں آجاتا ہے اور ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ فساد جاری رہتا ہے اس وقت داعی بے فائدہ اپنے آپ کو قانون کے سامنے مجبور پاتا ہے اور جبّاروں اور سرکشوں کی جھُرمٹ میں پھنس جاتا ہے۔

ہم یہاں بزدلی یا ذلّت و رسوائی کی تعلیم نہیں دینا چاہتے البتہ ہم یہ پسند کرتے ہیں کہ داعی کا عقلی و نفسی افق وسیع ہو۔ وہ بیماری کی جڑ اور اس کی بنیاد پر حکمت و دانش کے ساتھ اور انجام و آغاز پر غور و فکر کر کے تیشہ چلائے یہی علاج کا طبعی راستہ ہے رہا انفرادی حادثات پر حملہ کرنا اور فساد کے متفرق مظاہر پر تیشہ چلانا تو یہ ان سادہ دل اور بیوقوف لوگوں

کا کام ہے جو انجام وعواقب پر غور کئے بغیر جذبات کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں اور مستقبل کے لئے اپنے کو تیار نہیں کر

اس غلطی میں حسنِ نیت کے باوجود بہت سے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ موسیٰ ؑ سے یہ غلطی سرزد ہو گئی تھی جو ایک نو عمر نوجوان تھے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قومِ فرعون کے سردار جاگ اٹھے اور اس نوجوان کے خطرے کے سدِ باب کے لئے اسے قتل کرنے کی سازشیں کیں لیکن اللہ ہی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔ اس نے موسیٰ ؑ کو تیار کیا تھا تاکہ مناسب وقت میں اپنے اصلاحی مشن کا آغاز کریں۔

اللہ نے دیکھا کہ اس نوجوان کے اندر پختگی آگئی ہے اور اس کے ایمان کی حرارت کافی طاقتور ہو چکی ہے لیکن اس کی آزمائشیں ابھی مکمل نہیں ہوئی ہیں اور ظلم و جبر کے مظاہر دیکھ کر اس سے غلطیوں کے صادر ہونے کا اندیشہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ محسوس کیا کہ اسے گرفتار کر کے یا قتل کر کے اس مصلح کا راستہ بند کیا جا سکتا ہے اس لئے اس کی تدبیر و حکمت مقتضی ہوئی کہ ایک دور دراز دیہات میں ایک نیک اور بزرگ شخص کے زیرِ تربیت اس کی پرورش ہو۔ اس لئے اسے شہر سے نکل جانے کا حکم ہوا کیونکہ سردارانِ قومِ فرعون اس کے قتل کی سازشیں کر رہے تھے۔ چنانچہ آپ وہاں سے فرار ہو گئے، یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اس لئے بیان کی ہے تاکہ ہر داعیِ دین اس پر غور کرے۔ اس لئے کہ یہ واقعہ کافی غور و فکر کا حامل اور رشد و عبرت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پختگی کی عمر کو پہنچ گئے اور بارِ نبوت کو اٹھانے کے لائق ہو گئے تو دوبارہ نرم باتوں اور کھلے دلائل کے ذریعہ معاشرے کے فساد کو دور کرنے کے لئے آموجود ہوئے لیکن پھر فساد کے ان سطحی مظاہر کی طرف متوجہ نہ ہوئے جو

اس سے پہلے غلطیوں کی طرف لے جاتے تھے۔

اس عظیم رُکاوٹ کو دُور کرنے کی بس ایک تدبیر ہے وہ یہ کہ داعیٔ دین اپنے رب سے مضبوط تعلق قائم رکھے اور اپنے مشن کی راہ میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ اس پر فرض ہے کہ اپنے مشن کی طرف دعوت دینے میں تساہل ہرگز نہ کرے عنقریب وہ دیکھے گا کہ اس کے مشن کا فیضان ان ساری رکاوٹوں کو بہالے جائے گا جیسا کہ اللہ نے فرعون کے ساتھ کیا۔

ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں دیکھتے ہیں کہ اس داستان سے آپ کے دل کو تقویت حاصل ہوئی اور آپ نے کسی انفرادی علاج اور تدبیر کو اختیار کرنے کے لئے جلدی نہیں مچائی بلکہ آپ خانہ کعبہ میں بُتوں کے جھرمٹ میں آدھی رات کو نماز ادا کرتے تھے لیکن ان پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا اور نہ ان کی طرف کبھی غیظ و غضب کے ساتھ بڑھے اور اگر کبھی آپ ہاتھ بڑھاتے بھی تو کوئی آپ کو ایسا کرتے نہیں دیکھ پاتا لیکن اس کا انجام کیا ہوتا؟ بُت پھر اپنی جگہ آموجود ہوتے بلکہ ان سے عقیدت اور عصبیت مزید بڑھ جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی اذیتیں دی جاتی ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کی تدبیر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ صبر وعزیمت کی راہ اختیار کی جائے، دعوتِ دین کے کام کو جاری رکھا جائے، انصار اور حامیانِ دعوت کی شیرازہ بندی کی جائے اور قوتوں کو ایک نقطہ پر مرتکز کر دیا جائے، عقائد کو ذہنوں میں راسخ کیا جائے اور عقل و نظر کے معیارات کو بدل دیا جائے۔ یہاں تک کہ وقتِ موعود آیا تو رسولِ اکرمؐ ایک چھڑی سے ہر بُت کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور کہتے جاتے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا۔ اور ایک ایک کر کے سارے بُت گرا دیئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے جاں نثار صحابہ نوجوان آپ سے کہتے تھے کہ ہتھیار اُٹھالیں اور اپنے

دشمنوں کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوں لیکن آپؐ ان کے جوش وجذبہ کو سرد کر دیتے تھے اور ان سے انتظار کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ مکہ میں جب کہ جہاد شروع نہ ہوا تھا، انہیں معلوم تھا کہ ایسے دن کا وعدہ کیا گیا ہے جب یہ لوگ ہتھیار اٹھا سکیں گے۔ وہ مکہ میں قرآن کی یہ آیات پڑھتے تھے:

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ (مزمّل : ۲۰)

(اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں —)

تو اس دن کے انتظار میں ان کا شوق ورغبت اور جذبہ وحوصلہ بھڑک اٹھتا تھا لیکن آپ نے ان نوجوانوں کی جلد بازی سے کوئی تاثر قبول نہ کیا نہ ان لوگوں کی طرح کسی ہلکے پن اور سطحیت کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ آپ برابر انہیں نصیحت کرتے تھے کہ اپنے ہاتھوں کو اس وقت تک روکے رہیں اور نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی پر اکتفا کریں تاآنکہ تو تیں مکمل ہو جائیں، پھل پک جائے اور اللہ کا فیصلہ آجائے۔

یہ ہماری بڑی سخت قسم کی غلطی ہوگی اگر ہم مصیبتوں اور پریشانیوں کا علاج کرنے میں اس طریقہ کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ نوجوانوں کو بتائیں گے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعین کیا ہے اور جسے رسولِ اکرمؐ نے حکمت و قوت اور حلم ومتانت کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

جب داعیٔ دین مصائب و مشکلات کی گھاٹیاں عبور کرلے، آلام اور کٹھنائیوں کی بدلیاں چھٹ جائیں اور اسے معاملہ پر قابو حاصل جائے تو اس نظام کو قائم کرنے میں لگ جائے جو اس کی دعوت کا تقاضا ہے اور اس مرحلے کا استقبال اس طرح کرے کہ یہ اہمیت اور ذمہ داری میں گھاٹیوں اور مصائب والے مرحلے سے کم نہ ہو گرچہ اس میں ذمہ داری دوچند نہیں ہوتی اور پریشانیوں کی کثرت نہیں ہوتی۔

اس مرحلہ میں داعیٔ دین کو ایک اُمّت کی تشکیل کرنی ہے اور تقویٰ اور رضائے رب کی بنیاد پر ایک مملکت قائم کرنا ہے۔ اس مرحلہ میں بھی وہ اپنے مشن کے اصولوں کا پابند ہے اور اس کے علمی مزاج کے اشارے کے مطابق ہی اسے کام کرنا ہے۔ پیچھے ہم نظام کے قواعد پر گفتگو کر چکے ہیں، اب صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ داعیٔ دین دوبارہ جان لے کہ اللہ نے رسالت کی ذمہ داریاں نہایت سہل اور واضح انداز میں بیان کردی ہیں جس میں کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ اسے اوامر و نواہی کی شکل میں ڈھال دیا ہے اور کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ یہ بہانہ کرے کہ وہ امر و نہی کے درمیان تمیز نہیں کرسکتا، ان کے درمیان اپنی ذمہ داری کھودے۔

⁂ ⁂ ⁂

گزشتہ تحریروں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ علمی مزاج وہ خدائی تحفہ ہے جو نیک بخت اور صالح افراد کو نصیب ہوتا ہے لیکن اگر مندرجہ ذیل طریقے اپنائے یا ان سے بہتر وسیلے اختیار کرسکے تو اس خدائی تحفہ کا ایک بڑا حصہ حاصل کرسکتا ہے۔

۱— وہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تاریخ کا مطالعہ کرے اور آپ کی داعیانہ سیرت پر خصوصی نظر ڈالے پھر اس سیرت کو منظّم دعوت کے مختلف مراحل میں

تقسیم کر کے ہر مرحلہ کا خصوصی جائزہ لے اور رسولؐ نے اس مرحلے میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو اسلوب اور طریقے اپنائے ان پر غور کرے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہاں سیرت طیبہ کے مختلف مراحل کے ذکر کا موقع نہیں ہے اس پر تفصیل سے گفتگو انشاء اللہ "دعوتِ دین کے ماخذ" کے باب میں ہوگی۔

۲۔ ان تمام خدائی احکام اور اوامر کو جمع کرے جن میں رسولؐ کو بحیثیت داعی خطاب کیا گیا ہے، پھر ان سب کی تالیف و تبویب کرے تاکہ ان سے داعیٔ دین کے لئے ایک عملی دستور نکال سکے۔ اگر وہ ایسا کر سکے تو انبیاء کے آثار و تعلیمات کا اس سے زیادہ اخذ کرنے والا اور کوئی نہ ہوگا۔

۳۔ جن معاملات میں اللہ نے رسولوں کی گرفت کی ہے اور ان پر عتاب نازل کیا ہے ان سب کو اکٹھا کیا جائے اور جن امور میں ان کی تعریف کی ہے انہیں جمع کیا جائے پھر ان سب سے رغبت اور دلچسپی کے ساتھ استفادہ کیا جائے۔

۴۔ عمل کرے، اقدامات ہو، مشق و ممارست ہو، حرکت و جدّ و جہد ہو ان سب سے دلوں کا جمود ٹوٹے گا اور ان میں قوت و حرکت آئے گی۔

۵۔ ان تمام چیزوں پر عمل کرے جن کا ذکر ہم معاشرتی روحانیت کے باب میں تفصیل سے کر چکے ہیں۔

۶۔ وہ اپنا تعلق دعوت سے جوڑ لے، اس کی مشکلات و مسائل پر خوب غور کرے اور جو حالات در پیش ہیں اور جن پریشانیوں سے دعوت کو سامنا ہے، ان سب کا جائزہ لے اور انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔ یہ ہم آہنگی کی اس عملیت کے مترادف ہے جہاں دل اور دعوت ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے

ہیں اور یہ دل دعوت کے ہنگاموں اور غلغلوں سے معمور ہو جاتا ہے، زندگی کی دوسری سطحی مصروفیات کا پھر کہیں دخل نہیں رہ جاتا۔ اور جب داعیٔ دین اس مقام کو پہنچ جائے تو سمجھ لیجئے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اس کا ایک بڑا حصہ اس نے پالیا کیونکہ اس کے تمام خیالات خدا پرستی کے رنگ میں رنگ چکے ہیں اور ان میں پاکیزگی و ستھرائی آگئی ہے۔

عملی مزاج کی برکتیں

اس فصل میں موقع بموقع عملی مزاج کی برکتوں پر گفتگو ہو چکی ہے لیکن اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ مزید چند نکات کی طرف اشارہ کر دیا جائے شاید ثمرات کو حاصل کرنے کی رغبت آپ کو عمل اور اقدام کرنے والوں کی صف میں کھڑا کر دے:

۱۔۔ دعوت کا فہم وسیع ہوگا اور اس میں استحکام پیدا ہوتا جائے گا، حیاتِ انسانی اور اس کے مزاج و فطرت سے آشنائی ہوگی۔ اس لئے کہ عملی مزاج داعیٔ دین کو ایک دائرے سے نکال کر دوسرے دائرے میں داخل کرتا ہے، اسے خیالی و تجریدی احکام و قواعد کی دُنیا سے نکال کر قابلِ عمل اور لائق تنفیذ احکام کی دُنیا میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ان احکام کو داعیٔ دین خود بخود نافذ کرتا ہے یا اپنی رہنمائی اور قیادت میں ان کے نفاذ کی جدّوجہد کرتا ہے اور زندگی اور اس کے اثرات و نتائج کا مشاہدہ کرتا ہے۔ دوسری طرف اس کی ذمہ داری بس اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ احکام کو نافذ کر دے بلکہ یہ فریضہ بھی اس پر عائد ہوتا ہے کہ معاشرے کے مسائل و مشکلات — جو گوناگوں اور متنوع ہیں — کو اس طرح حل کرے کہ رُوحِ مقصد سے وہ دُور

نہ نکل جائے۔ یہاں پہنچ کر اسے احساس ہوگا کہ اصول و مبادی کی حیثیت اس کے ذہن میں فروعیات کی تھی۔ اور کلی قواعد اس کی نگاہ میں جزئیات کے برابر تھے اس طرح اس کے ذہن میں نصب العین کا شعور پیدا ہوگا اور اس کا ذہن نصب العین اور معاشرے کی ضروریات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگا۔ اس کے فکر و نظر اور عمل و سعی کے دائرے وسیع ہوں گے اور دعوتِ دین کے اسرار و رموز اور لوگوں کے مزاج سے ان کی ہم آہنگی اور ان کی اصلاحِ احوال سے واقفیت بڑھے گی۔ یہ ایک بڑا وسیع باب ہے۔ ہم بس اسی قدر گفت گو پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ لوگ فہم و تفقہ کے عظیم فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جو میدان حیات کے تجربات سے حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ تجریدی سمجھ ہوتی ہے جو بس کتاب کی سطروں سے سست فطرت اور کاہل انسانوں کے دماغوں تک منتقل ہو جاتی ہے۔

۲۔ ایک داعیٔ دین کو عمل و تنفیذ کی راہ میں جو مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور قواعد و مبادی کی تعمیل میں جن زہرہ گداز لمحات سے گزرنا پڑتا ہے، اس سے اس کے اعصاب کے اندر رقت اور گداز پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس پاکیزہ اور مطہر ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں حرارتِ ایمانی شعلہ فشاں ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیدار شعور کا مالک ہو جاتا ہے، زندہ و متحرک وجدان سے مالا مال ہو جاتا ہے جو خدائی تعلیمات سے اثر قبول کرتا اور الہامی بارش سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ روحِ قرآن سے مربوط ہونے پر قادر ہو جاتا ہے جس کا تذکرہ "دعوت کے مآخذ" میں ہو گا۔ اس رقت اور گداز کی بدولت اس کے اعصاب کتابِ عزیز کے اسرار و رموز کو بہترین طریقے پر اخذ

کر سکتے ہیں۔

۳۔ عملی مزاج کا سب سے بڑا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ داعیٔ دین عمل کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور عمل ہی اس سرزمین کی سُنّتِ الٰہی ہے، یہاں انسان کا نصب العین عمل ہے اور اسی پر ثواب و عقاب اور رحمت و نعمت منحصر ہے، یہ قانون اس دنیا میں بھی چلتا ہے اور آخرت میں بھی:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (زلزال: ۷، ۸)

(پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔)

یہ امر بدیہی ہے کہ یہاں وہی خیر و برّ کے اعمال مراد ہیں جن کا منتہائے مقصود رضائے الٰہی ہو، جو اعمال، خواہشات کے نتیجے میں انجام دیئے جائیں اور جن کا مقصد ذاتی مفاد اور انانیت کی تسکین ہو اُن سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ان ذاتی مقاصد اور ضروریات کے لئے کام کرنے میں بھی یہ قانون لاگو ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آلِ عمران: ۱۴۵)

(جو شخص ثواب دُنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دُنیا ہی میں سے دیں گے۔)

لیکن ہماری گفتگو اصل عمل اور انسان کے اعلیٰ و ارفع نصب العین کے بارے میں ہو رہی ہے۔ عمل وہ نہیں ہے جو مال و دولت بٹورنے کے لئے کیا جائے اور اجر کا تعلق

منصب اور شہرت سے نہیں ہے۔ یہاں اجر کا مطلب یہ ہے کہ آپ عالم حقائق میں اپنے لئے یا دوسروں کے لئے باقیات صالحات کا ذخیرہ کریں۔

میں ایک مردِ پیر کی اس کے مرض کے آخری زمانے میں عیادت کے لئے جایا کرتا تھا بیماری نے اس کو لاغر اور نحیف کر دیا تھا۔ ماضی میں اس نے اپنی پوری زندگی لاؤ بالی پن اور غفلت میں گزاری تھی، بچپن، جوانی اور بڑھاپا گناہوں سے لت پت تھا حالانکہ اس کے باوجود عوام میں اس سے عقیدت بھی موجود تھی اور اس کا رعب بھی تھا، ایک دن جبکہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا میں اس کے پاس عیادت کے لئے گیا۔ جب اسے کچھ سکون ہوا تو سانسیں کھینچتے ہوئے اس نے کہا:

میں اپنی ساٹھ سالہ طویل زندگی کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بس ایک دن میں میری پوری زندگی سمٹ کر رہ گئی ہے بلکہ صرف ایک دن میری زندگی رہی ہوتی تو معاملہ میرے لئے آسان ہوتا۔ میں اپنی زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو خالی خولی باتوں اور لہو و لعب کے اعمال کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ لگتا ہے کہ اوہام اور خیالوں کی دُنیا میں تنکے کی طرح اڑتا رہا ہوں جس کی کوئی قیمت نہیں۔ میں اپنے نفس کا فریب خوردہ ہوں، لوگوں نے مجھے دھوکے میں رکھا، انہوں نے میرا احترام کیا، میری طرف محبت اور دوستی کے ہاتھ بڑھائے لیکن میں اپنے آپ کو اور اپنے بیتے دنوں کو دیکھتا ہوں تو وہاں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر میں عوام کو نصیحت کر سکتا تو انہیں پائیدار عمل کرنے کی وصیت کرتا جو ان کے نامۂ اعمال اور میزان میں اس دن باقی رہے جب لوگ اپنے نامۂ اعمال اور میزان کے پلڑے کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

پھر وہ بوڑھا شخص رونے لگا اور کہنے لگا کہ:

اے کاش مجھے ایک ہی دن مل جائے تاکہ میں کچھ عمل کر سکوں بلکہ اپنے نفس کی تعمیر کر سکوں اور خدا سے اس حال میں ملوں کہ میری عمر صرف ایک دن کی ہو اس لئے کہ اگر اس حال میں خدا سے ملاقات ہوئی جبکہ پلڑے میں رکھنے کے لئے میرے پاس کوئی عمل نہیں ہے، بس وہ طویل عمر ہے جسے بیکاری و خرمستی میں گنوا دی......

اس طرح کی باتیں وہ شخص عالمِ نزع میں کہتا رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی مال و دولت اور ذاتی مفاد کا نام نہیں ہے نہ اپنی خواہشات وضروریات کی تکمیل کو زندگی کہتے ہیں نہ کھانے پینے اور پہننے کو زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، نہ خوش حالی وعیش کوشی اور آرام طلبی پر اس کا انحصار ہے بلکہ زندگی نام ہے اس باقی رہنے والے پائیدار عمل کا جو حق کی اعانت، فضیلت کی اشاعت اور خیر کو عام کرنے کے لئے کیا جائے، جس کا محرک صرف رضائے الٰہی ہو، اپنا نفس یا عوام کی خوشی اس کا محرک نہ ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی زندگی کے آخر میں اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھیں گے جب اُس نادم شخص کی طرح تجزیہ کریں گے۔

رسول اکرمؐ کی مبارک زندگی کا تصوّر کیجئے۔ آپ نزع کے عالم میں ہیں اور آپ کی پوری زندگی حقائق اور پرمشقت جہاد کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ پھر بھی آپ ایک لمحہ لہو ولعب میں گزارنا پسند نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ ایامِ جاہلیت میں بھی اللہ نے آپ کو شرک اور کفر کی نجاستوں سے پاک رکھا اور پاکیزہ زندگی گزارنے کی توفیق دی کیونکہ دورِ جاہلیت میں بھی آپ مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے تھے، کمزوروں کے بوجھ ڈھوتے تھے بات ہمیشہ سچی کہتے تھے اور راہِ حق میں پیش آنے والی تمام مصیبتوں میں حق کا ساتھ دیتے

تھے۔ آپ کی پوری زندگی ایسی ہے کہ اگر پوری انسانیت کی عمر دوسرے پلڑے میں رکھ دی جائے تو آپ کا پلڑا جھک جائے۔

میرے بھائی! دیکھئے تو سہی علمی مزاج کا کمال، جب اس مزاج کا انسان کے اندر شعور پیدا ہوتا ہے تو عمل اور سعی کے لئے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے ـــــ اور جو جہاد کرتا ہے درحقیقت اپنے لئے کرتا ہے ـــــ اور جب وہ اپنے رب سے ملتا ہے تو اس کی پوری زندگی حقائق سے معمور ہوتی ہے، اعمال صالحہ سے گراں بار ہوتی ہے اور اس کا انسانی وجود اللہ کی میزان میں دنیا جہان کے تمام پہاڑوں سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ ہلاکت ہے کم عقلوں کے لئے، جو اپنے رب سے ملتے ہیں تو خالی خولی، ان کے سارے کرتوت بلبلے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں جب وہ عالمِ حقائق میں ان پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

ہمارے بول خود اپنی تاریخ مرتب کرتے ہیں اور جو کچھ اعمال ہم کرتے ہیں وہ اسی تاریخ کی سطریں ہیں۔ گپ شپ کی محفلیں، لہو ولعب کی بزمیں، سطحی اور بے فائدہ باتیں، رنگ رلیوں کی راتیں اور غفلت و سرمستی میں ڈوبی ہوئی حرکتیں یہ سب نقش بر آب ہیں۔ آپ اپنی عمر اور اپنی جوانی کے بارے میں جواب دہ ہوں گے کہ انہیں کن کاموں میں صرف کیا؟

معلوم نہیں، کب لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور اس دبیز غلاظت کی بدلی سے کب نجات پائیں گے؟

اللہ کا قانون عمل کا ہے۔ جس نے اس قانون پر عمل کیا اس نے اپنے ہاتھ میں دنیا و آخرت کی کامیابی کی کلید پکڑ لی اور جس نے عمل کو نظر انداز کر دیا اور بطن و فرج ہی میں الجھا رہا وہ اللہ کے قانون سے نکل بھاگا اس کی مثال ان طفیلی کیڑوں (PARSITES)

اور موذی مکوڑوں کی ہے جو زندہ اجسام اور آباد گھرانوں کو ضیق میں ڈال دیتے ہیں۔

قانون عمل ثمرات لاتا ہے لیکن ثمرات سے مراد مال و دولت اور جاہ و منصب نہیں بلکہ حق کی قوت میں اضافہ اور نیکی و فضیلت کی ترقی ہے اور ایثار و مساوات اور بر و تقویٰ کے معانی کو غالب کرنا ہے یہ ہے وہ حقیقی ثمرہ جو سچا عمل ہمیں دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ عمل اپنے نتائج بروئے کار نہ لائے۔ بلکہ عمل اپنے اندر ثمرہ کا راز لازماً رکھتا ہے اگر کسی کی نگاہ اپنے عمل کے ثمرات دیکھ نہیں پا رہی ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ کاشت کی کٹائی کا ایک مقررہ ہوتا ہے جس کی خبر صرف اللہ کو ہوتی ہے اور اس کا علم کسی کو اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس کا عمل ظاہر کردے اور اس کے ثمرات دکھادے۔

جو لوگ بلا عمل اجر کی توقع رکھتے ہیں، ان کی حالت پر مجھے تعجب ہے۔ یہ لوگ بلا مقدمہ نتیجہ کی امید لگائے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سنگ و خشت کے بغیر ہی عمارت کھڑی کردیں اور بغیر حروف اور جملوں کے تاریخ لکھ دیں۔ اور یہ اوہام و خیالات کی دُنیا کے سوا اور کہیں رائج نہیں ہے۔ حقائق کی دُنیا میں ہمارے چھوٹے بڑے تمام اعمال کا محاسبہ ہوگا اور ایک ایک ذرہ کا حساب لیا جائے گا۔

کتنے ہی لوگ ہیں جو کامیابی چاہتے ہیں اور حق کو غالب ہوتے دیکھنا پسند کرتے ہیں لیکن ان پر راہیں بند ہوتی ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اس کے لئے کونسا عمل کریں؟ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر کلمہ عمل ہے، ہر قدم عمل ہے، ہر حرکت عمل ہے، اور ہر اشارہ عمل ہے اور ہر حرکت حرکت کو جنم دیتی ہے اور ایک عمل دوسرے عمل کے لئے راہیں۔ بس وہ اُٹھ کھڑا ہو، حرکت میں آجائے، صبح و شام سعی و جہد

میں لگ جائے اور غفلت وسرمستی کی محفلوں سے دُور رہے۔ اللہ کا قانون عمل کا ہے اور
اس کا مصداق معمولی بات اور نہایت کم حیثیت حرکت پر بھی ہوتا ہے:

وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (نساء: ۴۰)

(اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوچند
کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔)

قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ ان ساری کوششوں کا مقصود اللہ کی رضا حاصل کرنا
ہو، حق کی حمایت اور اس کی خدمت پیشِ نظر ہو اس صورت میں عمل کی راہیں بند نہیں رہ
سکتیں کیونکہ خود اللہ کا فرمان ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ
لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (عنکبوت: ۶۹)

(جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے، انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے
اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔)

داعیان کرام! جس شخص کو اس کا عملی مزاج اقدام وعمل کی طرف مہمیز کر دیتا ہے،
اس کے ہاتھ میں اللہ کے نام سے وہ دُنیا اور انتظام دینا، اس کے خزانوں اور محلات
اور دولت ومنصب کی کلیدیں تھما دیتا ہے۔ آپ کو دیکھنا چاہیئے کہ ان کلیدوں کے
ذریعہ آپ کے سر کون سی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ رسول اکرم ﷺ ———
داعیٔ اعظم ——— نے جس مفلسی کی حالت میں زندگی گزاری اور آپ کے بعد دعوت کا
کام کرنے والے جس فقروفاقہ اور تنگی وپریشانی سے دوچار ہوئے وہ تاریخ کے اوراق

میں ثبت ہے۔ آپ سوچیں کہ ان خزانوں اور کلیدوں میں سے کون سی چیز قبول کر رہے ہیں اور کون سی ٹھکرا رہے ہیں، کس قفل کو کھولنے میں لگے ہوئے ہیں اور کس کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں افسوس ہے انسانوں پر کس قدر دور ہیں اُس خیر سے جو ان کے سامنے ہے، کتنا نظر انداز کر رہے ہیں اس نصرت کو جو قریب ہی آلگی ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے کس قدر نا آشنا ہیں حالانکہ وہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں!!

لوگو! عمل ہی نصرت و کامیابی کا راز ہے، یہی عزت و اقتدار کی کلید ہے اور سعادت و سیادت کی سبیل بھی یہی ہے کاش کہ لوگ سمجھتے!!

۴ — مسرت اور اطمینان کی روشنی داعیٔ دین کے آفاق میں ضو فشاں ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی مایوسی یا ناکامی کا احساس نہیں کرتا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسان ہی اعتماد و یقین یا امید سرسبز و شاداب یا توقع و امکان کی حقیقت ہے لیکن ہر صورت میں یہ چیز عملی مزاج ہی کا کرشمہ اور اسی کی دین ہے۔

میں پسند نہیں کرتا کہ یہاں امید کا مفہوم بیان کروں یا رجا کی حقیقت کی نقاب کشائی کروں بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عملی مزاج داعیٔ دین کے قلب کو مبارک اور خوش بخت احساس سے بھر دیتا ہے۔ اسے اس بات کا کامل یقین ہوتا ہے کہ وہ بہر صورت شاداب میدان میں ہے اس کا یہ احساس اس کاشت کار کی طرح ہوتا ہے جو اپنے بیج کی عمدگی اور اس کی صحت پر، اپنی زمین کی شادابی اور اس کی قوت زرخیزی پر اور فضا کی سازگاری اور آب و ہوا کی فراہمی پر شاداں اور مطمئن ہوتا ہے۔

اب بتائیے کہ اس کاشت کار کے احساس کو آپ کیا نام دیں گے؟

آپ اسے امید کا نام دیں گے؟ وہ امید سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ اس لئے کہ

امید بسا اوقات بار آور نہیں ہوتی اس میں خواہشات کی فریب کاری اور خیالات کی بے اعتدالی کا خدشہ بھی رہتا ہے، اس میں حالات سے خوش گمانی اور بدگمانی کا امکان بھی رہتا ہے، امید بس مستقبل میں ثمرات کی توقع رکھتی ہے، حال میں اسے اس کی کوئی توقع نہیں رہتی۔

اس کاشت کار کا یہ احساس درحقیقت وہ یقین ہے جس میں کوئی شک و شبہ راہ نہیں پا سکتا۔ کیونکہ بیج تمام امراض سے محفوظ ہے، مٹی عمدہ ہے زرخیز ہے اور فضا کا مزاج سازگار اور لامحالہ آفات و مصائب سے محفوظ ہے۔ یہ کاشت کار اصل میں داعئ حق ہے، اور یہ بیج وہ دعوت ہے جو لوگوں کے درمیان دی جاتی ہے اور یہ مٹی انسانوں کی وہ فطرت سلیم ہے جو بیج پڑتے ہی اسے اپنے سینے سے چمٹا لیتی ہے اور اس کے ساتھ تعاون کرنے لگتی ہے اور فضا کی سازگاری سے مراد خدائے تعالیٰ کی نگرانی ہے جو کفالت و حفاظت کے لئے کافی ہے۔

اس فصل کے آغاز میں ہم کہہ چکے ہیں کہ داعئ دین کے فہم و شعور کا واضح ترین مظہر یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرلے کہ ہمارا نصب العین حق ہے اور اس کے ماسوا سارے مقاصد غلط اور باطل ہیں۔ وہ حق و باطل کے درمیان تمیز کرلے جیسے ہم خواب میں دیکھی ہوئی پرچھائیوں اور عالمِ مشاہدہ و بیداری کی حقیقت میں تمیز کرلیتے ہیں۔

میدانِ دعوت میں داعئ دین کو اس بات کا یقین کامل ہوتا ہے کہ جس نصب العین سے وہ وابستہ ہے وہی تنہا کارآمد اور مفید اور نتیجہ خیز ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مقاصد بانجھ اور بنجر ہیں اس لئے کہ وہ بس اوہام ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک شخص جو بہترین بیج ڈالتا ہے اور دوسرا شخص جو بدبودار بیج ڈالتا ہے اور اسے اس کی خرابی کا احساس ہوتا ہے، ان دونوں میں کتنا زبردست

فرق ہے بلکہ آپ ان دو افراد کے درمیان موازنہ کیجیے جن میں ایک شخص صحت مند اور توانا بیج کی کھیتی کرتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن وہ پہلے شخص کی نقل اتارتے ہوئے اپنی مٹھیاں بند کرکے فضا میں اُچھالتا ہے تاکہ زمین میں لاشئ (کچھ نہیں) کی تخم ریزی کرے۔ بتائیے ان میں کون سا عمل حق ہے اور کون باطل ؟

میرے بھائیٔ ! آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم فرضی اور خیالی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم تو آپ کے سامنے حقیقت کا چہرہ پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں احساس ہے کہ حسبِ خواہش تعبیر نہیں کر پا رہے ہیں اس لئے کہ یہ ہماری طاقت سے پَرے ہے۔

داعئ دین یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ لامحالہ صحیح ہے اور جو دوسرں کے پاس ہے وہ محض خواب میں دیکھی ہوئی پرچھائیاں ہیں، اس کے پاس بیج ہے ــــ وہ بیج نہیں جو مُستقبل میں ثمر دار ہوگا بلکہ ایسا بیج جو بیک وقت ثمر بھی ہے یعنی ثمر دار بیج ۔ میں قارئین کو زحمت میں نہیں ڈالنا چاہتا بس ان آیات کو نقل کر دینا چاہتا ہوں جن میں فرعون کے جادوگروں کی حکایت کی گئی ہے۔ انہیں جیسے ہی معلوم ہوا کہ موسیٰؑ نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ عین حق ہے فوراً سجدہ میں گر پڑے اور ایمان لے آئے۔ یہاں دیکھئے، کیا ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے حق کو قبول کیا، پھر اپنی فطرت میں اس کے تخم کو سینے سے چپٹایا، تب وہ بیج سرسبز و شاداب ہوا، پھولا پھلا اور ایمان و تسلیم پر منتج ہوا ؟ کیا اتنا لمبا راستہ اختیار کرنا پڑا ؟ یا یہ پھل خود بیج میں پوشیدہ تھا جیسا کہ اللہ نے خود بیان کیا ہے:

فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ

مُوسٰى وَهٰرُوْنَ۝ (شعراء : ۴۵ تا ۴۸)

(پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جارہا تھا اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اُٹھے کہ "مان گئے ہم رب العالمین کو ـــــ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب کو")

یہی مفہوم ہم بیان کرنا چاہتے ہیں اور اسی گہری سمجھ کو ہم شعور کا نام دیتے ہیں جو داعیٔ دین کے قلب میں جگہ بناتا ہے جس میں مایوسی اور ناکامی جگہ نہیں پاتی" بلکہ وہ تو یقین کی وہ روشنی ہوتی ہے جو بیج کے ثمرات سے وہ چیزیں دیکھ لیتی ہے جو بڑے بڑے آنکھوں والوں کو نظر نہیں آتیں۔

میں دورِ جدید کے داعی کے ساتھ ایک دیہی بس میں سفر کر رہا تھا۔ کسی چوک پر گاڑی رکی اور ٹریفک پولیس آفیسر سواریوں کو گننے لگا اور ہر گاڑی کے سلسلہ میں اپنے فرائض کو نبھانے میں لگ گیا۔ ایک شخص جو آفیسر کے بغل میں بیٹھا ہوا تھا، یکایک داعی موصوف کی طرف بڑھا، انہیں سلام کیا اور ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دونوں میں مختصر گفتگو شروع ہوگئی:

آپ فلاں صاحب ہیں؟

جی ہاں، اور آپ کا تعارف؟

میں فلاں شخص ہوں، اسی گاؤں کا باشندہ ہوں، یہیں پرورش پائی ہے!

مجھے آپ نے کیسے پہچانا؟

میں نے آپ کو اخوان المسلمون کی ایک شاخ "امبابہ" میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں وہیں کام کرتا ہوں، وہیں زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں۔

کبھی کبھی دفتر بھی آتا ہوں، آج کل اپنے بال بچوں سے ملنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔

اس وقت تک ٹریفک پولیس آفیسر اپنا کام کر چکا تھا اور گاڑی حرکت میں آچکی تھی۔ وہ داعی موصوف کی طرف بڑھا اور چلتے چلتے اس نے کہا: "اس گاؤں میں ایک شاخ قائم ہو چکی ہے۔" مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا: کیا اس شخص نے اس شعبہ کے بارے میں گفتگو کر کے آپ کے علم میں اضافہ کیا ہے؟

داعی محترم نے کہا: نہیں، لیکن یہ گفتگو اللہ کی خاطر ہوئی ہے وہ اسے ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ یہ شخص ابھی اپنے ساتھیوں میں بیٹھے گا تو وہ اس سے سوال کریں گے: یہ کون شخص تھا جسے تم نے سلام کیا ہے؟ وہ انہیں بتائے گا کہ فلاں شخص ہے۔ وہ پوچھیں گے: یہ کیا کر رہا ہے؟ وہ جواب دے گا کہ: وہ فلاں فلاں باتوں کی دعوت دے رہا ہے اور اپنی دعوت میں یہ پیغام لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔

داعی موصوف نے کہا: " یہ سچی گفتگو ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ صالح بیج ہے جو صالح اور زرخیز زمین میں ڈالا گیا ہے اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کے پاکیزہ پھل سے مستفید ہو سکیں۔"

میرے بھائی! اس مختصر گفتگو پر غور کیجئے۔ دیکھئے اس داعی دین نے کس طرح صحیح اور خوبصورت حقائق کا استخراج کیا؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کون سا شعور اس داعی دین کے قلب مبارک پر حاوی تھا جب اس نے اس مختصر گفتگو سے اتنے بلند حقائق دریافت کر لئے؟

یہ دراصل وہ شعور ہے جو فوری اجر پر اعتماد کرتا ہے بروقت ثمرات کے حصول کا اسے اطمینان ہوتا ہے یہ اس یقین و ایمان کا شعور ہے جو حق کی حقیقت اور اس زندگی

میں اس کے اثرات کا ادراک کرتا ہے جب حق کی ایک مختصر گفتگو کے سلسلے میں اس کے
شعور کا یہ عالم ہے تو طول طویل گفتگوؤں کی بابت اس کے شعور اور احساس کی تیزی و
ذہانت کا کیا کہنا ؟!

آپ یہ نہ سمجھیں کہ طویل کلامی سے اس کا شعور مستحکم اور توانا ہو جائے گا ؟ اس لئے
کہ حق تو بس حق ہے وہ کلام کی قلت یا کثرت سے کمزور یا مستحکم نہیں ہوتا - ایک لفظ
کی حقانیت الفاظ کے ڈھیر سے اور جملوں کے خزانوں کی حقانیت سے کسی طرح مرتبہ
میں کم نہیں ہے -

یہی وجہ ہے کہ داعی ہر اس کلمہ کی قیمت اچھی طرح سمجھتا ہے جو وہ دعوت کی راہ میں
اپنی زبان سے نکالتا ہے اسی طرح حق کے ہر اس کلمے کی اہمیت اور مرتبت سے وہ واقف
ہوتا ہے جو اس کے پاس سے گزرتا ہے اسے ان چیزوں میں بھی خوشی و مسرت ،
نرمی و سہولت کا احساس ہوتا ہے جن کو لوگ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے اور ان میں وہ خیر
اسے نظر آجاتا ہے جس پر لوگوں کی نگاہ نہیں جاتی - آپ اسے اُمید کا نام نہ دیجئے -
یہ امید سے اوپر اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہے - اگر آپ اسے یقین و اعتماد کی روشنی
نہیں کہنا چاہتے اور فوری اجر اور بر وقت ثمرات کی مسرت اور اطمینان کے شعور کا نام
نہیں دینا چاہتے تو جو چاہے کہہ لیجئے -

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے اندر مایوسی و ناکامی راہ پاسکے گی ؟ کیا
گھبراہٹ اور اکتاہٹ کو ایسے لوگوں کے اندر نفوذ کا موقع مل سکے گا ؟ یا یہ لوگ اللہ کے
فضل و کرم سے نازاں و فرحاں ہوں گے اور اس عزم و ہمت کے مالک ہوں گے جو بر آن
حق کو کمک فراہم کرتا رہے گا ؟ -

یہ بات دھیان میں رہے کہ نصب العین پر گہرا یقین اور اعتماد از حد ضروری ہے لیکن عوام پر داعیٔ دین کا اعتماد کرنا اور ان کی بہترین فطرتوں کو استعمال کرنا بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داعیٔ دین چھوٹے بڑے، امیر و غریب، مفلس و غنی ہر ایک کو دعوت دیتا ہے اور تمام ہی فطرتوں سے خیر کی توقع رکھتا ہے وہ کبھی کسی کی جانب سے اعراض و بے نیازی اور مخالفت کو پہلے سے طے نہیں کر لیتا۔

کیا کاشت کار اپنی شاداب و سرسبز زمین کے سلسلے میں بدگمان ہو سکتا ہے جس کی حفاظت و صحت مندی اور طاقت زرخیزی کے تمام شواہد موجود ہیں؟

اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ایک داعیٔ دین ان لوگوں کے سلسلے میں کوئی بدگمانی کیسے کر سکتا ہے جن کو اللہ نے اصل فطرت پر پیدا کیا ہے؟ فطرت سچی ہوتی ہے اور اللہ کے حکم سے وجود میں آتی ہے۔ اگر کوئی شخص حق سے بے نیازی برتتا ہے تو اس کی فطرت بے نیازی نہیں کرتی" بلکہ باطل خواہشات اور غلط شہوتیں دعوت اور فطرت کے درمیان خلیج حائل کر دیتی ہیں۔ دیکھتے نہیں، رسول اکرمؐ کیا فرماتے ہیں:

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔"

اللہ نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون کے پاس رسالت لے کر بھیجا تھا، اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ یہ سرکش و نافرمان ظالم اپنے دل میں ایک فطرت رکھتا ہے جو خیر کو قبول کر سکتی ہے اسی لئے اللہ نے فرمایا تھا:

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ: ۴۴)

(شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے)

ایک باشعور داعی تمام انسانوں کا رُخ کرتا ہے اور سارے انسان اس کی نگاہ میں قبولِ دعوت کی یکساں صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے بارے میں اسے توقع بلکہ یقین ہوتا ہے کہ وہ خیر و معروف میں اس کا مددگار بنے گا، اگر کوئی انسان بے نیازی ظاہر کرتا ہے یا بدسلوکی کرتا ہے تو وہ دوسرے تمام انسانوں سے شر کی توقع نہیں رکھتا اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ لوگ فطرت سلیم کے مالک ہیں اور یہی فطرت امیدوں اور توقعات بلکہ یقین و اعتماد کا مرکز ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ تمام انسانوں کو ایک نئی امید اور ایک نئے یقین کے ساتھ دعوت دیتا ہے۔ گویا اس کے نزدیک ہر انسان کے اندر ایک ہاتفِ غیبی ہے جو اسے ندا دے رہا ہے کہ یہ ہے تمہارا مددگار، دیکھو یہ مددگار نظر انداز نہ ہونے پائے۔ شاید ہماری ان باتوں کی بہترین وضاحت وہ واقعہ کردے جو رسولِ اکرم کی بعثت کے گیارھویں سال آپ کے ساتھ پیش آیا۔

حج کا زمانہ تھا۔ مختلف وفود، قبائل اور خاندان، حج کے لئے مکہ میں جمع تھے۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر اپنے خیمے لگا رکھے تھے یا پہاڑیوں پر بسیرا تھا۔ رسول اکرم دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینے کے لئے اس سال نکلے۔ ۵۱ سال سے زیادہ آپ کی عمر ہو چکی تھی۔ آپ مختلف خیموں اور گھروں تک جاتے، لوگوں سے ملاقات کرتے، پورا دن تپتی ہوئی ریت پر گزار دیتے، سنگلاخ چٹانوں پر ادھر سے اُدھر چکر لگانے میں صرف کر دیتے، لوگوں کی مجلسوں اور چوپالوں میں شریک ہوتے، مختلف خاندانوں سے الگ الگ ملتے، ان سے بحث و مباحثہ کرتے، اپنی کہتے دوسروں کی سُنتے، آخر میں انہیں خوبصورتی سے جواب دیتے یا سختی سے کسی چیز سے روکتے، دن کے آخری حصے میں جب آپ لوٹتے تو آپ کا دامن خالی ہوتا۔ ایک بھی فرد آپ کی بات سُن کر نہ دیتا۔

یہاں تک کہ حج کا زمانہ اختتام پر آیا۔ لوگ کوچ کی تیاریاں کرنے لگے اور رسول اکرمؐ کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ آیئے آخری دنوں کے حالات دیکھیں۔ تمام لوگ سفر کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ کے رسول اپنی دعوت میں مصروف۔ لوگوں کی بے نیازی آپ کے اندر مایوسی پیدا نہیں کرتی نہ زمانۂ حج کا بلانتیجہ اختتام آپ پر کوئی اثر ڈالتا ہے بلکہ ہر روز ایک نئے جذبہ اور ایک نئی مسرت و شعور کے ساتھ آ موجود ہوتے ہیں۔ آج بھی رسول اکرمؐ مختلف خیموں کا چکر لگا کر اور بہت سی مجلسوں میں شرکت کر کے لوٹتے ہیں، گزشتہ ایام کی جدوجہد آپ کو تھکا کر چور کر دیتی ہے اور عمر بھی تو آپ کی پچاس سے زائد ہو چکی ہے۔۔۔ آپ لوٹ رہے تھے کہ دیکھا اہل یثرب کے چھ آدمیوں کی ایک ٹولی ایسی ہے جس تک ابھی آپ کی دعوت نہیں پہنچ سکی ہے۔

اگر اس وقت ہم میں سے کوئی شخص ہوتا تو سخت غیظ و غضب میں ہوتا اور عوام الناس سے ہاتھ جھاڑ لیتا اور مایوسی و نامرادی اسے تھک ہار کر بیٹھنے پر مجبور کر دیتی، وہ ان چھ افراد کی طرف سے بھی مایوس ہو جاتا ہے جیسا کہ حاجیوں کی پوری سوسائٹی سے مایوسی ہوئی تھی۔

اگر ہم میں سے کوئی فرد ہوتا، جس کی عمر پچاس سال سے زائد ہو گئی ہو اور دن رات وہ اپنے جسمِ ناتواں کو گھسیٹتا پھر تا رہا ہو تو ان چھ افراد سے بے نیازی برتتے ہوئے سیدھے گھر کا رُخ کرتا جہاں وہ تھکن سے چور جسم کو راحت بخش سکتا۔

یہ چھ افراد اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، اپنے سر مونڈ وا رہے تھے۔ اگر اس مقام پر ہم میں سے کوئی شخص ہوتا تو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ جاتا کہ: جب فارغ اوقات میں لوگ ہماری طرف متوجہ نہ ہوئے تو بھلا یہ لوگ جو اپنے سر مونڈوا رہے ہیں،

ہماری بات کیسے سُن سکتے ہیں؟ بلکہ ہوسکتا ہے کہ ہم ایسے موقع پر یہ سوچتے کہ حجاموں کی مجلس میں دین کی بات کرنا زیبا نہیں ہے!

لیکن میرے بھائی! ٹھہریئے، دیکھئے داعیٔ اعظمؐ کیا کرتے ہیں۔ آپ ان چھ افراد کا رُخ کرتے ہیں سنجیدگی، متانت، جلالِ نبوت اور یقین کی حالت میں آگے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ کر رُک جاتے ہیں۔

اللہ کا کرشمہ دیکھئے، یہی لوگ آگے چل کر بیعتِ عقبہ اولیٰ کرتے ہیں اور انصارِ مدینہ کی بنیاد بنتے ہیں ایک نئے دور کی کلید ثابت ہوتے ہیں جس میں ہجرت کے بعد اسلام داخل ہوا۔

میں اب آپ کو یہیں چھوڑے دیتا ہوں آپ اس مثال پر غور کیجئے اور اس کے دور رس مقاصد اور نتائج کا مشاہدہ کیجئے۔ یہاں قابلِ لحاظ چیز یہ نہیں ہے کہ رسول اللہؐ کو ان لوگوں میں رضا کار جاں نثار مل گئے بلکہ دیکھنے کی چیز وہ مضبوط و توانا شعور ہے جو رسول اللہؐ کے اندر پیدا ہوگیا تھا جب بیداری و حرکت نے آپ کو عمل پر اُبھارا تھا اور ناامیدی و نامرادی دُور بھاگ چکی تھیں۔ یہ کوئی بہت اہم چیز نہیں ہے کہ اس کے بعد لوگ ایمان لے آئے یا کوئی بھی اس دعوت کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔

یہ شعور لامحالہ سچا ہے، برحق ہے، لوگ داعیٔ دین کی بات تسلیم کریں یا نہ کریں، اس لئے کہ لوگوں کا اس پر لبیک کہنا ایک چیز ہے اور داعیٔ دین کے اندر اس کی سچائی و حقانیت بالکل دوسری چیز ہے، لوگوں کا ایمان لانا اس کی سچائی کی دلیل ہرگز نہیں ہے اسی طرح لوگوں کا جھٹلا دینا اس کے جھوٹ یا غلط ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

ہم نے ایک داعیٔ موصوف کی گفت گو اوپر نقل کی ہے۔ جس شعبہ کے بارے میں

اوپر گفتگو ہوئی ہے وہ اس کے بعد قائم نہیں رہ سکا تو کیا جو کچھ کیا گیا ہے اس میں یہ چیز ذرہ برابر تبدیلی پیدا کر سکتی ہے؟ یا اس شعور کی سچائی کو کچھ گزند پہنچا سکتی ہے؟

آپ کے پاس روپئے ہیں، آپ چاہیں تو ان سے چپاتی خرید لیں، یا کپڑے بنوا لیں یا اگر چاہیں تو ہتھیار خرید لیں۔ یعنی ان روپیوں میں وہ قوت خرید ہے جو آپ کے ہاتھ میں روٹی، کپڑا یا ہتھیار پہنچا سکتی ہے اگر بازار میں روٹی یا کپڑا یا ہتھیار دستیاب نہ ہو تو روپیوں کی قیمت محفوظ رہتی ہے تا آنکہ روٹی کپڑا یا ہتھیار دستیاب ہونے لگے۔

یہی معاملہ حق کا ہے۔ حق اسی عالم موجودات کی کرنسی ہے جس کے بل پر اس دنیا کے قوانین بنتے اور بگڑتے ہیں اور جس کے ذریعہ اس کائنات کا نظم چلتا ہے۔ جو شخص اس کرنسی کا مالک ہو جائے، وہ مال دار اور طاقت ور ہے اور اسے مال داروں اور اغنیاء کا شعور حاصل ہو جائے گا۔ لیکن جو کوئی دوسری کرنسی کا مالک ہو گا تو وہ مفلس ہو گا کمزور ہو گا اور کمزوروں اور مفلسوں کا شعور اس سے چپک جائے گا۔ یہ شعور جو حق کی کرنسی رکھنے والے کو یہ یقین اور اعتماد دلاتا ہے کہ اس کی زندگی محنت و کرامت اور عزت و شرافت سے معمور ہے، یہی تمام گفتگو کا حاصل اور نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ وہ انسان کو دو عظیم حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے:

پہلی حقیقت یہ ہے کہ وہ جو کوئی کام کرتا ہے، اسے اس بات کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے کہ اس کے ثمرات فوری طور پر ملیں گے جیسے روٹی یا کپڑا روپیوں کے اندر مخفی ہوتا ہے۔ یہ احساس آدمی کو بڑے بڑے کام کرنے اور ہر طرح کی دولت و غنا سمیٹنے کے لئے مہمیز لگاتا ہے پھر وہ عمل سے رک نہیں سکتا، گفتار سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتا، حرکت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اقدامات کرنے سے نچلا نہیں بیٹھ سکتا اگر وہ حق کے

سلسلے میں ہوں گی، ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ الّا آنکہ آپ کسی طرح یہ تصور کرسکیں (جو محال ہے) کہ ایک شخص بیک وقت مال سے محبت کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا۔ حق کی قدر و قیمت کا شعور کرنسی کی قیمت کے شعور کی مانند ہے لیکن حق کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے کی حیثیت وہ نہیں ہے جو مال کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے کی ہے اس لئے کہ مال کے حصول میں انسان کو کامیابی ملتی بھی ہے اور نہیں بھی لیکن حق کے رہرو کی کامیابی اس کی نیت کی سچائی پر موقوف ہے اگر نیت مخلص ہے تو اس کا عمل بجائے خود کامیابی ہے اس لئے کہ وہ خود دولت ہے۔ قلب ہی وہ ٹکسال ہے جہاں یہ دولت ڈھلتی ہے، اس سے نکلنے والا ہر کلمہ اور ہر وہ عمل جس پر قلب کی چھاپ ہے، حق کی کرنسی ہے اور سچائی کی دولت ہے جس کے ماسوا کی اس عالم وجود میں کوئی قیمت نہیں ہے۔"

داعیٔ حق وہی ہے جو حق کی قیمت کا احساس رکھتا ہے اور اس کی شدت احتیاج کا شعور رکھتا ہے بلکہ ساری انسانیت کی محتاجی کا اسے یقین ہوتا ہے اور اس احساس کی وجہ سے اس کے حصول کے لئے وہ کام کرتا ہے اور اس کی تائید و حمایت کے لئے وہ دوڑ دھوپ کرتا ہے، اس عمل اور جدّ و جہد کے دوران یہ احساس اس پر مستولی رہتا ہے کہ اسے دونوں ہاتھوں سے اس دولت کو جمع کرنا ہے۔ اب بتائیے اس شخص کے قریب مایوسی کیسے پھٹک سکتی ہے؟ وہ تو عزیمت و جدّ و جہد اور صبر و ثبات کا پیکر ہوگا جو ع

جتنا ہی دباؤ گے اتنا ہی وہ ابھرے گا

کا مصداق ہوگا۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ شعور انسان کی معنویت اس کی کرامت اور اس کی مردانگی کی خصوصیات کو بلند کرتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جس طرح روپیہ انسان کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے اس لئے کہ دونوں کے درمیان کرنسی سے استفادہ کرنے کی مشابہت تو موجود ہے لیکن اس کے باوجود دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ چونکہ حق آدمیوں کو تیار کرتا اور سورماؤں کو ڈھالتا ہے اس لئے ان کی معنویت کی یہ بلندی ہی اس صفت اور تشکیل کا جوہر ہے۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں کیا سوچیں گے جو عوام کی طرف دیکھتے ہیں جبکہ وہ باطل سے سودا بازی کرتے اور مل بیٹھ کر سانٹھ گانٹھ کرتے ہیں؟ جیسے کوئی آدمی بچوں کی طرف دیکھے جبکہ وہ کھوٹے اور جعلی سکوں سے آپس میں سودا کر رہے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کی پختگی اور اس کی مردانگی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس سے بہتر موقف اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ان بچوں کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا کر دے۔

۵ — علمی مزاج جب داعیٔ دین کو دعوت کے میدان میں لا کھڑا کرتا ہے تو اس کے اور مختلف مکاتیبِ فکر کے درمیان بہت سے تعلقات پیدا ہوتے ہیں، کچھ تعلقات ہمدردی و غم خواری پر مبنی ہوتے ہیں اور کچھ کی نوعیت دیگر ہوتی ہے۔

عوام الناس کی ایک تعداد حمایت و تائید کرتی ہے، کچھ لوگ مخالفت کرتے ہیں، اور کچھ عناد اور دشمنی پر اُتر آتے ہیں پھر انہیں میں سے ایسے لوگ بھی اُبھر آتے ہیں جو اپنی دشمنی میں ظلم و ایذا دہی کا ہر ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور وہ اسی تمام عرصے میں مجبور ہوتا ہے کہ ہر گروہ کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ رکھے۔ ساتھ ہی اسے جہاد کی مشقتوں اور مشکلات و مصائب کی سیاست سے بھی پالا پڑتا ہے۔ داعیٔ دین اپنے بیشتر شب و روز

غم ورنج میں گزار دیتا ہے، اس کا دل ان حادثات وواقعات سے گہرا اثر قبول کرتا ہے بلکہ بسا اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کے کاندھے جواب دینے لگتے ہیں اس کی ہمت بیٹھنے لگتی ہے، وہ سراپا عاجز ودرماندہ بن جاتا ہے، اس کی قوت وطاقت کے متعلق بدگمانی ہونے لگتی ہے، اس کائنات میں اس سے زیادہ عاجز ودرماندہ، اس سے زیادہ کمزور اور خدائے بزرگ وبرتر کی طاقت کا محتاج اور کوئی نہیں رہتا۔

یہ سخت وشدید حالات، جو داعیٔ دین کو اس کی طاقت اور ذاتی قوت سے علیحدہ کردیتے ہیں، اس کی ذاتی خوبی کے ہر احساس کو کچل دیتے ہیں اور اسے معمولی تنکا بنادیتے ہیں اِلّا یہ کہ اللہ اپنے خصوصی فضل سے اِس کی تلافی کردے، نہایت مبارک اور مقدس ہیں، یہ داعیٔ دین کے قلب کو اس کی مبارک حرارت سے جوڑ دیتے ہیں اور جب وہ حرارت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو غفلت وسرستی کے سارے آمیزے دھل جاتے ہیں اور انسان اپنی کمزوری وناتوانی اور خدا کی مدد اور اس کی طاقت کی ضرورت حد درجہ محسوس کرنے لگتا ہے، پھر وہ بڑی تیزی سے اللہ کی پناہ میں آتا ہے اور اس وقت جب وہ اللہ کو پُکارتا ہے تو اس کی دُعا دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے جس کا ساتھ اس کے تمام اعضاء وجوارح دیتے ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس کے ساتھ ہم آواز بن جاتی ہے اور یہ دُعا خالص ہوکر پوری قوت اور تیزی سے اوپر اُٹھتی ہے یہاں تک کہ تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور یہ اللہ کے عرش کے سامنے عجز ودرماندگی کا اظہار کرکے سجدہ ورکوع کی حالت میں مدد اور نصرت مانگتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس وقت بڑھ کر دُعا سُنتا ہے جب اس کا بندہ اس مبارک کٹھالی میں پگھل جاتا ہے اپنی عاجز وناتواں زبان سے اسے پُکارتا ہے اور پاکیزہ ولپست شعور سے اس کی دہائی طلب کرتا ہے۔

اس حالت کے اطراف وجوانب بڑے ہی مبارک اور نفع بخش اور بار آور ہیں۔ یہ انسان کے اس میل کچیل کو دھو دیتی ہے جو غفلت و سرمستی کی حالت میں اس پر جم جاتی ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ مجاہد ہے یا عمل ہے یا با صلاحیت ہے اور آزمائشوں میں داخل ہے یا طاقتور اور توانا ہے۔ جب سرکشی کے بیج انسان کے اندر پرورش پانے لگتے ہیں اور اس کی جڑیں قلب میں پھیل جاتی ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے بے نیاز اور اپنے اوپر اکتفا کر لینے والا ہو جاتا ہے اور یہ فساد وطغیان کی جڑ ہے جو غالی تصوف کی ایک بڑی حقیقت ہے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (علق: ۶، ۷)

(ہرگز انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔)

یعنی انسان جب دیکھتا ہے کہ اس کے اندر علم یا صلاحیت پیدا ہو گئی ہے، جاہ و منصب کا مالک ہو گیا ہے، مال و قوت اس کے گھر کی باندی بن گئی ہے تو اس پر سرکشی سوار ہو جاتی ہے اور شیطان جدھر چاہتا ہے اسے بہکانے کے لئے پھرتا ہے اسی لئے اللہ کے رسول ؐ اپنی قوت و طاقت سے پناہ مانگتے تھے:

"اے اللہ مجھے ایک لمحہ کے لئے بلکہ اس سے بھی کم مدت کے لئے میرے نفس کے حوالے نہ کیجیو۔"

یہ بلند و پاکیزہ حالت ناگزیر ہے تاکہ داعیِ دین کی تمام گندگیاں دھل جائیں اور وہ ہمیشہ اپنے نفس کی حقیقت اور اپنی پست منزلت سے آگاہ رہے اور جو شخص اپنے نفس کو پہچان لے اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔

اس دعا کی برکت یہ ہے کہ انسان جب ضعف و ناتوانی کی کٹھالی سے اسے

پکارے گا اور عاجز و مجبور شعور کے ساتھ اس کی فریاد کرے گا تو اللہ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اسے ایسی جگہ سے مدد دے گا جہاں سے وہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ دیکھئے نوحؑ اپنے رب سے کتنی لاچاری و بے بسی کی حالت میں دُعا کرتے ہیں:

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ (قمر: ۱۰)

(میں مغلوب ہو چکا ہوں اب تو اِن سے انتقام لے۔)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس شخص کی زبان سے دُعا نکل رہی ہے جو ذلیل اور پست ہو چکا ہے، جس کا نفس ہر قسم کی طاقت و قوت سے خالی ہے، اس نے سچائی کے ساتھ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ کا سہارا لیا ہے اور کافر دشمنوں کے مقابلے میں اس سے مدد مانگی ہے چنانچہ دیکھئے دُعا کو اللہ نے اس طرح قبول فرمایا کہ اس کا سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ (قمر: ۱۱، ۱۲)

(تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اُس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔)

محترم داعیٔ دین! کمزور کی دُعا، جو غلبہ و طاقت کے شعور کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو، آسمان کے دروازے کھلوا دیتی ہے اور نصرتِ الٰہی اور اس کی فوجوں کی مدد سے زمین کے چشمے پھوٹ بہاتی ہے تو کیا ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ ہم کس طرح اللہ سے دُعا کریں اور کیسے اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے آسمانوں اور زمین کو مسخر کریں؟ اور کیا اللہ کے

رسولؐ کے اس قول کی حقیقت ہماری سمجھ میں آتی ہے؟

اِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَائِکُمْ

اللہ کے رسول کی زندگی دیکھئے۔ دعوتِ دین کے دو زبردست مددگار اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں آپ کی زوجہ مطہرہ خدیجہؓ اور چچا ابو طالب کا انتقال ہو جاتا ہے، ان دونوں سہاروں کے چھن جانے پر آپ تنہائی محسوس کرتے ہیں چنانچہ طائف نکل جاتے ہیں جو مکہ سے دور ہے، شاید کوئی طائف کے باشندوں میں سے دعوت کا حامی و مددگار نکل آئے۔ لیکن باشندگانِ طائف اس کا بہت بُرا جواب دیتے ہیں، آپ کے پیچھے لونڈوں کو لگا دیتے ہیں اس وقت آپ کا دل رو اُٹھتا ہے، تنہائی اور جدائی کا احساس فزوں تر ہو جاتا ہے، کمزوری و ناتوانی اور ذلت و پستی کا شعور پوری قوت سے بیدار ہوتا ہے، چنانچہ دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے، زبان میں گویائی آتی ہے اور گرم گرم سانسوں کی شکل میں اسے خدا کے حضور پیش کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اَشْکُوْا اِلَیْکَ ضُعْفَ	"اے اللہ میں تجھ سے اپنی طاقت کی
قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَهَوَانِیْ	کمی، کم تدبیری اور لوگوں کی نگاہ میں
عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ	اپنی ذلت کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں
الرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ	اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے،
الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ	تو کمزوروں کا رب ہے اور تو میرا رب ہے،
اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی قَرِیْبٍ	تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے، ایسے
یَتَجَهَّمُنِیْ اَوْ عَدُوٍّ مَلَّکْتَهٗ	رشتہ داروں کے جو میرے ساتھ بدسلوکی کرتے
اَمْرِیْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِکَ	ہیں یا ایسے دشمن کے جس کو تو نے میرے

عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیُ - (حدیث) معاملے پر قابو عطا کر دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔)

میں آپ کو یہاں رسول اکرمؐ کی اس دعا پر نہیں روکنا چاہتا اور آپؐ نے اپنی جس ناتوانی و کمزوری کا شکوہ کیا ہے اور کمزوروں کے رب کہہ کر جس طرح اللہ سے فریاد کی ہے، اس پر آپ کو متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ آپ کو میں جس چیز کی دعوت دیتا ہوں وہ یہ کہ آپؐ کے جذبے کی گہرائی و گیرائی، یقین کی حرارت و تمازت اور مشکلات و شدائد میں آپ کا صبر و ثبات قابلِ غور ہے۔ دیکھئے کس شعور کے ساتھ ہمیں اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ میں آپ کو یہاں غور و فکر کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور اپنی بات جاری رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی قلبِ مُبارک کی دُعا اس طرح قبول کی جو سان و گمان سے پرے ہے۔ رسولِ اکرمؐ رات کی تاریکی میں بیٹھے تھے، ملاءِ اعلیٰ کے باشندے آپ سے قریب تر تھے، اس سرزمین کے جنات آپ کی آواز غور سے سُن رہے تھے جبکہ آپ شیریں آواز میں قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ آپ کا ترنم اور نغمہ کائنات کی گہرائیوں میں اور عالمِ موجودات کی تہ میں عبودیت کا خشوع و خضوع اور الوہیت کا راز پیوست کر رہا تھا۔ جنات آپ کی دعوت پر لبیک کہہ اُٹھتے ہیں اور ایسی جگہ سے نصرت مل جاتی ہے جس کا خیال بھی آپ کے ذہن میں نہ آیا ہوگا۔ اس وقت یہ خوشخبری نازل ہوتی ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ

مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِیْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (احقاف : ۲۹ تا ۳۱)

(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سُنیں۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا، خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا، "اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف، اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذابِ الیم سے بچا لے گا۔)

ہم داعئ دین کو وصیت کرتے ہیں کہ وہ دعوت میں اپنے آپ کو جھونک دے اور ان مشکلات و مصائب کو قابو میں کرنے کے لئے مندرجہ بالا اسباب و وسائل کو اختیار کرے تاکہ اس کے دل کا تزکیہ بھی ہو سکے اور خدا سے مضبوط تعلق بھی قائم ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ اسی شخص کی دُعا سُنتا ہے جو پاکیزہ اور صاف ستھرا دل لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہو۔

۶- اب ہم علمی مزاج کی چھٹی برکت کا ذکر کریں گے۔ توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا

سینہ کھول دے گا اور آپ کا فہم اسے اخذ لے گا اور اس کے اسرار و رموز کی بار آوری اور نتیجہ خیزی پر آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔

ہم میں سے کوئی اپنی روزمرہ کی زندگی میں کسی کام کے سلسلے میں یوں تبصرہ کرتا ہے کہ یہ مردہ کام ہے اس میں کوئی رُوح نہیں ہے، اور کسی دوسرے عمل کے سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ یہ زندہ و توانا عمل ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ پہلا کام یا عمل ایسے قلب نے انجام دیا ہے جو زندگی کی صلاحیت سے محروم اور ایمان کی حرارت سے خالی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس عمل کے اندر قوت ہوتی، اور اس کے اندر جان ہوتی۔ ہم پرہیزگاروں اور متقیوں کے حلقے میں یہ سُنتے رہتے ہیں کہ فلاں نماز مردہ ہے یا مردہ کی حالت میں اس نے جنم لیا ہے، لیکن جب نماز کے وقت دل حاضر ہو، خشوع و خضوع سے ادا کی جائے، رکوع و سجود کی تکمیل کی جائے، دل کی گہرائیوں سے کلمات نکلیں تو ایسی نماز کو زندہ نماز کہتے ہیں جو خدا کے ہاں پہنچتی ہے اور قبولیت سے سرفراز ہوتی ہے۔

یہ حقیقی کلام ہے اس میں کوئی مجاز یا کنایہ نہیں ہے:

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ (مدثر: ۳۱)

(اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ محض لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔)

وَالرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل: ۸۵)

(اور روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔)

کچھ اعمال زندہ و بیدار ہوتے ہیں اس لئے کہ ان میں رُوح موجود ہوتی ہے اور کچھ اعمال مردہ ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ رُوح کے بغیر جنم لیتے ہیں۔

اگر ہم ان زندہ یا مردہ اعمال کا مشاہدہ نہ کر سکیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ موجود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس کائنات کی بہتیری عجیب و غریب ایسی چیزیں ہیں جن کو ہم دیکھ سکتے ہیں نہ چھُو سکتے ہیں۔ سُن سکتے ہیں نہ انہیں سونگھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ نے ہمارے حواس کو ان معنوی و رُوحانی امور کی حقیقت کے ادراک سے قاصر بنایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس نے ان حواس کو فقط مادّی امور کے ادراک کے لئے تخلیق کیا ہے، جو ماورائے مادہ حقائق ہیں ان تک پہنچنے کے لئے ان حواس کے لئے کوئی سبیل نہیں ہے اِلّا یہ کہ اللہ عام قانون کے خلاف کوئی انتظام کر دے۔

ہم انہیں عاجز و محدود حواس کے ذریعہ علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہیں، اور جو کچھ ہماری گرفت میں آتا ہے اسی کے مطابق ہم فتویٰ صادر کرتے اور اسی موقف کو ہم اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جو حقائق اور خبریں دوسری کائنات سے متعلق ہیں، جو ہمارے علوم و فنون کی رسائی سے باہر ہیں، ان کا انکار کرنا اور انہیں جھُٹلانا ہمارے لئے زیبا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان تمام غیبی حقائق کی تصدیق کریں جن کے معقول ہونے، سچا ہونے اور بصیرت و بصارت کے مطابق ہونے پر سچے شواہد موجود ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق رسول اکرمؐ اس شخص کی حالت بیان کرتے

ہیں جو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے کہ:

"اگر وہ مومن ہو گا تو اس کی نمازیں اس کے سر کے قریب موجود ہوں گی، روزے دائیں جانب ہوں گے اور زکوٰۃ بائیں جانب ہو گی اور صدقہ، صلہ رحمی، معروف اور حُسنِ سلوک کی تمام اچھائیاں اس کے دونوں قدموں کے پاس ہوں گی۔"

ان اعمال کی چاروں طرف موجودگی کی حکمت یہ ہے کہ وہ ہر پریشان کُن چیز حتیٰ کہ دونوں فرشتوں کے سوالات کو بھی اس سے دور رکھیں گے۔ وہ منکر نکیر کو مردے تک اسی وقت پہنچنے دیں گے جب ان کے بارے میں انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ خیر کے پیغامبر بن کر آئے ہیں، پوری حدیث سُن لیجئے:

"فرشتے سر کی جانب سے مردے کے پاس آئیں گے تو نمازیں بول اٹھیں گی: ادھر سے راستہ نہیں ہے۔ پھر دائیں طرف سے آئیں گے تو روزے کہیں گے: ہماری طرف سے راستہ نہیں ہے، پھر وہ بائیں طرف سے آئیں گے تو زکوٰۃ راستہ دینے سے انکار کر دے گی پھر اس کے دونوں پیروں کی طرف سے آئیں گے تو وہ ساری اچھائیاں کہہ اُٹھیں گی کہ: "ادھر سے راستہ نہیں ہے۔"

ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ اس حدیث کو تمثیل کہہ کر اس کی تاویل کرنے لگیں۔ اور یہ سوچیں کہ اس تمثیل سے اللہ کے رسول نے عالمِ آخرت کی باتوں کو ہمارے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کی تاویل جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ مقام رسول کی گستاخی اور بلا دلیل آپ کے کلام کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹانے کی

کوشش ہے ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر دوسری دنیا کے حقائق سے ہم ناواقف ہیں تو ہماری ناواقفیت اس کی تکذیب کے لیے دلیل نہیں بن سکتی ۔ اگر اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ نماز سرہانے کھڑی ہوگی اور اس طرح جواب دے گی تو یہ بالکل سچی بات ہے ۔ ہمارے لئے زیبا نہیں ہے بلکہ ہماری عقلی شرافت کے خلاف ہے کہ ہم اپنی ناواقفیت کو اس کی تاویل کے لئے بنیاد بنالیں ۔ بلکہ ہماری عقل اور ہمارا ضمیر اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی شخص معمولی سطح پر زندگی گزار رہا ہو اور جب کوئی کلام کسی بلند افق سے بلند ہوتا دیکھے تو اسے اپنی طرف کھینچ لے اور اپنے سے قریب لے اور اس کا چہرہ بگاڑنا شروع کردے تاکہ اس کلام اور اس کے پست معیار اور سطح کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوسکے ۔ ہماری عقل اور ہمارا ضمیر تو یہ کہتا ہے کہ ہم اس سطح تک اٹھنے کی کوشش کریں جہاں ان دانشوروں کا کلام ہمیں لیجانا چاہتا ہے ۔ اگر اللہ کے رسول نے یہ فرمایا کہ نماز سرہانے کھڑی ہوگی اور اس طرح کی باتیں کرے گی تو اس کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی کھڑی ہوگی اور وہ جواب دے گی جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے ۔ رہی یہ بات کہ وہ کیسے کھڑی ہوگی، کیا اس کے دو پاؤں ہوں گے ؟ کیسے بات کرے گی ؟ کیا اس کے پاس زبان ہوگی ؟ اور کیسے حرکت کرے گی، کیا اس کے پاس دو ہاتھ ہوں گے ؟ اس طرح کے سوالات کرنا ہمارا کام نہیں ، جس طرح کی بھی کیفیت ہو، ہمارا کام بس اس کو تسلیم کرنا ہے کہ نماز کھڑی ہوگی اور اس طرح کی باتیں کرے گی جو ہمارے رسول نے بتائی ہیں ۔ ورنہ یہ تاویل کرنے والے اللہ کے اس قول کے بارے میں کہیں گے :

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (نور : ۲۴)

(وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جب کہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔)

کہ آدمی اپنی شہادت کیسے دے گا؟ اس کے ہاتھ کیسے گواہی دیں گے؟ اس طرح سوچنا ہمارے لئے زیبا نہیں ہے۔ جس طرح بھی کیفیت ہو، جو چیز شک و شبہ سے بالاتر ہے وہ یہ کہ شہادت بہرحال واقع ہوگی:

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢١﴾

(حٰم السجدہ: ۲۱)

(وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گے "ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے، اُسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اُسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔)

نماز، روزہ، زکوٰۃ، معروف حُسنِ سلوک اور دوسرے اعمال صالحہ زندہ وجود ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں سے مرکب ہیں ظاہری وہی عمل کی شکل ہے اور باطن وہ رُوح ہے جو ان اعمال میں مخفی ہوتی ہے۔ عمل کی شکل وہی انسان کا اپنا فعل ہے اور روح تو رب کے حکم سے جاری ہوتی ہے۔ اس عملی شکل اور رُوح کے درمیان اختلاط و امتزاج کا عمل انسان کے قلب میں مکمّل ہوتا ہے۔ ہر وہ پاکیزہ عمل جو مومن دل سے نکلے، وہ زندہ عمل ہے جس میں پاکیزہ روح بسی ہوئی ہے اور ہر وہ عمل جو قلب کے علاوہ کہیں اور سے صادر ہو مردہ اور بے جان عمل ہے ہم یہاں جس چیز کو داعیان کرام اور دوسرے لوگوں کے لئے نمایاں

کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ زندہ اعمال اپنی پاکیزہ رُوح کے ساتھ انسان کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی اس سے چپکے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب بندہ روزِ قیامت اللہ سے ملاقات کرے گا تو اس وقت بھی یہ اعمال ساتھ رہیں گے اسے نفع پہنچاتے رہیں گے اور اس کی خدمت میں لگے رہیں گے، اس سے ہر پریشانی اور مصیبت کو دُور رکھیں گے اور ہر خیر اور بھلائی کو اس سے قریب کریں گے اس زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ہم نے اوپر ابو ہریرہؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے اس مفہوم کی وضاحت اور تاکید ہو جاتی ہے۔ ہم ایک اور حدیث یہاں نقل کریں گے جس سے ہر قسم کا شک و شبہ رفع ہو جائے گا۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے بعض حصے یہاں تحریر کئے جاتے ہیں:

"میں نے گزشتہ شب ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے اور انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اللہ کی طرف سے وحی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی اُمت کے ایک فرد کو دیکھا کہ شیطان اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے ہیں، چنانچہ ذکرِ الٰہی آیا اور اس نے ان شیطانوں کو بھگا دیا۔ اور میں نے اپنی اُمت کے ایک شخص کو دیکھا کہ پیاس سے زبان نکالے ہوئے ہے، جب جب وہ حوض کے قریب جاتا ہے اسے روک دیا جاتا ہے اور بھگا دیا جاتا ہے، چنانچہ ماہِ رمضان کے اس کے روزے آئے اور اس کو سیراب کر دیا۔ اور میں نے اپنے ایک امتی کو اس حال میں دیکھا کہ تمام انبیاء حلقہ بنائے بیٹھے ہیں، وہ جب کسی حلقہ کے قریب ہوا بھگا دیا گیا چنانچہ اُس کا غسلِ جنابت آیا، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پہلو میں بٹھا دیا۔ اور میں نے

اپنے ایک اُمتی کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے آگ کے شعلوں سے بچاؤ کر رہا ہے کہ اس کا صدقہ آیا اور اس کے اور آگ کے درمیان ڈھال بن گیا اور اس کے سر پر سایہ ڈال دیا۔ اور میں نے اپنے ایک اُمتی کو دیکھا کہ جہنم کے فرشتے اسے گھیرے ہوئے ہیں اتنے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس کے کارنامے آئے اور اسے ان کے چنگل سے نکال کر رحمت کے فرشتوں کے گھیرے میں داخل کر دیا۔ اور میں نے اپنے ایک اُمتی کو دیکھا کہ وہ دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے اور اس کے اور خدا کے درمیان حجاب حائل ہے کہ اتنے میں اس کا حُسنِ اخلاق آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اللہ کے سامنے کر دیا۔ اور میں نے اپنے ایک اُمتی کو دیکھا کہ وہ پل صراط پر کھڑا کانپ رہا ہے جیسے کھجور کی شاخ تیز آندھی میں کانپتی ہے کہ اتنے میں اللہ کے سلسلے میں اس کا بہترین عقیدہ آیا اور اس کی کپکپاہٹ ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ اور میں نے اپنے ایک اُمتی کو دیکھا کہ وہ جنّت کے دروازوں تک پہنچ چکا تھا کہ اتنے میں دروازے بند کر دیئے گئے، چنانچہ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی شہادت آئی، اس نے دروازے کھول دیئے اور اسے جنّت میں داخل کر دیا۔"

اس لمبی حدیث سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ زندہ اعمال کو تصرفات کے اختیارات حاصل ہیں کیونکہ اللہ نے ان میں طاقت ودیعت کی ہے۔ یہاں ہم یہ بتانا پسند کریں گے کہ اعمال کا یہ تصرف آخرت تک محدود نہیں ہے بلکہ اس دُنیا میں بھی یہ انسان کو نفع پہنچاتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کہتے ہیں:

"جو شخص روزانہ سو بار یہ کلمات دُہرائے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَ لَہُ الْحَمْدُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ - اُس کو شیطان سے امان مل جاتی ہے تا آنکہ وہ میرے پاس آجاتا ہے۔"

ترمذی نے اس طرح کی حدیث انس بن مالکؓ کے واسطہ سے روایت کی ہے۔

اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں:

"جو شخص گھر سے نکلتے ہوئے یہ دُعا پڑھے بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اس سے کہا جاتا ہے کہ تم بچا لیے گئے، تمہیں راہِ راست مل گئی اور تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا۔ اور شیطان اس سے دُور ہٹ جاتا ہے اور وہ دوسرے شیطان سے کہتا ہے کہ اس شخص پر کیا حربہ آزماؤ گے جو بچا لیا گیا، جسے ہدایت مل گئی اور جس کی حفاظت کر دی گئی۔"

بلکہ یہ اعمال انسان کے مادّی اُمور میں بھی اس طرح مدد کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بُخاری نے روایت کی ہے کہ:

"فاطمہؓ نے اپنے والدِ محترم سے شکایت کی کہ چکّی چلانے، کام کاج کرنے اور دوڑ بھاگ کرنے میں بڑی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے اگر ایک خادم رکھ دیں تو اچھا ہے۔ لیکن اللہ کے رسولؐ نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا کہ اُنہیں اور ان کے شوہر کو اس بات کی تعلیم دی کہ جب وہ روزانہ بستر پر جائیں تو ۳۳ بار سُبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر

پڑھا کریں۔ اور فرمایا: یہ وظیفہ تم دونوں کے حق میں ایک نوکر سے زیادہ بہتر ہے۔"

حبیب بن مسلمہؓ جب کسی قلعہ پر چڑھائی کرتے یا کسی دشمن سے آپ کی ٹڈ بھیڑ ہوتی تو کہتے: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار روم کے کے ایک قلعہ پر چڑھائی کی اور آپ نے اور تمام مسلمانوں نے یہ کلمات دُہرائے اور زور کی تکبیر بلند کی تو قلعہ منہدم ہو گیا اور دُشمن شکست کھا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ حبیب بن مسلمہؓ اس حدیث کی تقلید میں ایسا کرتے رہے ہوں جس میں بیان ہے کہ جب فرشتوں کو عرش اُٹھانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے کہا:

"اے ہمارے رب! ہم اس عرش کو کیسے اُٹھا سکیں گے جس پر آپ کی عظمت اور آپ کا جلال ہے؟ اللہ نے کہا: کہو، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ چنانچہ فرشتوں نے یہ کلمات دُہرائے اور پھر عرش اُٹھا لیا۔"

ہم کہہ چکے ہیں کہ قول و عمل کے ساتھ روح کے امتزاج کا یہ عمل دل میں ہوتا ہے۔ ہر قول نفع بخش ہو سکتا ہے نہ ہر عمل بار آور۔ اس لئے ہر داعیٔ دین کو اس حقیقت کو سمجھنا چاہیئے اور اس دل کی قیمت کا اسے احساس ہونا چاہیئے جو اللہ نے اس کے سینے میں رکھ دیا ہے۔ اسی دل کے ذریعہ وہ اس لائق ہو سکتا ہے کہ نصرت و فتح کی فوجیں تیار کر سکے جس کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسے انتخاب کرنا چاہیئے کہ وہ ان مبارک فوجوں سے الگ تھلگ رہے گا یا دل کی دنیا کے بند دروازے کھولے گا تاکہ اللہ کی فوج کا استخراج کر سکے؟ یہ فوجیں آپ سے اس سے کہیں زیادہ

مربوط رہیں گی جتنا دُنیوی فوجیں اپنے کمانڈر سے مربوط رہتی ہیں۔ یہ آپ کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہیں۔ وہ آپ کا جزو ہیں اور آپ ان کا جزو ہیں، ان کا آپ سے اس سے کہیں زیادہ تعلق مستحکم رہے گا جتنا نیک اور فرماں بردار بیٹوں کا اپنے باپ سے رہتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ اولاد ہے جسے آپ کے قلب نے جنم دیا ہے جبکہ دوسری اولاد وہ ہے جو آپ کے صلب سے جنم لیتی ہے۔ البتہ پہلی قسم کی اولاد زیادہ وفادار اور پائیدار رشتے رکھنے والی ہوتی ہے اور مدد اور تعاون کی زیادہ قدرت رکھتی ہے۔ آپ اللہ کے اس قول سے استشہاد کر سکتے ہیں:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝ (کہف: ۴۶)

(یہ مال اور یہ اولاد محض دُنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے۔)

اس آیت میں دونوں قسم کی اولاد میں ایک ہلکا سا تقابل پیش کیا گیا ہے جس سے اللہ نے پردہ نہیں اُٹھایا تاکہ لوگوں کے اندر ایسی چیزیں پرورش نہ پا جائیں جو ان کے افکار و نظریات کو زیر و زبر کر دیں، اور اہلِ دانش کے لئے چھوڑ دیا کہ وہ مراد تک پہنچ جائیں کیونکہ علمِ راسخ کے وہ مالک ہوتے ہیں۔

شاید اس ہم آہنگی کی دلیل قرآن کی یہ آیت بن جائے:

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ (کوثر: ۳)

(تمہارا دُشمن ہی جڑ کٹا ہے۔)

اس آیت میں ان لوگوں کے خیالات کی تردید کی گئی ہے جو رسولِ اکرم ؐ کے بیٹوں کی موت پر آپ پر لعن طعن کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص لاولد ہے اس کا کوئی بیٹا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر اللہ نے یہ فیصلہ دیا کہ لاولد تو وہ شخص ہے جس کا سینہ نفرتِ رسول سے کھول رہا ہو، جس کے پاس اعمال اور قلوب کی اولاد نہ ہو جو بعد کی نسل میں باقی رہ جائیں اور ان کا چرچا ہوتا رہے۔ رہی صلبی اولاد تو ان میں ان کے باپ کے لیے کوئی بھلائی نہیں ہے اگر وہ شخص برّ و تقویٰ اور نیکی و بھلائی کے اعمال سے تہی دامن ہو۔

میرے بھائی! آپ اس راہِ جہاد میں اس اولاد کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں، زیادہ سے زیادہ اعمال کیجیے اور نیت کو مخلص بنائیے تو عالمِ خفا میں یہ ذرّیت بڑھتی جائے گی اور یہ اولاد اپنے باپ پر بوجھ ہرگز نہ بنے گی بلکہ اس کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرے گی چاہے باپ اپنی اس اولاد کو نہ دیکھ سکے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوگا کہ باپ اپنے کمرے میں شب و روز آرام کر رہا ہوگا اور تھکن اور مشقت سے چور ہوگا لیکن یہ اولاد اس کی خواب گاہ کے قریب نچلی نہ بیٹھے گی بلکہ مختلف مقامات پر ایسے عمل کی تلاش میں گھومے پھرے گی جس سے وہ اپنے باپ کی مدد کر سکے۔ بہت سے لوگ بیٹھے آپ کی مجاہدانہ دوڑ دھوپ کا تذکرہ کریں گے اور یہ مخفی اولاد اللہ کی توفیق سے دلوں کے اندر جذبات کو ابھارے گی اور قوم کے دل و دماغ میں خیر کے خیالات کی پرورش کرے گی۔ جب لوگ محض گفتگوؤں سے آپ کی تعریف کر رہے ہوں گے اور آپ سے تعاون کے فریضے پر بات کر رہے ہوں گے یہ محض روحیں وہ کام کر جائیں گی جو بڑے بڑے مقالے اور تقریریں نہ کر سکیں گی۔ اور مستقبل ایسے افراد کو لا کھڑا کریں گی جو آپ کی دعوت

پر بیعت کریں گے اور آپ کی طرف دستِ تعاون دراز کریں گے۔

میرے مخلص بھائی! یہی اولاد ہے۔ اپنے قولی و عملی جہاد میں، جنگ و صلح کی دوڑ دھوپ میں ان کو ساتھ رکھئے۔ اور جان لیجئے کہ جو مجاہد اس اولاد کی تعداد کو جمع کئے بغیر میدانِ جہاد میں آتا ہے وہ اس مجاہد سے بھی کمزور اور لاغر ہوتا ہے جو بغیر ہتھیار کے میدان میں کود پڑے۔ اور یقین کیجئے کہ یہ اولاد اپنے باپ کے لئے اور اپنے باپ ہی کے ہاتھوں اس طرح جنگ لڑتی ہے کہ حیرت و دہشت سے آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اسی سلسلے میں علامہ ابن قیم نے کہا تھا:

"فوجی امام ابن تیمیہؒ کی طاقت کو میدانِ جنگ میں ایک بہت بڑی چیز دیکھتے تھے"

میں نے اپنی بات پہنچا دی ہے۔ اے خدا تو گواہ رہنا۔

تیسرا باب

داعیٔ دین کے مآخذ

ان مراکز و مآخذ سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ یہ تقریر و تحریر اور بلاغت و فصاحت کے لئے سرچشمہ کا کام دیں گے اور ان میں معانی کا بحرِ ذخار ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آئے گا جس سے داعیٔ دین اپنی گفت گو کو مزین کر سکے گا اور خطابت و تحریر کے جوہر دکھا سکے گا۔

ہماری مراد ان مراکز سے یہ ہے کہ ان سے داعیٔ دین کی صلاحیتوں کو جلا ملے گی، اس کی روح کو پیغام میسر آئے گا، اس کے نفسی احساسات و جذبات پر الہام ہوگا، اپنے نصب العین کے سفر کے لئے عملی رہنمائی ملے گی اور اس بااخلاق معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کے لئے مواد حاصل ہوگا جو ہمارا مقصود و محبوب ہے۔ یہاں ہم ان مآخذ کا تذکرہ علی سبیل المثال کر رہے ہیں، حصر و احاطہ پیشِ نظر نہیں ہے:

(۱) قرآن کریم

(۲) سُنّتِ مطہرہ

(۳) قوموں اور ملّتوں کی تاریخ اور بڑے لوگوں کے کارنامے

(۴) روزمرّہ زندگی کے واقعات

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہر ایک ماخذ کی کچھ تفصیل یہاں بیان کر دی جائے۔

۱ــ قرآن کریم

اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (شوریٰ : ۵۲)

(اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے، تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔)

بہتیرے لوگ بلکہ اہل علم کی بھی ایک بڑی تعداد جب قرآن کریم پر گفتگو کرتی ہے تو کہتی ہے کہ قرآن کے دو پہلو ہیں ایک الفاظ کا دوسرا معانی کا، پھر اس کے بعد وہ مختلف گروہوں اور مکاتیب فکر میں بٹ جاتی ہے۔

شعبہ ادب کے افراد معانی کی خوبصورتی اور عبارتوں اور اسالیب کی عمدگی پر غور کرتے ہیں اور اسی نہج سے قرآن کے اعجاز و بلاغت کے اسباب ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیا قرآن کا اعجاز اس کے الفاظ و تراکیب میں ہے؟ یا معانی میں ہے یا دونوں ہی میں اس کا اعجاز ہے؟ اور قانون و فقہ سے دلچسپی رکھنے والے الفاظ و معانی پر اس لئے غور کرتے ہیں تاکہ عبادات و معاملات اور دوسرے امور کے متعلق شرعی احکام کا

استنباط کر سکیں۔

علم کلام کے ماہرین الفاظ و معانی پر اس لئے دھیان دیتے ہیں تاکہ عقائد کے اصول کا استخراج کر سکیں۔ اور اس کی حفاظت و دفاع کے لئے پوری تیاری کر سکیں۔

علم عمرانیات کے ماہرین (SOCIOLOGISTS) قرآن پر اس لئے نگاہ دوڑاتے ہیں تاکہ انسانی حقوق، خاندان کی ذمہ داریوں اور اس کے باہمی تعلقات کے عوامل کا استنباط کر سکیں، معاملات کے وہ قواعد و ضوابط اخذ کر سکیں جو جماعت کو باہمی تعاون اور شورائیت کے دائرے میں رکھیں، اخلاق کے وہ قوانین فراہم کر سکیں جن سے افراد کے دلوں کا تزکیہ ہو سکے اور زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر تبدیل ہو سکے اور اس میں بلندی آسکے۔

اور سیاست داں اور ماہرین اقتصادیات اپنے اپنے مطلب کی چیزیں اس سے نکالتے ہیں لیکن یہ سارے لوگ ایک ایسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو سب کے لئے نفع بخش اور بار آور ہے۔

یہ سارے طبقے بس قرآن کے الفاظ و معانی کے گرد گھومتے رہتے ہیں، ہم نے اس بحث کے آغاز میں قرآن کریم کی ایک آیت نقل کر دی ہے تاکہ قاری کو معلوم ہو جائے کہ قرآن رُوح ہے محض الفاظ و معانی کا مجموعہ نہیں ہے۔

میں اپنے لئے یہ جائز نہیں سمجھتا کہ روح اور الفاظ و معانی کے درمیان مقابلہ آرائی کروں اور ایک کو دوسرے پر افضل قرار دوں اس لئے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اور وہ ہر چیز سے واقف ہے البتہ میں یہ کہتا ہوں کہ قرآنی رُوح کا اہتمام ہمارے قلوب اور ہماری عقلوں میں شایان شان مقام حاصل کرے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے کہ جسم و بدن

کی رُوح کا تو ہم خیال رکھیں لیکن کلام الٰہی کی روح سے غفلت برتیں کیونکہ دونوں رُوحیں خدا کی جانب سے ہیں کلام الٰہی کی رُوح کا تذکرہ پہلی آیت میں ہو چکا ہے مندرجہ ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ جسمانی روح کا ذکر یوں کرتا ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ
وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝ (بنی اسرائیل: ۸۵)

(لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو "یہ رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔)

جو لوگ قرآن کے اعجاز و بلاغت اور اسرار و رموز کی جستجو میں رہتے ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سب سے پہلے اس رُوح کو تلاش کریں پھر الفاظ و معانی کی قوت، رعنائی، نصیحت آموزی اور احکام و قوانین کو تلاش کریں۔ اس لئے کہ الفاظ کے اعجاز کی تلاش میں مصروف رہنے والا شخص کسی دشمن کا منہ بند نہیں کر سکتا نہ اس کے اس ادعا کا راستہ بند کر سکتا کہ اسے اس کلام میں کوئی معجزہ نظر نہیں آتا اور اس کے پاس جو ادبی اقوال اور میراث ہیں وہ اس کلام سے زیادہ عمدہ اور بہترین ہیں لیکن رُوحِ الٰہی کے اعجاز میں کوئی شخص شُبہ نہیں کر سکتا، اس کی قوت تمام لوگوں کے نزدیک مسلّم ہے، کسی نے کلامِ الٰہی کے اندر پائی جانے والی رُوحِ الٰہی کی آج تک مخالفت نہیں کی اسی طرح اجسام کائنات میں جو رُوحِ الٰہی دوڑ رہی ہے اس کی بھی کوئی مخالفت نہ کر سکے گا۔ قرآن کریم نے اعجاز کی ان دونوں قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا
وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ (حج: ۷۳)

(جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔)

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۸)

(کہدو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔)

اس لیے کہ مسئلہ کلامی یا بدنی صورت کا نہیں ہے، اس کی تخلیق اور انشا پردازی پر قدرت رکھنے کا ہر دشمن دعویٰ کر سکتا ہے لیکن سب سے نمایاں اعجاز اس رُوح کے ڈالنے میں ہے جس سے جسم زندہ ہوتے ہیں اور کلام کی شان بڑھتی ہے۔

میں یہاں قرآن کے اعجاز پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں کہ اس کے اندر پائی جانے والی روحِ الٰہی کی توضیح کروں، یہاں تو گفتگو اس طور سے ہو رہی ہے کہ قرآن پاک داعیٔ دین کے احساسات وجذبات کی نشو ونما کے لئے سب سے بڑا سرچشمہ اور مرجع ہے۔ ہر داعیٔ دین بلکہ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ مندرجہ ذیل چیزوں کو اختیار کرے۔

پہلی نصیحت

وہ قرآن کو اس حیثیت سے پڑھے کہ وہ رُوح ہے۔ اور روح کے اپنے اثرات و نتائج ہوتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا اثر زندگی، ارتقا اور قوت کا ظہور ہے اور

سمع وبصر کی صلاحیتوں کا ابھرآنا ہے۔ ہم ان آیات کا تذکرہ کرکے طول کلامی نہیں کرنا چاہتے جو بتاتی ہیں کہ قرآن قلوب اور صلاحیتوں کے لیے زندگی ہے۔ قرآن کے ذریعہ ان ہیں نمود وارتقاء، قوت وطاقت اور سمع وبصر کی صلاحیت آتی ہے۔ البتہ داعیان دین سے ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس روح کو تلاش کریں اور اس روح اور اپنے قلب کے درمیان تعلق پیدا کرنے کی تدبیر کریں تاکہ روحِ قرآن کی تمام لہریں اور کرنیں ان کے پورے وجود کو منور کرسکیں۔ انسان کے قلب تک اس روحِ قرآنی کے منتقل ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ پورا قرآن پڑھا جائے البتہ یہ امر ناگزیر ہے کہ ان تمام حجابات اور پردوں کو ہٹادیا جائے جو اس کے قلب اور قرآن کے درمیان حائل ہیں۔ جب یہ حجاب ہٹ جائیں گے اور قلب قرآن کے سامنے ہوجائے گا تو وہ ایسی زندگی، قوت، روشنی اور خشوع ورقت محسوس کرے گا جو اس کے پورے وجود پر چھاجائے گی اگر ہمارا قرآن سے بہترین رشتہ قائم ہوجائے تو صرف ایک آیت یہ کارنامہ انجام دے سکتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف ایک آیت کے سلبی وایجابی پہلوؤں پر ہماری نظر ہوجائے، عمل واعتقاد کی دنیا میں اس سے استفادہ کرلیا جائے، بغیر کسی سستی وکاہلی کے اس کی مشمولات کو اختیار کرلیا جائے اور اس کی روح کو قلب سے ملادیا جائے تو ہمارے اندر ظاہری وباطنی زندگی دوڑ جائے اور ایک نئی زندگی، ایک نیا حوصلہ آجائے اور ہمارا قلب ودماغ منور ہوجائے۔ جیسے کوئی شخص بجلی کے تار کو کسی طرف سے بھی چھولے تو اسے بجلی کا جھٹکا فوراً لگے گا اور وہ پریشان ہوجائے گا چاہے بیک وقت وہ اس کے تمام اجزاء پر ہاتھ نہ رکھ سکے، قرآن اللہ کی مضبوط رسّی ہے، جیسا کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے:

"اس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا دوسرا سرا انسانوں کے ہاتھ میں، ہم اس کے جس حصے کو بھی مضبوطی اور توانائی کے ساتھ پکڑ لیں گے اس کا اثر دل پر پڑے گا اس کے اندر لرزش پیدا ہوگی اور زندگی دوڑ جائے گی:

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (زمر: ۲۳)

(اللہ نے بہترین کلام اُتارا ہے ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں اسے سُن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔)

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال اُٹھے کہ اگر دلوں کو زندہ کرنے کے لئے صرف ایک آیت کافی ہے تو پورے قرآن کا فائدہ کیا ہے؟ اور کیوں نہیں اللہ نے صرف ایک آیت یا چند آیات کے نزول پر اکتفا کیا؟ یہ ایک برحق سوال ہے اور معقول اعتراض ہے لیکن یہ اعتراض اس وقت رفع ہوجائے گا جب ہمیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ قرآن کا کام صرف دلوں کو زندہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ عمل کے ان طریقوں کو بھی متعین کرتا ہے جن سے زندگی اس نہج پر ڈھل سکے جس کی طرف پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جاچکا ہے تاکہ خدا کی طرف سفر کرتے وقت انسان اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو۔ کسی عارف باللہ کا قول ہے کہ "جس نے تصوف اختیار کیا لیکن تفقہ سے نابلد ہے تو وہ زندیق ہوگیا۔" تصوف کا مطلب یہاں دل کی زندگی ہے اور تفقہ سے مراد اللہ کے احکام اور ان کے

حدود کی معرفت ہے جن کو ہم نے عمل کے طریقے کہا ہے۔ اور زندقہ سے مراد اللہ کے راستے سے بھٹک جانا ہے۔

میرے بھائی! آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ نے جب انسان کے اندر رُوح پھونک کر اسے زندہ کیا تو اسے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے عقل سے نوازا جس سے وہ اس زندگی کی تنظیم کر سکے اور معاملات کا انتظام چلا سکے اور نفع و نقصان کو پہچان کر اس سے مناسب برتاؤ کر سکے؟!

یہی معاملہ رُوح قرآن کا ہے جس سے دل زندہ ہوتے ہیں اور اس زندگی کی عقل جو اسے بصیرت کی روشنی میں اللہ کی طرف موڑتی ہے، وہی شرعی احکام ہیں۔ اسی لئے اللہ کے رسولؐ کہتے ہیں:

"ایک فقیہہ، شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔"

اور یہ زندگی —— جیسا کہ اوپر کہہ چکے ہیں —— صرف ایک آیت سے پیدا ہو سکتی ہے بلکہ ایک مختصر سا کلمہ بھی یہ زندگی پیدا کر سکتا ہے اس لئے کہ یہ رُوح ہے جہاں جسم کی لمبائی چوڑائی کام آتی ہے نہ کلام کی طوالت ——! رہے احکام، تو اللہ کو ہماری تعمیر و تشکیل کا مزاج اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ انہی چیزوں کو سمجھ سکتا ہے جو مفصل ہوں، مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہوں۔ اگر عقل کا مزاج دل کے مزاج کی طرح ہوتا اور حقائق کو ایک ہی جملہ میں ایک ہی لحظہ میں قبول کر لیتا تو وہ سارے احکام ایک ہی آیت میں بیان کر دیتا یا پھر احکام کی وہ صورت ہوتی جو ہم نہیں جانتے۔ لیکن اللہ نے ہر چیز اس قانونِ فطرت پر رکھی ہے جو اس نے تخلیق کی ہے۔ وہ علیم و حکیم ہے۔ دلوں کی زندگی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ ہم کتنی زیادہ مقداریں قرآن پڑھ لیتے ہیں بلکہ اس کا انحصار

اس کیفیت اور حالت پر ہے جس کے ساتھ ہم قرآن پڑھتے ہیں۔ یہاں ہم مندرجہ ذیل چیزوں کی تلقین کرتے ہیں:

۱ــ قرآن پر غور کیا جائے اور ہر عبرت اور نصیحت کے موقع پر ٹھہر کر سوچا جائے۔ تلاوت قرآن خاموشی اور سکون کے ماحول میں ہونا خاص طور سے رات کی تنہائیوں میں جب قلب صاف ستھرا ہوتا ہے اور نفس کے سارے دروازے کھلے ہوتے ہیں، اس کا اہتمام کیا جائے۔

۲ــ تلاوت قرآن کے ذریعہ اپنے ضمیر سے پوچھئے: تیری محبّت اللہ کے ساتھ ہے یا دُنیا کے ساتھ؟

میرے بھائی! ہر دُنیاوی محبّت اور مادّی خواہش آپ کے اور خدا کے درمیان ایک دبیز پردہ ہے اور قرآن اور آپ کے قلب کے درمیان ایک زبردست رُکاوٹ ہے۔ مال کی محبّت حجاب ہے، اولاد کی محبّت رُکاوٹ ہے، دُنیاوی دلچسپیوں میں قلب کا الجھنا اس راہ کا سنگِ گراں ہے، اپنے عمل، ذہانت، صلاحیت اور اپنی قوت و منصب پر خوش ہونا اور اترانا، اللہ کی حرام کردہ چیزوں کی طرف نفس کا مائل ہونا، خیر کی طرف رغبت کرنے والوں سے بغض، نفرت اور کینہ وحسد رکھنا، مصیبتوں اور تکلیفوں میں گرفتار دیکھنے کی خواہش کرنا، یہ سب اس راہ کی زبردست رُکاوٹیں ہیں، جن سے قلب کو آزمائش پیش آتی ہے اور یہ چیزیں اسے روح قرآن تک پہنچنے سے روک دیتی ہیں۔

میرے بھائی! بڑی صفائی سے یہ معلوم کر لیجئے کہ آپ کے اور قرآن کے درمیان اس طرح کی کوئی رُکاوٹ تو موجود نہیں ہے؟ پیمانہ آپ کے سامنے ہے، اب

آپ جانیں اور آپ کا کام:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۚ (انفال: ۴۲)

(تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔)

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ (بنی اسرائیل: ۴۵، ۴۶)

(جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔)

میرے مخلص بھائی! قلب کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور آپ اگر زندگی کے متلاشی ہیں تو کسی ایسی کوشش سے دریغ نہ کیجیے جو آپ کو زندہ لوگوں کی صفوں میں کھڑی کر سکے چاہے وہ آپ کے لئے کتنا ہی گراں اور بار خاطر ہو۔ ہم جس نصب العین کے حامل ہیں، اس کے حقوق بس دلِ زندہ ہی ادا کر سکتا ہے اور آخرت کے اس سفر میں مال کام آئے گا نہ اولاد۔ صرف قلب سلیم ہی اس دن بار آور ہوگا۔ اس لئے اپنے قلب کو ان تمام خواہشات اور محبتوں سے خالص کر لیجیے جس کی وضاحت ہم معاشرتی روحانیت میں کر چکے ہیں تاکہ آپ کا قلب روشن رہے، اس پر کوئی حجاب نہ رہے۔ اس وقت آپ ادراک کریں گے احساس کریں گے، محبت و اکراہیت کا سلوک کریں گے، روئیں گے اور خشوع کریں گے بہرحال

جنت کے باغ میں ہوں گے۔

۳ — اپنی عبودیت کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھئے۔ حقیقی معنوں میں عبدیت اور غلامی کو مستحضر رکھئے، پورے شعور اور مستحکم احساس کے ساتھ اپنی اس حیثیت کو تازہ رکھئے جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے احکام کی پیروی اور غلامی کرتا ہے۔ ہم اس اضطراب، تردد اور خوف کو اچھی طرح جانتے ہیں جو کسی غلام کو اپنے ظالم و جابر اور طاقت ور آقا کے سامنے لاحق رہتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ غلام کے کان آقا کی باتوں پر لگے ہوتے ہیں، اس کا قلب احکام کے لئے ہمہ آن متوجہ رہتا ہے، اس کی آنکھیں چہرے کی سلوٹیں اور سر کی حرکتیں سب طاعت و وفاداری کا اعلان کرتی ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے اسے بڑھ کر قبول کرتی ہیں اور اسی اطاعت اور غلامی میں راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔ غلام یہ سارے کام اسی لئے کرتا ہے تاکہ آقا کو یہ احساس دلائے کہ وہ اس کی رضا کو اختیار کرے گا اور انہی چیزوں کا رخ کرے گا جو مالک اور آقا کی مرضی کے مطابق ہوں گی۔

اطاعت و وفاداری کی یہ حالت جس میں ایک انسان اپنے جیسے انسان کے تئیں مبتلا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ذلت و پستی اور یہ اطاعت و انابت اس خدائے ذوالجلال کے سامنے ہو جو سب سے بڑا اور سب پر غالب ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو انسان کے اوپر پڑے ہوئے تمام پردے ہٹ جائیں اور وہ اپنے آپ کو عرش الٰہی کی عظمت کے سامنے موجود پائے جیسے بیچ میں کوئی پردہ تھا ہی نہیں۔ جب وہ اللہ کے اقتدار میں آئے گا تو اس کی پناہ ڈھونڈھے گا، اپنے وجود کو اپنے کان اور دل میں سمیٹ لے گا اور اللہ کے اوامر و نواہی اس کے دل میں جگہ بنالیں گے پھر کسی دوسری طاقت کے احکام کی اس کے دل

میں کوئی جگہ نہ رہے گی۔ یہ وہ حالت ہے جو مشق و ممارست سے پیدا کی جا سکتی ہے اور بلاشبہ یہ حالت روح قرآن کو انسان کے قلب تک پہنچانے میں مدد معاون ثابت ہوگی۔

۴۔ یہ عبودیت حقیقی بار آور صفت کے ساتھ مستحضر ہو جس سے انسان کے اندر اپنے آقا کے حکم پر دوڑ پڑنے کا جذبہ بیدار ہو اور جو ذمہ داری اس نے اس پر ڈالی ہے اور جس کا تذکرہ اس نے قرآن میں کر دیا ہے اس کے نفاذ کی طرف لپک پڑنے کا داعیہ پیدا ہو۔ یہ چیز دو پہلوؤں سے مطلوب ہے:۔

(الف) کسی حکم کا نفاذ اس کی وہ عملی تفسیر ہے جو بہت سے مخفی گوشوں کو نمایاں کر دیتی اور پوشیدہ حیثیتوں کو ابھار دیتی ہے اور انسان کے اندر کتابِ الٰہی کا وہ فہم پیدا کرتی ہے جسے نظری تلاوت کی مدد تک محدود انسان کبھی اخذ نہیں کر سکتے۔

(ب) کسی حکم کی تنفیذ کا مطلب یہ ہے کہ پُر مشقت ذمہ داری ادا کی جائے اور کانٹوں سے بھری ہوئی وہ وادی طے کی جائے جس میں کتنی ہی ہمتیں تھک کر بیٹھ جاتی ہیں اگر انسان اپنے آپ کو تنفیذ پر اور ریاضت و مجاہدہ کو برداشت کرنے پر آمادہ و تیار کر لیتا ہے اور بغیر کسی سُستی و کاہلی کے ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے تو اس کے قلب میں رگ و ریشے میں حرکت دوڑ جاتی ہے۔ شعور میں آگہی آ جاتی ہے اور اس کے ضمیر کی طاقتوں اور صلاحیتوں میں بیداری آ جاتی ہے اس سے ہمیں کتابِ الٰہی کو سمجھنے اور اس کے اسرار و معانی سے واقفیت حاصل کرنے میں مزید مدد ملتی ہے۔ بغیر سرگرم اور پُر مشقت تنفیذ کے اعصاب پژمردہ اور مضمحل ہو جاتے ہیں، ضمیر کی صلاحیتوں پر جمود طاری ہو جاتا اور زنگ لگ جاتا ہے پھر کوئی صلاحیت روحِ قرآن کے مطالعہ کے لئے باقی

نہیں رہتی۔

۵ — قرآن اللہ کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کمال وجلال کی تمام صفات میں منفرد ہے۔ ہر کلام — چاہے وہ انسان ہی کیوں نہ ہو — اپنے بولنے والے کے اسرار ورموز، اس کی ذاتی تصفات پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ ہم جب کسی شخصیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے کلام کو پڑھتے ہیں جو ہمارے مطلوب کی تکمیل کر دیتا ہے۔ پھر تو ہزار درجہ مناسب اور زیبا ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم خدا کے اسرار اس کے کلام میں تلاش کریں اور اس کے کمال وجلال کی صفات کو اس کے کلام میں پڑھیں۔ جعفر بن محمد صادق کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اپنی مخلوق کے سامنے جلوہ گر ہے لیکن لوگ بصیرت سے کام نہیں لیتے۔"

تجلیاتِ الٰہی کا اس کے کلام میں مشاہدہ کرنے کے لئے، میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کی جمال وکمال کی صفات کا استحضار کرنا پڑے گا، جیسے قدرت، رحمت، برّ و محبت وغیرہ کی وہ ساری صفات جن کا احاطہ ناممکن ہے، جس قدر ممکن ہو ان کا ہیبت اور خشوع کے ساتھ استحضار رکھیں۔ اب اگر ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ہمارے دل میں ان صفات کا شعور ہوتا ہے اور ان کے مطالعہ کی رغبت رہتی ہے تو قرآن کی آیات اللہ کی توفیق سے ضرور اس سلسلہ میں مددگار ثابت ہوں گی۔

ہم کسی مقالہ کو پڑھنے سے پہلے مقالہ نگار کا نام دیکھتے ہیں۔ اگر وہ بڑے مصنفین میں سے ہو تو اس کی فصاحت وبلاغت، قوت معانی اور صحتِ رائے کے سلسلے میں ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے بلکہ خود اس کے چہرے کے خدوخال بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے

ہیں اور اس سے ہمیں مقالہ کی مشمولات اور اس کے اشاروں اور کنایوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور کبھی بغیر توجہ کے مقالہ پڑھ لیتے ہیں اور اسے کوئی خاص اہمیت نہ دے کر نظر انداز کردیتے ہیں لیکن جب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں بڑے مصنف کی تصنیف ہے تو ہم اس مصنف کی قوتِ بیان اور انفرادیت کو سامنے رکھ کر دوبارہ اسے پڑھتے ہیں اور اس وقت بہت سے وہ نکات سامنے آتے ہیں جو پہلی بار اوجھل رہ گئے تھے۔ پہلے مضمون نگار یا مصنف کی روح ہماری نگاہوں سے دور تھی لیکن اب سطروں کے بیچ وہ جھلکی پڑتی ہے۔ اور اللہ ہی کے لئے بلند مثالیں ہیں۔ شاید ہمارے کہنے کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

۶ — ہم قرآن اس طرح پڑھیں گویا خود اللہ سے اسے سن رہے ہیں ادریہ بدیہیات میں سے ہے جس سے ہم غفلت برت رہے ہیں کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے جس کے ذریعہ اس نے ہم کو خطاب کیا ہے اور اسے ہماری طرف ارسال کیا ہے۔ اس کا وسیع تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم اس عظیم متکلم کی بات سُنیں اور دھیان سے اس پر توجہ دیں:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (اعراف : ۲۰۴)

(جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سُنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر بھی رحمت ہوجائے۔)

غور اور توجہ سے سُننے کا یہ کام صرف کان سے نہیں بلکہ قلب سے اور انسان کے پورے شعور سے ہوتا ہے یہ وہ مقام ہے جو انسانوں سے مشق و ممارست، محنت و

ریاضت اور تدریج کا تقاضا کرتا ہے۔ سلف صالح میں سے کسی نے کہا ہے کہ: میں قرآن پڑھتا تھا لیکن مجھے اس میں کوئی حلاوت محسوس نہ ہوتی تھی یہاں تک کہ میں نے اس کی اس طرح تلاوت کی گویا رسول اکرمؐ کو اپنے صحابہ کے سامنے تلاوت کرتے سُن رہا ہوں، پھر ایک زینہ اور طے کیا تو اس کی اس طرح تلاوت کرنے لگا گویا خود جبرئیل علیہ السّلام کی زبان سے سُن رہا ہوں جیسے وہ رسول اکرمؐ کے سامنے پیش کر رہے ہیں پھر آخری منزلت میں اللہ کا نام آگیا تو میں اب خود اس کلام کے متکلم سے سُن رہا ہوتا ہوں۔ اب میں نے وہ لذت اور نعمت پالی ہے جس کے بغیر مجھے صبر نہیں ہوتا۔

یہ شہود کا وہ مقام ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا ہاں اس کے اثرات کا تذکرہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ کسی اہلِ بیت کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ نماز کی حالت میں وہ اس قدر محو ہوئے کہ ان پر غشی طاری ہو گئی، جب ہوش آیا تو ان سے اس بیہوشی کی وجہ دریافت کی گئی۔ انہوں نے کہا: میں آیت کو اپنے قلب پر دوہراتا رہا یہاں تک کہ میں نے خود اس کے متکلم کی زبان سے یہ آیت سُن لی اسی وقت میرا جسم خدا تعالیٰ کے بلند و برتر مقام کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔

میرے بھائی! یہ قرآن سے آپ کو جوڑنے کے کچھ طریقے ہیں۔ جب رشتہ قائم ہو جائے گا تو آپ کے اندر زندگی نشو و نما پائے گی، آپ کا قلب حرکت میں آجائے گا اور ارتقاء پذیر ہو گا اور بار آور اور ثمردار پودے اُگ آئیں گے۔ مالک بن دینارؒ کہا کرتے:

"اے اہلِ قرآن! قرآن نے تمہارے دلوں میں کیا تخم ریزی کی ہے؟ قرآن مومن کے لئے بہار ہے جیسے بارش زمین کے لئے بہار ہے۔"

دوسری نصیحت

قرآن کریم میں جہاد کے بہترین مظاہر، اس کے سچے حقائق اور اس کے پاکیزہ مقاصد کی مکمل داستان ہے جس کی قیادت کا پرچم رسولِ اکرمؐ سے بندھا ہوا ہے اور آپؐ کے پیچھے صحابہ کرامؓ کی فوج ہے۔

ہم ہر انسان پر یا کم از کم ہر داعیٔ دین پر یہ واجب ٹھہراتے ہیں کہ وہ اس قصّہ کی خبریں قرآن کریم کے اجزاء میں پڑھے، مکّی اور مدنی ادوار میں جہاد کے مزاج کا مطالعہ کرے اور یہ مطالعہ محض تلاوت اور تسلّی کے لئے نہ ہو بلکہ فہم و تدبّر اور شعور کا مطالعہ ہو۔

مطالعہ کو آسان بنانے کے لئے ہم اس بات کا تذکرہ کر دیتے ہیں کہ مکّی جہاد دو مختلف و متضاد عقلیتوں کے مابین ایک گمبھیر کشمکش تھی:

۱۔ ایک عقل وہ تھی جو اللہ پر اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی تھی اور اسی ایمان کی روشنی میں حقائق موجودات سے لے کر زندگی کی غرض و غایت تک کو دیکھتی تھی۔

۲۔ دوسری طرف جاہل اور مادی عقل تھی جو ایمان کی حقائق کو کوئی چیز نہ سمجھتی تھی اور عالمِ موجودات پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالتی تھی کہ وہ محدود دُنیوی محسوسات ہیں جو گود سے شروع ہوتے اور گور تک ختم ہو جاتے ہیں۔

پہلی عقل کے نزدیک توحید امر مُسلّمہ تھی جبکہ دوسری قسم کی عقل اسے عجوبہ سمجھتی تھی:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝ۚۖ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ۚۖ (ص: ۵ تا ۷)

(" کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے؟" اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ " چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی مقصد سے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سُنی یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک مَن گھڑت بات۔)

محسوسات کے دائرے میں محبوس عقل اسی طرح سوچتی ہے۔ اسی پر توحید کے ان تمام مسائل کو سوچ سکتے ہیں جن کے سلسلے میں بحث و مناقشہ ہوتا رہتا ہے۔ رسولوں پر ایمان لانا مومن عقل کے نزدیک کوئی عجوبہ نہیں ہے لیکن مادی عقل سختی سے اس کا انکار کر دیتی ہے:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۹۴)

(کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟)

رسول کا مذاق اُڑاتے ہوئے اس عقلیت کا شکار کہتے ہیں:

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ؕ (فرقان: ۷)

(یہ کیا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟)

رسول کی مفلسی کو انھوں نے اپنی رائے کی تائید میں استعمال کیا کہنے لگے اگر اللہ رسول ہی منتخب کرتا تو جاہ و منصب والے لوگوں میں سے کسی کو رسول بناتا:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (زخرف: ۳۱)

(یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔؟)

جہنم کے اُنیس [۱۹] فرشتے ان مادیت زدہ لوگوں کی عقلوں میں نہیں سما سکتے۔ یہ اس آگ کا ٹھٹھا کرنے لگے جس میں لاتعداد انسانوں کو جھونکا جائے گا اور اس کی نگرانی صرف اُنیس [۱۹] فرشتے کریں گے؟! ان کے بارے میں اللہ کا قول نازل ہوا کہ:

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ (مدثر: ۳۱)

(ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں اور ان کی تعداد کو کافروں کے لئے فتنہ بنا دیا تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے، اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں اور دل کے بیمار اور کفار یہ

کہیں کہ بھلا اللہ کا اِس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ——— اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لئے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو۔)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ (سبا: ۷)

(منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟)

یہ وہ اہم عقائد ہیں جن کے سلسلے میں ان دو مختلف و متضاد عقلوں میں بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی مکی سورتوں نے بیشتر انہی عقائد پر گفتگو کی ہے ان سورتوں نے عقیدہ کا تذکرہ کیا ہے، مشرکین و کفار کے خیالات نقل کئے ہیں، ان کے شبہات و اعتراضات کا ذکر کیا ہے اور پھر مضبوط دلائل اور سادہ و فطری اسلوب کے ذریعہ ان کی تردید کی ہے اس سے مادی عقل کی خصوصیات سامنے آتی ہیں اور اس بحث و مباحثہ کی جنگ کی واضح تصویر سامنے آتی ہے جس نے تیرہ سال تک مکہ میں آگ دہکائے رکھا۔

جس طرح ان دو عقلوں میں کشمکش برپا تھی اسی طرح دو قوتوں کے درمیان بھی معرکہ آرائی جاری تھی ایک طرف بے یار و مددگار ایمان کی طاقت تھی اور دوسری طرف ظالم و جابر

طاغوت کی طاقت تھی۔ ایمان کی طاقت خود اپنے لئے کسی چیز کی طلبگار نہ تھی جبکہ طاغوت کی طاقت کو جس چیز کا خطرہ سب سے زیادہ تھا وہ یہ کہ اس کا اقتدار چھن جائے گا اور ان سارے مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا جو اسے کمزوروں کے مقابلے میں حاصل تھے جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں پر اپنے غصہ اور غضب کے کوڑے برساتا تھا اور کسی رحم و قرابت کا کوئی پاس نہ کرتا تھا اور ایمان کی طاقت ذلت و خواری سے اس طاغوت کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی بلکہ ایمان اور خدا اور رسول پر اعتماد کے ذریعہ وہ اپنے دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی۔

قرآن کا مکی حصہ ان تمام حالات کی تصویر کشی کرتا ہے اور اس کی مثالیں اور واقعات بیان کرتا ہے۔

جب آپ سنجیدگی و بردباری سے ان دونوں کشمکشوں کا مطالعہ کریں گے اور صرف مکی سورتوں کی دستاویزات پر غور کریں گے اور نزول ترتیب کے لحاظ سے ایک سورہ سے دوسری سورہ کی طرف منتقل ہوں گے۔

تو آپ اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ خود اس کشمکش میں جا داخل ہوں گے اور اس کی گرمی اور حرارت اپنے قلب میں محسوس کریں گے اور اس سے قرآن کو سمجھنے اور اس کے حقائق و معانی کو زندہ شکل میں دیکھنے پر آپ کو قدرت حاصل ہوگی اور دورِ جدید میں درپیش جہاد اور نصب العین کے میدان میں اس علمی جہاد کی خبروں اور داستانوں سے آپ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ ہر رات گزری ہوئی رات سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اور ان ساری چیزوں کا انحصار اس دانش اور ذکاوت پر ہے جو اچھی طرح ان چیزوں کو پیش کر سکے اور بہترین طریقے سے استدلال کر سکے۔

❊ ❊ ❊

مدنی دور میں مسلمانوں کی قوت تین محاذوں پر برسرِ پیکار تھی۔ یہود، مشرکین اور منافقین ان کے درپے آزار تھے دوسری قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی قوت ان کی تعداد اور ہتھیار مکی دور سے زیادہ تھے یہاں مسلمان مسلّح قوت کے مالک تھے۔

یہودیوں کا محاذ

یہود اہلِ علم وفضل تھے صدیوں سے ایک آسمانی کتاب کے وارث تھے لیکن اس کتاب کے صرف نصوص و احکام باقی رہ گئے روح پوری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ احکام و قوانین دماغوں میں جڑ پکڑ چکے تھے لیکن دل روح اور اس کی بلند کیفیت سے خالی تھا۔ زمانہ دراز ہوا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر اپنے رب کے نافرمان بن گئے، ان کے اندر دنیا سے محبت آگئی، رشوت کا کاروبار شروع کر دیا، سود کھانے لگے جبکہ اس سے سختی سے روک دیا گیا تھا، وہ ناجائز طریقے سے دُنیا کماتے تھے اور پھر بھی ان کا دعویٰ تھا کہ ہماری مغفرت تو ضرور ہو جائے گی، اگر ان کے سامنے ناجائز دولت آتی تو بلا جھجک اور شرم اسے قبول کر لیتے اس لئے کہ وہ اپنے کو خدا کا بیٹا اور اس کا چہیتا سمجھتے تھے ان کے عقیدے کے مطابق جہنم کی آگ اگر انہیں چھوئے گی تو بس چند روز کے لئے اس طرح انہوں نے اپنے دین کو دُنیا کے سامنے جھکا دیا تھا اور تھوڑی سی قیمت کے بدلے کتابِ الٰہی کو بیچ دیا تھا، یہ خود ان کے اور ان کے آباء کے کارناموں کا ہلکا سا جائزہ ہے۔

جب رسولؐ اللہ مدینہ تشریف لائے تو باہم رضامندی سے ایک معاہدہ کر لیا، انہیں امن و امان، انتظامات اور آزادی کی ضمانت دی اور اپنی مرضی کے مطابق بہترین

زندگی بسر کرنے کا اختیار دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ رسول کی طاقت بڑھ رہی ہے، آپ کا اقتدار وسیع ہوتا جارہا ہے، آپ کا دین غالب ہو رہا ہے اور سیاسی و اقتصادی معاملات کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی تو ان کے دل غیرت سے پکنے لگے اور ان کی نفرت و عداوت بڑھ گئی:

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○

(مائدہ: ۶۸)

(ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔)

یہ ان کی دو پست اور سطحی خصلتیں تھیں۔ ایک خصلت دُنیا کے عوض دین کو بیچ دینے کی تھی جو ان کی پُرانی بیماری تھی اور دوسری خصلت نفرت و عداوت سے پر غیرت تھی جو ان کی نئی بیماری تھی، اس کے ساتھ ہی ان میں مکاری، دھوکہ بازی اور چال بازی عام تھی۔ قرآن نے دین کو دُنیا کے عوض بیچ دینے کی ان کی تجارت کا ریکارڈ اس طرح محفوظ کیا:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ○

(آل عمران: ۱۸۷)

(ان اہلِ کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا، انہیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا، کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔)

مدنی سورتوں کی بہتیری آیات نے یہود کی اس روش پر تبصرہ کیا ہے اور انہیں لعنت ملامت کی ہے۔ دُنیا سے ان کی محبت اور عارضی متاع سے ان کا عشق قرآن پاک کی اس آیت میں دیکھئے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ (بقرہ: ۹۶)

(تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے حتیٰ کہ اس معاملہ میں یہ مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کس طرح ہزار برس جئے۔)

اس آیت میں حیاۃٌ (زندگی) کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بس زندگی مطلوب ہے، زندگی کس قسم کی ہو؟ اس سے انہیں بحث نہیں، جس قسم کی بھی زندگی میسر آجائے ان کے لئے کافی ہے۔ چاہے پست زندگی ہو یا بلند، شریفانہ زندگی ہو یا رذیلانہ، عزت کی زندگی ہو یا ذلت کی، سب ان کی نگاہ میں برابر ہے اہمیت ان کے یہاں زندگی کی نوعیت کی نہیں بلکہ خود زندگی کی ہے چاہے کسی نوع کی ہو۔

یہود کی غیرت ونفرت کو ان الفاظ میں محفوظ کر دیا:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ

(بقرہ: ۱۰۹)

(اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹالے جائیں گرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔ مگر اپنے نفس کی حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ (بقرہ: ۱۰۵)

(خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔)

وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (آلِ عمران: ۱۱۹)

(جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمہارے رسول اور تمہاری کتاب کو) مان لیا ہے مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف، ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں —— ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔)

یہ مکار اور چالباز لوگ جو ذلت وخواری کے ساتھ دُنیوی زندگی کے حریص ہیں ، جنہوں نے اس کے عوض دینِ الٰہی کو بیچ دیا، کیا آپ ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ مشرکینِ مکہ کی طرح کھل کر میدان میں آئیں گے ؟ مشرکینِ مکہ پوری جرأت و بیباکی سے اللہ کے رسول پر حملہ کرتے تھے اور آپ کو علی الاعلان تکلیفیں پہنچانے کے درپے تھے لیکن ان ذلیل لوگوں سے اس کے سوا اور کسی بات کی توقع نہ کیجئے کہ یہ چالباز بزدلوں کی جنگ لڑیں گے، جس میں وہ اپنی زندگی اور سلامت کے حد درجہ خواہش مند ہوں گے اور اس کے بعد ان سطحی اور گھٹیا حرکتوں کا ارتکاب کریں گے جو اس ذلیل بزدلی کے تقاضے ہوں گی ۔ جب یہ لوگ اپنے دین کو اپنی دنیا کے عوض بیچ چکے ہیں اور انہوں نے تھوڑی سی قیمت کو اپنی کتاب پر ترجیح دی ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کتاب قرآن کی تحریف سے چوک جائیں گے جب سطحی اور گھٹیا جنگ کے طریقہ کار اس تحریف اور ترمیم کا تقاضا کریں گے ؟ اور کیا یہ ایک قطرہ خون بہانے کے لئے تیار ہوں گے ؟ یا اپنی زندگی اور سلامت کو کسی تکلیف یا نقصان کی نذر ہونے دیں گے ؟

ان لوگوں نے نبی سے سُنا اور انہیں معلوم ہوا کہ قرآن کہتا ہے کہ " وہ موسیٰؑ کی شریعت اور ان سے پہلے کے انبیاء کی کتابوں جیسے احکام و قوانین لے کر آیا ہے "

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (شوریٰ : ۱۳)

(اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا

ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ کو دے چکے ہیں۔)

اور انہیں پتہ چلا کہ قرآن تورات اور اپنے قوانین کے درمیان مشابہت کے ذریعہ استدلال کرتا ہے اور اس مشابہت کی مثالیں بھی بیان کرتا ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (مائدہ: ۴۵)

(توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔)

یہ نئے نبی اور قرآن کا دعویٰ تھا۔ اس نے یہودیوں اور ان کی کتاب سے استدلال کیا تھا۔ اب اگر یہ لوگ اسے تسلیم کر لیتے تو گویا اپنے دشمن کو اپنے اوپر غالب ہونے کا موقع فراہم کرتے اور اگر اس کا انکار کرتے تو فریق مخالف کی دلیل ٹھکرانی پڑتی اور غیض و غضب سے اپنے ہونٹ کاٹتے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ان حرکتوں سے باز آجائیں گے؟

قرآن نے اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ تورات میں اس نبی کی بشارت موجود ہے اور اس کی بعض خصوصیات بھی گنائی گئی ہیں:

يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ (اعراف: ۱۵۷)

(اس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔)

تو کیا یہ لوگ اس نام کو اپنی کتاب میں لکھا ہوا چھوڑ دیں گے؟ اور کیا اس حقیقت کا اعتراف کرلیں گے کہ ان کی کتاب نے واقعی اس نبی اُمّی کی بشارت دی ہے؟ یا ان کے لئے ایک اور موقع ہے کہ کتاب کی تحریف کر دیں اور اس مبارک نام کو چھپا دیں؟ کیا کوئی بزدل اور کمینہ اس تحریف کے ذریعہ اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے سے باز رہ سکتا ہے؟

جب ان ساری چیزوں کو ہم اپنے ذہن میں تازہ رکھیں گے تو قرآن کے وہ تمام معانی، جن کو اس نے محفوظ رکھا ہے، ہمارے دل و دماغ میں واضح تر اور نمایاں تر ہو جائیں گے مثال کے طور پر قرآنِ پاک کی یہ آیات دیکھئے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ: ۱۰۱)

(اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو ان اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتابُ اللہ کو اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ کچھ جانتے

ہی نہیں۔)

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ (مائدہ : ۴۱)

(اور جو یہودی ہیں یہ جھوٹ کے لئے کان لگائے رہتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے، سُن گن لیتے پھرتے ہیں، کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنیٰ سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو، اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لئے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا ان کے لئے دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔)

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ (آل عمران : ۷۸)

(ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔)

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۷۱)

(اے اہلِ کتاب، کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟)

رسولِ اکرمؐ کی نبوت کو باطل کرنے کے لئے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم اسی رسول پر ایمان لائیں جو ایسا ذبیحہ لائے جس پر آسمان سے آگ اترے اور وہ اسے کھا جائے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ اس طرح کی کوئی چیز لے کر نہیں آئے اس لئے آپ پر ایمان لانے کے سلسلہ میں ہم معذور ہیں اس لئے کہ یہ اللہ کا عہد ہے۔ جو شخص اس واہیات حجت پر غور کرے گا، وہ اس میں ان ذلیل بزدلوں کی کمزوری اچھی طرح محسوس کرے گا جو بہادری سے اپنے فریق کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

اگر ان کی باتیں سچی ہوتیں تو یہ ان تمام رسولوں پر ایمان لائے ہوتے جنہوں نے اس طرح کی قربانیاں پیش کی تھیں لیکن انہوں نے تمام رسولوں کا انکار کردیا اور انہیں قتل کر ڈالا۔ اس حقیقت کو قرآن کی بہت سی آیات نے پیش کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْہُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۞ (آل عمران : ۱۸۳)

(جو لوگ کہتے ہیں ”اللہ نے ہم کو ہدایت کردی ہے کہ ہم کسی رسول کو تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے“ ان سے کہو ”تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانیاں بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو اُن رسولوں کو کیوں تم نے قتل کیا؟“)

اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَہْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ۞ (بقرہ : ۸۷)

پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کرڈالا۔)

یہی ایک ہتھیار نہیں ہے جس سے انہوں نے رسول اکرمؐ سے جنگ کی، تحریف اور کتمان حق تو نفرت و حسد کا کم سے کم مظہر ہے۔ ان دلوں کو تو ایسا ایجابی و مثبت عمل ہی ٹھنڈا کر سکتا ہے جس کے ذریعہ اس عظیم دین کی جڑیں کھوکھلی کردیں چنانچہ ان کے دل و جگر ہر وقت حسد اور کینہ کی آگ میں جلتے رہتے تھے۔

اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۡ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ۡ (آل عمران : ۱۲۰)

(تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔)

لیکن یہ مثبت عمل، ظاہر ہے کہ ان ذلیل بزدل لوگوں کا ہے جو سب سے پہلے اپنی زندگی اور سلامتی کے خواہش مند ہوتے ہیں، تو یہ مثبت عمل کس قسم کا ہو سکتا ہے؟ انہوں نے انصار کے درمیان دسیسہ کاری کی اور مختلف شیطانی حرکتوں کے ذریعہ ان کے درمیان تشکیک و تردّد کے بیج بوئے۔ اس کی ایک مشہور مثال یہ ہے کہ انہوں نے اوس و خزرج کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے سے بھائی کا سلوک کر رہے ہیں الفت اور پیار سے باہم گفتگو میں مصروف ہیں اور ان کا میل ملاپ قابلِ رشک ہے، اس سے وہ غیض و غضب کے مارے بھڑک اُٹھے۔ انہوں نے ان کے درمیان کچھ چالاک اور ماہر لوگوں کو بھیجا تاکہ نبیؐ کی آمد سے پہلے دونوں قبیلوں کے درمیان جو جنگ چل رہی تھی اس کا تذکرہ چھیڑ دے۔ چنانچہ اس نے جنگِ بعاث میں عربوں کے کارناموں کو بیان کرنا شروع کیا اور فریق فاتح کی شان میں قصیدہ خوانی کرنے لگا۔ اس سے دونوں فریق حرکت میں آ گئے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت سے لبریز ہو گئے، قریب تھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کا منہ نوچیں، رسول اکرمؐ کو اس کی اطلاع مل گئی۔ آپ بھاگے ہوئے آئے، انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا اور اس مکّار یہودی کے ارادوں کو طشت از بام کر دیا۔ اس پر وہ نادم ہوئے اور ہر فریق دوسرے سے مصافحہ و معانقہ کرنے لگا۔ اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝

(آل عمران: ۱۰۰)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم نے اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔

ان کی شیطانی تشکیک اور وسوسہ اندازی کی مثال یہ ہے کہ وہ ایک فریق کو نبیؐ کی خدمت میں بھیجتے کہ وہ ایمان لے آئیں اس سے مسلمانوں کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی، اور مدینہ میں یہ خبر گونج جاتی۔ پھر یہ ایمان لانے والے لوٹتے اور اعلان کرنے لگتے کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے دین کے مزاج کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، لیکن ہم نے اس رسول کی جھلک ان میں نہیں دیکھی جس کا تورات میں تذکرہ ہے اور ان کے قرآن میں ہمیں کچھ نظر نہ آیا ——

اس گھٹیا حرکت کے بعد وہ نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کرتے کہ وہ اپنے قدیم مذہب کی طرف لوٹنے پر مجبور ہیں جب تک نبی منتظر کی بعثت نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ اہل ایمان کا راستہ روکتے اور بہتیرے لوگوں کو شک و تذبذب میں ڈال دیتے تھے:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (آلِ عمران: ۹۹)

(اے اہلِ کتاب، یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ یہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم

خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) اس کے گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔)

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۚ (آل عمران: ۷۲)

(اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لے آؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔)

انہوں نے دین کے شعائر اور قرآن کی تعلیمات کا بھی مذاق اُڑانے سے دریغ نہ کیا تاکہ سادہ دل لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کر دیں کہ یہ دین کچھ نہیں ہے اس قرآن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ (بقرہ: ۲۴۵)

(تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تاکہ اللہ کئی گنا اسے بڑھا چڑھا کر واپس کر دے؟)

تو کسی یہودی نے اس آیت کا مذاق اُڑایا اور کہنے لگا: محمدؐ کا رب (نعوذ باللہ) محتاج اور فقیر ہے اور ہم سے قرض مانگ رہا۔ پھر وہ اس پر حاشیہ آرائی اور طول طویل بحثیں کرنے لگا تاکہ لوگوں کو باور کرا سکے کہ جو رب قرض کا محتاج ہے اس پر ایمان لانا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کو غصہ آیا اور انہوں نے اس یہودی کی پٹائی کر دی۔

اس نے رسول اللہ ؐ کی خدمت میں مقدمہ پیش کر دیا۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے شروع سے ساری داستان سنائی، تو وہ مکر گیا اور ذلیل اور پست طبیعت کے لوگوں کی طرح برات کرنے لگا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی:

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۤءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

(آل عمران: ۱۸۱)

(اللہ نے ان لوگوں کا قول سُنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذاب جہنم کا مزہ چکھو۔)

اسی طرح انہوں نے اذان، قبلہ کی تبدیلی اور دوسرے شعائر کا بھی مذاق اُڑایا:

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ

(مائدہ: ۵۸)

(جب تم نماز کے لئے مُنادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں۔)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ (بقرہ: ۱۴۲)

(نادان لوگ ضرور کہیں گے: انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رُخ

کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے ؟ -)

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ (نساء: ۱۴۰)

(اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سُنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور اُن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو۔)

اس طرح کی آیات قرآن پاک میں بے شمار ہیں :

اسی وجہ سے نئے دین کے ساتھ یہودیوں نے مندرجہ ذیل برتاؤ کیا :

۱ — اپنی آسمانی کتاب میں تحریف کر ڈالی اور نئے نبی اور اس کی تعلیمات کے متعلق ساری بشارتوں کو چھپا کر رکھا اور ان کا انکار کیا۔

۲ — اس دین کے پیروکاروں اور مددگاروں کے درمیان دسیسہ کاری کی اور انہیں شک و شُبہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔

۳ — اس دین کے شعائر اور قرآن کی آیات کا مذاق اُڑایا۔ اور بزدلوں کی دنارت اور کینہ پروروں کے غصہ وجلن کا مظاہرہ کیا۔

ان حقائق کو سمجھنے کے بعد ہم منطقی فہم سے آگے بڑھ کر قرآن کریم کا جذباتی اور قلبی فہم بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہودیوں کے سلسلے میں نبی اکرمؐ کا طرزِ عمل

(الف) احسن طریقے سے آپ نے ان سے بحث ومباحثہ کیا :

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖ (عنکبوت: ۴۶)

(اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے۔)

ایک طاقتور اور زیرک مسلمان پست طبیعت اور گھٹیا لوگوں سے ہمیشہ ہتھیار کے ذریعہ جنگ نہیں کرتا۔ نبیؐ تمام صبر آزما حالات پر صبر کرتے رہے اور احسن طریقہ ہی اختیار کیا۔ اگر آپ چاہتے تو دین کی خاطر ان سے انتقام لے سکتے تھے جبکہ آپ کے ہاتھ میں وہ قوت اور اقتدار بھی تھا جو اس سلسلہ میں معاون ثابت ہو سکتا تھا لیکن آپ نے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا اور مضبوط دلائل اور احسن طریقے سے ان سے گفتگو کرنے پر اکتفا کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں سے چند کو رسول اکرمؐ نے مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور کچھ لوگوں کو قتل بھی کروا دیا لیکن یہ سزا ان کی تحریف کتاب اور گزشتہ کارناموں کی وجہ سے نہیں دی گئی بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے رسول کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور بنو نضیر نے دھوکہ سے ایک ملاقات میں آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس فعل شنیع کا ارتکاب کر گزرے تھے جس سے اللہ نے اپنے نبی کو بچا لیا اور ان کا قصہ سورۂ حشر میں بیان کیا۔ اور بنو قریظہ نے غزوۂ خندق میں دھوکہ دیا اور انہوں نے وہ چال چلی جو اگر کامیاب ہو جاتی تو اس روئے زمین پر آج کوئی مسلمان نظر نہیں آتا۔ تاریخ کا دھارا بدلا ہوا تھا اور دنیا کی جو حالت آج ہم دیکھ رہے ہیں، اس سے یکسر مختلف ہوتی۔ ان کا یہ قصہ سیرت کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ قرآن نے اس کا ایک حصہ سورۂ احزاب میں نقل کیا ہے۔

اللہ کے رسولؐ یہود سے احسن طریقے پر ہی گفت گو کرتے تھے اور ذلت وچالبازی اور حسد وکینہ کے جو جرائم ان سے سرزد ہوتے تھے انہیں نظر انداز کر دیا کرتے تھے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (بقرہ: ۱۰۹)

(اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پلٹالے جائیں اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔)

(ب) انہیں تمام رسولوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی دعوت دی اس لئے کہ قرآن اپنے سے پہلے تمام انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے اور چونکہ یہ سارے انبیاء اللہ کی دعوت دیتے تھے، ان کا مقصد ایک تھا، اور ان کی کتابیں اصول و قواعد میں متفق تھیں اس لئے ان سب پر ایمان لانا اور جس نبی کا دور حاصل ہو جائے اس کی مدد کرنا واجب ہے اس لئے کہ یہ خود اللہ کی مدد کرنا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ

بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ۗ
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۗ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

(آل عمران : ۸۱)

(یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج میں نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمّہ داری اُٹھاتے ہو؟" انہوں نے کہا: "ہاں ہم اقرار کرتے ہیں" اللہ نے فرمایا: "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں")

یہ ایک خالص دعوت ہے جس کی طرف ایک داعی الی اللہ کو توجہ دلائی جائے تو اس پر خوش ہو جائے گا اور اس کے حاملین اور علمبرداروں کے لئے کوئی تنگی نہ محسوس کرے گا اللہ کی دعوت دینے والے تمام لوگ ایک ہی مقصد کی خاطر جہاد کرتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ذریعہ تقویت حاصل کرتے ہیں اور جب بھی میدان میں کوئی نیا گروہ آئے جو ہمارا کام کرے اور ہماری دعوت کا پرچم بلند کرے اور ہماری کتابوں میں اس کی شہادت بھی موجود ہو تو ہماری یہ ذمّہ داری ٹھہرتی ہے کہ ہم اس پر خوش ہوں اس لئے کہ وہ ہماری قوت میں اضافہ کا موجب ہے، لیکن جو لوگ اس سے کڑھیں اور اسے رُسوا کرنے کی ٹھان لیں وہ دراصل اپنی نفسانیت کے لئے کام کرتے ہیں ان کے اندر اللہ کے لئے خلوص نہیں ہوتا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہود

رسول اللہ سے کڑھتے تھے، حالانکہ آپ نے انہیں صرف اپنی کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دینے کے بجائے تمام انبیاء اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی۔ آخر اس میں کیا حرج تھا؟

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ

(مائدہ : ۵۹)

(ان سے کہو۔ "اے اہل کتاب، تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی۔)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ (مائدہ : ۶۸)

(صاف کہدو کہ" اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔)

اس وسیع و فراخ دعوت کے ساتھ ان کا رویہ بہت نازیبا اور غلط رہا۔ وہ نفس کی تنگی اور فطرت کی کمینگی کے سوا اور کسی چیز کا مظاہرہ نہ کر سکے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰھٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰی وَمَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۫ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾ (بقرہ: ۱۳۵، ۱۳۶)

(یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو "نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔" مسلمانو، کہو کہ "ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ۔ اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مُسلم ہیں۔")

رسول اکرمؐ اس عوامی دعوت کی تبلیغ و اشاعت اور وسیع و فراخ انسانیت کے اندر اس کی تخم ریزی میں برابر لگے رہے یہاں تک کہ حق غالب ہو گیا اور اللہ کا فیصلہ ان کی ناپسندیدگی کے باوجود نافذ ہو کر رہا۔ یہ وہ طرزِ عمل ہے جس میں گرد و غبار کے ایک ذرے کی بھی آمیزش نہیں ہے، اس شخص کا طرزِ عمل ہے جس کا ایمان پہاڑ کی طرح مضبوط تھا اور جسے اپنے رب کے وعدے پر مکمل بھروسہ تھا۔

(ج) اللہ نے ان پر جو نعمتیں نازل کی تھیں اور جس فضل و عنایت سے انہیں نوازا تھا، ان کی یاد دہانی کرائی:

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾ ...... وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ

اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ (بقرہ : ۴۷، ۴۹، ۵۰)

(اے بنی اسرائیل، یاد کرو میری اُس نصیحت کو، جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی، انہوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہارے لئے راستہ بنایا پھر اس سے تمہیں بخیریت گزروا دیا پھر وہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى

(بقرہ : ۵۷)

(ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تمہارے لئے من وسلویٰ کی غذا فراہم کی۔)

یہ وہ اسلوب ہے جسے اپنے بدترین دشمن پر بھی آزمائیں گے تو وہ نرم پڑ جائے گا لیکن کینہ پرور، حاسد اور انانیت کا غلام صرف یہی چاہتا ہے کہ پوری روئے زمین کی خوشحالی تنہا اسی کے حصہ میں آجائے۔

ضروری تھا کہ ان پر حملہ کیا جائے، ان کی ذلت ورسوائی کا پردہ بے نقاب کیا جائے،

ان کے اسرار فاش کیے جاتے لیکن یہ حملہ عادلانہ ہونا چاہیے تھا جس میں حقائق کو ثابت کیا جاتا، تحریف و ترمیم کے ان کے سارے جرائم بے نقاب کیے جاتے، ماضی میں انبیاء کے ساتھ ان کے اسلاف کا طرز عمل نمایاں کیا جاتا، موسیٰؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک ان کی ساری کارگزاریاں سامنے لائی جاتیں، اللہ کی آیات کا جو انکار اور اس کے ساتھ جو دشمنی اور عناد روا رکھا تھا اور بعض انبیاء کی تکذیب اور قتل کا جو شنیع کام انہوں نے کیا تھا، ان سب سے پردہ اٹھایا جاتا تاکہ لوگ ان سے دھوکہ نہ کھائیں اور دیکھ لیں کہ آج قرآن کے ساتھ انہوں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے وہ در حقیقت ان کے طویل ماضی کی ایک کڑی ہے اور یہ جرائم انہیں قدیم زمانے سے وراثت میں ملتے آ رہے ہیں۔ اور یہ ساری حقیقتیں اس کے باوجود ان کی کتاب تورات میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔

آپ اس حملے کی عدالت اور انصاف پر اس وقت یقین کر لیں گے جب آپ دیکھیں گے کہ وہ ساری دستاویزات اور حالات کیا ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور حقائق و واقعاتی باتیں کون سی ہیں جو قرآن میں موجود ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (آل عمران: ٣٣)

(اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے لیے منتخب کیا تھا۔)

اور ان کے بارے میں کہتا ہے:

وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (الدخان: ٣٢)

(اور اُن کی حالت جانتے ہوئے ان کی دوسری قوموں پر ترجیح دی۔)

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ ان قدیم انبیار کی بہت سی تعلیمات کو انہوں نے مسخ کر دیا جس کی پاداش میں انہیں اللہ نے خنزیر اور بندر بنا دیا لیکن آج ان کے اندر کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو عدل و راستی کی روش پر قائم ہیں:

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۱۳،۱۱۴)

(اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں یہ صالح لوگ ہیں۔)

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝

(مائدہ: ۶۶)

(اگرچہ ان میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔)

اللہ کے رسولؐ اسی عادلانہ پالیسی پر گامزن تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ یہ لوگ قرآن پر ایمان لے آئیں۔ لیکن اللہ نے یہ کہہ کر ان کے سلسلے میں تمام اُمیدیں منقطع کر دیں کہ:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ

مِلَّتَهُمْ (بقرہ : ۱۲۰)

(یہود اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔)

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ (بقرہ : ۱۴۵)

(تم اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے لگیں۔)

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ : ۷۵)

(اب کیا تم اِن سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ اِن میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سُنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر اس میں دانستہ تحریف کی۔)

مدنی سورتوں میں اس محاذ کے تمام واقعات کو تلاش کیا جا سکتا ہے جس پر رسولِ اکرم نے یہود سے جنگ کی خاص طور سے سورہ بقرہ، آلِ عمران اور مائدہ میں ان کو اکٹھا کرنا آسان ہے، اگزشتہ سطروں سے اس معرکہ کو سر کرنے کے لئے ان ابتدائی خطوط کو طے کیا جا سکتا ہے جو ہمیں یہود کے بارے میں قرآنی آیات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور یہ خطوط ہمیں ایک داعئ دین کا فہم دیتے ہیں جو اپنے جذبات و احساسات کو قرآن کریم کے واقعات سے مربوط کر دینا چاہتا ہے میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ تفسیر ابن کثیر اس سلسلہ میں کافی مددگار ثابت ہو سکتی ہے وہ ان ابتدائی خطوط کی معرفت فراہم کرتی ہے جو آپ کو

اس معرکہ کی فضا میں زندگی بسر کرنے پر مدد دیتے ہیں گویا آپ ان معرکوں کو دیکھ رہے ہیں یا سُن رہے ہیں اس لئے قرآنی رُوح کو قارئین کے دلوں تک پہنچانے میں اس تفسیر کا بڑا رول رہا ہے اور اس کے مطالعہ سے داعی ان گوناگوں کشمکشوں اور مزاحمتوں سے گزرتا ہے جن سے وہ اپنی دعوت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

مُنافقوں کا محاذ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت وہاں عبد اللہ بن اُبَیّ کی تاجپوشی کی تیاریاں ہو رہی تھیں لیکن آپؐ کی آمد کے بعد ماحول کا رنگ بدل گیا اور اس شخص کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے اپنے انصار و اتباع کی محفل میں طے کیا کہ حالات کو تبدیل کرنا ہے اور رسولِ اکرم ص کے خلاف فتنوں کی آگ بھڑکانی ہے لیکن اللہ نے اپنے سپاہیوں کی مدد کی، اور اپنے دین کو تقویت بخشی وہ لوگ جنگِ بدر ہی سے سازش میں مصروف ہو گئے اور طے کیا کہ اب معاملہ کافی غور طلب ہو گیا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے ہیں اور رسول کی سمع و طاعت اور محبّت کا اعلان کر رہے ہیں تو انہوں نے تنہا رہنا مناسب نہ سمجھا اور ظاہری طور سے اسلام میں داخل ہو گئے لیکن ان کے دل انکار اور مخالفت پر اسی طرح اڑے رہے۔ یہ لوگ یہود اور دوسرے دشمنانِ اسلام کے جاسوسی کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ نے منافقوں کی سازش سے آپ کو باخبر کر دیا اور عمومی انداز میں اس کی اطلاع دے دی تاکہ ہوشیار رہیں:

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ

مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ

(توبہ : ۱۰۱)

(تمہارے گردوپیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہوگئے ہیں تم انہیں نہیں جانتے۔ ہم ان کو جانتے ہیں)

پھر مزید ان سے واقفیت بہم پہنچائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ۞ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِىْ لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۞

(محمد : ۲۹، ۳۰)

(کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھادیں اور اُن کے چہروں سے تم اُن کو پہچان لو مگر ان کے اندازِ کلام سے تو انہیں جان ہی لوگے اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔)

ہم مکہ میں مشرکین کا اور مدینہ میں یہود کا طرزِ عمل دیکھ چکے ہیں۔ اب ان لوگوں کا موقف باقی بچتا ہے جو بلاشبہ ان تینوں میں سب سے حقیر، سب سے زیادہ کینہ فطرت اور خبیث الطبیعت تھے۔ مردانگی کو ختم کرنے والی کوئی آفت نفاق سے بڑھ کر خطرناک نہیں، اسی لئے قرآن کا فیصلہ ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ

تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝ (نساء : ۱۴۵)

(یقین جانو کہ منافق جہنّم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔)

اس منافقانہ جنگ کے اسالیب کی تلخیص مندرجہ ذیل نکات میں بیان کی جاسکتی ہے:

(الف) جنگوں میں مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کرنا:

یہ منافقین دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مہارت اور عمدگی کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں کیونکہ وہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، نبیؐ سے اخلاص کا مظاہرہ کر چکے ہیں اور لوگوں پر اپنی پارسائی اور دیانت داری کا سکہ بٹھا دیا ہے حتیٰ کہ عمرؓ جیسے لوگ ان میں سے اکثر کے بارے میں تقویٰ اور پرہیز گاری کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہ "بزرگ دین دار" میدانِ جہاد میں نکلنے سے کتراتے ہیں یا گھروں میں بیٹھ رہنے کی اجازت حاصل کر لیتے ہیں۔ جب عوام انہیں دیکھتے ہیں تو ان کی اقتدار اور پیروی میں وہ بھی کترانے لگتے ہیں اور اس طرح اپنے ساتھ بیٹھ رہنے والوں کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگ گھروں میں بیٹھے رہ جاتے ہیں اور کچھ ان کے مشوروں کی مخالفت کرتے ہوئے میدانِ جہاد میں نکل جاتے ہیں۔ اگر کوئی میدانِ جہاد میں شہید ہو جاتا ہے تو یہ لوگ تبصرہ کرتے ہیں:

لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (آل عمران : ۱۶۸)

("اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔" ان سے کہو، اگر تم اپنے

اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے اسے ٹال کر دکھا دینا۔)

بعض منافقین میدانِ جہاد کے لئے نکلتے تھے لیکن راستے ہی سے لوٹ آتے تھے اور کہتے تھے: بخدا ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس بنیاد پر خودکشی کر لیں؟ کوئی منافق لوٹتا تو اس کے ساتھ فوج کا ایک بڑا حصہ لوٹ آتا جیسا کہ جنگِ اُحد میں ہوا۔ اگر یہ لوگ راستے سے واپس نہ ہوتے تو طرح طرح کی فتنہ پردازیاں کرتے اور فوج میں ایک دوسرے کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کی رُوح سرایت کرنے کی کوشش کرتے جیسا کہ غزوۂ تبوک میں ہوا۔ کسی نے کہا: یہ شخص روم کے محلات اور اس کے قلعوں کی فتح یابی کے خواب دیکھتا ہے افسوس ہے اس پر! دوسرے نے کہا: کیا تم لوگوں نے رومیوں کی جنگوں کو عربوں کی خانہ جنگی سمجھ لی ہے؟ بخدا کل ہم بھی تمہارے ساتھ رسیوں میں جکڑے نظر آئیں گے! کتنا صحیح تبصرہ ہے قرآن کا:

لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ (توبہ : ۴۷)

(اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے۔)

(ب) مسلمانوں کے درمیان زخم کاری کرنے اور ان کی صفوں میں فتنہ پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ غزوہ بنو مصطلق میں دو غلام پانی کے لئے جھگڑ پڑے ان میں، ایک مہاجر کا تھا دوسرا انصاری کا۔ مہاجر کے غلام نے مہاجرین کی دہائی دی اور انصار کے غلام نے انصار کو فریاد کے لئے پکارا۔ منافقوں کے سردار عبد اللہ بن ابی نے سن لیا اس نے اس موقع کو ہاتھ سے

نہ جانے دیا۔ پکار اٹھا : ان لوگوں نے ہمارے ملک میں فتنہ میں برپا کر رکھا ہے بخدا ہماری اوران قریشیوں کی مثال بالکل وہی ہے جو کسی کہنے والے نے کہی ہے کہ اپنے کتے کو موٹا کرو، وہ تمہیں کاٹ کھائے گا۔ پھر وہ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا : یہ مصیبت تم لوگوں کی ہی لائی ہوئی ہے تم نے انہیں اپنے ملک میں گھسنے کی اجازت دی اور اپنے مال ان میں تقسیم کردیئے بخدا اگر تم اپنے ہاتھ ان سے روک لیتے تو تمہیں چھوڑ کر کسی اور ملک میں جا بستے۔

لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ

(منافقون : ۸)

(ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔)

اس شخص نے انصار اور مہاجرین کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکانی چاہی لیکن اللہ نے اس کے حوصلے پست کردیئے اور رسولِ اکرمؐ کی ماہرانہ اسکیم کے ذریعہ اپنی فوج کے اندر تفرقہ اندازی کی روک تھام کردی جس کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

(ج) پیغمبرِ اسلام اور آپ کے صحابہ کا مذاق اڑا کر اور ان کے سلسلے میں بے سرو پا داستانیں پھیلا کر کارِ رسالت کی شان گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ عبداللہ بن ابی ہی تھا جس نے حدیث افک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ منافقین کی طرف سے بالواسطہ اسلام پر ایک زبردست حملہ تھا کیونکہ اگر

حضرت عائشہؓ، ان کے والد اور خاندان کے بارے میں لوگوں کو شک ہو جاتا اور نبی اکرمؐ کی حیثیت مشتبہ ہو جاتی جو ان کے خیال میں ایک زانیہ عورت کو رکھے ہوئے تھے (نعوذ باللہ) تو نبی اکرمؐ اور اسلام کے قائدین کی جرأت و بے باکی اور بلندی جاتی رہتی۔ یہ چہ میگوئی اتنی بڑھی کہ پورا ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، بہتیرے مسلمان اس میں ملوث ہو گئے اور قریب تھا کہ اوس وخزرج کے تنازعہ سے ایک دردناک حادثہ وجود میں آجائے کہ رسول اکرمؐ نے حکمت سے کام لیا اور اس شر کا استیصال کر دیا۔ سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل اور رسول اکرمؐ کی حکمت وتدبیر درج ہے۔

یہ لوگ استہزائیہ انداز میں متقی مومنوں کے اندر نقص نکالتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے صالحین قُراء کے سلسلے میں کہا: ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ ہمارے قُراء ہم میں سب سے زیادہ پیٹو، جھوٹے اور جنگ کے موقع پر بزدلی دکھانے والے ہیں۔ جب رسول اکرمؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو غضبناک ہو گئے اور وہ شخص معذرت کرنے لگا کہ ہم تو محض مذاق کر رہے تھے۔

یہ لوگ نبی کے بارے میں کہتے کہ یہ شخص کان کا کچا ہے، جو شخص کوئی بات کہہ دے تصدیق کر دیتا ہے اور اس کے برعکس کوئی کہہ دے تو بھی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔

یہ لوگ صدقہ دینے والے رضاکار مسلمانوں کا مذاق اڑاتے اگر کوئی بھاری رقم دیتا تو اس پر ریا کا لیبل چسپاں کر دیتے اور جو سخت محنت کے باوجود تھوڑی سی رقم صدقہ کر پاتا تو اس کا استہزاء کرتے۔ وہ یہ سب کرتے اور پھر بھی مسلمانوں میں شمار ہوتے۔ کوئی ان کی اسلامیت کا انکار نہ کر سکتا تھا اس لئے کہ وہ اپنی زبانوں سے

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہتے تھے اور اس شہادت کے پردے میں سارے جرائم کرتے تھے ، جب مؤاخذہ ہوتا تو معذرت کر دیتے یا انکار کر دیتے اور قسمیں کھانے لگتے۔

(د) رسول اللہ اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لئے یہود اور مشرکین و نصاریٰ سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے۔ اور ان تعلقات کے قصے سیرت و تفسیر کی کتابوں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ یہاں ہم ابو عامر راہب گروہ کے منافقین کی ایک مثال نقل کر رہے ہیں، یہ شخص نبیؐ کے خلاف مدد لینے کے لئے قیصرِ روم کے پاس پہنچا اور اس نے اس سے وعدہ کر لیا اور اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ وہیں سے اس نے اپنے منافق ساتھیوں کو لکھا کہ عنقریب وہ ایک لشکرِ جرار لے کر رسول اللہ سے جنگ کرنے آ رہا ہے۔ جو انہیں شکست فاش دے گا اور ان کی مٹی پلید کر دے گا اور اس نے انہیں حکم دیا کہ کسی الگ تھلگ جگہ پر کوئی جائے پناہ بنائیں جہاں سے خط و کتابت جاری رہ سکے اور جو حملہ کے وقت گھات اور کمین گاہ کا کام دے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک مسجد بنائی جسے بعد میں مسجد ضرار کا نام دیا گیا، اسی مسجد کے بارے میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنٰى ۚ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ۝ (توبہ : ۱۰۷)

(کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لئے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہل ایمان

میں پھوٹ ڈالیں اور (اسی بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لئے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول سے برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔)

نبی اکرمؐ نے اس گروہ کے ساتھ جو موقف اختیار کیا اسے کوئی دوسرا نہیں اپنا سکتا:

(الف) آپ ان کے دل کی باتیں اللہ کے حوالے کرتے اور ان کے ظاہر کو سامنے رکھ کر ان سے معاملہ کرتے۔ ایک منافق اپنے نفاق سے توبہ کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں آیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ، ایمان میری زبان پر ہے اور نفاق میرے دل میں ہے اور میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا:

"اے اللہ تو اسے ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل دے اور میری محبت اور مجھ سے محبت کرنے والوں کی محبت اس کے دل میں ڈال دے اور اس کا انجام خیر پر کرے۔"

اس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول، میرے اور منافق ساتھی ہیں، میں ان کا سردار تھا تو کیا میں انہیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو جاؤں؟ آپ نے فرمایا:

"جو ہمارے پاس آئے گا، ہم اس کے لئے مغفرت کی دعا کر دیں گے اور جو اڑا رہے گا تو اللہ اس سے خود نمٹے گا اور تم ہرگز کسی کا پردہ نہ چاک کرو۔"

(ب) ان کی سازشوں اور چالوں سے چوکنا رہتے اور جب اللہ تعالیٰ ان کی کسی سازش اور مکاری سے باخبر کر دیتا تو اپنے کسی صحابی کو بلاتے اور اس سے کہتے: ان لوگوں کے پاس جاؤ کیونکہ یہ لوگ جل چکے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ انہوں نے کس طرح کی باتیں کہی ہیں

اگر یہ انکار کریں تو انہیں بتادو کہ انہوں نے فلاں فلاں باتیں کہی ہیں۔ جیسا کہ غزوۂ تبوک میں ہوا جب انہوں نے مسلمانوں کو روم سے دھمکانے کی کوشش کی۔

(ج) انہیں آپ بتا دیتے تھے کہ یہ چشم پوشی اور اعراض غفلت اور بلادت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک دور اندیش اور ذہین شخص کی چشم پوشی ہے۔ کبھی کبھی آپ اس طرح کی باتیں کہہ دیتے جس سے ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ وہ مخلص مسلمانوں کی طرح کھل کر بات نہیں کرتے تھے:

فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِىْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۚ (محمد: ۳۰)

(اور ان کے چہروں سے تم انہیں پہچان لو مگر ان کے اندازِ کلام سے تو تم ان کو جان ہی لوگے۔)

اور ان کی حالت اطاعت گزار مسلمانوں سے یکسر مختلف ہوتی:

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً (توبہ: ۴۶)

(اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاریاں کرتے۔)

لیکن انہوں نے اس طرح کی کوئی تیاری نہیں کی جس طرح دوسروں نے کی۔ چنانچہ منافقین کی علامت یہ بن گئی کہ وہ جنگ کے لئے تیاریاں نہ کرتے تھے بس جھوٹے عذرات پر اکتفا کر لیتے تھے۔ بلکہ خود معذرت طلبی ان کی ممتاز اور نمایاں صفت قرار پائی:

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ (توبہ: ۴۵)

(درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دلوں میں شک ہے۔)

(د) ان کی بزدلی اور کمینگی کو کھول کر بیان کر دیا:

وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَجَٰهِدُوا۟ مَعَ رَسُولِهِ ٱسْتَـْٔذَنَكَ أُو۟لُوا۟ ٱلطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا۟ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ ٱلْقَٰعِدِينَ ۝ رَضُوا۟ بِأَن يَكُونُوا۟ مَعَ ٱلْخَوَالِفِ

(توبہ: ۸۶، ۸۷)

(جب کوئی سورہ اس مضمون کی نازل ہوتی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انہیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں)

فَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا ٱلْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ ٱلْمَغْشِىِّ عَلَيْهِ مِنَ ٱلْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ

(محمد: ۲۰، ۲۱)

(مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو افسوس ان کے حال پر (ان کی زبان پر ہے) اطاعت کا اقرار اور اچھی اچھی باتیں۔)

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا۟ تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ (منافقون: ۴)

(انہیں دیکھو تو ان کے جُثّے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں بولیں تو تم ان کی باتیں سُنتے رہ جاؤ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں۔)

ہر منصف دیکھ سکتا ہے کہ محض ان کی حقیقت اور اوصاف بیان کرنے پر قرآن کا اکتفا کرنا ہی عادلانہ موقف ہے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کن خائن اور پوشیدہ لوگوں پر یہ صفات منطبق ہوتی ہیں حتیٰ کہ اگر دورِ جدید کی کسی تحریک میں یہ منافقین ہوتے تو ان صفات کی روشنی میں ان کا پردہ فاش کیا جاسکتا تھا۔

اس محاذ کی خاص بات یہ تھی کہ منافقین اسلامی فوج کے اندر معنوی اقدار کو کمزور کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کام کر رہے تھے اور رسالت کی شان کو گھٹانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اس کی اہمیت کم ہو جائے اور اسلام کا کام تمام کرنے کے لئے داخلی و خارجی دشمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے اور رسول اکرمؐ ان کے ظاہر کو قبول کر لیتے تھے اور دل کی باتوں کو اللہ کے حوالے کر دیتے تھے۔

ان کے جرائم اور سازشوں سے چوکنا رہتے تھے اور انہیں اس سے خبردار کرتے تھے۔

اپنی فطانت سے ان کے نفاق سے آگاہ ہو کر انہیں اس سے ہوشیار کر دیتے تھے۔

اور انہیں اس سے زیادہ تکلیف نہ پہنچاتے تھے کہ ان کی بزدلی اور پست ہمتی کو کھول کھول کر بیان کر دیتے تھے لیکن اشخاص کو کبھی نشانہ نہ بناتے تھے۔

اتنی تلخیص سے داعیٔ دین کو شاید ان قرآنی حصّوں کو سمجھنے میں آسانی ہو جو منافقین

کے بارے میں نازل ہوئے ہیں خاص طور سے مدنی سورتیں اور وہ بھی سورۂ بقرہ کا آغاز اور سورۂ نساء، توبہ، محمد اور منافقون۔

مشرکین کا محاذ

یہاں تو تیر و تفنگ اور تلوار کی لڑائی ہے اور خوں ریز معرکے ہوئے ہیں لیکن قرآن اس کا اندراج مورخین کے انداز میں کرتا ہے نہ میدان جنگ میں موجود نامہ نگاروں کی طرح داستان سرائی کرتا ہے۔ بلکہ اس کے بیان کرنے کا ایک عجیب اور انوکھا انداز ہے وہ آپ کے سامنے فوج کی باتیں، جنگوں کے قصے اور آدمیوں کی گفتگوؤں کا وہی حصہ پیش کرتا ہے جو واقعی اندراج اور رجسٹریشن کے لائق ہوتے ہیں یہ انداز حادثات و مقالات کے بیچ سے حرب کے قوانین، قتال کے احکام اور جہاد کے آداب بھی بیان کر دیتا ہے چنانچہ جب آپ ان سورتوں کو پڑھتے ہیں تو حیرت انگیز فتح کا منظر سامنے آجاتا ہے جو جنگی ماہرین کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا اور بلند و پاکیزہ بیع اور خدائے ذوالجلال کے ہاں باعزت مقام کے حصول کی خواہش موجیں مارنے لگتی ہے —

حیرت انگیز وہ شکل ہے جس سے قانون وجود میں آتا ہے اور بلند و بالا عزائم ہی وہ پیمانے ہیں جو حیرت انگیز فوائد اور نتائج ظہور میں لاتے ہیں اس لئے یہ ایک ایسی مردانگی اور شجاعت ہے جو قانون پر قائم ہے اور قانون خود اپنے آپ کو شجاعت کی خبروں کے درمیان سے آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہے اس لئے اگر آپ یہ کہیں کہ قانون کا راز اس میں ہے کہ قوم کچھ نہیں تھی اور پھر سورما بن گئی تو صحیح کہیں گے اور اگر یہ کہیں کہ قوم نے اپنے اعمال کے ذریعہ ان قوانین کو زندہ شکل دے دی تو یہ بھی غلط نہ ہوگا۔

قرآن کے سامنے دونوں ہی چیزیں ہیں ایک طرف وہ قوانین کی فضیلت بتاتا ہے تاکہ ہمتیں ان تک بلند ہوں اور دوسری طرف مومنین کے اعمال کی تعریف کرتا ہے تاکہ جو اس طریقہ پر چلنا چاہے اس کے لئے وہ نمونہ کا کام دے سکیں۔

قرآن نے قوانین جنگ اور آدابِ قتال پر جو گفتگو کی ہے اسے بیان کرنا پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ یہاں تو رسولِ اکرم ص کے مدنی جہاد کی ایک جھلک پیش کرنا مقصود ہے اور مقام یہاں اختصار کا متقاضی ہے کہ ہم جہادِ رسول کے تیسرے محاذ پر گفتگو کر رہے ہیں:

ا۔ اس قانون کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ جنگ اللہ کی راہ میں ہو۔ اور مسلمانوں نے اس دفعہ کو پڑھا اور سمجھا تھا اور اس کی بھرپور رعایت رکھی تھی۔ اس لئے کہ ان کے قلوب نے اس کا احاطہ کر لیا تھا اور اس پر کما حقہٗ ایمان لائے تھے۔

ہم یہاں جہاد فی سبیل اللہ کے تین مقاصد بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

پہلا مقصد

عقیدۂ اسلامی کی نشر و اشاعت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

(انفال: ۳۹)

(ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔)

دوسرا مقصد

وطن کو آزاد کرانا اور کمزوروں اور مظلوموں کو غیر ملکی اقتدار کی ذلت سے رہائی

دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ۝

(نساء: ۷۵)

(آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔)

تیسرا مقصد

اُن غداروں کی سرکوبی ہے جو اپنے عہد و پیمان سے پھر گئے ہوں اور معاہدہ فسخ کر دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (توبہ: ۱۳)

(کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے ملک سے رسول کو نکالنے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے۔)

یہ آیت مشرکین قریش کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے رسول اللہ سے کئے ہوئے حدیبیہ کے معاہدے کو توڑ دیا تھا:

۲ — اس مُبارک قانون کی دوسری دفعہ جنگ کرنے والے پر یہ واجب کرتی ہے کہ وہ اپنا اجر بس اللہ ہی سے متوقع رکھے :

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۚ (نساء : ۷۴)

(اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں۔)

لیکن جو لوگ آخرت کی زندگی کو دُنیا پر فروخت کر دیتے ہیں وہ اس دفعہ کے مخاطب نہیں ہیں۔

جن لوگوں کے لئے اس نے فتح و نصرت لکھ دی ہے ان کے لئے اسی دُنیا میں اللہ کا انعام رکھا ہوا ہے اور آخرت میں تو تمام لڑنے والوں کے لئے اجرِ عظیم ہے :

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا ۝ (نساء ۷۴)

(اور جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۚ

(توبہ : ۵۲)

(ان سے کہو " تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔)

یہاں حُسْنَيَيْنِ سے مُراد دُنیا میں حق کا غلبہ اور شہادت کا اجر ہے

اگر شہید ہو جائے۔ اس مناسبت سے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک غلطی کی طرف نشاندہی کر دی جائے جس میں بعض لوگ حسن نیت کے باوجود مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ لوگ حُسۡنَیَیۡنِ سے مراد فتح کے وقت مالِ غنیمت اور شہادت کے وقت اجرِ عظیم لیتے ہیں۔ غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان فوجی محض احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے جنگ کرتا ہے، دُنیوی مال و متاع کے لئے نہیں، اور یہ عظیم و بلند مقصد ایمان کے میزان میں ہر دُنیوی مال سے وزنی اور قیمتی ہے چاہے پوری روئے زمین کے برابر سونا مل جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شہادت کے اجر کے مقابلے میں مالِ غنیمت رکھتے ہوئے عقل و بصیرت بھی ابا کرتی ہے کہاں یہ مالِ غنیمت جسے اللہ متاعِ قلیل کہتا ہے اور کہاں شہادت کا بلند مرتبہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ ۚ (نساء: ۷۷)

(ان سے کہو، دُنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے۔)

بھلا بتایئے متاعِ دُنیا کے مالِ غنیمت کی کیا حیثیت ہے اور شہادت کے عظیم اور بے مثال اجر کا کتنا وزن ہے؟ اس کے بعد اپنے ضمیر سے پوچھئے کہ کیا وہ مالِ غنیمت کو شہادت کے پلڑے کے مقابلے میں دوسرے پلڑے میں رکھنے کے لئے تیار ہے؟۔

مومن کا ضمیر تو اس بات پر مطمئن ہو گا کہ وہ ایک اچھائی حق کی بلندی اور دین کی فتح ہے اور یہ اللہ کے اس قول کے مطابق ہے:

وَمَنۡ يُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيُقۡتَلۡ اَوۡ يَغۡلِبۡ فَسَوۡفَ

نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (نساء : ۷۴)

(اور جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔)

تو کیا اللہ مالِ غنیمت کو اجرِ عظیم کہہ رہا ہے حالانکہ وہ متاعِ دُنیا کو قلیل کہہ چکا ہے ؟

پھر یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ مسلمان درہم و دینار کے غلام نہیں ہوتے، وہ شمشیر بکف ہوتے ہیں اور ان کے دل سینوں میں ہوتے ہیں جو صرف اللہ کا نعرہ بلند کرتے اور اسی کے ثواب کے منتظر ہوتے ہیں اگر ان کے ہاتھ مالِ غنیمت لگ جاتا ہے تو اسے اللہ کی دولت سمجھتے ہیں جس سے اس نے اپنے دشمنوں کو بے دخل کر دیا ہے اس لئے وہ اس کے زیادہ حقدار ہوتے ہیں اور وہ دولت ان کے لئے جائز ہوتی ہے۔

۳ — تیسری دفعہ یہ بتاتی ہے کہ تائید و نصرت کا سرچشمہ جس سے وہ جنگ میں ہمکنار ہوتے ہیں، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے کسی مخلوق کے پاس ذاتی قوت نہیں ہوتی اِلّا یہ کہ وہ خدا سے مستفاد ہوتی ہے اور اللہ نے اپنی ذات کو قوی کہا ہے اور یہ کہ وہ مضبوط و مستحکم قوت والا ہے، اپنے بندوں پر غالب ہے، اس کے سوا کسی کے پاس طاقت نہیں :

لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۝ (کہف : ۳۹) (زور صرف اللہ کا ہے۔)

جب مسلمان کسی کو مارنے کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھاتا ہے تو وہ اسے اللہ کی طاقت کے ذریعہ حرکت میں لاتا ہے، اپنی قوت کے ذریعہ نہیں :

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيكُمْ (توبہ : ۱۴)

(ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دلوائے گا۔)

مسلمانوں نے کتنے ہی سورما تہ تیغ کر دیئے اور کتنے ہی بہادروں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیا لیکن اللہ کا حکیمانہ قول یوں تبصرہ کرتا ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص (انفال: ۱۷)

(تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا۔)

ایک شخص اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں آتا ہے اور کہتا ہے: اے اللہ کے رسولؐ دشمنوں نے آپ کے خلاف ہتھیار اور فوجیں جمع کر رکھی ہیں اور مجھے آپ کے مستقبل کے بارے میں اندیشہ ہے۔ آپؐ نے عرش الٰہی کی طرف نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ قوت باجبروت ہے مقتدر ہے اگر آسمانوں اور زمین کی طرف متوجہ ہو جائے تو سب کو نیست و نابود کر دے، اس سے آپ کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور فرمایا: ہمارے لئے اللہ کافی ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (آل عمران: ۱۷۳)

(جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، اُن سے ڈرو"، تو یہ سُن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے"۔)

اس طرح کی باتیں ان لوگوں کی طرف سے تعجب خیز نہیں ہیں جنہیں اللہ نے یہ تعلیم دی ہو کہ:

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝ (الملک: ۲۰)

(بتاؤ، آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔)

بعض مسلمانوں کے دلوں میں بھول سے کبر و غرور کا شائبہ آجاتا تھا اور اپنی کثرت تعداد پر نازاں ہو جاتے تھے لیکن اللہ فوراً ہی ایسی صورتِ حال پیدا کر دیتا کہ وہ قانونِ الٰہی کی حقیقت کی طرف پلٹ جاتے:

وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ (توبہ: ۲۵)

(ابھی غزوہ حنین کے روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔)

۴۔ اس مقدس جنگی دستور کی چوتھی دفعہ یہ تھی کہ نصرتِ الٰہی کوئی ہدیہ میں دینے والی چیز نہیں ہے جو یوں ہی کسی کو نواز دی جائے بلکہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ آدمی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے عملی طور سے اُٹھ کھڑا ہو:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (محمد: ۷)

(اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا)

جو شخص اللہ سے جھوٹی توقعات باندھے رہے اور اپنے گھر میں نصرتِ الٰہی کے انتظار میں بیٹھ رہے تو وہ ناکام و نامراد بنانے والی غفلت کا شکار رہے اور بے فائدہ پوری عمر گنوا دے گا۔

اس دفعہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ ہم پوری طاقت سے اُٹھ کھڑے ہوں اور تمام ممکنہ اسباب ووسائل اختیار کریں اور ہم اللہ کے حضور یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنی پوری قوت اور صلاحیت۔ تیری راہ میں لگادی تھی چاہے وہ مقدار میں بہت قلیل ہو، یہی نصرتِ الٰہی کی واحد کلید ہے اور وہ راز ہے جس سے آسمان وزمین کی تمام الٰہی فوجیں حرکت میں آتی ہیں۔

یاد رکھئے۔ قرآن کی ایسی بے شمار آیات ہیں جو ان قوانین کے اردگرد گھومتی ہیں اور ان سے قریبی یا دور کا تعلق رکھتی ہیں اور ان کی خوب اچھی طرح تشریح کر دیتی ہیں اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ میں ہر دفعہ پر کافی وشافی گفت گو کروں تو اسے ایسا سوچنے سے باز رہنا چاہیے۔ یہاں تو چند مختصر اشارات ہیں اگر ہم تمام آیات کو بیان کریں تو گفت گو بڑی طویل ہو جائے گی۔ اس لئے اس سے آگاہ رہیئے اللہ آپ کے ساتھ ہے۔

میں پھر یہ دوہرانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم اس سلسلے میں فوجیوں کی خبریں اور لشکروں کی حرکات وسکنات بیان نہیں کرتا بلکہ وہ ان قوانین کو بیان کرتا ہے، مجاہدین کے ان اقوال واعمال کا ذکر کرتا ہے جو اس کے مطابق ہوتے ہیں اور اس کے اسرار ورموز کی علمی تفسیر اور اس کے وعدوں کی صحت کے واقعاتی تجربے ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو ذہن نشین رکھنا ناگزیر ہے جبکہ ہم جہاد فی سبیل اللہ کے اس خوں ریز معرکہ کو پڑھنے جا رہے ہوں، اس وقت آیات پہلے کے مقابلے میں زیادہ فصاحت ووضاحت سے اس کے مخفی گوشوں کی طرف اشارہ کریں گی۔

ان باتوں کو سامنے رکھ کر بدر، بنو نضیر، اُحد، خندق، بنو قریظہ، حدیبیہ اور تبوک کی جنگیں، آلِ عمران، انفال، توبہ، احزاب، فتح، حشر کی سورتوں میں پڑھئے یہ سب

مدنی سورتیں ہیں، ہم نے جن چیزوں کی طرف اوپر اشارہ کیا ہے وہ آپ انشاء اللہ پڑھنے کے دوران محسوس کریں گے بشرطیکہ آپ اسے منارۂ نور بنالیں جس سے اپنی تربیت اور جہاد میں رہنمائی حاصل کریں۔

قرآن میں معاشرے کی تشکیل کی بنیادیں

تیسری نصیحت

ہم قرآن کو اس طرح پڑھیں کہ وہ ایک بااخلاق معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا ہے یا کامل نمونے کی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے اور ضروری ہے کہ اس تعمیر کا مواد اس کی واضح آیات میں درج ذیل طریقے سے تلاش کریں:

۱۔ وہ تعلیمات کیا ہیں جنہیں قرآن فرد کو دیتا ہے تاکہ وہ اس سوسائٹی کا ایک بارآور رُکن بن سکے؟

۲۔ وہ اجتماعی اصول اور جذباتی وقلبی رشتے کیا ہیں جنہیں وہ جماعتوں کے لئے متعین کرتا ہے تاکہ وہ نیکی اور خدا ترسی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرسکیں؟

۳۔ وہ قواعد وضوابط کون سے ہیں جنہیں وہ حکومت کے عام نظام کے لئے رائج کرتا ہے تاکہ اس کے سائے میں خیرِ اُمت پرورش پاسکے جسے اللہ نے عوام کے لئے منتخب کیا ہے؟

آسانی کے لئے ہم یہ تذکرہ کئے دیتے ہیں کہ جو آیات اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان کے متعلق ہیں اور جو انسان کے انفرادی

اخلاق سے بحث کرتی ہیں وہ سب فرد کی تربیت اور تیاری کے لئے خاص ہیں تو آپ ان آیتوں کو کھنگالیے اور قلبی و جذباتی وابستگی پیدا کیجئے آپ دیکھیں گے کہ قرآن انسانی تربیت کی شکم سیری کے سامان لے کر آیا ہے جو انسان کے باطنی وجود کی مضبوط تعمیر کرتا اور اس کی مستحکم تربیت کرتا ہے اور آپ محسوس کریں گے کہ اس نے اس باب کی تمام تفصیلات و جزئیات کا احاطہ کر لیا ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر آپ اس طرح کی آیات کا ایک بہترین مجموعہ تیار کر لیں جو ہماری زبان پر ہر دم جاری و ساری رہے۔

ایک دوسرے کا تعاون کرنے والی جماعتوں کے دستور میں اس نے طبقاتی نظام کو پیش کیا ہے، فطری طور پر پائے جانے والے مادی امتیازات کو تسلیم کیا ہے اور حقیقی بھائی چارگی کے سایہ میں انسانیت کے حقوق کی کفالت کا اہتمام کیا ہے، مالداروں کے مال میں محتاجوں کا حق متعین کیا ہے اور صاف کہا ہے کہ مال و دولت تو دراصل اللہ کی ملکیت ہیں اور بے شمار ایسے اصول پیش کئے ہیں جن سے مادی اور نفسی گرہیں کھل جاتی ہیں اور جذبات کا امتزاج اور جماعت کے درمیان محبت کی کثرت آسان ہو جاتی ہے آپ پر قرآن کے اس نوعیت کے تمام حصوں کا استقصاء واجب ہے ساتھ ہی محبت اور بھائی چارگی کی بنیاد پر جماعت کی تشکیل میں ہر اصول کی معرفت بھی ہو۔

حکومت کے نظام کے سلسلے میں اس نے صدر مملکت کی دو ذمہ داریاں ٹھہرائی ہیں:

۱۔ حکومت میں عدل کو ملحوظ رکھنا۔

۲۔ لوگوں کے مختلف حقوق کی حفاظت کرنا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ،

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔

(نساء : ۵۸)

(اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔)

اور افراد کی ذمہ داری بھی دو اصولوں میں بیان کی :

(۱) معصیت کے سوا تمام معاملات میں اُولی الامر کی مطلق اطاعت۔

(۲) اپنے ان تنازعات کو حکومت کے پاس لے جانا جنہیں مصالحانہ وسائل سے حل کرنے کی وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (نساء : ۵۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔)

یہ حکم انفرادی معاملات، جان و مال اور عزت کی حفاظت میں، اور بیع و شراء، دین و رہن، اجارہ، میراث وغیرہ کے معاملات میں سب پر محیط ہے مملکت کی خارجی

سیاست کے اصول، جنگ و صلح اور معاہدات کے قواعد مملکت کی کمزوری کے اسباب کی وضاحت اور اس کو طاقتور بنانے کے منصوبے سب یہاں مذکور ہیں۔

جب ہم قرآن پڑھیں گے، اور ہمارے ذہن میں اس طرح کی چیزیں نہ ہوں گی، تو ہمیں ایسا معلوم ہوگا کہ قرآن ایک بند اور خاموش کتاب ہے کہ گویا ہم کسی اجنبی اور غریب الدیار شہر میں چل رہے ہیں، لیکن جب ہم ان چیزوں کا باریکی اور ہوشمندی سے خیال رکھیں گے تو ہماری بصارت و بصیرت کے سامنے۔ بہترین حقائق منکشف ہوں گے جو کسی دوسرے دل میں نہیں آسکتے۔

چوتھی نصیحت

ہم پر فرض ہے کہ ہم قرآن کا مطالعہ اس حیثیت سے کریں کہ وہ ان تمام قوانین کا جامع ہے جن کے اردگرد یہ وجود گھومتا ہے اس لئے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ایک مقدار میں ہے اور ہر امر ایک سُنّت کے تحت جاری ہے، جو شخص ان قوانین اور سُنتوں کا پتہ پا جائے اور ان کی تصدیق کرے اور ان پر ایمان لے آئے اور ان سے بہتر استفادہ کی کوشش کرے تو اس عالم وجود کی چابی اس کے ہاتھ میں آگئی اب اسے یہ سوچنا ہے کہ کیسے ان میں تصرف کرے۔

یہاں مثال کے طور پر بعض قوانین بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔ استغفار، الہامی و آسمانی روزی کی کلید ہے۔ یہ نہ سوچیے کہ ہماری مُراد بس قلبی معنوی رزق سے ہے بلکہ یہی مادی رزق کا قانون بھی ہے۔ ہم آپ کو ظن و گمان کی وادی میں نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی سُنئے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ

عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (نوح : ۱۰ تا ۱۲)

(میں نے کہا، اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمہارے لئے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کردے گا۔)

ہم دورِ جدید میں اس طرح کی باتوں کے سلسلے میں شک و غفلت میں مبتلا ہو چکے ہیں اور ہم یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ یہ محض ترغیب و ترہیب کے لئے ہے امرِ واقعہ نہیں ہے نہ کوئی سچا قانون ہے۔ ہم اس خیال کا شکار ہوئے تو ہر چیز ہم نے کھودی ہمارے سلف صالحین اس چیز کو سمجھتے اور اس پر یقین رکھتے تھے اور اس راز کو پا لینے کے بعد آسمان کے دروازے کھولنے کی دعا کرتے تھے اور اللہ ان کی مرادوں کو پوری کرتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار بارش نہیں ہوئی، آسمان تھم گیا، بارش رک گئی، زمین خشک ہو گئی، یہ عمر بن خطابؓ کا زمانہ تھا وہ لوگوں کے ساتھ استسقاء کریں یعنی پانی کی دعا کریں جو رسولؐ کا اس طرح کے سخت مواقع پر عمل تھا۔ عمرؓ نے اپنے رب سے استغفار کیا پھر لوگوں کو لے کر لوٹ آئے۔ لوگوں نے پوچھا:

ہمارا خیال ہے آپ نے پانی کی دعا کی ہے؟

آپ نے فرمایا: میں نے تمہارے لئے آسمان کے چھتروں کو چھوڑ دینے کی دعا کی ہے۔

لوگوں نے پوچھا: آسمان کے نچھتر کیا ہیں؟

آپؓ نے جواب دیا: استغفار۔

لوگوں کو اس پر بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ اپنی بات کہہ رہے ہیں یا کتاب اللہ میں موجود ہے چنانچہ انہوں نے پوچھ لیا تو آپ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ (نوح: ۱۰، ۱۱)

(میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔)

اور میں نے تمہارے لئے استغفار کر دیا، اب اللہ جتنا چاہے گا پانی برسائے گا لوگ کہتے ہیں کہ عمرؓ نے ابھی اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ اُفق میں حرکت ہوئی، ہوائیں چلنے لگیں اور بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آنے لگے یہاں تک کہ مدینہ میں زوردار بارش ہوئی اور قرآن کا یہ وعدہ پورا ہوا۔

۲۔ نعمتوں کی حفاظت اور پائیداری اس بات میں مضمر ہے کہ آپ مَاشَاءَ اللهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ۔ کہیں۔ یہ ایک مقدس قانون اور سچی حکیمانہ تعلیم ہے جسے اللہ نے سورۂ کہف میں مردِ مومن کی زبان سے جاری کیا ہے جب اس نے اپنے ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے کہا:

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ ۚ (کہف: ۳۹)

(اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ نکلا کہ مَاشَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

ہم کتنی بار اس قول کو پڑھ چکے ہیں لیکن اس میں جو خیر پوشیدہ ہے اس کی طرف ہماری توجہ نہیں گئی یہاں تک کہ اللہ کے رسول کے اس قول سے ہمیں معلوم ہوا:

"اللہ تعالیٰ کسی بندے پر جب بھی مال واہل یا اولاد کی نعمت کرے تو وہ کہے کہ مَاشَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ کیونکہ اسے اس میں موت سے پہلے مصیبت نظر آتی ہے۔"

اسی لئے بعض اسلاف کہا کرتے تھے:

"جس شخص کو اس کی کوئی حالت یا مال واولاد غرور میں بتلا کردے تو فوراً وہ مَاشَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہے۔"

یہ قول آیت کریمہ سے ماخوذ ہے اور اس کی نسبت حدیث شریف کی طرف ہے۔

۳— ہر برا عمل انسان کے اوپر لوٹ آتا ہے اور اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ ایک قانون ہے جو دوسرے قوانین الٰہی سے پیچھے نہیں ہے۔ چنانچہ برائی کی نیت ہر عمل کے اندر بری روح جنم دے دیتی ہے جو درندوں کی طرح گھات میں رہتی ہے اور انسان کے اوپر حملہ کرنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اللہ کی یہ آیات پڑھیے:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ (یونس: ۲۳)

(لوگو، تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔)

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ (فاطر: ۴۳)

(اور بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔)

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ (فتح: ۱۰)

(جو اس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اُس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔)

محمد بن کعب قرضی کہتے ہیں:

"تین خصلتیں ایسی ہیں جن میں اگر کوئی شخص مبتلا ہو جائے تو اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ اسے گرا نہ دیں، دھوکہ بازی، ظلم اور بدعہدی۔"

اور اس کی تصدیق اوپر کی قرآنی آیات سے ہوتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ ہمیں بتاتے ہیں کہ بُرائی اپنے کرنے والے کو ڈھونڈھ کر پکڑتی ہے:

بُری چال سے بچو اس لئے کہ بُری چال اپنے چلنے والے ہی کے خلاف جاتی ہے اور وہ اللہ کی طرف سے اسے تلاش کرتی ہے۔"

بلکہ اللہ تعالیٰ صریح لفظوں میں کہتا ہے کہ یہ اس کا قانون ہے:

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ؀ (فاطر: ۴۳)

(اور بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کی جو سُنّت رہی ہے وہی ان کے ساتھ بھی برتی جائے؟ یہی بات ہے تو تم اللہ کی سُنّت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔)

۴۔ ہر وہ منزل، جس کی طرف آدمی اللہ کا نام لے کر بڑھے گا، پہنچ کر رہے گا۔ اور عقل سے اس کی تصدیق انسان پر آسان ہے لیکن یہ آسان نہیں ہے کہ اس کا

قلب اس کا احاطہ کرے اس لئے کہ یہ ایمان ویقین کی حقیقت ہے جسے دل والے ہی سمجھ سکتے اور اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔

ہم مقصد و مقامات پر کہہ چکے ہیں کہ دل، جن چیزوں کو سمجھ لیتا ہے، اس کو تسلیم مطلق کرتا ہے اور بغیر کسی علت اور دلیل کے اس پر آمنا و صدقنا کہہ دیتا ہے۔

لیکن عقل کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہ ہر چیز کو منطق کے میزان پر اسباب اور مسبب، علت اور معلول کے پیمانے میں جانچ کر ہی قبول کرتی ہے، روزمرہ کے عام قوانین کے خلاف کوئی چیز اسے گوارہ نہیں ہوتی۔

آدمی جب اپنی فکر کے حقائق کے لئے اٹھتا ہے تو عقل اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اس کے نشیب و فراز کو دیکھتی ہے لیکن جب قلب کا معاملہ ہوتا ہے تو آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے اور عقل لب بام محو تماشا رہ جاتی ہے۔

ہم یہاں یہ نہیں چاہتے کہ عقلی و جذباتی فہم کی حقیقت بیان کریں گرچہ ہمارا احساس یہ ہے کہ وہ اہم ترین ضرورت ہے جس سے کوئی بے نیاز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن و سنت میں بہت سی ایسی حقیقتیں ہیں جنہیں ہم عقل کی نگاہ سے دیکھیں تو محض وہم معلوم ہوتی ہیں، ہم اسی تاکید پر اکتفاء کرتے ہیں کہ انسان کو فہم کی دونوں ہی قسموں کی ضرورت ہے تاکہ ہر ایک سے اس کے مقام پر بہتر استفادہ کر سکے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان مصر فتح کرنے کے لئے آتے اور وہاں کے ذمہ دار سرداران اکٹھا ہوئے اور انہوں نے کمانڈر ان چیف سے ایک قاصد بھیجنے کے لئے کہا تاکہ اس سے گفتگو کی جا سکے۔ لیکن گفتگو جب شروع ہوئی تو ان لوگوں نے مسلمانوں کا مذاق اڑایا ان کی عزیمت کی توہین کی اور فتح کے سلسلے میں انہیں مایوس کرنے کی کوشش کی اس وقت قاصد نے

بڑی سکینت اور اطمینان سے جواب دیا:

اے لوگو! ہم ملک فتح کرنے کے لئے نہیں آئے کہ وہ تو اللہ نے اسی وقت فتح کر دیا تھا جب ہم نے تم تک پہنچنے کے لئے وادیاں طے کی تھیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خود کہتا ہے:

وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ (توبہ: ۱۲۱)

(اس طرح یہ کبھی نہ ہوگا کہ (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ دیا جائے)

اس حسین استنباط، دقیق فہم اور یقین صادق پر سر دھنئے جس سے اللہ نے ان مسلمانوں کو نواز رکھا تھا۔

۵ — اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ (اعراف: ۱۹۶)

(اور وہ نیک آدمیوں کی نگرانی کرتا ہے۔)

اللہ کا نیکو کاروں کا نگراں ہونا ایک نافذ قانون اور سچا قول ہے۔ یہ ہر اس شخص کو معلوم رہنا چاہئے جو اس جائے پناہ میں داخل ہونا پسند کرے جس پر کوئی بُری نیت سے حملہ نہیں کر سکتا، اور اس کی تمام تر ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صلاح اور تقویٰ کے اسباب اکٹھا کر لے تاکہ اس پر اس مقدس قانون کا نفاذ ہو سکے۔

مرد صالح کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس کے کمزور و ناتواں بچے زندہ رہ جاتے ہیں، اس وقت اللہ کی رعایت و نگرانی انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اس لئے کہ اللہ کی حفاظت اور نگرانی ان کے والدین کی نگرانی کے برابر ہے کہ اس سے دل کو

ڈھارس بندھتی اور ہمت افزائی ہوتی ہے اس چیز کی تصدیق سورہ کہف میں ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کہتا ہے :

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ (کہف : ۸۲)

(اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لئے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے، میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو دیوار سیدھی کرنے پر مامور کیا تاکہ دونوں یتیم بچوں کی دولت محفوظ رہے اور والد صالح کے انتقال کے بعد خدا کی حفاظت اور رعایت کا منشا پورا ہو سکے۔

ہم نے اس سلسلے میں عمر بن خطابؓ کا ایک لطیف استنباط بھی پڑھا ہے۔ ایک سال قحط پڑ گیا، زمین خشک ہو گئی اور لوگوں نے امیر المومنین سے اپنی تنگی اور مصیبت کی شکایت کی اس وقت عباسؓ بن عبد المطلب رسول اکرم کے چچا با حیات تھے، چنانچہ عمرؓ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور لوگوں کے لئے پانی کی دُعا کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے رب سے یوں دُعا کی :

اے اللہ تیرا نبی زندہ تھا تو وہ اپنی اُمت کے لئے بارش کی دُعا کرتا تھا اور تو اس کو قبول کرلیتا تھا، آج ہم لوگ ہیں اور ہمارے درمیان وہ ذات نہیں ہے جو ہمارے لئے بارش کی دُعا کرتی تھی، اے اللہ، یہ عباس تیرے نبی کے چچا ہیں تو اپنے نبی کے بقیہ خاندان کی حفاظت کیجیو کیونکہ تو نے فرمایا ہے اور تیرا فرمان برحق ہے:

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ (کہف: ۸۲)

(اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں اور اس دیوار کے نیچے اِن بچوں کے لئے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔)

لوگ کہتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد آسمان ان پر اُمنڈ آئے اور زوردار بارش ہوئی۔

مندرجہ بالا مثالوں میں وہ حقیقت موجود ہے جس کی خاطر ہم استشہاد کرنا چاہتے ہیں اور اس سے ہمارا مقصود بالکل واضح ہوجاتا ہے۔

گرچہ ان قوانین میں سے اکثر کی یافت قرآن کے قاری کے لئے آسان ہے اور وہ بقدرِ توفیق وہدایت استنباط کرسکتا ہے لیکن اس کام کو آسان بنانے کے لئے ہم یہاں چند ہدایات دے رہے ہیں:

۱۔ قاری اس طرح کے قوانین مبتدا خبر کے جملوں میں آسانی سے تلاش کرسکتا ہے۔ جیسے اللہ کا قول ہے:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ

فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ (نحل: ۴۱)

(جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دُنیا ہی میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے کاش کہ یہ لوگ جان لیں۔)

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ (توبہ: ۱۲۳)

(اور جان لو کہ اللہ مُتقیوں کے ساتھ ہے۔)

آپ اس طرح کے صیغوں کا مطالعہ کریں، اس میں آپ کو بہت کچھ مل جائے گا۔

۲۔ امر اور جواب امر میں بھی اس طرح کے قوانین اللہ نے بیان کیے ہیں

اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ (نوح: ۱۰، ۱۱)

(اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔)

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ (توبہ: ۱۴)

(ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا۔)

۳۔ شرط اور جواب شرط میں بھی اللہ نے پوری قوت سے یہ قوانین بیان فرمائے ہیں:

إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝ (محمد: ۷)

(اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا)

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝

(طلاق: ۴)

(اور جو شخص اللہ سے ڈرے، اس کے معاملے میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے)

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۝ (طلاق : ۳)

(جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے۔)

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال: ۲۹)

(اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لئے کسوٹی بہم پہنچا دے گا۔)

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اعراف : ۹۶)

(اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔)

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ۝ (رعد : ۱۷)

(جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے۔)

۴۔ حصر اور قصر کے صیغوں میں بھی یہ قوانین پوری وضاحت سے نظر آ سکتے ہیں:

لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ (توبہ : ۵۱)

(ہمیں ہرگز کوئی (بُرائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی ہے مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔)

وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ (توبہ : ۳۲)

(اور اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔)

وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ (توبہ : ۱۲۱)

(اسی طرح یہ کبھی نہ ہو گا کہ (سعی جہاد میں) وہ کوئی وادی پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ دیا جائے۔)

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ (شوریٰ : ۴۲)

(ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔)

۵۔ ہر وہ جملہ جو سابق عمل کے لئے جزا کا کام دے:

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ (حشر : ۱۹)

(وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا)

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِىْ رَبِّىْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِىْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۱ (شعراء : ۲۱)

(پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرمالیا۔)

اس کے بعد آدمی کی ذمہ داری یہ رہ جاتی ہے کہ وہ ان قوانین کو کرید کرید کر تلاش کرے اس لئے کہ یہ سب اللہ کے نافذ قوانین ہیں۔ اور جن صیغوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، بس وہیں تک یہ موضوع نہیں ہے بلکہ ہر وہ حکم جو کسی آیت سے نکالا جا سکتا ہو، وہ ایک قانون سمجھا جائے گا۔ ان ساری چیزوں کا دارومدار نظر پر ہے بلکہ ان قوانین میں نظر و تدبر کی کیفیت پر ہے، دارومدار قلبی اہتمام اور اس

دل چسپی پر ہے جو پچھلے لوگوں کی طرح آپ کو ہر وقت مشغول رکھے ۔ ان چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے قرآن پڑھیے، آپ کے دل ودماغ میں آفاق وکائنات کی ساری پہنائیاں وا ہو جائیں گی ۔

پانچویں نصیحت

قرآن اللہ کا کلام ہے، اس کے معانی کا گنجینہ ہے اور اس کے علوم ومعارف کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور یہ وہ پہلو ہے جس پر لوگ غور نہیں کرتے اور کما حقہٗ اس میں تفقہ حاصل نہیں کرتے ۔

جب ادبی ذوق رکھنے والے انسان کلام کی تنقید میں باہم مختلف ہوجاتے ہیں ، کوئی کہتا ہے کہ کلام کا ادب الفاظ میں ہے نہ کہ معنیٰ میں اور دوسرا کہتا ہے کہ معانی ہی سب کچھ ہیں الفاظ تو محض برتن ہیں، قابلِ ذکر چیز مغز اور گودا ہے نہ کہ چھلکے ۔ جب اُدبا میں یہ تقسیم ہوجاتی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنفین اپنی صلاحیتوں کے تفاوت کی وجہ سے باہم مختلف ہوجاتے ہیں اور بہترین معانی کو پیدا کرنے میں ان کا کمال ہوتا ہے ۔ اس کے بعد ان کا کلام بتدریج شرف وعزت حاصل کرتا ہے جیسے جیسے کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اس میں معانی کا اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔

جب ہم نے یہ تسلیم کرلیا تو ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ انسان اور خالق تعالیٰ کے درمیان جو زبردست فرق ہے اس پر غور کرلیا جائے اگر یہ تقابل صحیح ہو ۔ اس لئے کہ ایک طرف وہ مخلوق ہے جو بالکل نابود ہے اور دوسری طرف وہ عظیم خالق ہے جو ہر چیز میں جلوہ گر ہے اور اس کے دم سے تمام چیزیں قائم ہیں ۔ لیکن پھر بھی ان دونوں میں فرق کا تصور کرنا پڑے گا تاکہ انسانی کلام اور خدائی کلام کے درمیان پائے جانے والے

فرق کو محسوس کیا جا سکے۔ انسان کا کلام حد درجہ کمزور اور عاجز ہے جبکہ خدائے ذوالجلال کا کلام قدیم ہے اس کے معانی قدیم ہیں اور اس کے معارف کو شمار کیا جا سکتا ہے نہ ان کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ جب قرآن کریم کا مطالعہ کریں تو اس شعور کو مستحضر رکھیں یا اپنے احساسات اور مدرکہ قوتوں میں ان زبردست تفاوتوں کو حاضر رکھیں، اس سے ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ ہر کلمہ بلکہ ہر حرف کے معانی میں ڈوب سکیں محض ساحل کی سیر کر کے واپس نہ آجائیں اور ہم اسلامی عصبیت کی روح رکھنے کی وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ اس انسان کی روح کے ساتھ بول رہے ہیں جس نے خدائی کلام اور انسانی کلام کے درمیان واقع فرق کو مٹانے کی پوری کوشش کی لیکن آخر میں اپنی بیچارگی کا اسے اعتراف کرنا پڑا اور اس نتیجہ تک وہ پہنچا جو اوپر گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے صفحات میں محدود مقدار میں اور چند متعین و مشہور سورتوں میں گفتگو کی ہے جنہیں ہم قرآن پاک کی سورتیں کہتے ہیں۔ علمائے اسلام نے آیاتِ قرآن بلکہ کلمات اور حروف تک گننے کی کوشش کی ہے بس چند حروف ہیں جو اللہ کے تمام قدیم کلام پر مشتمل ہیں ہم کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ یہ چند حروف علوم الٰہی کا احتواء کر سکتے ہیں اگر ہر حرف میں آفاق و کائنات کے اشارے نہ ہوں؟

کوئی مصنّف اس بات کی کوشش کر سکتا ہے کہ اپنی ادبی تخلیق میں اتنے حروف استعمال کرے جو قرآن کے حروف کے برابر ہوں یا اس سے زیادہ ہوں۔

اگر آپ کاتبوں کی ایک پوری نسل کی تخلیقات جمع کر لیں، ان کے حروف شمار کر لیں اور ان حروف میں جو معانی پوشیدہ ہیں انہیں کھنگال لیں پھر ان معانی کا کتاب اللہ کے

معانی سے مقابلہ کریں تو شرم سے آپ کی گردن جھک جائے گی اور آپ اسی تقابل سے توبہ کرلیں گے کہ کتنی نامعقول حرکت ہم نے کی تھی ۔ اور اگر انسانیت کے تمام مصنفین کی ہر دور کی تخلیقات اور فلاسفہ کے نتائجِ فکر آپ جمع کرلیں اور ان کے حروف شمار کریں اور ان کے معانی اکٹھا کرلیں پھر ان سے کلامِ الٰہی کا موازنہ کریں تو آپ کا ایمان و یقین آپ کو اس حماقت کے ارتکاب پر لعنت و ملامت کرے گا اور آپ کے دل کی گہرائیوں میں یہ آواز گونجے گی جو پوری انسانیت کو مخاطب کرکے پکار اُٹھے گی :

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ (بنی اسرائیل : ۸۵)

(اور تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے ۔)

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

(روم : ۶ ، ۷)

(مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔ لوگ دُنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں ۔)

دوسری طرف وحی یوں چیلنج کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے :

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ (کہف : ۱۰۹)

(اے نبیؐ ، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں بلکہ اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے ۔)

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (لقمان: ۲۷)

(زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات) بن جاتے جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔)

اگر آپ پوری انسانیت کا علم جمع کر سکیں —— اور وہ بہت تھوڑا ہے —— اور اسے ایک جگہ کسی طرح رکھ سکیں جس کے حروف گنے ہوئے ہوں اور اس کے برابر قرآن کے حروف اور اس کے کلمات رکھ دیں تو کیا آپ یہ کہنے کے سزاوار نہیں ہوں گے کہ قرآن کے ہر کلمہ کے نیچے بہتیرے علوم و معارف کے اشارات ہیں؟ بھلا یہ بات کیونکر صحیح نہ ہو گی جبکہ قرآن جو آپ کے سامنے ہے، دُنیا و آخرت کے ان تمام علوم کا جامع ہے جن کا احاطہ صرف اللہ ہی کر سکتا ہے؟

میرے بھائی، یہ بات بالکل صحیح ہے، قرآن کے ایک ایک کلمہ کے نیچے اسرار و معانی کا بحرِ بیکراں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

"قرآن کی ایک پیٹھ ہے، ایک پیٹ ہے، ایک نقطۂ آغاز ہے، اور ایک کنارہ ہے۔"

آپ نے قرآن کو جس قدر سمجھا تھا، ہم نہیں سمجھ سکتے آپ فرماتے ہیں:

"اس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں ہیں۔"

اس کلام کی شان ملاحظہ فرمائیے جس کے عجائبات ختم ہونے میں نہیں آتے۔

سائنس داں اپنی بحث ایٹم پر یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ یہ وہ تنہا جوہر ہے جس سے مادہ ترکیب پاتا ہے اور یہ جز و جز و نہیں ہو سکتا اس لیئے کہ یہ آخری درجے میں چھوٹا اور باریک ہے۔ پھر اب وہ ہمیں بتانے لگے ہیں کہ ذرہ بھی توڑا جا سکتا ہے اور اس کے اجزاء کیئے جا سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے عملاً اسے توڑ دیا اور اس میں اللہ کی خلقت کا پتہ لگا لیا اور آج تک اس کے جزئیات کے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن قرآن ذرہ کے ٹوٹنے اور جز و جز و ہونے کا پہلے دن سے اعلان کر رہا ہے:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ (یونس : ۶۱)

(کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ اس سے چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔)

یہاں تنہا 'اصغر' کا کلمہ محض ذرہ کی طرف اشارہ ہی نہیں کر رہا، بلکہ یہ صاف صاف بتا رہا ہے کہ ذرہ کے اجزاء ہو سکتے ہیں اور اسے توڑا جا سکتا ہے۔ سوچئے اس ذرہ کو جز و جز و کرنے میں کتنی محنتیں ضائع ہوئیں، کتنے تجربات اس پر کیئے گئے اور کتنے علوم و معارف اس مقصد کے لئے استعمال کیئے گئے؟ اور کتنے علوم و معارف اور طاقتوں کے اسرار اس کے اجزاء میں مدفون ہیں؟ اور جب علوم جدیدہ کی پہنائیوں کو طے کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ ذرہ کا ٹوٹنا محض ایک دروازہ ہے تو آپ اس حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں کہ یہ لفظ 'اَصْغَرَ'، تمام انسانی علوم کا اس وقت مذاق اُڑا رہا تھا

جب یہ لوگ اس کے تجزیہ کے منکر تھے اور اس وقت یہ ذرہ ہیں پوشیدہ علوم و معارف سے غافل لوگوں کو اشارہ کر رہا تھا۔

جب قرآن کے ایک کلمہ کا حال یہ ہے تو سوچیے کہ ان تمام کلمات کی وسعت اور ہمہ گیری کا عالم کیا ہوگا؟ بلکہ یہ اس کلمہ کا حال ہے جو مادہ محسوسہ پر مشتمل ہے، اب سوچیے کہ اس کلمہ کی جامعیت کیسی ہوگی جو روح کے ان اسرار و رموز پر مشتمل ہے جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں نہ محسوس کر سکتے ہیں؟!

میں اپنے آپ کو یا کسی شخص کو اس بات کا مکلف نہیں ٹھہراتا کہ وہ ان تمام پہنائیوں کو طے کرے بلکہ محض یہ شعور مستحضر رکھے جو اسے توجہ دلاتا رہے کہ وہ دوسرے کلاموں کی طرح ایک عام کلام نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ وہ ایک ایسے کلام کا مطالعہ کر رہا ہے جو علوم و معارف کے اسرار سے بھرا پڑا ہے تاکہ کوئی ایک سطر بھی کم از کم اس سے ایک معنیٰ نکالے بغیر نہ چھوڑدے اور اسے معلوم ہو جائے کہ قرآن سے جو واقفیت ہمیں حاصل ہوئی ہے اور جن عجیب و غریب معانی پر اس کی آیات مشتمل ہیں ان پر گفتگو کر کے ہم شکم سیر نہیں ہو سکتے اس لئے کہ وہ چند جھلکیاں ہیں جو بعض عارفین پر منکشف ہوئی ہیں جنہیں اللہ نے چند معانی سے واقف کرادیا ہے، رہے بعض خاص اور اہم نقوش تو ان سے پردہ اُسی وقت اُٹھ سکتا ہے جب اللہ چاہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُۥٓ إِلَّا ٱللَّهُ ۗ وَٱلرَّٰسِخُونَ فِى ٱلْعِلْمِ يَقُولُونَ ءَامَنَّا بِهِۦ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ ۝ (آل عمران: ۷)

اور ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا بخلاف اس کے جو لوگ

علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔" اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔)

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۞ (حشر: ۲۱)

(اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت) پر غور کریں)

میرے بھائی، کلام اللہ پر تدبیر کیجئے اور ہدایت و بصیرت کی روشنی میں اسے کھنگالئے، اس کے معانی آپ پر ایسے دروازے کھولیں گے۔ جو اس سے پہلے آپ پر بند رہے تھے۔

قرآن کو اس حیثیت سے پڑھئے کہ وہ معانی کا خزانہ ہے اور علوم و معارف کی انسائیکلو پیڈیا ہے اور دیکھئے آپ کو کیا ملتا ہے؟

قرآن کو اپنے سامنے کھول لیجئے، اس کی کسی سورہ کا رُخ کیجئے اور اس میں ڈوب جائیے جیسے کوئی ماہر غوطہ خور سمندر میں ڈوب کر قیمتی موتیاں اور جواہرات نکالتا ہے۔ ایک ایک آیت پڑھئے اور قرآن کے حاشیے پر اس معنیٰ کا عنوان لکھ دیجئے۔ جو آپ کی سمجھ میں آئے پھر انہیں کاپی یا رجسٹر میں درج کر لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے ایسے عناوین اور موضوعات آ گئے ہیں جو زندگی کے علوم و حقائق سے بھرے

ہوئے ہیں جن کی آپ تشریح کرنے لگیں تو پوری عمر صرف ہو جائے۔ میں اپنے سامنے سورۂ زخرف کھول رہا ہوں اور بعض اہم موضوعات نقل کر رہا ہوں:

موضوعات	زخرف کی آیات
۱۔ قرآن علمِ الٰہی اور علو و حکمت کے مضامین کا جامع ہے۔	وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ (زخرف: ۴) (اور درحقیقت یہ اُمّ الکتاب میں ثبت ہے ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب)
۲۔ ہماری حد سے بڑھی ہوئی گمراہی فطری ہدایت کے استعداد کو فاسد نہیں کرتی۔	أَفَنَضْرِبُ عَنكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا أَن كُنتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ ۝ (۵) (اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لئے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو؟)
۳۔ حق کو ٹھکرانا باطل پرستوں کا طریقہ کار رہا ہے۔	وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۶، ۷) (پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو)

۴۔ ہر حسی نعمت میں دو فائدے ہیں، محسوس نفع اور روحانی نفع۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۝ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ۝ (۱۲، ۱۳)

(اور تمہارے لئے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر چڑھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لئے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔)

۵۔ ناز و نعمت کا پلا ہوا شخص مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے کے لائق نہیں ہوتا۔

أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝ (۱۸)

(کیا وہ شخص جو زیوروں میں پالا گیا ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتا؟)

۶۔ حسی ادراک کی صحت اسی میں چل سکتی ہے جس میں وہ موثر ہو۔

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ (۱۹)

(انہوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا کیا اُن کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟)

۷۔ اندھی تقلید انجام بد اور سطحیت کا باعث ہوتی ہے۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾

(۲۱، ۲۲)

(کیا اس سے پہلے ہم نے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند (اپنی اس ملائکہ پرستی کے لئے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں؟ نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔)

۸۔ عیش کوشی میں تقلید کرنے سے لیڈروں کے اندر عناد اور حق کو قبول کرنے سے بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۚ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ (۲۳، ۲۴)

(اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا، کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے

اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لئے تم بھیجے گئے ہو ہم اُس کے کافر ہیں)

۹۔ لذت کوشی اور تنعم حق و باطل کے درمیان تمیز کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۲۹، ۳۰)

(بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاعِ حیات دیتا رہا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا۔ مگر جب وہ حق اِن کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں)

۱۰۔ آدمی کی قدر و قیمت جاہ و مال سے نہیں بلکہ نفس سے ہوتی ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (۳۱)

(کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟)

۱۱۔ صلاحیتوں اور معیشت کی تقسیم میں انسانوں کے درمیان تفاوت اس سرزمین کی آبادکاری اور معاشرے کی تشکیل کی سُنّت ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ (۳۲)

(دُنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو

کچھ دوسرے لوگوں پر بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔)

— ایمان کے حقائق عزتِ نفس اور غنا ہیں اور دُنیوی متاع کی قدریں سطحیت اور بدبختی کا مخزن ہیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۚ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳۳، ۳۴، ۳۵)

(اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں، جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے۔ یہ تو محض حیاتِ دُنیا کی متاع ہے اور آخرت صرف تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لئے ہے۔)

۱۳— ذکرِ الٰہی قلب کی روشنی اور زندگی کا سامان ہے لیکن اس سے بے نیاز شخص

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ (۳۶)

(جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر

اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔)

۱۴۔ سب سے مضبوط رشتہ اللہ سے محبت کرنا ہے اور باطل کی بنیاد پر قائم ہونے والا ہر رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیۡتَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَیۡنِ فَبِئۡسَ الۡقَرِیۡنُ ﴿۳۸﴾

(آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا، کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بُعد ہوتا، تو، تو بدترین ساتھی نکلا۔)

۱۵۔ جب عقل و خرد سے تعبیر کا مادہ رخصت ہو جائے تو ہر ہدایت کی طرف سے ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔

اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ اَوۡ تَہۡدِی الۡعُمۡیَ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۰﴾

(اب کیا اے نبیؐ، تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟)

۱۶۔ دُنیا ہلاکت کا سامان ہے اور پیغمبر اس سے بچانے کے داعی ہوتے ہیں جو اس دعوت کا انکار کر دے وہ پیغمبر کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد اس کی زد میں آجاتا ہے۔

فَاِمَّا نَذۡہَبَنَّ بِکَ فَاِنَّا مِنۡہُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ ﴿ۙ﴾ اَوۡ نُرِیَنَّکَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰہُمۡ فَاِنَّا عَلَیۡہِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ ﴿۴۱، ۴۲﴾

(اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے خواہ ہم تمہیں دنیا سے اُٹھا لیں یا تم کو آنکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے اِن سے وعدہ کیا ہے۔ ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔)

۱۷۔ حق اہلِ حق کے لئے دنیا کے

فَاسۡتَمۡسِکۡ بِالَّذِیۡۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ

فتنوں اور اس کی رُسوائیوں سے ڈھال ہے۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۴۳)

(تم بہر حال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔)

۱۸۔ قرآن نفسی حقائق کے لئے تقویت اور ذکر کی یاددہانی کا سامان ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ (۴۴)

(حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے یاددہانی ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جوابدہی کرنی ہوگی)

۱۹۔ حق صدق وصفا کا جوہر ہے جس میں کسی زمانے میں کسی چیز میں اختلاف نہیں رہا ہے۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝ (۴۵)

(تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے اُن سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کئے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟)

۲۰۔ باطل کے چاکروں کو یہ آیات نہیں ڈرا سکتیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۚ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۴۷، ۴۸)

(پھر جب اُس نے ہماری نشانیاں اُن کے سامنے پیش

کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانی
ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی اور ہم نے
ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں)

۲۱ — جب فکر کی تعمیر غائب ہو جاتی ہے اور حسی ادراک کے سوا اور کچھ باقی نہیں بچتا تو اندازوں کے پیمانے گڑبڑ ہو جاتے ہیں اور حس کے مظاہر اپنی قوتِ ادراک کے نتائج کے سہارے احکام متعین کر لیتے ہیں۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ
اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝
اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ
وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ
اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ
الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ (۵۱ تا ۵۳)

(ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا،
"لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں
میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں
آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی
بات کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اِس پر سونے
کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس
کی اردلی میں نہ آیا؟)

۲۲ — قیادت ہی عوام کو حق و قوت جیسی چیزوں میں لگاتی ہے اور باطل

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا
قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۵۴)

کی قدروں کو مزین کر کے ان کی صلاحیتیں بھی وہی ضائع کرتی ہے۔

(اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔)

۲۳- جو حق کا انکار کر دیتا ہے ہلاک ہو جاتا ہے۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۵۵)

(آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا۔)

۲۴- غلط مباحثوں سے حیرانی میں ڈالنا باطل کی عادت ہے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ [1] (۵۸،۵۷)

---

[1] روایتوں میں آتا ہے کہ جب آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ نازل ہوئی تو مشرکین بھڑک اُٹھے اور عبداللہ بن زبعری نے رسول اکرمؐ کو چکمہ دے کر مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہا۔ اس نے پوچھا: اے محمد، کیا یہ آیت ہمارے اور ہمارے معبودوں کے لئے خاص ہے یا ہر قوم اور اس کے معبودانِ باطل کے لئے ہے؟ آپؐ نے فرمایا: عام ہے، تو اس نے کہا: اے محمد، میں جیت گیا، اس لئے کہ عیسیٰؑ بھی معبود مِنْ دُوْنِ اللّٰه ہیں اس لئے وہ بھی جہنم میں ہوں گے اور ہمارے معبود ان سے بہتر نہیں ہیں اس لئے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو ان کے ساتھ جہنم میں جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس پر قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں:-

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى (باقی ص۶۰۳ پر)

(اور جوں ہی کہ ابن مریم کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچادیا اور کہنے لگے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے لئے محض کج بحثی کے لئے لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ)

۲۵۔ اللہ سے محبت باقی رہنے والا رشتہ ہے اور دنیاو آخرت میں مامون رہنے کی علامت ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ (۶۷، ۶۸)

(وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے اس روز اُن لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے کہا جائے گا کہ اے میرے بندو، آج تمہارے لئے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔)

۲۶۔ اللہ کی رضا کے لئے عمل صالح

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ

(بقیہ صـ ۶۰۲) اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ (انبیاء : ۱۰۱)

(رہے وہ لوگ جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو گا، تو وہ یقیناً اس سے دُور رکھے جائیں گے۔)

اور وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا ... الخ

تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (۷۲)

ہی ابدی نعمت کا راز ہے۔

(تم اس جنت کے وارث اپنے اُن اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دُنیا میں کرتے رہے۔)

۲۷۔ حق کے مقابلے میں باطل کی ہر تدبیر اور چالبازی رائیگاں چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی بغیر لکڑی کے رسّی بٹے ہر ایجابی عمل سے خالی، جس پر ہر کام کا دارومدار ہوتا ہے۔ باطل پرست یہ غلط سمجھتے ہیں کہ انجام وعواقب پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ غلط کار کتنی ہی محکم تدبیر کرے اللہ تعالیٰ اسے رُسوا کر کے چھوڑتا ہے۔

اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا اَمۡرًا فَاِنَّا مُبۡرِمُوۡنَ ۝ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَ نَجۡوٰىهُمۡ ؕ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیۡهِمۡ یَكۡتُبُوۡنَ ۝ (۷۹، ۸۰)

(کیا ان لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو پھر ہم بھی ایک فیصلہ کئے لیتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سُنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔)

گرچہ یہ عناوین اور موضوعات ہر آیت سے تمام تر ماخوذ نہیں ہیں نہ سورہ کی تمام آیات کا استقصار کیا گیا ہے اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں کہ عناوین کا یہ گروپ اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ ان میں سے ہر عنوان علمی یا قلبی زندگی کا کوئی رنگ لئے ہوئے

ہے بلکہ بعض عناوین تو ماورا ر مادہ حقائق جیسے فرشتوں وغیرہ پر مشتمل ہیں اور ہر ایک اپنے مضمون میں وہ حق سمیٹے ہوئے ہے جس کے آگے سے باطل آسکتا ہے نہ پیچھے سے

اس طرح قرآن پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا قلب و دماغ حاضر ہو۔ اسی سے ان قدسی معارف کے خزینے کھل سکتے ہیں۔ یہ معارف آپ کو ملأ اعلیٰ تک پہنچائیں گے اور رضوان الٰہی کے ان جاں نواز جھونکوں سے مشام جان کو معطر کر دیں گے جنہیں الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایک مسلمان بھائی نے ایک طریقہ کا تجزیہ بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ میں اپنی لائبریری میں چار پانچ گھنٹے تک بیٹھتا تھا اور جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا میرا استغراق اور میری دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ میرے اندر مسرت اور خوشی اتنی بڑھ جاتی کہ میں بے چین ہو جاتا یا اچھلنے والے سرور کو قابو میں کرنے سے میں بے بس ہو جاتا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کتابوں پر مارنے لگتا یا بلا ارادہ زبان سے تحسین و مسرت کی آوازیں نکالنے لگتا۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ اس بھائی نے پورا قرآن اسی انداز سے پڑھا اور حسبِ صلاحیت تین سال میں قرآن پاک کے کنارے اس نے حواشی چڑھائے اور وہ برابر غور کرتا رہا اور اہم معانی کی ربانی کرنوں سے مستنیر ہوتا رہا۔ میں یہاں آپ کی توجہ حافظ ابن کثیر کی تفسیر کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں۔ یہ تفسیر آپ کے لئے حد درجہ اس مقصد کے لئے معاون ثابت ہوگی، اسے حاصل کرنے اور مطالعہ کرنے کی کوشش کیجئے۔

اب میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اپنے دن بھر کا حاصل جمع کیجئے اور یہ نصف ربع سے کم نہیں ہوگا۔ اور اسے اپنے قلب و دماغ میں اچھی طرح تیار کر لیجئے۔

پھر اُسے اپنے ان بھائیوں یا عوام کے سامنے پیش کیجئے جن سے آپ گفت گو کرنا چاہتے ہیں، اس کی ترتیب وہی ہو جو آپ کو پسند ہو اگر اسے بیان کرتے وقت آپ کے وجدان میں یہ چیز تازہ ہوگی، احساسات میں زندہ ہوگی اور دل کے اندر اس کے لئے نرم گوشہ ہوگا تو سامعین کے دلوں پر بہت اچھا اثر ڈالے گی بلکہ خود آپ بہت متاثر ہوں گے دوسری طرف معانی میں نشو وارتقاء ہوگا۔ آپ کے اندر وہ بیٹھ جائیں گے اور بار بار لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے آپ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوگا اور آپ کے لئے استشہاد و استدلال آسان ہو جائے گا۔

میں آخر میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ آپ ان تمام آیات کو جمع کرلیجئے جو ایک ہی مفہوم یا ملتا جلتا مفہوم بتاتی ہیں اس طرح کہ ایک گروپ میں جمع کر کے اس موضوع کے تمام عناصر مکمل کر لئے جائیں اور یہ کام بغیر تکلف اور زحمت کے بتدریج کیجئے، آغاز کار کے طور پر امام ابن کثیر کی تفسیر آپ کو مدد بہم پہنچائے گی پھر انشاء اللہ آپ کی کتاب خود ہی اس طرح کے معانی سے بھرپور ہوگی۔ ہم نے بتدریج یہ کام کرنے کی نصیحت کی ہے اس لئے کہ بتدریج کام کرنے سے مقصد پر ذہن و دماغ مرکوز ہو جاتا ہے اور کتاب میں آنے سے پہلے آپ کے عقل میں موضوع آجاتا ہے اور آپ کا استشہاد اسی وقت مکمل ہوتا ہے، منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اللہ ہی اچھے راستے کی توفیق دینے والا ہے۔

چھٹی نصیحت

یہ ہے کہ آپ قرآن پڑھیں تو آپ کا اعلیٰ و اوّلین مقصد آخرت کے لئے تیاری ہو۔ ہم نے اوپر جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے چاہے وہ قرآن میں خدائی روح ہو یا جہاد کے قصے ہوں، یا اجتماعی ضوابط اور اصول ہوں یا دوسرے قوانین اور علوم و معارف ہوں یہ سب

مقصود بالذات نہیں ہیں۔ نہ اسلام کی مطلوبہ منزل ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ دلوں کو بیدار کیا جائے اور ہر معنوی یا مادّی وسیلہ کے ذریعہ ان کا احاطہ کیا جائے تاکہ دل زندہ اور تمام امراض سے محفوظ ہوں تاکہ ان کے ذریعہ آدمی آخری منزل تک پہنچ سکے۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ہر آیت میں اس مفہوم کو دیکھیں اس لئے کہ عبرت اسی سے مکمل ہو سکتی ہے اور اس کے بغیر ارشاد و توجیہ کا جمال نمایاں نہیں ہوگا۔ یہاں ضرورت استدلال کی ہے لیکن قارئین کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے اسی پر بس کرتے ہیں اور اللہ سے اس کے ہر اُس نام کے واسطے سے دُعا کرتے ہیں جسے اس نے اپنے لئے متعین کیا ہے، یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا کسی مخلوق کو اس کی تعلیم دی ہے یا اسے علمِ غیب میں اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے کہ وہ قرآنِ پاک کو ہم سب کے دلوں کی بہار بنادے، اس سے ہمارے غم دُور کردے اور ہماری آنکھوں میں روشنی تیز کردے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ۔

۲ — سُنّتِ مُطہّرہ

قرآن پاک کے بعد دُنیا و دین کے علوم کے لئے دوسرا مرجع سُنّت پاک ہے اور یہ قدسی صفات شخص کے اقوال و اعمال ہیں اور قرآن اور کائناتی آیات، قوانین اجتماع و معاشرت اور نفوس کی بیماریوں اور زندگی کی مشکلات و مسائل اور متعدد قسم کی اصلاحات کے فہم و شعور کے عظیم تجربات کا کامل خلاصہ ہیں۔ جب تم کسی کہنے والے کو سُنو کہ: اللہ کے رسولؐ نے فرمایا، تو اپنے کان کھڑے کر لو، اپنے تمام احساسات اور جذبات کو جمع کر لو اس لئے کہ تم سب سے سچی، نفع بخش اور پاکیزہ بات سُننے جا رہے ہو جسے ایک انسان نے کہی ہے ان صفات اور خوبیوں کی وجہ سے یہ ایک ایسا زبردست فائدہ ہے جس کے آگے دُنیا و مافیہا کے سارے فوائد ہیچ ہیں یہ عقلی و رُوحانی، اجتماعی و علمی ہر طرح کا فائدہ ہے جس میں ہر انسان اپنی تسکین کا سامان پا سکتا ہے اور مطلوب و محبوب منفعت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

یہاں میں ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو سیرت پر کام کرنے والے ہمارے بعض معاصرین کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے وہ یہ کہ حضور اکرمؐ کی تاریخ کسی علمی و تحقیقی شخصیت کی تاریخ نہیں ہے نہ میدانِ جنگ کے کسی سورما اور جنگجو کی تاریخ ہے ان لوگوں کی تاریخ ان اثرات و نتائج کا ذکر کرتی ہے جو ان کے ذاتی فعل اور نفسی عوامل سے اُبھرنے والے کارناموں سے عوامی زندگی پر پڑتے ہیں لیکن رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی تاریخ اللہ کے عمل کی تاریخ ہے جسے وہ اپنے ایک خدا پرست بندے کے ہاتھوں کرتا ہے اور اس بندے کو خود کسی چیز پر اختیار نہیں ہوتا، وہ بات کرتا ہے تو اپنے جی سے بات نہیں کرتا اور میدانِ جنگ میں جب تیر اندازی کر رہا ہوتا ہے تو در اصل اللہ کی طاقت یہ سب کچھ کر رہی ہوتی ہے۔

۱

در اصل نبوی دور کی کچھ الگ ہی خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے تاریخ کے دوسرے ادوار سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ تاریخ کے عام ادوار میں تو روزمرہ کے انسان، افراد اور جماعتیں، اور قومیں اور قبیلے اپنا کردار ادا کرتے ہیں لیکن یہ نبوی دور ایسا ہے جس میں وہ عوامل اور خصوصیات کام کرتی ہیں جو عام انسانوں کی رسائی سے بلند ہوتی ہیں اس لئے یہ بڑی فحش غلطی ہوگی اگر ہم سیرت نبوی کا مطالعہ تاریخ کے دوسرے ادوار کی طرح کرنے لگیں۔

اس وقت مطالعہ کی غلطی ایسی بنیاد پر قائم ہوگی جو صحیح نہیں ہوگی یا سرے سے کوئی اس کی بنیاد ہی نہیں ہوگی اس لئے کہ ان مختلف عوامل کو برابر رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل واقعہ کو باطل کر دیا جائے جس سے عقل انکار کرتی ہے اور اس کی بنیاد پر کوئی نتیجہ نکالنے سے ابا کرتی ہے۔

یہ مطالعہ اس لئے بھی غلط ہے ـــــ کیونکہ یہ ہمارے سامنے حقیقت کے خلاف نتائج لاتا ہے ـــــ کہ یہ ہمیں خیر و قوت کے سرچشموں، معرفت کے مآخذ اور حق کے ان نوامیس سے دور رکھتا ہے جو محیر العقول انداز میں ایمان کی مرغوبات اور یقین کی رضا پر لبیک کہتے ہیں ان نوامیس اور منطق کے خلاف جن سے ہم مانوس ہیں اور

یہی سیرت نبوی سے عبرت و نصیحت اور حقیقت کے مقامات ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ سیرت کا مطالعہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ یہ ایک عظیم جدوجہد کا ثمرہ ہے اور اس مضبوط و مستحکم شخص کے بقیات ہیں جس نے خیر کو پسند کیا، صلح و آشتی، آزادی و مساوات کو محبوب رکھا اور اس سے نسلوں پر زبردست اثرات ڈالے لیکن یہ ان حقائق، محرکات اور مقاصد کی کنہ سے بہت دور ہے جس میں اور جس کی خاطر رسول اکرم ﷺ جیتے تھے اور ان حقائق کی حقیقت سے بہت پست ہے جو آپ کے ذہن و ضمیر میں علی الاعلان موجود تھے جنہوں نے معاملات کے بارے میں غور و فکر کا انداز بدل دیا اور ایسی عقل و منطق سے انہیں ممتاز کر دیا جو دوسرے کو کہاں حاصل ہو سکتی تھی اور آپ کی گھٹی میں وہ بہترین ادب پلا دیا جس نے علم و حکمت کے شہ پارے جمع کر دیئے چنانچہ آپ کا برتاؤ، آپ کے تصرفات جنہیں لوگ معمولی یا غیر معمولی سمجھتے ہیں، یہ سب مردِ مومن کی اس نگاہِ دُور رس کا کرشمہ تھے جو ہر معاملہ کی حقیقت تک پہنچ جاتی تھی اور ہر چیز کے بارے میں وہ نتیجہ نکال لیتی تھی جس تک بڑے بڑے علامۂ دہر نہ پہنچ سکے۔

(۲)

اللہ کے بندے تھے

عبودیت کا لفظ سامنے آتا ہے تو ذہن میں اس کی ایک دُھندلی تصویر آ کر رہ جاتی ہے۔ یا کوئی لاغر و نحیف آئیڈیل ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے یا ہم اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن رسول اکرم ﷺ کے وجدان و شعور اور عقل و منطق میں عبودیت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود تھی اور آفتابِ ضیا بار کی طرح یہ حقیقت آپ کے پورے وجود میں روشن

رہتی تھی، کبھی آپ سے او جھل ہونے کا نام تک نہ لیتی تھی اس سے آپ کے اندر وہ بلند احساسات اور پاکیزہ جذبات پروان چڑھے جن کا جہل و غرور کے حاملین میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

عبودیت کا یہ شعور آپ کے اندر اس طرح رچ بس گیا تھا جس طرح غلام کے اندر اپنے آقا کے ماتحت ہو کر کام کرنے کا تصور جم جاتا ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں رہ جاتا۔ اور حکم معلوم ہو جانے کے بعد اس کے لئے تعمیل و اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہ شعور آپ کے اندر پوری طرح واضح تھا اور آپ کے احساس میں پوری طرح مرکوز تھا چنانچہ آپ خوف اور جنگ کے موقع پر اعتمادِ کامل سے محروم نہ ہوتے اور آپ کے ایمان میں کوئی کمی نہ آتی۔ اسی طرح نصرت و فتح کے مواقع پر تکبر اور غرور سے محفوظ رہتے چنانچہ خشوع و خضوع اور شکر و سپاس سے تجاوز نہ کرتے۔ مدح و ثنا کی جگہوں پر لوگوں کے درمیان اپنے کو برابر حیثیت دے کر تکبر سے بچتے تھے آپ اس بات سے سختی سے روکتے تھے کہ بادشاہوں کی طرح آپ کی تعظیم کی جائے، اور دوسرے انبیاء پر فضیلت دی جائے اور اُس غلو اور افراط سے اپنا دامن بچائے رکھتے جو الوہیت کے مقام تک آپ کو پہنچا سکے۔ یہ چیز آپ کے اخلاق و کردار میں، نرمی و انکسار، سچائی و پاکیزگی اور قوت و طاقت عقل کے جوہر کے استعمال اور اسے اوہام و خرافات سے بچانے کی کوشش، محض فطرت کے فیصلے سے عام سلوک و برتاؤ کو قائم کرنے کی جد و جہد غرضیکہ ہر چیز میں نظر آتی ہے۔ نفسی و معاشرتی آداب و قواعد سے آپ حد درجہ آراستہ تھے اور عبودیت اور عبدیت کا یہ احساس ہمیشہ تازہ رہتا تھا۔

جب تک رسولِ اکرمؐ کی سیرت کے مطالعے میں اس چیز کو مستحضر نہیں رکھیں گے،

ہمارے اوپر اس سیرت کی سچائی نکھر نہ سکے گی اور عبرت و نصیحت کے مآخذ اور انقلاب و اصلاح کے مقامات ہماری آنکھوں سے اوجھل رہیں گے۔

۳

اللہ کے رسول تھے

یہ لفظ (رسول اللہ) اسلام کے ہر دور اور نسل میں بار بار استعمال ہوا ہے اور لوگوں کی زبانوں پر جاری و ساری رہا ہے یہاں تک کہ یہ اصطلاح بن چکا ہے جس کی کوئی واضح صورت ذہن میں موجود ہے نہ اس کے معنیٰ کی عظمت پائی جاتی ہے بلکہ یہ جامد گودنے کے عمل کی طرح ایک نشان بن چکا ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس میں ہاتھ اِدھر اُدھر چلتا رہتا ہے اور اِس میں زبان بغیر معنیٰ کا خیال کیے چلتی رہتی ہے۔

ایک انصاف پسند محقق آپ کی رسالت کی سچائی کے حق میں دلائل فراہم کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ صبر کے ساتھ آپ کے مختلف اقوال و تصرفات کا مطالعہ کرے۔ یہ سارے اعمال اور اقوال ایک وحدت کی طرف لے جاتے ہیں جو آپ کے ہر قول و عمل میں پائی جاتی ہے ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے اور ان میں ایک ہی وجدان کی جھلکیاں ملتی ہیں اور وہ "انسانی رسول" کا وجدان ہے اس شخص کا وجدان نہیں جو اپنے اندرون کی انگیخت سے کام کرتا ہے اور ہر معاملہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ کو جس دن سے تبلیغ و دعوت کا حکم ملا، آپ کے شعور میں حقیقت "رسول" کا اہم معنیٰ جاگزیں ہو گیا، آپ کے ذہن سے کبھی یہ معنیٰ غائب نہیں ہوا نہ وجدان سے یہ حقیقت کبھی اوجھل ہوئی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی طرف سے تبلیغ و دعوت کے کاز پر مامور ہیں۔ آپ اپنے تمام اوقات میں اور سارے ہی حالات میں اللہ کے رسول تھے

اس معنیٰ کی وسیع ترین مشمولات اور خصوصیات آپ کے اندر موجود تھیں، اس کے تمام تقاضے اور ظاہری و باطنی شرائط آپ کے اندر پائی جاتی تھیں آپ کا ہر قول اور ہر عمل اس معنیٰ سے صادر ہوتا تھا جس پر "رسول" کی چھاپ لگی ہوتی تھی اور ہر وقت یہ ذمہ داری آپ کے ذہن میں تازہ رہتی تھی کہ آپ کا کام بس پہنچا دینا ہے اور آپ کو یہ مطلق اختیار نہیں ہے کہ ایک حرف کا اس میں اضافہ کر سکیں یا ایک کلمہ اس میں سے کم کر دیں۔ اور اس رسالت کی جو چیزیں واجب مدح و تعظیم تھیں، عقل کہتی ہے کہ ان تمام تعریفوں اور تعظیمات کو اللہ کی طرف موڑ دیا جائے جو اس رسالت کو بھیج کر احسان کر رہا ہے۔ سچائی اور شرافت یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی چیز کا رسول اپنے لئے دعویٰ کرے یا کسی تعظیم اور ثنا کو قبول کرے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ اس معنیٰ و مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہر فضل و احسان کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اور اپنے آپ کو اس بات سے بری قرار دیتے تھے کہ اس رسالت میں ان کا کوئی اثر ہو الّا یہ کہ تبلیغ آپ کی ذمہ داری تھی۔۔۔۔۔''

جھوٹے دعویدار اور بناوٹی سورما اور فلاسفہ کبھی کبھی بھول جاتے ہیں اور وہ غلطی کر جاتے ہیں جس سے انہیں بچنا تھا اور اس کی وجہ سے اپنے بیشتر اقوال و افعال میں جس چھاپ کو انہوں نے باقی رکھا تھا وہ باقی نہیں رہ پاتی اور اس طرح تناقض اور تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور ان کا جھوٹ طشت از بام ہو جاتا ہے۔

لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل ایک دوسرے کے مطابق تھا۔ آپ کے سارے اقوال و افعال ایک ہی وجدان سے صادر ہوتے تھے اور وہ رسالت کا وجدان تھا۔

چونکہ رسول اکرمؐ کی سیرت میں اس وجدان کا واضح ہونا آپ کی رسالت کی سچائی کی دلیل ہے اس لئے وہ ہمارے باب میں ایک قسم کی راست روی اور واجب کا فہم وشعور حاصل کرتا ہے جس سے جادہ واضح ہو جاتا ہے، منزل کے نقوش نمایاں اور جلی ہو جاتے ہیں پھر فہم میں کوئی التباس نہیں رہتا، راستے سے بھٹکنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا نہ واجبات میں کوئی کوتاہی یا سستی رہ جاتی ہے۔ اس دائرے میں حقائق قابلِ احترام ہوتے ہیں، فضل فضل والے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور سوسائٹی ان لوگوں کی آفت سے محفوظ رہتی ہے جو ان کاموں پر تعریف کروانا چاہتے ہیں جو وہ نہیں کرتے۔

سیرتِ نبوی کے مطالعہ میں اس مفہوم کو نظر انداز کرنے سے ہمارے ہاتھوں چھلکے کے سوا اور کچھ نہیں آسکتا پھر تو اس سے جذبات بیدار ہوں گے نہ بصیرت میں روشنی آئے گی نہ عزائم اور ارادے بلند ہوں گے۔

۴

اخلاق کی پاکیزگی اور بصیرت کی روشنی

اوپر کی سطروں سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ارادہ اور عزم سے خالی تھے، عقل وخلق کی خصوصیات سے نابلد تھے، نہیں، حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ آپ کا اخلاق کیسا تھا؟ تو انہوں نے فرمایا: "آپ کا اخلاق قرآن تھا،"

اور قرآن حکمت وعلم اور اخلاق وکردار سب پر مشتمل ہے اور عقیدہ وعبادت اور مختلف معاملات کا ایک جامع دستور ہے۔

رسول اکرمؐ اپنی عقل کی پختگی، طبیعت کی سادگی اور فطرت کی سلامت میں پوری انسانیت کا مکمل تھے اللہ نے اپنی تربیت و پرورش میں انہیں مکمل نمونہ بنایا تھا

جیساکہ قرآن میں اس نے کہا ہے۔ چنانچہ عمدہ اخلاق کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں، طبیعت کی پاکیزگی کی جو اعلیٰ ترین مثال مل سکتی ہے، مخفی معاملات میں جتنی دور رس نگاہ ہو سکتی ہے حلم و سنجیدگی، عزم و جزم، حق کی سچی معرفت اور تمیز اور قدسی توشہ کا اصل ذوق، جس سے ضمیر سعادت مند ہوتا اور رُوح خوش ہوتی ہے سب کی بھرپور مقدار آپ کی ذات میں موجود تھی اور اللہ نے کامل نمونہ کے مطابق آپ کی پرورش کی تھی اور قرآن میں جو اصول و اقدار اور سیدھی و سچی تصویر کھینچی گئی ہے اس سے آپ ہم آہنگ تھے۔ آپ پوری انسانیت کے لئے افضل ترین نمونہ، قرآن کی سچی تمثیل، اور ظاہری و باطنی، مخفی و علانیہ زندگی میں تقلید کے لئے موزوں ترین شخص تھے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (انعام: ۱۲۴)

(اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کا کام کس سے لے۔)

جو شخص بعثت سے پہلے کی آپ کی زندگی کا مطالعہ کرے گا وہ ہمارے اس قول کی تصدیق کرے گا۔ کوئی بنجر اور بہرا گونگا برتن نہ تھا جس میں رسالت انڈیل دی گئی تھی بلکہ زندہ و بیدار، ادراک و ارادہ کی مالک، راست رو فطرت تھی جو سچے اصولوں پر قائم تھی اور عقل و شعور، جذبات و احساسات اور اخلاق و کردار میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔

چونکہ قرآنی معارف نے اس میں برکت عطا کی اور آپ کو علم و حکمت، اخلاق عظیم کی صلاحیتیں اور جمال ربّانی کے عطیات دیئے اس لئے آپ کے دل و دماغ اور ضمیر میں عبودیت اور رسالت کا جو مفہوم جاگزیں ہوا وہ ایک دوسری چیز تھی جو اُن ذاتی خوبیوں پر وارد ہوئی جن کے لئے اس نے عام احاطہ کی قائم مقامی کی اور اس کے اردگرد موافق و مخالف، نواہی و اوامر کے تمام حدود کھینچ دیئے اور عقل و وجدان کے دائرے بنا دیئے اور کن چیزوں کو

اختیار کرنا ہے اور کن چیزوں کو چھوڑنا ہے اس کی صراحت کردی اس لئے رسول کا معاملہ اس شخص سے مختلف ہوتا ہے جو خود سے معاملات کو دیکھتا ہے اور دوسری تمام بندشوں سے آزاد ہوتا ہے۔

سفیر جو کسی غیر ملکی گروہ یا ملک کے پاس اپنے ملک کی نمائندگی کرتا ہے، اپنے سلوک و برتاؤ اور مظاہر میں ان متعینہ ہیئتوں کا پابند ہوتا ہے جن کو اس کی ذمہ داری لازم ٹھہراتی ہے اور مسائل کو سمجھنے سمجھانے اور حل کرنے میں وہ اپنی اُمت کی رائے اور اپنی مملکت کی تجویز کا پابند ہوتا ہے، اسے اپنی رائے اور مرضی کو دبانا پڑتا ہے اور اپنے ذاتی خیال کو کچل دینا ہوتا ہے اس لئے کہ مملکت مختلف معاملات اور مصالح کے تقاضوں کو زیادہ وسیع پیمانے پر احاطہ کرتی ہے جن میں کچھ اسے معلوم ہوتے ہیں اور کچھ اس کے علم سے باہر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ سفارت کی خدمت انجام دینے سے پہلے اور بعد میں وہ ہر حسّی یا معنوی بندش جو سلوک و برتاؤ کے قواعد اور نظر و فکر کی منطق سے متعلق ہیں، سے آزاد ہوگا، گرچہ ان دونوں میں یہاں ایک عظیم فرق ہے وہ یہ کہ رسول اکرمؐ کی فطرت وحی الٰہی کی ترجمان تھی اسے کسی ایسے کام پر آمادہ نہیں کیا گیا جسے وہ ناپسند کرتی ہو نہ کسی ایسی چیز کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالا گیا بلکہ رسول اکرمؐ کی ہر خواہش کار رسالت سے ہم آہنگ تھی۔ چنانچہ جب سفارت نے معاملات سے نمٹنے میں ایک خاص منطق کے اندر آپؐ کو محدود کردیا تو یہ آپ کے لئے دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیاز ہوگیا اور آپ کے سامنے نظر و فکر کے وہ تمام دروازے کھل گئے جن سے آپ نے منزلِ مقصود اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جو دوسروں کے بس کی بات ہرگز نہ تھی۔

ہم اس رسالت کے ایک مرحلہ میں دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ میں چودہ سو[۱۴۰۰] صحابہ آپ

کے ساتھ ہیں لیکن اس صلح پر ابو بکر صدیقؓ کے سوا کوئی راضی نہیں ہے۔ اس صلح کے مخالفین میں سرفہرست عمر بن خطابؓ ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے جو فیصلہ کیا تھا اس کے ظاہر سے یہ لوگ اختلاف رکھتے تھے اس لیئے کہ ابو بکرؓ کے بقول "ان کا خیال اور تصور اس چیز تک نہ پہنچ سکا جو محمدؐ اور ان کے رب کے درمیان تھی۔"

خود اسی موقف کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے سیرت نگار اس صلح پر ٹھہر جاتے ہیں جس کا آپ نے مظاہرہ کیا اور جسے اس موقعہ پر آپ نے اختیار کیا اور اس کی خوب تعریف کرتے ہیں اور اسے آپ کی عظیم ترین عظمت اور بلندی سمجھتے ہیں اور اس کے ماوراء پر غور نہیں کرتے لیکن ظاہر ہے کہ ان چیزوں پر رک جانے سے وہ حکمت سمجھ میں نہیں آسکتی جو اس میں ملحوظ رہتی ہے اور یہ عاجزی و درماندگی ہر اس شخص کا دامن تھام لیتی ہے جو سیرت پاک میں عبودیت کے معنیٰ کو اختیار نہ کرے۔ اس لئے کہ قابلِ لحاظ چیز جنگ یا صلح نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ آدمی کی زندگی میں بلند اقدار ہوں اور وہی اقدار اس کے ارادوں اور عزائم کو مہمیز کریں، اگر اسے جنگ کرنے کے لئے کہیں تو شیرِ ببر بن کر میدان میں کود پڑے اور اگر صلح و آشتی کا تقاضا کریں تو جوئے نغمہ خواں ہو جائے۔ کتنی ہی جنگیں انسانیت کے حق میں صلح سے بہتر ہوتی ہیں اور لوگ اچھی حالت میں ہوتے ہیں جب تک ان کے پاس ایسے اقدار ہوتے ہیں جن کی راہ میں وہ موت کو ترجیح دے سکیں جیسا کہ ان کی خاطر وہ زندگی کا انتخاب کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتے۔ انہی اقدار اور بلند مقاصد کو صلح حدیبیہ میں آپؐ نے ملحوظ رکھا تھا۔

۵

ایک چیز اور ہے جسے ایک محقق کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے جب وہ سیرت نبویؐ کا

مطالعہ کرے میری مراد رُوح کے نوامیس اور عالمِ غیب کی برکتوں سے ہے۔

رُوح، رب کے حکم سے ہے اور غیب کی برکتیں حیلہ و تدبیر سے نہیں حاصل کی جاسکتیں نہ ہمارا عام ذہن ان تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جب ہم نے اس مقدمہ کے آغاز میں کہا تھا کہ "حق کے نوامیس ایمان کی مرغوبات اور یقین کی رضا پر حیرت انگیز انداز میں لبیک کہتے ہیں برخلاف ان نوامیس اور منطق کے جن سے ہم مانوس ہیں" وہاں غیب کی برکتوں اور عالم ارواح کی حقیقتوں سے ہماری مراد رسالت کا مغز اور پوری سیرت میں توجیہ وارشاد کا ضابطہ تھی۔

یہ عالم مادّہ اور رُوح دونوں پر مشتمل ہے اور رُوح مادہ کا اصل ہے اور اس کے نوامیس اور اندازوں کا محافظ ہے اور انسان بھی مادہ اور رُوح کا مرکب ہے اور اس کی روح مادہ کی اصل ہے اور اس کے اندر سیادت و قیادت اور اس سرزمین کی تمام مخلوقات پر شرف و امتیاز کا سرچشمہ موجود ہے۔

انسان کا اپنے ظاہری و باطنی یعنی مادی و روحانی وجود سے تعلق قائم رکھنا ہی زندگی کا وہ آئیڈیل طریقہ کار ہے جس سے انسان کا ظاہری و باطنی مکمل وجود حاصل ہوتا ہے اس کے بغیر وہ ایک بیکار وجود ہے جس میں کوئی خیر نہیں پایا جاتا کیونکہ انسان کی زندگی خشک محسوسات کے دائرے میں مقید ہو جاتی ہے اور اپنا اکثر وجود اور بہتیری صلاحیتیں کھو بیٹھتی ہے بلکہ اس کا پورا وجود نیست ہو جاتا ہے جب ہم ان چیزوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم کرتے ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ مثالی تاریخی شخصیت ہیں جنہوں نے زندگی کے ظاہر و باطن تمام معاملات میں مکمل وجود کا ثبوت دیا اور حد درجہ حکمت و مہارت

کے ساتھ عالمِ غیب وشہود کی تمام چیزیں اخذ کیں جس کی وجہ سے حسبِ منشا کائنات کے قوانین آپ کے مطیع ہو گئے اور آپ کو تائید و نصرت اور فتح سے نوازا گیا اور زمین و آسمان کی برکتیں آپ کے حصے میں آئیں۔

اس طبعی دُنیا کی کچھ طاقتیں ہیں اور ان کے کچھ قوانین ہیں اور ہماری زندگی پر ان کے کچھ اثرات ہیں اور واقعاتی آثار ہیں جو سمجھے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں اسی طرح ماوراء طبیعت دُنیا یعنی غیب اور معنوی حقائق کی دنیا کی کچھ قوتیں ہیں اور ان کی طاقتوں کے کچھ قوانین اور ہماری زندگی میں ان کی کچھ مداخلت پائی جاتی ہے اور واقعاتی آثار بھی ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں، ان کی حقیقت میں، سُنتوں اور قوانین میں اور ان سے انسان کے تعلقات میں کافی فرق ہے۔

لیکن اکثر لوگوں نے بس طبعی دُنیا سے ربط رکھا اور اس دنیا کی طاقتوں سے معاملہ کیا، رہی دوسری دُنیا اور اس کی قوتیں اور قوانین تو ان تک پہنچنے سے ان کے ارادے اور عزائم عاجز رہے اور ان سے معاملہ نہ کر سکے اسی لئے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اس دوسری دُنیا کے اثرات سے خالی نظر آتی ہے، اسی لئے انہیں کبھی بھولے سے بھی اس کی یاد نہیں آتی اور جب وہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو ہر ایک دوسری دُنیا کے تصور کے خلاف ہی بات کرتا ہے۔ گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور وہ محض خیالی اور عجز و درماندگی کی دُنیا کی باتیں ہیں۔

ہم کہتے ہیں: یہ رسول اکرمؐ ہی وہ راست تاریخی نمونہ تھے جنہوں نے عالم طبعی اور عالمِ غیب دونوں سے اپنا ربط رکھا اور ان دونوں میں اپنا وجود اور ان دونوں کے ساتھ اپنا معاملہ اور برتاؤ ثابت کر دیا۔ اور ان سب سے ہر ایک کے قوانین کی

روشنی میں اپنا لائحہ عمل مُرتب کیا۔ اور غیب کی قوتیں، ان کے عجیب و غریب اثرات اور آپ کی زندگی کا ان کا احاطہ کیے رہنا، کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی نگاہ سے اوجھل نہ رہا اور وحی الٰہی برابر آپ کو اس کی طرف توجہ دلاتی رہی اور تخلیق و محنت، نصرت و فتح، غلبہ و تمکن، خوشحالی و فارغ البالی اور ہر مقصد میں کامیابی میں اس کے اثرات و خصوصیات کو نمایاں کرتی رہی:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝

(طلاق: ۴)

(جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے۔)

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۝ (طلاق: ۳)

(جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔)

یہ وہ پانچ خصوصیات اور عوامل ہیں جن سے اللہ نے اپنے رسول کو ممتاز کیا۔ آپ انسانوں ہی کی مانند ایک انسان تھے چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے لیکن ان خصوصیات نے آپ کے باطن اور آپ کی سیرت کو پاکیزگی اور آپ کی فکر کو معانی کے غیب تک سرایت کر جانے اور مشیّتِ الٰہی کے پابند ہونے کے لحاظ سے دوسروں کے باطن اور سیرتوں سے بہت بلند کر دیا۔ اگر ہم آپ کی سیرت میں حق و راستی تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات مستحضر رکھنی چاہیئے کہ یہ معزز سیرت —— بعد از وحی —— ان خصوصیات کی تشکیل کردہ ہے جو الٰہی تربیت اور نبوّت کے لئے خدائی انتظام اور تیاری کا

نتیجہ تھیں کہ یہی سچا اور محفوظ طریقہ ہے۔

اور اس مقام پر گنجائش نہیں ہے کہ ہم آپ کی زندگی میں ہر خصوصیت کے اثرات کا ذکر کریں نہ اس کا موقع ہے کہ اس پاکیزہ اور مقدس سیرت میں ان کے عمل و فعل کی مثالیں دیں۔ ہم میں سے ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے ضمیر و ذہن میں یہ مستحضر رکھے کہ وہ ان خصوصیات کے نتائج کا مطالعہ کر رہا ہے عنقریب اسے اس پاکیزہ اور روشن سیرت کے معجزات نظر آئیں گے اور ہم اپنی عقلوں کو منزہ قرار دیتے ہیں اور سیرت رسول کو بھی کہ ہم اس کا اُس طرح مطالعہ کریں جس طرح عام تاریخ کے حقائق کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ممتاز و نمایاں رجال تاریخ کی زندگیاں پڑھی جاتی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

سُنّتِ رسول کے یہ الٰہی آفاق عبرت و نصیحت اور واقعات سے معمور ہیں جو قلب اور عقیدہ کو مخاطب کرتے ہیں اور اس مادّی عقل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو صرف مادہ کے قوانین کے سامنے جھکتی ہے اسی لئے دورِ جدید کے محققین، مدرس اور اساتذہ ماورا طبیعت حقیقتوں پر ایمان نہیں لاتے، مثال کے طور پر جنگِ بدر کے دن فرشتوں کی مدد اور ان کی معرکہ آرائی اور مشرکین کی آنکھوں پر پردہ پڑ جانے کے واقعات ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتے اس لئے کہ مادی قوانین کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی اور اس لئے کہ اللہ کا فعل ہے جو مادہ اور غیر مادہ دونوں کا مُہیمن و محافظ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ ان واقعات سے ایسے گزر جاتے ہیں جیسے انہوں نے اسے نہیں دیکھا اور دل میں اس کے منکر ہیں اس لئے آپ کا معاملہ ان سے مختلف ہونا چاہیئے آپ رسول کریمؐ کے واقعات میں ہمیشہ دو پہلوؤں کو تلاش کیجئے: ایک تو خدائی عوامل ہیں جن پر کوئی حجاب

نہیں ہے، دوسرے نفسی عوامل ہیں جو آپ کی ذات کے لئے خاص ہیں۔ ان دوسرے عوامل پر اگرچہ آپ کی ذاتی چھاپ ہے اس لئے کہ یہ آپ کے قلب کے خیالات اور آپ کے نفس کے عزائم ہیں لیکن یہ بھی الہامی اور ربانی ہیں اس لئے کہ آپ کے احساسات وجذبات اپنے رب سے ہمیشہ جڑے رہتے ہیں، پہلے عوامل بے حجاب ربانی ہیں جبکہ دوسرے بالواسطہ ربانی ہیں۔ جن کی بے حجابی انہی لوگوں پر منکشف ہوتی ہے جو بین السطور حقائق کو بھی پڑھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے اس طرح کے سینوں میں اللہ کے انوار کی ضیاباری کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں نے یہ باتیں آپ کو اس لئے بتائی ہیں تاکہ اس حقیقت کی روشنی میں آپ نبوی دور کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور دوسرا مقصد یہ پیش نظر تھا کہ آپ کو علمی طور پر معلوم ہو جائے کہ جو شخص دنیا میں اپنے معدہ اور حیوانی جوارح کے اشارے پر زندگی بسر کرنے کے بجائے خدائی احساسات کے الہام کے تحت زندگی بتلائے، اپنی ہوائے نفس سے کام کرنے کی بجائے اللہ کے حکم کے مطابق کرے، اپنے ذاتی مفادات اور مرغوبات کی خاطر لڑنے کی بجائے حق کی راہ میں اور حق کی خاطر جہاد کرے، اس شخص کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں ہو سکتا، اسے لامحالہ اللہ کی نصرت حاصل ہوگی اور آسمان وزمین کی تمام مخفی اور ظاہر فوجیں اس کی تائید کریں گی میرے بھائی اسے سمجھ لیجئے یہ ان علمی حقائق کا لب لباب ہے جن کے شواہد اور دلائل سیرت رسول میں نمایاں نظر آئیں گے۔ یہیں سے آپ کے اندر اس بات کی زبردست خواہش ہونی چاہیئے کہ اپنی زندگی کو ان فوجوں کی تائید سے معمور کرلیں اور اللہ کی نصرت سے کنارہ کش نہ ہوں جیسا کہ بے نور جاہل اس کی نصرت سے دور ہیں۔

میرے بھائی! خیر آپ کے سامنے ہے، اس کے اور آپ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے بس اپنے ربانی ہاتھ کو پھیلا دیجئے اور اسے اخذ کر لیجئے۔ یہ تو آپ کی علمی تاریخ کے سلسلہ میں چند باتیں تھیں، اسی طرح ہم آپ کی قولی تاریخ کے سلسلے میں بھی کہتے ہیں۔ آپ کی باتیں دوسرے عام انسانوں کی سی باتیں نہیں ہیں۔ اگر اللہ کا رسول یہ کہتا ہے کہ ذکر کی مجلسوں کو فرشتے گھیرے ہیں لئے رہتے ہیں تو یقین کیجئے کہ یہ بنی برحق ہے اس ہیں کوئی مجاز یا کنایہ نہیں ہے اس لئے کہ وہ آپ سے وہی باتیں کہتا ہے جو اسے معلوم ہیں اور اسے ساری باتیں اللہ ہی سے معلوم ہوتی ہیں۔

اور جب مومن پیٹھ پیچھے اپنے بھائی کے لئے دُعا کرتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ اور جو دُعا آپ نے کی ہے وہی آپ پر بھی منطبق ہوتی ہے اسی لئے وہ لامحالہ قبول ہوگی اور اگر اللہ کے رسول کسی عمل پر جزا کا وعدہ کرتے ہیں یا کوئی حقیقت بیان کرتے ہیں یا کوئی نصیحت کرتے ہیں تو بلاشبہ یہ حق ہے۔ جب آپ سُنّت کو اس انداز سے پڑھیں گے تو اسلام کے حقائق اور اسرار و رموز کو اسی طرح یا اس سے قریب تر سمجھ سکیں گے جس طرح صحابہ نے سمجھا تھا اور آپ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ قرآن کریم کی بشارت کے سامنے اپنے نفس کو پیش کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو آپؐ کے اُسوہ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۳ — تاریخ وسیَر

(قوموں اور ملتوں کی تاریخ اور بڑے لوگوں کے کارنامے)

مقصد یہ نہیں ہے کہ داعی تاریخ پر اس طرح نظر ڈالے جس طرح ایک مدرّس نظر ڈالتا ہے وہ تاریخ کی معلومات کو علمی انداز میں اور مرتب ڈھنگ سے جمع کرتا ہے پھر انہیں اپنے طلبہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اور مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ داعی ظرافت کا مظاہرہ کرے اور وقت کاٹنے کے لئے قصے بیان کرے۔ اس لئے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس گھٹیا طریقہ کار کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ قصہ پر قصہ سُناتے چلے جاتے ہیں حالانکہ ان میں کوئی ربط ہوتا ہے نہ ان سے کوئی مقصد پیشِ نظر رہتا ہے۔

داعی تاریخ کا مطالعہ اس نہج سے کرے کہ یہ انسانیت کی خطا و صواب اور ہدایت و ضلالت اور ان کے انجام کا مخزن اور ریکارڈ ہے اور اس سے وہ اپنے موضوع کے لئے کچھ مقدار میں اخذ کرے۔

دیکھئے قرآن کریم نے اس سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا ہے؟ یہی ہم چاہتے ہیں۔

قرآن میں قصوں کو بیان کرنے اور تاریخ کے اوراق الٹنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بس قرون ماضیہ کے حالات معلوم ہو جائیں بلکہ اعلیٰ ترین مقصد انسانیت کا علاج ہے

کیونکہ انسان کے اندر اصل فطرت اور معرفت کے معیار کو وہ پالیتا ہے، ان کی تاریخ بیان کرتا ہے، ان کے اثرات کا تذکرہ کرتا ہے اور ماحول میں اس سے پیدا ہونے والے خیر وشر کا ذکر کرتا ہے۔

رہیں عارضی فطرتیں اور تغیر پذیر طبیعتیں تو ان کی تاریخ کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ملتا اس لئے کہ زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ ان میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے اور یہ اپنا اثر کھو بیٹھتی ہیں جبکہ قرآن قیامت تک کے لئے الہامی کتاب ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ادراک کے انہی معیارات اور اسی اصل فطرت کے اعمال کا لحاظ کرے جو ہر زمانے اور ماحول میں انسان کے ساتھ رہے اور جو تعمیر وتشکیل کے جوہر میں ایک دوسرے کی مشابہ انسانیت کا مجموعہ بنی آدم کو دے سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ان فطرتوں اور معیارات کے بنی آدم میں وحدت کی لڑی میں پروئے ہونے کے باوجود مختلف ماحول اور حالات کی وجہ سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور عقل کی بعض خصوصیات ان کے عمل کی ادائیگی سے عاجز ہیں لیکن ان کے متعدد ہونے اور مظاہر اور صورتوں میں فرق واقع ہونے کے باوجود آپ اپنے سامنے ظاہر ہونے والی چیزوں کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں اور انہیں ان کی اصل محرکات تک لوٹا سکتے ہیں اور اس فطرت سے ملا سکتے ہیں جس نے اسے دعوت دی تھی یا اس کی وحی کی تھی۔

قرآن کریم حادثات کی تفصیل میں نہیں جاتا نہ واقعات کی باریکیاں بیان کرتا ہے بلکہ اس مغز پر ٹھہر جاتا ہے جو واقعہ کی جان ہے مثال کے طور پر جب وہ طالوت اور جالوت کا ذکر کرتا ہے تو تاریخی واقعات نقل کرتا ہے نہ وہ پس منظر بیان کرتا ہے جو آپ کو اس معرکہ کی پوری تصویر سے واقف کرا سکے اس لئے کہ ظاہری صورتیں لائق توجہ نہیں ہوتیں، البتہ

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو جاتا ہے کہ وہاں ایک قلیل گروہ تھا جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا جس کی تعداد کہیں زیادہ تھی، لیکن اللہ نے اہلِ ایمان کو کافروں پر غلبہ عطا کیا اور انہیں ذلیل و خوار کر دیا۔ سورہ بقرہ میں پورا قصہ پڑھ لیجئے آپ اسے عزائم اور اقدامات میں اور اللہ کی طرف سے نصرت نازل ہونے میں ایمان اور اس کے اثرات کے گرد گھومتے ہوئے پائیں گے اور اس سلسلہ میں جو جائے وقوع کی تفصیلات وغیرہ ہیں ان کو قرآن ایک کنارے چھوڑ دیتا ہے۔

اس طرح کے عمیق تاریخی تجزیہ کے لئے داعی کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی دعوت کا فہم اور اس کا شعور واضح طور سے رکھتا ہو، اپنے موضوع کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہو تا کہ اکتا دینے والی اور خلل پیدا کرنے والی چیزوں سے وہ احتراز کر سکے۔

ایک چیز بہت زیادہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ ایک تاریخی واقعہ سے مختلف معانی نکل سکتے ہیں۔ چنانچہ داعی اس کے مختلف پہلوؤں کو لے کر اسے مختلف مواقع پر بیان کرتا ہے اور ہر جگہ اس کے بیان کرنے کا انداز جُدا اور مختلف ہوتا ہے یہ چیز اس کی حکمت و مہارت اور بیداریٔ شعور پر دلالت کرتی ہے اس طرح کہ وہ ہر بار احساس کے نئے تار کو چھیڑ سکے مثال کے طور پر ہٹلر کی بیداری کو آپ کئی طرح سے بیان کر سکتے ہیں۔ آپ اسے اس وقت اپنے مقصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں جب آپ اس امر کی دلیل دے رہے ہوں کوئی قوم گرنے اور زوال میں چلی جانے کے بعد اسی وقت عروج و اقبال کو گلے لگا پاتی ہے جب اس کے سپوت اپنے عزائم مجتمع کر لیں اور اس کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں۔ اور اگر یہ عزم و حوصلہ قوم کے جوانوں میں نہ ہو تو یہ عظیم

مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

آپ اس انقلاب کو اس مقصد کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ فقر و محتاجی اور مفلسی اپنی جھونپڑی سے ایسے عباقرہ جنم دے سکتی ہے جو ایک پوری اُمت تشکیل کر سکتے اور انہیں ایک راہ پر گامزن کر سکتے ہیں اور انہیں اعلیٰ قیادت اور سیادت کے منصب پر فائز کر سکتے ہیں، ہٹلر کا اس کے معاصر سیاست دانوں اور لیڈروں سے مقابلہ کیا جائے تو وہ ایک جاہل یا نیم جاہل شخص تھا۔

اگر آپ باطل کے زوال اور اس کی سرعتِ ادبار پر گفتگو کر رہے ہوں تو نازی عقیدہ کو مثال کے طور پر بیان کر سکتے ہیں جس نے اپنی قوم کو سب سے برتر اور بہتر سمجھا اور ہمیں غلام اور نوکر چاکر۔ اور دعویٰ کیا کہ یہی فطرت کی رُوح اور وحی الٰہی ہے حالانکہ اللہ ان فرسودہ خیالات سے بَری ہے۔ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے ان میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور خدا ترس ہو:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ .

(انبیاء : ۱۸)

(بلکہ حق کی چوٹ ہم باطل پر لگاتے ہیں اور اس کا بھیجا نکال دیتے ہیں)

وَ يَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُوْرَهُ (توبہ : ۳۲)

(اور اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے)

اگر اس بیداری کے مختلف پہلوؤں کا استقصاء کرنے لگوں تو منزل سے بہت دُور جا پڑوں گا۔

تاریخ میں ایسے واقعات بھی ہمیں ملتے ہیں جو پہلی نظر میں معمولی نظر آتے ہیں لیکن جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو انسانی نفوس کی بہت سی جھلکیاں اور طبیعت کی بہت سی صفات ان میں نظر آتی ہیں اور کسی شخص یا جماعت کے لئے دلوں میں رجحانات وخیالات بھی ان سے معلوم ہوتے ہیں داعئ دین کی ذمہ داری ہے کہ اس کے لئے بیدار اور ہوشیار رہے۔

۴ـــروزمرہ کی زندگی کے واقعات

موجودہ عملی زندگی اس کی رواں دواں تاریخ ہے جو کسی دن اس کی ماضی کی تاریخ بن جائے گی اس میں خطا و صواب اور ہدایت و ضلالت اور ان کے اثرات پوشیدہ ہوتے ہیں اور یہ ماضی کی تاریخ سے اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ یہ زندگی کی حقیقت کو کتابوں کے صفحات کے بجائے آپ کی نگاہوں کے سامنے وجود کے صفحات پر زندہ اور عملی شکل میں پیش کرتی ہے جسے آپ کی نگاہ، آپ کی سماعت اور آپ کے احساسات اخذ کر سکتے ہیں اس کے ایک گوشہ میں اجمال اور دوسرے میں تفصیل نہیں ہوتی بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام واقعات آپ کی نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں جس سے معاشرے کے اجتماعی و اقتصادی قوانین کی صحت اور ان کا فساد پوری طرح آپ کے سامنے آجاتا ہے اور صلاح و فلاح کے نمونے بھی آپ کے سامنے رہتے ہیں جو رضائے الٰہی کی خاطر اپنے ہر قول و عمل میں سچائی اور دیانت داری کو اُسوہ بناتے ہیں، دوسری طرف وہ چور اور ڈاکو بھی آپ کی نظروں میں رہتے ہیں جو لوگوں میں رفعت اور فخر کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ آپ اس تاریخ کو روزانہ ہر راستے میں، ہر گلی میں، ہر گھر میں، ہر محکمہ میں اور نیک و بد ہر محفل میں پڑھتے ہیں اور یہ تاریخ اپنے عملی واقعاتی کپڑوں میں جلوہ گر رہتی ہے۔ اپنی دعوت کا شعور پیدا کرنے اور اپنے احساسات تیز کرنے کے بعد آپ کی ذمہ داری

ہے کہ تاریخ کی اس قسم پر غور کریں، اس کی محرکات و عوامل اور مقاصد کو نظر میں رکھیں، اس کے نتائج و اسباب کا تجزیہ کریں اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی فکر کی روشنی میں اسے ترتیب دیں، آپ کے پاس ڈائری ہونی چاہیئے جس میں زندگی کے اقتباسات آپ جمع کرلیں اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ڈائری کی جمع کردہ بعض مثالیں آپ کی گفتگو کو پُر جوش، قیمتی، پُر اثر اور مُدلل بنادیں گی۔

سب سے بہتر طریقہ ایک اخوانی بھائی کا تھا وہ اپنے جمعہ کے خطبے کو اپنی ہفت روزہ ڈائری سے ترتیب دیتا تھا اللہ تعالیٰ اسے مزید توفیق دے اور کامیابی و نصرت سے نوازے۔

چوتھا باب

۱ — لیکچر

۲ — درس

۳ — تقریر

۴ — مقالہ

۵ — روزمرّہ کی گفتگو

میں سمجھتا ہوں کہ لیکچر اور درس میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن لوگوں نے اس لحاظ سے دونوں میں تفریق کی ہے کہ لیکچر موضوع کے عناصر کا احاطہ کر لیتا ہے اور ان عناصر کے معانی میں پھیلاؤ اور تفصیل چاہتا ہے، لیکچرار کی توجہ مکمل اور بھرپور ہونی چاہیئے اور سامعین کو ایسی معلومات بہم پہنچانی چاہئیں جن سے کچھ نمایاں چیزیں ان کے سامنے آئیں اور مضبوط و مستحکم رہنمائی ملے اور لیکچر میں ترتیب اور نظم ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اس میں جذبات کا استعمال نہیں ہوتا نہ تحیر اور احساسات کو انگیخت کیا جاتا ہے جس سے بنیادی موضوع سے سامعین دور ہو جائیں جبکہ درس میں ان میں سے کچھ چیزوں کا استعمال ہوتا ہے اور اس سے درس کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

ان تمام چیزوں کے ساتھ پوری گفتگو میں خدائی رنگ غالب رہنا چاہیئے اس لئے کہ کائنات میں کوئی موضوع یا معاملہ ایسا نہیں ہے جس کا خدا سے تعلق نہ ہو اور اس میں خدائی رنگ کا ظہور اس تعلق کا حتمی اور ناگزیر تقاضا ہے، کسی بھی موضوع کو خدائی رنگ سے خالی کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو زندگی کو اللہ سے دُور رکھتے ہیں یا اللہ کو نعوذ باللہ زندگی میں دخل نہیں دینے دیتے اس طرح کی زندگی کھوٹ اور نقص سے بھر جاتی ہے اور اس کے بارے میں گفتگو بلا موضوع ہوتی ہے جس میں کوئی برکت ہوتی ہے نہ اس میں کوئی علم جھلکتا ہے۔

داعی کی باتوں میں اس رنگ کے حصول کے لئے ہم یہاں کچھ ہدایات دے رہے ہیں جنہیں وہ درس اور لیکچر میں اس خاص گفتگو کے لئے بطور مقدمہ اختیار

کرے جن کا تذکرہ ہم لیکچر، درس، خطبہ، مقالہ اور عمومی گفتگو میں علیحدہ کریں گے اور توفیق اللہ ہی سے ملتی ہے:

ا۔ داعی کا درس کسی مدرسہ یا معہد کے استاذ کے درس سے بہت مختلف ہوتا ہے:

(الف) مثال کے طور پر داعی کو جغرافیہ، کیمیا، نحو و صرف وغیرہ اسباق سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

(ب) ان دونوں میں سے ہر ایک کا طریقۂ درس دوسرے سے مختلف ہے۔ مدرسہ کے مُدرّس کے لئے مُدرّس کو تفصیلات و جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے ورنہ اسے کمزور سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ اس کی ذمہ داری اس باب کی تمام تفصیلات سے مستفید کرنے کی ہے۔ لیکن ایک داعیٔ دین کو عمومی معانی و قواعد اور عوامی چیزوں سے دل چسپی ہوتی ہے مثال کے طور پر روزہ پر درس دینا ہے تو ایک استاذ فقہی نقطۂ نظر سے اس کی تیاری کرے گا اور اس کے وجوب، عدمِ وجوب، رخصت و عزیمت، رویتِ ہلال، نیت، کن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے اور کن چیزوں سے نہیں ٹوٹتا وغیرہ مسائل پر گفتگو کرے گا لیکن ایک داعی اس پہلو کو نمایاں کرے گا کہ یہ بندہ اور اس کے رب کے درمیان ایک معاملہ ہے جس میں بندہ روزہ مکمل کر کے اللہ کے مراقبہ سے مدد لیتا ہے اور اس کے اثرات اس کے نفس، احساسات و وجدانات اور انسان کی خصوصیات پر پڑتے ہیں وغیرہ۔ وہ اس سے روزہ میں امانت داری، فرد کے اخلاق و کردار اور سلوک و برتاؤ میں اس کے اثرات اور معاشرے کے تعلقات کے استحکام کا مفہوم نکالے گا

اس لئے کہ سماعت، بصارت، زبان ہاتھ سب امانت ہیں اور اس کے ہر عضو پر روزہ فرض ہے۔ آخر کسی وجہ سے تو اللہ نے فرمایا ہے:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۶)

(یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔)

روزہ کے سلسلے میں وارد شدہ آیات و احادیث بے شمار ہیں۔ اُن معانی و حقائق کے استخراج کے لئے ان کی حیثیت معدنی کان کی سی ہے۔ یہ اس کے نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور اس کی فکر اور ذوق کو بلند کرتے ہیں۔

ہم نے دیکھ لیا کہ داعی اور استاذ کے طریقۂ درس میں کتنا فرق ہے اور ان دونوں کا مقصد بھی کتنا مختلف ہے۔

۲۔ فنِ تدریس میں درس کا ایک موضوع یا سُرخی ہوتی ہے لیکن داعی کا درس عام طور سے ایک آیت یا حدیث کے ارد گرد گھومتا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے داعی اُس فنّی اسلوب سے اجتناب کرتا ہے جو درس کے حجروں کے لئے مخصوص ہے لیکن تفسیر میں تقلیدی اسلوب اور اعراب قابل لحاظ نہیں ہے نہ آیت یا حدیث کی تمام مشمولات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے اور اس کے تمام احکام اور باریک سے باریک معنیٰ کو بیان کرنا پیش نظر ہوتا ہے بلکہ آیت یا حدیث کا عام مفہوم وہ محور ہوتا ہے جس کے ارد گرد آپ کے تمام خیالات گھومتے ہیں اور یہ مفہوم وہ شہ پارہ ہوتا ہے جس سے سنجیدگی سے آپ اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں اگر آپ کو یہ یاد رہے کہ آپ داعی الی اللہ ہیں اور اپنے قلب کو آیت یا حدیث کے مفہوم میں پگھلا دیں تو قدسی فرمان

کی حکمت تو اپنے دونوں پہلوؤں کے درمیان علم کی شراب تصور کریں گے۔ اسی شراب کو اپنی گفتگو کا تکملہ بنا دیں اور آپ کا درس رسول اکرمؐ کے اس قول کا موضوع ہو: "اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے" حدیث کا عام مفہوم واضح ہے۔ یہاں ان تمام اختلافات کو نظر انداز کر دیجئے جو نیت سے عمل کے ربط کے سلسلے میں علماء سے منقول ہیں اور حدیث کے عمومی مفہوم کو لے کر اپنی گفتگو کا آغاز کر دیجئے اور اتنا خلاصہ بیان کر دیجئے کہ ہمارے سامنے دو پہلو ہیں ایک نیت ہے اور دوسرا انسان کا ظاہری عمل ہے اور ان دونوں پہلوؤں میں مضبوط رشتہ ہے اس لئے کہ عمل اچھی یا بُری نیت کی ظاہری شکل ہے اور نیت وہ روح ہے جو عمل میں مخفی ہوتی ہے۔

یہاں داعی اپنے آپ کو فلسفیانہ اور رُوحانی حقائق کے سامنے کھڑا ہوا پائے گا جو انسان کی انسانیت اور اس کی تہذیبی بہتری کا لب لباب ہے۔ لیکن ہم ایک اور مسلک اختیار کرتے ہیں کیونکہ نیت دل کا عمل ہے اگر دل شہوات نفس اور لذات و اہواء میں غرق ہوگا تو اس کی نیت بھی اسی طرح کی ہوگی اور اگر دل اللہ کی طرف متوجہ ہوگا اور خدائی انعامات کی طرف راغب ہوگا تو اس کی نیت مقدس ہوگی اور ان حقائق اور اچھائیوں سے ہم آہنگ ہوگی جو اس کے استعمال سے ختم ہونے والی نہیں۔

اور چونکہ عمل نیت کی شکل ہے اس لئے پہلے کے اعمال اس کی خواہشات و شہوات کی صورت ہوں گے اور دوسرے کے اعمال اس کے قلب کی توجہ اور قدس الٰہی میں اس کی دوڑ دھوپ کی شکل ہوں گے:

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ (بقرہ: ۲۶۹)

(اور جس کو حکمت ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔)

وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (زخرف : ۳۲)

(اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں)

اور خدا کی نصرت، اس کی مدد، اس کے اقتدار اور نگہداشت کی زمین و آسمان میں کوئی چیز قائم مقام نہیں بن سکتی۔ اور چونکہ نیت اعمال کے اندر موجود ہوتی ہے اور اس میں نتائج و ثمرات کا اظہار کرتی ہے اس لئے عمل ہی وہ وسیلہ ہے جس سے وہ اپنے لئے ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے اسی لئے اللہ کا اپنے انبیاء پر یہ فضل رہا ہے کہ وہ انہیں قدسی نیت کا راز اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق دیتا ہے:

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝ (طٰہٰ : ۱۴)

(میں اللہ ہی ہوں میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر)

اور عیسیٰؑ کہتے ہیں:

إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ (مریم : ۳۰ تا ۳۲)

(میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا)

اپنی تمام مخلوقات میں منتخب اور برگزیدہ شخص محمدؐ سے اللہ کہتا ہے :

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ (محمد : ۱۹)

(پس اے نبیؐ ، خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور معافی مانگو اپنے قصور کے لئے)

ابراہیم علیہ السلام اس تمام حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے ۔ کہتے ہیں :

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (شعراء : ۸۳)

(اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا)

اللہ کی معرفت پر استوار نیت بغیر عمل کے بارآور اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی ۔ قرآن میں آیا ہے کہ جب یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا اور وہ آزمائش کی ظلمتوں میں گھر گئے تو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی اور اللہ نے ان کی دعا سن لی ۔ اس پر قرآن کہتا ہے :

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (صٰفٰت : ۱۴۳، ۱۴۴)

(اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا ۔)

یعنی اگر وہ اطاعتِ الٰہی کے پیرو نہ ہوتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے خضرؑ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے دو یتیم بچوں کے مفاد میں دیوار سیدھی کر دی تھی اور ان دونوں کا باپ نیک تھا ۔ چنانچہ باپ کے نیک عمل نے وفات کے بعد بھی اپنے بچوں کی حفاظت کی اس لئے کہ اس باپ کے اندر نیت اور عمل کا حسین ملاپ تھا جس کی

وجہ سے اس طرح ان بچوں کی حفاظت ہوئی کہ ہماری عقل اسے اخذ نہیں کرسکتی۔ اس کی مثال اللہ کا یہ قول ہے:

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ

(ابراہیم: ۲۴، ۲۵)

(جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔)

یہاں غذا سے مراد وہ کھانے نہیں ہیں جو نفس کو مرغوب اور آنکھوں کو لذیذ لگتے ہیں بلکہ بغیر مال کے مال داری، بغیر خاندان کے عزت، بغیر منصب کے جاہ و حشمت اور آپ کے رب کی اجازت سے آپ کی مشیئت کی تابع مخفی فوجیں —— چاہے آپ کے علم میں ہوں یا مخفی ہوں —— ہیں یہ ہے کلمہ طیبہ کا معاملہ۔ پھر اس عمل کا کارنامہ کتنا عظیم ہوگا جس کا ساتھ زبان، آنکھ اور سارے اعضاء و جوارح نے دیا ہو اور دل میں وہ معرفت الٰہی جاگزیں ہو جو آسمان و زمین کے اقتدار میں ہر نعمت اور طاقت کا راز ہے؟

بلاشبہ یہ عمل پائیدار اور مستقل ہوگا کیونکہ اس کے اندر معرفت اور نیت کی پائیداری پائی جاتی ہے، انسان کے اصولوں، اس کی قدروں، اس کی دلچسپیوں کا آئینہ دار ہوگا اور خدا کی توفیق سے اُس تقدیر کو مکمل کرے گا جن کے ذریعہ اللہ اپنے نبی کی حفاظت کرتا ہے اور خضر علیہ السلام اسی حفاظت کی تقدیر کی محسوس شکل یا علامت تھے:

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ

(کہف : ۸۲)

(اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے۔ جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لئے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔)

وہ راز جس کی وجہ سے اللہ کی تقدیر حرکت میں آئی، اس عمل صالح میں پوشیدہ تھی جسے ان دونوں کے باپ چھوڑ گئے تھے۔

یہاں اس نصیحت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جس سے اللہ کے رسول نے ان علوی طاقتوں کی طرف اشارہ کیا جو اعمال صالحہ میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ فرمایا:

"ایک غار کے دہانہ پر جس کے اندر تین آدمی تھے، ایک بڑی چٹان آکر کھڑی ہو گئی اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ چنانچہ ان میں ہر شخص اپنے ایک ایک عمل صالح کی دہائی دینے لگا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اللہ کے یہاں اعمال صالحہ کی کیا قدر و قیمت ہے۔ چنانچہ ان تینوں نے اللہ کے حضور خشوع و خضوع کے ساتھ اور نجات کی دعا مانگتے ہوئے اپنے اپنے نیک عمل کا ذکر کیا یہاں تک کہ چٹان کھسکنے کی وجہ سے غار کا دہانہ کھل گیا اور

وہ لوگ نکل آئے۔"

یہاں خضر علیہ السلام کے تذکرہ کی مناسبت سے کشتی والوں کے سلسلے میں کچھ اشارات نقل کئے جاتے ہیں جو ان خصوصیات کو بتاتے ہیں جن سے عمل صالح کے ظاہری اور جلد ثمرات کے ساتھ مخفی ثمرات بھی سامنے آتے ہیں۔ یہ کشتی والے "مسکین" تھے جو سمندر میں کام کرتے تھے۔

عارفین باللہ کے نزدیک مسکین وہ شخص ہے جو اپنی طاقت و قوت اور مال و دولت اور صلاحیتوں کے شعور سے اللہ کے لئے خالی ہو اس لئے کہ درحقیقت یہ ساری چیزیں اللہ کا فضل ہیں، اس کا ان میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اور اپنے رب کی سچی معرفت کی علامت یہ ہے کہ انسان ان میں سے کسی چیز کو اپنی طرف منسوب نہ کرے اور اس کے دل و دماغ میں خدا کے سامنے محتاجی اور بے چینی کا احساس مستحضر رہے، چونکہ معرفت الٰہی کے یہ اثرات ہیں اور اللہ نے ان کے سلسلے میں اس چیز کی گواہی دی ہے اس لئے بلا شبہ ان کشتی والوں کو خدا کی معرفت کا عظیم حصہ ملا تھا اور عمل کی زندگی اور اس کے ثمرات کا راز ہے۔

اللہ کے قول یَعْمَلُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مال حلال کے لئے محنت اور عمل کرتے تھے اور عمل نیت اور معرفت کی صورت ہے۔

یہاں سمندر میں کام کرنے کا جو ذکر ہے وہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خشکی اور تری میں کام کرنے والوں میں بہت زبردست فرق ہے۔ سمندر میں رہنے والا سمندر کی موجوں اور اس کے تھپیڑوں سے بچنے کے لئے ہمیشہ خدا سے لو لگائے رہنے کا محتاج ہے اور بحر سے مراد دنیا کے فتنوں اور ہلاکت خیزیوں کے تھپیڑے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے خوف سے کانپنے والوں کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ (مومنون: ۶۰)

(اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل اُن کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔)

یہ تین حقائق یعنی مسکنت میں پوشیدہ معرفتِ الٰہی، معرفت کے تقاضوں کے مطابق عمل اور زندگی کی ہلاکتوں سے بچنے کے لئے اللہ کے دامن میں پناہ لینا، ہی اس زندگی کا طریقہ کار ہیں جو انسان کو بہترین حسی و معنوی ثمرات سے نوازتی ہے اور اس پر حفاظت و رعایت کی تقدیریں انڈیلتی ہے جو اس کے دل میں آتی ہیں اور نہیں بھی آتیں اور خضر علیہ السلام اس تقدیر کی علامت تھے جس سے اللہ نے کشتی والوں کو بادشاہوں کے غضب سے بچایا اس لئے کہ ان کا نیک عمل حفاظتِ الٰہی پر مشتمل تھا:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ (کہف: ۷۹)

(اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کردوں کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔)

چونکہ عمل کے ساتھ نیت کا یہ معاملہ ہے اس لئے آپؐ نے مذکورہ حدیث کے

آخری حصہ میں کہا ہے:

"جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف سمجھی جائے گی اور جس کی ہجرت دُنیا کمانے کے لئے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لئے ہو گی تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف سمجھی جائے گی جس کی خاطر اس نے ہجرت کی ہے"

یعنی اللہ نے ہر شخص کو آزادی دے دی کہ جو انجام وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے اس کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے کام کرے اگر وہ اللہ کی نصرت وتائید اور خوشحالی چاہتا ہے تو اس کے لئے اپنے ضمیر میں اس کی نیت کرے اور زندگی میں جو عمل کرتا ہے اسے بجالائے۔ اور اگر متاعِ دُنیا اور حسی لذت چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنی خواہشات کو اس نے حرکت دی ہے اور اسے اپنے عمل کی رُوح بنالی ہے تو اس نے اپنے نفس کے لئے رسوائی و نامرادی کی چاہت کی ہے اور جب دنیا کی دل فریبیاں ختم ہوں گی اور حقیقت سے پردہ اُٹھے گا تو وہ پکار اُٹھے گا:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ

(مومنون: ۹۹، ۱۰۰)

(اے میرے رب، مجھے اُسی دُنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔)

اور اس وقت ہاتھ ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔

بلاشبہ یہ حدیث اس سے کہیں زیادہ وسیع مدار پر مشتمل اور قابل غور ہے

لیکن ہمارا ارادہ استقصاء اور احاطہ کا نہیں ہے بلکہ ہم نے حدیثِ نبویؐ کے مفہوم کے ساتھ ایک داعی کے طرزِ قول و عمل کی نشاندہی کی ہے تاکہ ان خیالات کو مرتب کیا جا سکے جن کا یہ تفاعل اور کارروائی متقاضی ہے تاکہ اس درس کا مواد تشکیل دیا جا سکے جو حدیث شریف کے عام مفہوم کے اردگرد گھومتا ہے اور یہ ان فنی دروس و اسباق کے نہج سے یکسر مختلف ہے جسے امام نوویؒ وغیرہ اس حدیث کی شرح و تفصیل میں اپناتے ہیں۔

۳ — درس میں اس کے خیالات و عناصر اور انسانوں کے واقعی حالات اور مسائل کے درمیان مسلسل ربط کا خیال رکھا جاتا ہے۔ حضرت خضرؑ کے بارے میں گفتگو یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو لوگ اپنے بعد اپنے بچوں کے مستقبل سے اندیشہ ناک ہیں وہ ان کے لئے اس مردِ صالح کی طرح اللہ کی حفاظت کے اعمال چھوڑ جائیں اور وہ اس بات کے مکلف اسی وقت ہو سکتے ہیں جب مردِ صالح کی طرح اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے سے واقف ہوں۔ کشتی والے آدمیوں کے سلسلے میں کلام اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ دائرہ وسیع ہونا چاہیئے اور کسان، چرواہا، کاریگر، دکاندار ملازم سب اللہ کی حفاظت کے مستحق ہوں بشرطیکہ ان کے اندر اللہ سے محتاجی اور فقر پایا جائے اور اس کی خاطر وہ جاہ و منصب اور مال و قوت کو اپنی طرف منسوب کرنے سے باز آ جائیں۔

محاضرہ

۱ — ایک داعی کا لیکچر کسی یونیورسٹی کے استاذ کے لیکچرس سے بہت مختلف ہوتا ہے اس لئے کہ ایک داعیٔ دین کو فلکیات، طب اور اقتصاد وغیرہ موضوعات پر لیکچرس دینے سے

کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ اسے یونیورسٹی کے استاذ کی طرح موضوع سے متعلق بکھرے ہوئے مواد کو جمع کرنے کے لئے علمی آخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ یونیورسٹی کا استاذ جزئیات اور تفصیلات سے بھی دلچسپی رکھتا ہے جبکہ داعیٔ دین موضوع کے مواد کا احاطہ کرنے کے بعد عام احکام وقواعد پر اکتفا کرتا ہے تاکہ سامعین متوجہ رہیں اور ان کا نشاط برقرار رہے۔ اس طرح داعیٔ دین کے لئے اپنے موضوع پر ایک لیکچر دے دینا کافی ہوتا ہے جبکہ استاذ کو اسی موضوع پر متعدد لیکچرس کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

۲— ایک داعیٔ دین جس طرح اکیڈمی اسلوب سے پرہیز کرتا ہے اسی طرح عوامی اور بازاری لہجے اور رنگ سے بھی دور رہتا ہے لوگ اس کی اس بنا پر تعریف نہیں کرسکتے کہ اس کا اسلوب بالکل عوامی اور بازاری ہے بلکہ وہ انہیں ایسے اسلوب سے خطاب کرتا ہے جس کی انہیں امید اور توقع نہیں ہوتی بلکہ اسے اس کی ناکامی سمجھ لی جاتی ہے، کیونکہ وہ علم کے راستے سے اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اگر اس کا اسلوب دعوت سے خالی ہوگا تو وہ داعیان دین کے زمرہ سے نکل جائے گا جبکہ علمی وتحقیقی آدمیوں کی فہرست میں بھی اس کا شمار نہ ہوسکے گا۔ اس لئے کہ ایک داعیٔ دین پر واجب ہے کہ وہ ہمیشہ یہ یاد رکھے کہ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنا ہے اور جو یہ فریضہ انجام دے وہ اس سرزمین میں اللہ کے رسول کے بقول اللہ کا خلیفہ اور اس کا جانشین ہے۔ اور امر بالمعروف درحقیقت اسلام کا اس کے مختلف موضوعات میں تعارف کرانا ہے اور نہی عن المنکر کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کی لہر اور اس کے عیوب ونقائص پر بھرپور تنقید کی جائے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ داعی کے لیکچرس میں ربانی رنگ کا

غلبہ ہو، وہ کتاب و سنّت سے استفادہ کرتا رہے اور ان میں جو بھرپور مواد ہے اور اللہ کی حکمت و مصلحت کارفرما ہے اس کی طرف اشارہ کرتا چلا جائے۔ اس سے سامعین ہمیشہ اسی کی طرف متوجہ رہیں گے کیونکہ داعی کے ساتھ وہ بھی مثالی علم اور معاشرے کی لہر پر تنقید و تنقیص کے لمحات کے درمیان منتقل ہوتے رہیں گے اور اس سے سامعین اچھی طرح اخذ کرسکیں گے اور اپنی اندرونی بھار پر داعی سے استفادہ کرسکیں گے اور یہی داعیٔ دین کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

۳۔ لیکچر داعی کے درس سے اس بنا پر مختلف ہوتا ہے کہ لیکچر کا ایک عنوان ہے جو موضوع کا پتہ دیتا ہے جبکہ اس کے درس کا موضوع عام طور سے کوئی آیت یا حدیث ہوتا ہے۔ اور علمی خطوط لیکچرس کے مقابلے میں درس میں زیادہ واضح اور نمایاں ہوتے ہیں اس لئے کہ لیکچرار جب مختلف ماخذ سے لوٹتا ہے تو اسے مختلف حاصل شدہ معلومات کے درمیان تطہیر کرنی پڑتی ہے اور جو کچھ احکام و قواعد اس نے منتخب کئے ہیں انہیں جمع کرنا پڑتا ہے پھر اسے ایک ترتیب سے مرتب کرتا ہے جو مقدمات اور نتائج کو آپس میں جوڑتی ہے اور نظائر اور امثال سے وہ لطیف استدلال کرتا ہے، کبھی اس کا موضوع معاشرت ہوتا ہے تو کبھی اقتصادیات یا سیاسیات، اسی طرح کبھی معتقدات اور عبادات کے معاملات میں وہ محنت کرتا ہے ان تمام چیزوں میں وہ علمی خطوط کا پابند ہوتا ہے جن میں بحث کے عناصر اور ایسی منطق میں اس کے عام احکام شامل ہوتے ہیں جس میں موضوع کی وحدت مکمل ہوتی ہے۔ لیکن درس میں توجہ آیت یا حدیث کے محور پر خیالات کو یکجا کرنے کے اردگرد گھومتی ہے اور اس محور سے تعلق رکھنے والی آیات و احادیث لائی جاتی ہیں اور سلوک و برتاؤ کے ان نمونوں کی طرف

اشارہ کیا جاتا ہے جو سلبی یا ایجابی طور سے درس کے مغز سے متعلق ہوتے ہیں۔

اس طرح لیکچر اور درس میں سے ہر ایک کا اپنا الگ رنگ اور اس کی چھاپ ہے اسی طرح ان کی اہمیت اور افادیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اب ہم ہر ایک پر خاص گفتگو کرتے ہیں:

ا — لیکچر

(الف) لیکچر کا موضوع وہ فطری طور پر ایسا منتخب کرے جو زندگی سے متعلق ہو اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ داعیٔ دین اس دُنیا سے متعلق ہوں اور اس میں پرورش پانے والے خیر و شر، تلخ و شیریں اور معروف و منکر سے اثر پذیر ہوں، اس میں جو چیز اچھی اور صالح ہو اسے پسند کریں اور اس پر اللہ کی حمد کریں اور جو چیز فاسد ہو اس کے علاج کے لئے حکیمانہ وسائل اور موعظۂ حسنہ سے کام لیں اور اسے بدلنے کی کوشش کریں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ داعیٔ دین اپنا موضوع ان مسائل و مشکلات سے منتخب کرے جو زندگی میں پیش آتی ہیں اور ہر انسان کو ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح کے موضوعات اسے عوام کے دلوں سے قریب کریں گے اور ان کی توجہ اور ان کے جذبات اس کے لیکچر سے مربوط رہیں گے۔ وہ کوئی ایسا موضوع منتخب نہ کرے جس سے لوگ دور بھاگ جائیں یا جس میں دلچسپی لینے سے انکار کر دیں اور اس حالت کی زندگی ہی آپ کے لئے پسند کی گئی ہے اور یہ بہترین انتخاب ہے اس لئے کہ یہ خدا کا الہام اور تقدیر کی آواز ہے اور وہ صدائے بازگشت ہے جس کی گونج قرآن میں بھی سُنائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے

جستہ جستہ واقعات اور حالات کے تقاضوں پر تبصرہ کیا ہے۔

یہ فطری امر ہے کہ جو موضوعات کسانوں کے طبقے پسند کریں گے وہ ان موضوعات سے مختلف ہوں گے جن کی طرف اشارہ مظلوم مزدوروں کا طبقہ کرے گا، طلبہ کے اپنے مسائل اور مشکلات ہوتی ہیں جو پچھلے دونوں طبقات سے مختلف موضوعات کی طرف وحی کرتی ہیں، چھوٹے ملازمین کی جو پریشانیاں اور نفسی ومالی مشکلیں ہوتی ہیں جن سے وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جو ان کا شکوہ غور سے سُنے، اور ان کے حالات سے واقف ہو، لوگوں کے آپسی تعلقات میں، ان معاملات میں جن سے بعض گروہوں کو دوسروں سے سابقہ پڑتا ہے، اس اجتماعی سلوک کی فطرت میں، جس پر بعض گروہوں یا طبقوں کی زندگی جاری وساری ہے، ان معیارات اور پیمانوں کے گھٹیا ہونے میں جن سے لوگ آدمی کی شخصیت اور اس کی کامیابی ناپتے ہیں، دفتروں کے نظام اور تعلیم میں، تجارتی، تنظیمی اور سیاسی دائروں میں غرضیکہ ہر جگہ مختلف موضوعات ہیں جن کی توضیح سے آپ بے نیاز ہیں اس لئے کہ یہ سب نمایاں اور ظاہر ہیں اور اپنے آپ کو اور اپنے واقعات کو آپ کے عصبی نظام (THE NERVOUS SYSTEM) کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(ب) ناگزیر ہے کہ موضوع کا کھل کر مطالعہ کیا جائے، نمایاں عناصر اور واضح اقدامات میں اس کا تجزیہ کیا جائے اس طرح طبعی ترتیب اس کی قائم کی جائے کہ سامعین ایک زینے سے دوسرے زینہ پر چڑھ سکیں اور آخر میں خاتمہ اس طرح ہو کہ اس پر خاموشی ہی مناسب معلوم ہونے لگے۔ مثال کے طور پر اگر آپ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اس بلند انسان کی ذمہ داریاں بتانا چاہیں جس کی لوگ تعریف کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اخوان بھی جسے اچھا سمجھتے ہیں تو آپ کے لئے آسان طریقہ یہ ہوگا

کہ آپ اس انسان کے اندر مخفی بلند عنصر کے وجوب کو فرض کرلیں جیسے عزت و شرافت کے اسباب اور اصول واقدار پروان چڑھا سکیں، ذلیل اور گھٹیا انسان سے ہمیں کوئی سروکار نہ ہو کہ اس کی کوئی ضرورت ہمیں نہیں ہے۔ پھر ضروری ہے کہ اس انسان کی زندگی کا ایک مشن ہو جس کے حصول کے لئے وہ محنت اور کوشش کرے، جو شخص بغیر کسی متعین مقصد کے زندگی گزارتا ہے اور کسی معروف اصول کے بغیر جی رہا ہے تو وہ حیوان ہے جو قابلِ ذکر نہیں ہے۔

پھر عزتِ نفس اور شرافت اور مشن کے بعد علم[1] بھی اس کے پاس ہونا چاہیئے تاکہ ہدایت اور بصیرت کی روشنی میں وہ زندگی گزارے اور جس کے پاس علم نہیں ہوگا اسے بصیرت کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

---

[1] یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ علم سے مراد وہ حقیقی علم ہے جو آسمان اور اس میں اللہ کی عجیب وغریب آیات، زمین اور اس کی کائنات اور آثار، آسمان وزمین کے درمیان کائناتی مظاہر اور اس نے ہمیں جن نعمتوں، صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ہماری فطرتوں میں جو اسرار رکھے ہیں، ان سب پر غور وفکر کرنے کے بعد حاصل ہو یہاں تک کہ ہمیں اللہ تک پہنچادے، یہی وہ علمِ حقیقی ہے جس کی طرف انسانی کوششوں کو رُخ کرنا چاہیئے اور ہر وہ علم جو اللہ تک نہ پہنچائے، وہ بے برکت علم ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم صناعتوں یا زندگی گزارنے کے لئے اشیاء کے طریق استعمال سے دور ہیں بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ ان تمام چیزوں سے ہمارا اصل مقصود اللہ تعالیٰ ہو،

تو گویا تعمیر کے ستون عزت نفس اور قوت، مقصد و نصب العین اور علم قرار پائے، اگر آپ اس کی وضاحت کر دیں تو سمجھ لیجیے کہ سامعین کو آپ نے مطمئن کر دیا۔ لیکن جو گفتگو بے ترتیب اور شتر بے مہار ہو اس سے کوئی خیر بر آمد نہیں ہوتا۔

(ج) ہر عنصر کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے کتاب الٰہی کی آیات، سیرت رسول کے واقعات، صحابہ کرام ؓ کی زندگیاں، تاریخ یا روزمرہ کے دیکھے سنے جانے والے واقعات و حوادثات اس طرح بیان کیجیے جس کا تذکرہ ہم داعیانِ دین کے مآخذ میں کر چکے ہیں۔

مثال کے طور پر پچھلی شق میں مذکور عزت کی آپ کو تشریح کرنی ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ اس لفظ کا مزاج بتا رہا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ انسان اپنے جیسے کسی مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہو۔ وہ اس صورت میں دو ہی مقاصد کے لئے ذلیل ہو سکتا ہے یا تو اس کا ذاتی مفاد وابستہ ہو گا یا کسی نقصان دہ اور ضرر رساں چیز کا ازالہ مقصود ہو گا، اس وقت کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے بیشمار نصوص آپ کے اوپر جلوہ گر ہو جائیں گے اور آپ کے سامعین کو یہ یاد کرائیں گے کہ اسلام مسلمان کے اندر عزت نفس کی تخم ریزی کرتا ہے اور اس کی جڑیں بڑی گہرائی میں پیوست کر دیتا ہے، نفع کے حصول اور رزق کے خوف کے سلسلے میں وہ بتائے گا کہ اس کا رزق تو آسمان میں ہے اور جو چیز آسمان میں ہو محفوظ رہتی ہے اس سرزمین کے کسی انسان کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح بتائے گا کہ اللہ نے انسانوں کی تخلیق سے پہلے ان کے درمیان رزق کو تقسیم کر دیا ہے اور تقدیر کے قلم کی سیاہی خشک ہو چکی ہے اور رجسٹر لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اب حادثات و واقعات اس کے برعکس نہیں جا سکتے۔ اس

سلسلے میں قرآن و سُنّت کے نصوص بے شمار ہیں۔ ان لوگوں پر تنقید کرنا ناگزیر ہے جو اپنے آپ کو ذلیل کر لیتے ہیں اور یہ سمجھ کر اپنے اخلاق و کردار کو گرا دیتے ہیں کہ ان کے مرغوب و محبوب کے حصول کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ خاص طور سے جو لوگ اس رواں دواں مثل کی پرستش کرتے ہیں کہ: "اگر تمہیں کسی کتے سے بھی ضرورت ہو تو اسے یا سَیّدی کہہ کر پکارو" قتل و حرب، قید و بند اور دار و رسن سے خوف کھا کر ذلّت کے سامنے سپر ڈال دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مُسلمان کا رہنما اللہ کا یہ قول ہے:

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۚ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ (حدید : ۲۲)

(کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتۂ تقدیر) میں نہ لکھ رکھا ہو، ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے۔)

اور جب مسلمان جرأت و شجاعت کے ساتھ اقدام کرتا ہے تو بزدل لوگ ہی اس کو ملامت کرتے ہیں اور کمزور اور تھڑدلے انسان اسے ڈراتے ہیں، حالانکہ اللہ نے کتنی قطعیت کے ساتھ کہا ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۚ

(آل عمران : ۱۴۵)

(کوئی ذی رُوح اللہ کے بغیر اذن کے نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا

ہوا ہے ۔)

اور جب جنگ و حرب کے موقع پر اس کے اندر تردد اور تذبذب سر ابھارتا ہے تو اس کے دل کی گہرائیوں سے عقیدہ اسے پکارتا ہے کہ:

قُل لَّن يَنفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٦﴾ (احزاب : ۱۶)

(اے نبیؐ ، ان سے کہو ، اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لئے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا ۔)

آپ کے سامنے قرآن و احادیث کے نصوص کی ڈھیر لگ جائیں گی اور ہر نص واضح طور سے اس طریقہ کار کی مذمت کرے گا جسے آپ نے حصول مقصد کے لئے اپنایا ہے ۔

اختیار و انتخاب میں ، عناصر کی ترتیب میں ، شواہد اور دلائل کو جمع کرنے میں اور پوری گفتگو سامنے لانے میں اس علمی عقلیت کو حکم بنانا ضروری ہے جس کی نمائندگی وہ مظاہر کرتے ہیں جو " داعی کا مزاج ،، کے باب میں مذکور ہیں تاکہ کوئی چیز مبہم رہے نہ نظری ہو کر رہ جائے ۔

اور اپنے موضوع کی تقسیم یا اپنے عنصر کی حقیقت کی توضیح میں فلسفیانہ تقسیموں اور نظری گہرائیوں سے پرہیز کیجئے ۔ با اخلاق انسان ، جس کی ہم تعریف کرتے ہیں ، کی ذمہ داریوں کے ضمن میں ہم نے تمام چیزیں آپ کے سامنے نہیں رکھی ہیں اس لئے کہ ہمارا ارادہ فلسفیانہ استقصار کا نہیں ہے کہ مفروضات اور علت و معلول کی بھول بھلیوں

میں بھٹکیں۔ ہم نے بس تین جھلکیاں پیش کر دی ہیں جو فطرت کے دائرے سے پوری وضاحت اور فراخی کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں۔ اگر ہم نے استقصار کا ارادہ کیا ہوتا تو بڑی زحمتوں کے بعد اس بحث سے چھٹکارا ملتا اور اس وقت بھی ان اختلافات کا، جو آپس میں ٹکرا رہے ہیں، اور ان نظریات کا جن کے حاملین ان کی صحت کے دلائل نہ دے سکے، ذکر کرنا ناگزیر ہوتا، اس لئے انتخاب کے وقت ہم نے ارادہ کیا کہ اس طرح سے گفتگو کریں جسے بس سامعین کی عقل و فطرت سمجھ سکے، رہی یہ بات کہ وہ گفتگو بالکل جامع و مانع ہو تو یہ بات نہیں ہے گرچہ ہمارا ارادہ ہے کہ ایسا ہو اس لئے کہ یہ گفتگو حقیقت میں جامع ہے اس لئے کہ اسلام میں بھلائی، چاہے اس کی متعدد صورتیں ہوں، ایک ہی سرچشمہ کی طرف لوٹتی ہے، مثال کے طور پر آپ کسی بچے کی پرورش کرنا چاہتے ہیں اور اس کے اندر کوئی اخلاق نشو و نما دینا مقصود ہے تو آپ محسوس کریں گے کہ دوسرے فضائل اور اخلاق کو نشو و نما دینے پر یہ چیز منحصر ہے اور یہ خدا کی شریعت کے اسرار ہیں۔

(د) لیکچر کے نکات اس طرح فراہم کئے جائیں کہ اس سے یہ سمجھ میں آ سکے کہ لوگ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی تمام صالح اعمال، خدا کی رضا کے لئے قربانیوں اخلاقِ فاضلہ پر صبر اور استقامت اور فساد و فتنہ کے مقابلے میں ثبات کے ثمرات حاصل کرتے ہیں، اس پہلو کو نمایاں کرنا بہت ضروری ہے، صرف اس لئے نہیں کہ اس سے دلوں میں انشراح پیدا ہوتا، عزائم کو غذا ملتی اور ارادوں اور تمناؤں کو تقویت نصیب ہوتی ہے بلکہ اس لئے اس پہلو کا نمایاں کرنا ضروری ہے کہ یہی زندگی کی منطق ہے اور اس کائنات کا وہ قانون ہے۔ جو پیچھے نہیں ہوتا، ہر چیز کی ایک قیمت اور ہر عمل کا ایک اجر ہوتا ہے اور ہر بدنی و نفسی محنت کا ثمرہ دُنیا و آخرت دونوں

جگہ ملتا ہے اور ہر معاملہ کے انجام کا انحصار اس نیت پر ہے جس سے آپ نے اسے شروع کیا ہے اور یہ اللہ کے وہ قوانین ہیں جو افراد کی زندگی میں پیچھے رہتے ہیں نہ قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں۔ سستی بس محرومی کا سبب بنتی ہے۔ انا رکی ناکامی کو جنم دیتی ہے اور انانیت کا نتیجہ اختلاف، انتشار اور بزدلی ہوتا ہے۔

(ھ) ان سب سے داعی کا مقصد روحانی احساسات کا احیاء، اور دلوں میں خیر و تقویٰ کے خیالات کی پرورش ہونا چاہیئے ہر موضوع سے اسی بنیاد پر تعارض کرنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں لیکچرس میں داعی کے دو بنیادی مقصد ہونے چاہئیں: اپنے خاص موضوع کا اہتمام، اور قلبی احساسات کے اندر الہامی روح دوڑانا، اس طرح کا پہلا مقصد مقصود بالذات ہو اور دوسرے مقصد کے لئے وسیلہ کے طور پر مقصود ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ سامع کے سامنے اس طرح گفتگو کی جائے جس سے اس کے اندر یہ احساس بیدار ہو سکے کہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے اور اللہ کی آنکھیں ہمیشہ بیدار رہتی ہیں جو اسے دیکھتی رہتی ہیں اور اس کے ظاہر و باطن کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور انسان اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ دلوں میں پلنے والے خیالات کو اللہ کی رضا اور بندوں کی خیر خواہی کے گرد گھمائے اور خوش بخت ہے وہ شخص جو اپنے نفس کو پاکیزہ اور مطہر بنا سکے —— یہ ساری باتیں ایک ہی عنصر میں کہہ ڈالئے اگر گنجائش ہو یا مختلف عناصر میں انہیں پھیلا دیجئے اگر مناسب معلوم ہو، یا کسی عنصر میں انہیں داخل کیجئے اور دوسرے عناصر کو خالی چھوڑ دیجئے، اس میں موضوع اور اپنی عملی عقلیت کے ذوق کا خیال رکھیے۔

(و) میرا خیال ہے کہ لیکچر شروع کرنے سے پہلے آپ کے اور عوام کے درمیان قلبی تعارف

ہو جائے اس لئے کہ براہ راست موضوع کو چھیڑ دینے سے عوام ایک ایسے معاملے کا سامنا کریں گے جس کے لئے وہ پہلے سے تیار نہیں تھے۔ یہ احساسات کیا ہیں؟ بند گھر ہیں اور دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے کے لئے قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے کہ بغیر سلام اور موانست کے ہم ان میں داخل نہ ہوں۔

یہ موانست یا ہمارے بقول قلبی تعارف ناگزیر ہے اور اس کا آغاز نہایت آسان، تفصیلی اور قابل ہضم ہو تاکہ ذہن ودماغ آسانی سے اسے اخذ کر سکیں اور اس کے ادراک کے لئے تھوڑی سی جدوجہد بھی نہ کرنی پڑے۔ گویا وہ کسی خاص حادثہ کا ذکر کر رہا ہے جو اسے پیش آگیا ہے یا اس نے راستے میں اس کا مشاہدہ کیا ہے یا کوئی خبر ہے جسے اس نے پڑھی یا سنی ہے یا کسی محفل میں کوئی چیز دیکھی ہے یا کسی مقرر کی بات نقل کی ہے بشرطیکہ ان ساری چیزوں کا براہِ راست یا بالواسطہ دعوت سے تعلق ہو، پھر وہ اس آغاز کلام پر ایک مزاحیہ تبصرہ کر دے اگر مزاح کی گنجائش ہو یا مسرت کا اظہار کر دے، اگر اس کا موقع ہو یا مناسبِ حال کسی بھی جذبہ یا احساس کا اظہار کر دے۔ جب دل آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور نفوس آپ کے لئے وا ہو جائیں تو گویا ان کا رُخ آپ کی طرف مڑ گیا ہے اور آپ کے سامنے انہوں نے ڈگیں ڈال دی ہیں بس فوراً آپ انہیں اپنے قبضے میں کیجئے اور گرہ پر گرہ لگاتے جائیے پھر اپنے موضوع کی طرف اس طرح آجائیے کہ عوام کی انسیت میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے۔ آپ یہاں مجھ سے کسی مثال کے بیان کرنے کا مطالبہ نہ کیجئے اس لئے کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے جس کی تعلیم دی جاسکے بلکہ یہ خالص ذوق کا معاملہ ہے اور بیدار فطرت کی وحی والہام سے یہ کام ہوتا ہے اس لئے اس سلسلے میں یاددہانی اور اشارہ کافی ہے۔

(۱۰) یہاں ایک حقیقت اور ہے جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ داعی کے ذہن میں لیکچر کی پختگی مرورِ ایام اور کثرتِ مشق و تمرین سے آتی ہے اس لئے آپ بار بار ایک ہی لیکچر دیجئے، دسیوں بار دیجئے بلکہ جب بھی موقع ملے اس سے باز نہ آیئے، مختلف مقامات پر اس کا اہتمام کیجئے۔ اور ہر لیکچر کے بعد اپنے نفس کا محاسبہ کیجئے اور پچھلے لیکچر اور موجودہ لیکچر کے درمیان موازنہ کیجئے اس سے توضیح و تبیین پر آپ کو قدرت حاصل ہوگی اور عبارات و الفاظ کو بیان کرنے میں آسانی ہوگی، پھر بار بار لیکچر دینے سے معانی میں اضافہ ہوگا، ایک دوسرے سے الفاظ و معانی جنم لیں گے اور بلندی و قیمت میں بڑھاوا ہوگا اس سے نہ ڈریئے کہ مختلف مقامات پر ایک ہی لیکچر دینے سے عاجزی و درماندگی کا آپ پر الزام لگے گا نہ اپنے ساتھ رہنے والے شخص کے اس خیال سے خوف کھایئے کہ یہ شخص تو کم علم ہے۔ یہ سب بُرے خیالات ہیں اس لئے کہ حقیقت کو دہرانے سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی نہ اسے دہرانے والے کے مقام پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے بس انسان کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ حق پر ہو اور حق کی دعوت دے۔ مزید برآں تکرار کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے داعی کے ایمان میں اور اس کے اپنے قول سے وابستگی میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن اگر داعی مختلف وسیع و عریض لیکچر کس تیار کرنے میں محنت کرے تاکہ دوسروں کو یہ اطمینان دلا سکے کہ وہ بحرِ ذخّار ہے جو بے کنار ہے ہر شہر میں اُس موضوع پر بولتا ہے جو دوسرے شہر کے موضوع سے یکسر مختلف ہوتا ہے تو اس طریقۂ دعوت کا کوئی ثمرہ ظاہر نہیں ہوگا نہ انسانوں کو کسی حقیقت پر مطمئن کر سکے گا پھر اس سے انانیت اور ریاکاری اور شہرت کی بو بھی

آتی ہے۔ آپ کے علم کے لئے یہ کافی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے مکہؔ میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ لگایا اور تمام قبائل کو اسی ایک بات کی دعوت دیتے رہے کہ اللہ واحد کی عبادت کرو اور جن بتوں کی پرستش تم کرتے ہو ان سے الگ ہو جاؤ اور مجھے تبلیغِ دین سے نہ روکو۔ اس لئے کہ آپؐ ایک حقیقت کی تبلیغ و دعوت میں مصروف تھے آپ کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ اپنی لسانی و عقلی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر لوگوں کو مبہوت اور متحیّر کر دیں۔

۲ —— درس

واعظینِ کرام اور داعیان دین کا معروف طریقہ یہ رہا ہے کہ ان کے درس کا موضوع اللہ کی کتاب کی کوئی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہوتا تھا۔

میری رائے میں درس لیکچر سے مشکل ہے یا صحیح تر لفظوں میں درس میں لیکچر کے مقابلے میں داعی کی مہارت اور اس کی حسّاسیت کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکچرار اپنا ارادہ کسی متعین موضوع کے سلسلے میں عوام کو مطمئن کرنے تک محدود رکھتا ہے اسے محض دلالت کے لئے آیت یا حدیث سے مدد لینی پڑتی ہے اور یہ چیز اس کے مقصد سے متعلق ہے۔ لیکن درس دینے والے پر لازم ہے کہ وہ مہارت و باریکی، اور طول تدبر سے کام لے، ہر کلمہ پر بلکہ بسا اوقات ہر حرف پر ٹھہرے اور ہر وقفہ پر ایسے اشارات، معارف اور الہامی علوم نظر آتے ہیں جو اپنی روشنی تلاش و جستجو کرنے والے کے سینے میں اتار دیتے ہیں جس سے اس کا دل کھل جاتا ہے، اس میں وسعت

آجاتی ہے اور اللہ کے اس فضل پر اسے مسرت ہوتی ہے۔

اس لئے اس بات کی طرف اشارہ کرنا میں بہتر سمجھتا ہوں کہ درس کو لطیف و نفیس چیزوں سے معمور ہونا چاہیئے جن سے قلب میں حرکت پیدا ہو سکے اور وجدان کو وہ مخاطب کر سکیں۔ جب آیت اپنے تمام کلمات کے درمیان آپ کے سامنے کھل جائے اور ماورا سطر حقائق آپ کو نظر آنے لگیں تو جن معانی کو چاہیں ان کا استنباط کر۔ بس پھر انہیں ترتیب دے لیں اور ایک دوسرے سے مربوط کر دیں پھر گفتگو کا دائرہ وسیع کر کے اس مفہوم کی آیات و احادیث اور صحابہ کے اقوال و اعمال اور قدیم و جدید انسانوں کے حالات بیان کریں اور جہاں تک ہو سکے اس چیز کو آپ زندگی کے حوادث اور اس کے واقعات سے متصل کر دیں۔

اور حدیث کا درس بھی قرآن کے درس ہی کی طرح دیا جائے گا۔

میرے نزدیک لیکچر سے کہیں زیادہ درس فائدہ مند ہے۔ درس کی تیاری ہر وقت آسان ہے بس آپ اپنے گھر میں یا مسجد میں بیٹھ جائیے تاکہ موجود لوگوں کو درس دے دیں اور لیکچر میں ایسا نہیں ہوتا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ چونکہ درس میں عام طور سے تعداد کم ہوتی ہے اس لئے درس دینے والے کو اس بات پر قابو حاصل رہتا ہے کہ وہ سامعین کے دلوں میں اپنے لطائف کے ذریعہ اثر ڈال سکے۔ اپنے اور ان کے درمیان روحانی تعلقات اور علمی تعارف قائم کر سکے اس لئے وہ عام طور سے درس دینے والے کی منشا اور ارادہ میں ڈھل جاتے ہیں، لیکن لیکچر سننے والوں کی اکثریت محض سننے کے لئے آتی ہے اور تھوڑا سا وقت صرف کرتی ہے اور جب لیکچرر ان کی عقل پر چھا جاتا ہے اور انہیں خوش کر دیتا ہے

تو اکثر لوگوں پر اس کا اثر وقتی رہ جاتا ہے اور سامعین کی بہت ہی قلیل تعداد آپ کے ہاتھ ایسی لگتی ہے جو آپ کی فکر کے سپاہی بن سکیں۔

میں یہاں لیکچرس کی اہمیت نہیں گھٹا رہا ہوں، ہماری دعوت تو مرشد مرحوم کے لیکچرس ہی کے ذریعہ پھیلی ہے لیکن میں ان لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو لیکچرس کے مواقع کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں اور اسی وقت لب کشا ہوتے ہیں جب لوگ لیکچر کے لئے اکٹھا ہو جائیں۔

آپ کے اثر انداز ہونے کے لئے محض یہ کافی نہیں ہے کہ آپ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کا مطالعہ کرتے اور ان کا شعور رکھتے ہیں اس لئے کہ سامعین کا شعور آپ کے مقابلے میں کم بیدار ہو سکتا ہے اس لئے آیت یا حدیث کا مضمون بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے ذوق، اپنی جسارت اور اپنے تجربات سے آپ سامعین پر چھا جائیں۔

سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ: میں اللہ کے رسول کے ساتھ ایک درخت کے نیچے تھا۔ آپ نے اس کی ایک سوکھی شاخ پکڑ کر ہلائی یہاں تک کہ اس کی پتیاں جھڑ گئیں آپ نے پوچھا: سلمان، تم مجھ سے یہ نہیں پوچھ رہے ہو کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ میں نے پوچھا: اچھا بتایئے، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے فرمایا:

"جب مسلمان وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اسی طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح یہ پتیاں جھڑ گئی ہیں۔"

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ (ہود : ۱۱۴)

(اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں بُرائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ ایک یاددہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔)

آپ دیکھتے نہیں کہ اس خوبصورت علمی تمہید کے بعد ہمارے دل و دماغ میں قبولیت کی صلاحیت بڑھ گئی بلکہ ان کی زندگی اور مسرت میں اضافہ ہو گیا کیونکہ انہیں آیت کی روشنی اور اس کی بہترین توجیہ میسر آگئی گرچہ عقل و شعور کی بیداری میں کوئی شخص رسول اکرم کے برابر ہو سکتا ہے نہ قرآن کے ذریعہ کسی کے قلب میں وہ زندگی آسکتی ہے جو آپ کے قلب میں آتی تھی اس لئے آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ کتابِ الٰہی سے عبرت انگیزی کے لئے بہترین طریقہ اختیار کیا جائے پھر ہم لوگ تو آپ سے کہیں زیادہ اس کے حاجتمند ہیں۔ یہ اس الہام شدہ فطرت کی وحی اور واقعاتی عقلیت کا فضل ہے جس کی ضرورت ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔

انسان اس طرح کی بے شمار تمہیدات اکٹھا کر سکتا ہے جو ذہن کو بیدار کر دیں اور اور راہ ہموار کر دیں بشرطیکہ وہ آیت اور حدیث کا اچھی طرح فہم رکھتا ہو، اس کے بعض اشارات اور مقاصد کو احاطہ کئے ہوئے ہو پھر وہ اس سے عجیب و غریب نکتہ نکالے جس سے سامع حیرت میں پڑ جائے یا کوئی لطیف پہلو مستنبط کرے جو نفس کو اس حقیقت کی معرفت پر متوجہ کر دے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی مردِ نیک نے اپنے پیروکاروں اور سامعین سے پوچھا: تم میں سے کون اس دنیا میں رہتے ہوئے جنت

کی رہائش کو پسند کرتا ہے؟ اس کے جواب میں ہر ایک نے اپنی شدید خواہش کا اظہار کیا۔ حیرت کی بات تھی، جنت کا وعدہ آخرت میں ہم کیا گیا تھا، پھر بھلا اس دنیا میں ہم اس میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں؟۔

مردِ بزرگ نے کہا: پھر تو تم میں سے ہر ایک کو ذکر و علم کی مجلسوں کی پابندی کرنی ہوگی اس لئے کہ ان میں ہر ایک جنت کا ایک باغ ہے اور اس مردِ نیک نے اللہ کے رسول کے اس قول سے استشہاد کیا:

"جب جنت کے باغات سے تمہارا گزر ہو تو چر چگ لو" لوگوں نے پوچھا:

اے اللہ کے رسول جنت کے باغات کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

"علم کے حلقے"

۳ —— خطبہ

آپ لیکچر اور خطبہ میں کچھ اصطلاحی فرق مندرجہ ذیل نکات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں:

(الف) لیکچر پر حقائق کے اثبات اور معانی کے احقاق کا رنگ غالب ہوتا ہے لیکن خطبہ میں جذبات و احساسات کو ابھارنے اور وعظ و نصیحت سے کام لینے کی کوشش ہوتی ہے۔

(ب) لیکچر کے نکات، قواعد، اصول اور احکام کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن خطبہ کے عناصر میں عارضی خیالات اور ہنگامی معانی سے مشابہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

(ج) لیکچر کے نکات شرح و استدلال کے محتاج ہوتے ہیں لیکن خطبہ میں خیالات و معانی میں وسعت پائی جاتی ہے اور کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

میری ذاتی رائے ہے کہ خطبہ فی البدیہہ ہونا چاہیئے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ درس اور

لیکچر بھی برجستہ ہونے چاہئیں۔ پیپر کے لیکچرار اور مقررین سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تسلیم ہے کہ کبھی کبھی انسان کو اوراق میں اپنی بات سمیٹ کر پیش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ مقام محدود الفاظ اور عبارتوں کے مقصد کی وضاحت کا متقاضی ہو جیساکہ ذمہ دار سیاست داں کرتے ہیں یا جس طرح گفت و شنید کرنے والے (NEGOTIATIVES) عبارتوں کی تضمین اور الفاظ میں ایسے معانی و اشارات کو پرونے پر مجبور ہوتے ہیں جنہیں فی البدیہہ کما حقّہٗ انجام نہیں دیا جاسکتا۔ اس طرح کے کلمات کو ہمیں "بیانات" کا نام دینا چاہیئے اور اگرانہیں خطبہ کہنا ناگزیر ہو تو یہ وہ فیصلہ کن چیز (CONCLUSIVE THING) نہیں ہے جو ہم چاہتے ہیں۔

برجستگی سے مراد الفاظ کی برجستگی ہے معانی اور نکات کی نہیں۔ اس لئے کہ جو خطیب اپنے نفس کا احترام کرتا ہے اور اپنے فریضے کی قدر و قیمت جانتا ہے اس کے لئے یہ جاننا ناگزیر ہے کہ وہ کیا کہے گا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے موقف کے حق میں خیالات اور مناسب افکار کا مواد فراہم کرلے اور یہ کہ اسے اپنے دل میں تیار رکھے اور اپنے ذہن میں کئی بار اسے تازہ کرلے۔

یہ برجستگی، حاضر دماغی، تعمیر و تشکیل اور ثبوت و دوام کی ہے جب داعیٔ دین بولنے کے لئے کھڑا ہو تو اس کا دل پوری طرح مطمئن ہو، اس کے نظریات پوری طرح ثابت اور دل و دماغ میں بیٹھے ہوئے ہوں، اپنے نفس اور اپنے موضوع کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھے، فراہم کردہ ذخیرے کا سہارا لے اگر درمیان میں کوئی نئی بات یا خیال آجائے تو اچھی چیز ہے ورنہ جو کچھ اس کے ذہن میں ہے اسے سامع کے سامنے پیش کردینا اس کے لئے

کافی ہے۔

یہ برجستگی اور حاضر دماغی عام طور سے اس کے نفس کے حوادث کی صدائے بازگشت ہوتی ہے یا کسی حادثہ یا واقعہ پر لبیک کہنے یا اپنے احساسات کے آثار سننے کا نتیجہ ہوتی ہے وہ برابر بالبدیہہ بولے چلا جاتا ہے اور عارضی محرکات اور ہنگامی عوامل کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے نفسی عقدے وا ہو جاتے ہیں اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں اس وقت اس کی برجستگی تھم جاتی ہے۔

سامعین کو ابھارنے کی یہ قسم وقتی اور عارضی ہے اس سے ہنگامی طور پر کسی اچھے کام یا رُخ پر موڑنا ہوتا ہے لیکن اس سے ارتکاز (CONCENTRATION) تنظیم (ORGANIZATION) اور پائیداری (PERMANENCE) حاصل نہیں ہوتی۔

یہ برجستگی جو وجدان کی حرکت پر قائم ہے، اپنا کام اسی وقت کر سکتی ہے جب انسان فطری صلاحیت (ORIGINAL TALENT) اور تجربات سے بہرہ ور ہو اور ان تجربات پر اس کو مرکوز کر دے جیسے وہ حاضر نکات ہیں اس کے بغیر کلام غیر مرتب ہو جائے گا اور اپنی سطحیت اور بے ترتیبی (DISORGANAZATION) کی وجہ سے سامعین کے لئے اُکتاہٹ کا سبب بنے گا۔

بہتیرے برجستہ مقررین کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ ایک مفہوم آپ کے سامنے بیان کریں گے پھر تھوڑی دیر بعد ان پر انحراف کا دروازہ کھلے گا تو اس انحراف کو دوسرے باب تک پہنچا دیں گے اور اس طرح پہلے معنیٰ کو بُھلا دیں گے، بتایئے اس طرح کی اٹکل پچو باتوں کو کون پسند کرے گا؟

صحیح ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ اکثر سامعین سے اپنا موقف چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن مسئلہ یہاں موقف کے چھپانے یا کھولنے کا نہیں ہے اس لئے کہ داعی کوئی شعبدہ باز یا جادوگر نہیں ہوتا جو اپنی غلطیاں اور جھوٹی باتیں لوگوں سے چھپائے پھرے، داعی کے سامنے کثیر المقاصد ایک مشن ہے تو کیا اس نے اپنے مقصد تک رسائی حاصل کرلی اور کیا اس ذمہ داری کو انجام دے دیا جس کے اردگرد کلام گھوم رہا ہے یا اس نے اپنا موقف، چھپالیا اور خاموش رہا؟

۴ — مقالہ

فقہ الدعوۃ والداعیۃ کے باب میں ہم نے انقلابات کے لئے ضروری تحریر کے متعلق کچھ عرض کیا تھا اب ہم اسے دہرا کر طول دینا نہیں چاہتے۔ ہم یہاں اس سے آگے بڑھ کر یہ کہیں گے کہ داعئ دین عالم و جاہل، خواندہ و ناخواندہ سب کے لئے لکھتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس معیار اور سطح پر اُترے جسے جمہور پسند کرتے ہیں الفاظ آسان ہوں، افکار واضح ہوں۔ اور فکر کے واضح ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دل سے نکلا ہو، مثال کے طور پر وطن کی محبت کے گہرے جذبے سے سرشار ہو یا دینی وجدان کی تصویر ہو یا انسانی تجربہ کو پیش کیا گیا ہو یا معاشرہ اور اس کے افراد کے حالات پر صالح اور تعمیری تنقید ہو۔

جب فکر میں جذبے کی رُوح ملی ہوگی تو وہ لازماً آسان اور واضح ہوگی۔

اور جذبہ کی آمیزش اور فکر کا واضح ہونا لفظ کے واضح ہونے سے بے نیاز نہیں کردیتا نہ جمہور کی سطح تک الفاظ کے سلسلہ میں اتر آنا نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

ایک داعیٔ دین نے پوچھا: میری تحریر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
اس کے ساتھی نے کہا: تمہارے اسلوب نے تمہاری تحریر کی حیثیت بڑھادی ہے
اور اسے طبقہ علیا میں بلند مقام دلایا ہے لیکن سڑک پر چلنے والا عام آدمی اسے دیکھتا ہے
نہ اس سے اثر لیتا ہے۔ گرچہ طبقہ علیا کے افراد اسے پڑھتے ہیں اور اس کی خوبیوں سے
واقف ہیں۔ اگر تم اپنی تحریر کا معیار گرادو اور اسے عام لوگوں کے لئے قابلِ فہم بنادو تو
تمام انسان اسے دیکھ سکیں گے اور فٹ پاتھ کا آدمی بھی اس سے فائدہ اُٹھاسکے گا۔
داعیٔ دین نے تلخی محسوس کرتے ہوئے کہا: ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ جمہور
کو اپنے معیار تک اٹھائیں نہ کہ خود ان کے معیار تک گرجائیں۔
اس کے ساتھی نے کہا: اگر تم زبان وادب کے استاذ ہوتے تو تمہاری یہ بات
مناسب تھی لیکن تم داعیٔ دین ہو اور ایک مشن کے علمبردار ہو، تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ
سب سے ملو اور سب سے گفتگو کرو اور سب کو سمجھاؤ۔ اگر تم لوگوں سے ان کی عقلوں کے
مطابق معاملہ نہیں کروگے تو اپنے وقت کو برباد کروگے اور اپنے مشن میں ناکام رہوگے۔
کیا تم تاجر کو نہیں دیکھتے، وہ اپنی تجارت کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کرتا ہے اور تعارف
اور فروخت کے لئے کیا کیا حیلے اپناتا ہے؟ تم بھی اسی طرح لوگوں سے تجارت کررہے ہو،
تم سوچو کہ دعوت کی طرف ان کے شوق ورغبت اور ذوق کو کیسے اُبھاروگے؟
اوپر کی تحریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عوام کی حیثیت پڑھنے کے معاملہ میں
اس بچے کی ہے جس کے معدہ میں کوئی بیماری ہوگئی ہو، جب وہ کھانا دیکھتا ہے تو اس
کی پیشانی پر بل پڑجاتے ہیں، منہ نفرت سے پھیر لیتا ہے اور اپنا معدہ سکیڑ لیتا ہے، اس
کے والدین برابر اسے پھسلاتے ہیں اور اس کی بھوک کی شہوت کو بڑھاتے ہیں اور طرح طرح

کی تدبیریں کرتے ہیں تاکہ تھوڑا سا کھانا ہی وہ کھالے۔

ہم بہت سے لوگوں کو پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن وہ اس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں جو ان کے کسی کام نہیں آسکتیں، ناول اور قصے، تفریحی رسالے ان کے مطالعے میں رہتے ہیں اسی میں اپنے اوقات گنوادیتے ہیں اور راحت محسوس کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ماہر صحافی اس حقیقت کا ادراک رکھتا ہے اور جمہور کے سامنے ہلکے ہلکے پاؤں آتا ہے اسے کوئی خبر دینی ہوتی ہے تو چھوٹے موٹے قصہ کی شکل میں اسے بیان کرتا ہے یا کسی دل چسپ نکتہ کے ساتھ اسے تحریر کرتا ہے، وہ اپنے بیمار بچوں کو اپنا فن اور فکر سکھانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے، اپنے اخبار کو ترقی دیتا ہے اور بازار میں چھا جاتا ہے اور بزموں اور محفلوں میں اسی کی دھوم رہتی ہے اور گھروں اور پارکوں میں اس کا چرچا رہتا ہے اور قارئین کے کمروں اور خواب گاہوں کی وہ زینت بنا رہتا ہے۔

داعیٔ دین کو یہ حقیقت سمجھنی چاہیئے اور اسے چاہیئے کہ وہ بیمار بچوں کو اپنے حساب میں داخل کرے، اس کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ صحافی کی طرح تدبیریں کیسے کرسکتا ہے اور دعوت کا وقار اور اس کے معانی کی عظمت اس انداز کو ناپسند کرتی ہے میں کہتا ہوں کہ اس کے لئے لولے لنگڑے بہانے تراشنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ جب وہ حرکت کرے گا، کوشش اور جدّوجہد کرے گا، نئے نئے تجربات کرے گا تو کوئی مفید نتیجہ ضرور نکلے گا اور خوش کُن ثمرات برآمد ہوں گے۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ داعیٔ دین سطحیت اور چھچھوری حرکتوں کا مظاہرہ کرے لیکن یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ ہر وقت لئے دیئے رہے اور سنجیدگی اور خاموشی کا پیکر بنا رہے۔

آپ بلا شبہ ایسے فلسفہ اور علم کلام سے لیس ہیں جو فطرت کی گہرائیوں اور وجود کے باریک اور لطیف قوانین سے متعلق ہے لیکن اس طرح کی چیزیں ان تصنیفات کے لئے خاص ہیں جو اہل فکر و تحقیق کو مخاطب کرتی ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے اور ان کے ساتھ خصوصی معاملہ کرنا پڑتا ہے لیکن جن مقالات میں عوام کو مخاطب بنایا جاتا ہے ان میں آپ کے تجربات کا نچوڑ اور خلاصہ ہونا چاہیئے تاکہ ان سے استفادہ عام ہو سکے۔

داعیٔ دین کے اوپر اس سے اس کی ذمہ داری آسان ہو جاتی ہے کہ وہ عوام کے لئے عقیدہ کی تعمیر، خدا سے تعلقات کے سلسلہ میں عقل کا کردار، نادیدہ حقائق سے انسان کے تعلق کا طریقہ وغیرہ ان تمام فلسفیانہ موضوعات سے اجتناب کرے جن کا تعلق عقل و فلسفہ اور فکر سے ہو بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کے واقعات پر گفتگو کرے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ روزمرہ کی زندگی کے واقعات ہی انسانیت کی موجودہ تاریخ ہیں اور ان میں اس کے خطا و صواب، خیر و شر سب مدفون ہیں۔ اگر داعیٔ دین اس زندگی کے روزمرہ کے واقعات سے کوئی نیا مواد لیتا ہے اور اس کے خیر و شر اور صحیح و غلط دونوں پہلوؤں پر گفتگو کرتا ہے اور ہر ایک کی اس کے بڑھتے ہوئے طبعی شکل میں صورت گری کرتا ہے اور ربانی رُوح سے اس کا علاج کرتا ہے اور انہی پیمانے میں اس کی پیمائش کرتا ہے تو اس نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور امانت پہنچا دی۔ پھر وہ محسوس کرے گا کہ اس کی گفتگو بازاروں میں چھا چکی ہے، محفلوں پر اس کا تسلط ہو چکا ہے، گھروں میں اس کا چرچا ہے اور خواب گاہوں میں اسی کے تذکرے ہیں اس لئے کہ زندگی نے اسے یہاں تک پہنچایا ہے اس کے بعد آپ کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنی گفتگو میں عامی الفاظ استعمال کریں، جاری عبارت کو جگہ دیں، رائج امثال کو اہمیت دیں یا دوسرے

عوامی طریقے استعمال کریں جو کانوں کے لئے ہلکے ہوں اور مراد کی وضاحت میں ممد ومعاون ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول نے فصیح اللسان متقرروں کو ناپسند کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو ایسے الفاظ سے عوام کو خطاب کرتے ہیں جنہیں وہ سمجھ نہیں پاتے۔ اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے کلام میں غیر فصیح الفاظ بھی استعمال کرتے تھے اور اپنے اصلی لہجہ سے کبھی کبھی انحراف بھی کر جاتے تھے تاکہ قبائل کے وفود کو ایسے لہجوں میں مخاطب کریں جنہیں وہ سمجھتے ہوں۔ تو کیا ہم اس سے عبرت حاصل کریں گے؟

۵ — روزمرّہ کی گفتگو

جب داعیٔ دین کو یہ احساس ہو کہ عوام سے اس کی ضرورت ہے جس کی تکمیل کی اسے توقع اور امید ہے اور اس کے حصول میں وہ نرمی اور مہارت سے کام لے تو وہ اصل میں داعی ہے لیکن اگر وہ یہ شعور اور احساس نہیں رکھتا تو وہ اس اہم کام کے لئے موزوں نہیں ہے۔

جو لوگ عوام پر ناراض ہوتے ہیں اور ان کی بے نیازی پر لال پیلے ہوتے ہیں وہ داعیٔ دین کی ذمّہ داری کا شعور نہیں رکھتے۔

عوام کو کوئی ضرورت درپیش نہیں ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے آپ سے دوستی کریں لیکن آپ تو ضرورت مند ہیں آپ کو سوچنا ہے کہ کیسے ان سے مخاطب ہوں اور اپنی ضرورت پوری کریں، تو کیا نرم گفتگو اور شیریں کلامی کے سوا کوئی اور بھی چارۂ کار ہے؟

یہ بات لیکچر، درس، خطبہ اور مقالہ میں بھی کہی جاتی ہے لیکن روزمرّہ کی گفتگو

میں یہ زیادہ لائق توجہ اور نمایاں ہے اس لئے کہ یہاں کسی فرد یا چند افراد سے رو در رو، بات کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کے اندر کبر اور غرور ہوتا ہے، کچھ لوگ با اصول آدمیوں کو گری ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کی اِن کے دل میں کوئی قدر نہیں ہوتی اور کچھ لوگ بحث و مباحثہ اور غلبہ و فتح کا میلان رکھتے ہیں، آپ کو ان سب چیزوں کو سامنے رکھنا ہے اور ان کا جوڑ توڑ علاج کرنا ہے۔ اور ان کا علاج اسی طرح ہوسکتا ہے کہ ان سے صرفِ نظر کرلیں اور شیریں کلامی، نرم گفتاری اور خوئے دلنوازی سے چمٹے رہیں۔

ہم داعیٔ دین کو یہاں تین باتوں کی وصیت کرتے ہیں:

۱۔ پہلی نصیحت یہ ہے کہ اپنے مناظر پر غلبہ و فتح کی خواہش، ہرگز نہ کریں بلکہ جب یہ احساس ہو کہ گفت گو مناظرے کا رخ اختیار کر رہی ہے تو طرح دے دیں اور ادب اور حکمت سے دامن بچالیں اگر اس کے بعد پُر سکون ماحول میں نرم گفت گو کرسکیں تو بہتر ہے ورنہ تکرار ہرگز نہ کریں۔

اس سے صرف مباحثہ کی بُرائی اور دلوں میں پلنے والے کینہ و حسد سے بچنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس آفت سے دُور رہنا پیشِ نظر ہے جو ہمیں دعوت کے سچے اسلوب سے دور کردیتی ہے۔ مباحثہ و مناظرہ دعوت کا اسلوب ہرگز نہیں ہے نہ غلبہ و تمکن کا اس سے کوئی تعلق ہے اور دعوت میں کوئی غالب ہے نہ مغلوب لیکن سب نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

آپ کا غالب آنا ناگزیر ہے لیکن غلبہ و فتح سے محبت کا شعور اور اس کا اظہار ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

اور آپ کو غالب آنا ہے لیکن شیریں کلامی اور حسن کردار کے سوا کسی اور ہتھیار کو استعمال نہیں کرنا ہے یہ وہ ہتھیار ہے جو بڑے بڑوں کو چت کر دیتا ہے اور اس شخص کو آپ کی گود میں لا گراتا ہے جو عناد اور مباحثہ سے محفوظ ہو۔

۲۔ دوسری نصیحت یہ ہے کہ لوگوں کو چیلنج کرنا چھوڑ دیں کہ یہ دعوت بڑی عظیم اور اس کے اصول و مبادی بے حد قیمتی اور بلند ہیں، اور انہیں یہ چیلنج نہ کیجیے کہ دعوت کے آدمیوں میں صلاح و تقویٰ، جہاد اور اخلاق کی اسپرٹ بہت پائی جاتی ہے اور یہ کہ دعوت غلبہ اور تمکن کے بعد ایسے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک کرے گی وغیرہ۔

اس طرح کے چیلنج اور مبارزت طلبی سے بالکل پرہیز کیجیے اور ہمیشہ یاد رکھئے کہ ضرورت آپ کو درپیش ہے تو کیا یہ چیلنج سے پوری ہو جائے گی۔؟

آپ شکاری ہیں اور شکار آپ کے سامنے ہے جس کو آپ شکار کرنا چاہتے ہیں تو کیا آپ اسے بھڑکا دیں گے کہ وہ بھاگ جائے اور آپ اسے نہ پا سکیں ؟ یا معاملہ اس کے برعکس ہوگا؟

بلکہ ہم تو اس سے آگے بڑھ کر اس وقت بھی نرمی اختیار کرنے کی وصیت کرتے ہیں جب دوسروں کی جانب سے ہمیں چیلنج کیا جائے۔ ہم اس چیلنج کو بھول جانے اور دل و دماغ پر اس کا اثر نہ لینے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہم یاد رکھیں کہ شکار بس بھاگ جانے کو ہے اس لئے بغیر کسی ذلت کے اسے پرچائیں اور اس سے پُر سکون محبت کا اظہار کریں اور یہ بالکل فطری انداز سے ہو تصنع اس میں شامل نہ ہو یہاں تک کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ اپنی جگہ خاموش ہو جائے۔

آپ کا فریق مخالف جو آپ کو چیلنج کر رہا ہے، اس کا اس میں کوئی مادی یا اخلاقی فائدہ

نہیں ہے اس لئے وہ بیمار نہیں ہے اور اس کا علاج کرنا آسان ہے اور اسے حاصل کرنا سہل ہے —،

آپ اپنی طرف سے اس سے محبت، اس کی شخصیت اور اس کی رائے کے احترام کا مظاہرہ کریں اور اپنے سنجیدہ اشاروں اور پر سکون حرکات سے اسے باور کرائیں کہ آپ نارمل اور کشادہ دلی کی حالت میں ہیں اور اس کے چیلنج سے بالکل خالی الذہن ہیں۔

آپ کہیں گے: یہ کیسے؟ میں کہوں گا، اس کا علمی تجربہ کیجئے، زندگی کے تجربات ہی اس کی تشریح کریں گے اور بیشمار مثالیں آپ کے سامنے رکھدیں گے۔

۳۔ تیسری نصیحت یہ ہے کہ لوگوں پر اپنی علم دانی اور فصاحت کا سکہ نہ جمائیں۔ لوگ اس شخص کو پسند نہیں کرتے جو اپنی ذات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے یا دوسروں سے امتیاز کا مظاہرہ کرتا ہے۔

آپ خاکساری اختیار کریں، اپنا علم و فضل اور فصاحت و بلاغت طاق نسیاں کے حوالے کردیں اور لوگوں سے اس طرح بات کریں کہ اس میں کوئی تکلف اور تصنع نہ ہو پھر تو وہ ان سے مل جائے گا اور عوام اس سے گھل مل جائیں گے۔

ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو اپنی اہمیت جتاتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا احساس رکھتا ہے! ہوسکتا ہے کہ لوگ اسے غصہ نہ دلائیں اور کوئی اسے تکلیف نہ دے لیکن وہ عوام سے کبھی قریب نہیں ہوسکتا نہ اپنی ذمہ داری کی تکمیل میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

ہم یہ باتیں اس لئے کہہ رہے ہیں تاکہ ہم میں سے ہر شخص اپنے نفس کو دھولے اور اسے اس نجاست سے پاک کرلے اور لوگوں کو مخاطب کرنے میں یہ ہمارے لئے علمی دستور بن جائے چنانچہ جب ہم دوسروں سے خطاب کریں تو اس حیثیت سے خطاب

کریں کہ ہم بھی سامعین کے ہم مثل اور برابر ہیں اور ہمارے پاس جو علم وفضل ہے سب اللہ کا ہے، کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس لئے اللہ کے فضل کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوں، اپنے نفوس کی فضیلت کے ساتھ نہیں، تو اللہ تعالیٰ جن عقلوں اور دماغوں کو چاہے گا ہمارے لئے کھول دے گا اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَّ آخِرًا وَّصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا
مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا

